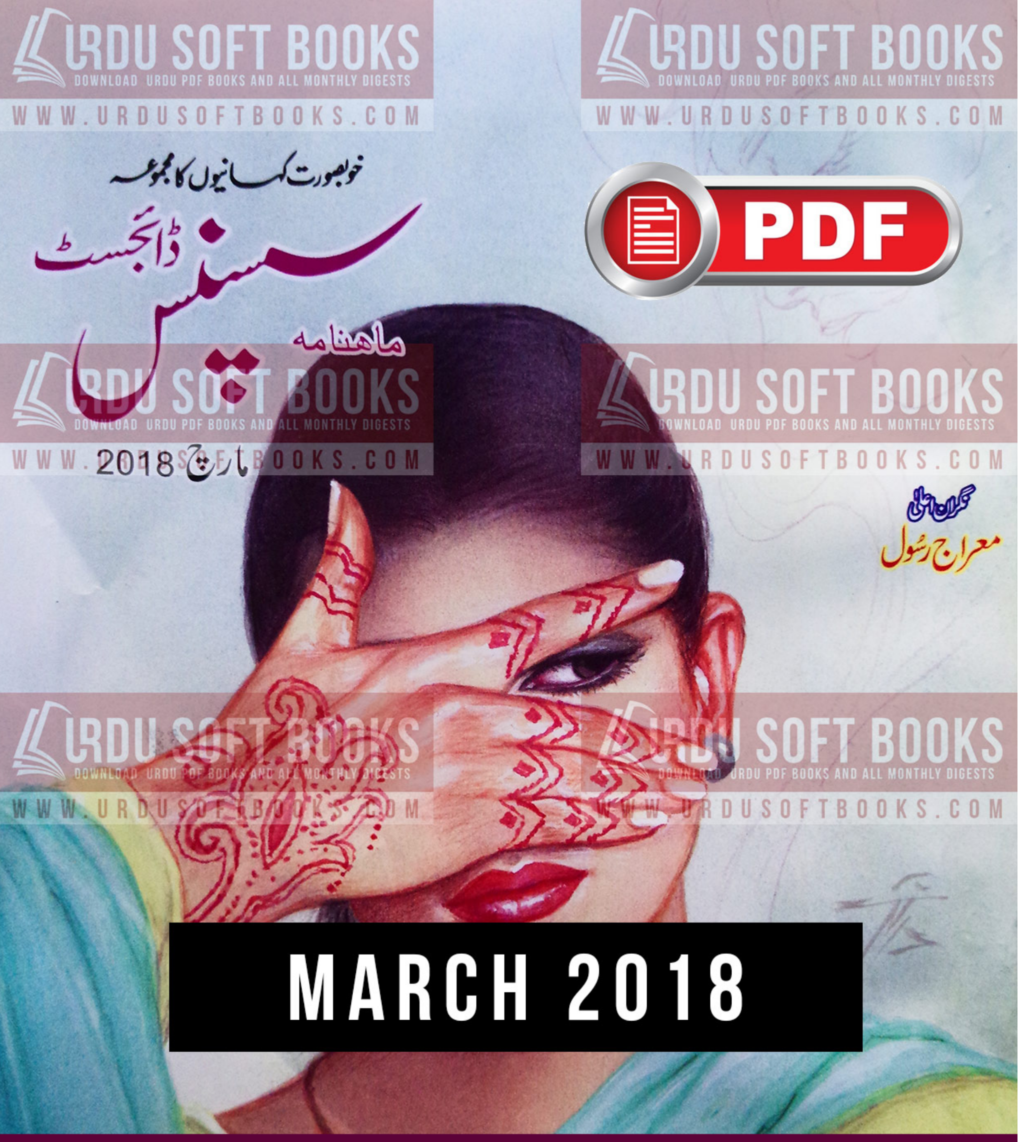

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

07 انشائیہ — جون ایلیا
جب الفاظ بے معنی ٹھہریں تو ایسی ہی لازوال تحریر رقم ہوتی ہے

08 آپ کے خط — مدیرِ اعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت وقارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16 موراں — علی اختر
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

49 نفع، نقصان — تنویر ریاض
محبت کی چاشنی میں لپٹی دھوکا دہی کی تلخیوں کا قصہ

57 التجا — محمد شوکی
بعد از مرگ...... بھٹکتی روح کی درد انگیز التجاؤں کا قصہ

62 رنگِ آسماں — اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خوں ریزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

93 جسٹس — ناہید سلطانہ اختر
معصوم بچوں کا بچپن چھین لینے والے سنگدل اور ظالم انسانوں کا ماجرا

99 مہلت — ثمر عباس
محفوظ ہاتھوں میں اپنا اہم رشتہ دے کر ایک مجرم باپ کے اطمینان کا قصہ

108 آوازِ حق — مرزا امجد بیگ
بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند لوگوں کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جلد 47 • شمارہ 03 • مارچ 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

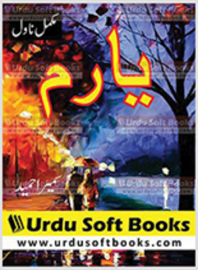

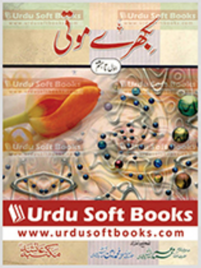

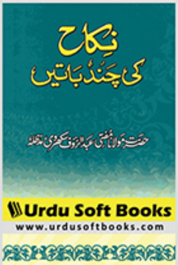

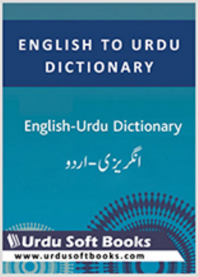

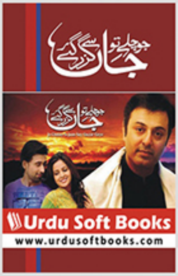

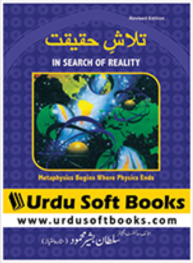

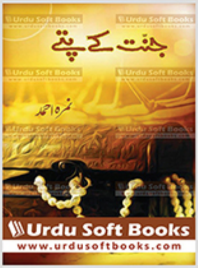

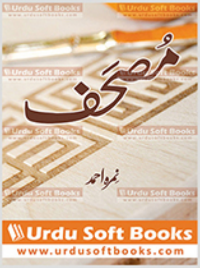

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

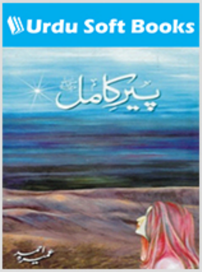

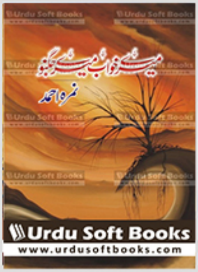

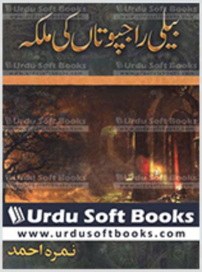

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

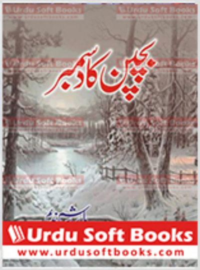

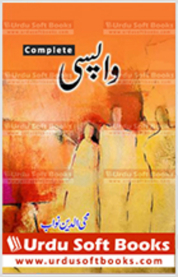

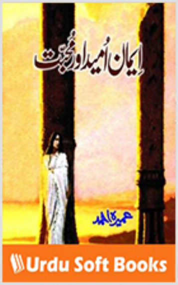

www.urdusoftbooks.com

139 **خلش** — نعمان اسحاق

زندگی کے بجائے درد کو جینے والی ایک حسینہ کی دلدوز کتھا

151 **امانت** — شاہ زین رضوان

محبت کے رشتوں میں گندھی ممتا کی تڑپ اور لگن کی روداد

160 **محفلِ شعر و سخن** — قارئین

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

163 **حبس زدہ** — مظہر سلیم ہاشمی

ایک پتھر دل باپ کی شقی القلبی... ایک لرزہ خیز واردات

174 **وقت** — حسام بٹ

ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

209 **دیدہ دلیری** — شاکر لطیف

دوسروں کو نصیحت کرنے والے منصفوں کی بے ایمانی اور بے اصولی کا ماجرا

221 **انتقام** — انجم فاروق ساحلی

جوش میں ہوش کھو دینے والے مجرموں کا عبرتناک انجام

225 **حضرت موسیٰ** — رضوانہ ساجد

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

239 **ناکام** — منظر امام

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے والوں کے لیے ایک حساس تحریر

245 **تنہائی** — نادیہ نور

خون جما دینے والے برفیلے موسم کی لہو گرما دینے والی واردات کا احوال

252 **حریف** — نشور ہادی

حفاظت کی چادر میں چھپے نکیلے خنجروں کی اذیت اور...... بے اعتبار رشتوں کی دلخراش داستان

** **کترنیں** — ادارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ماہِ فروری 2018ء کے دل کش شمارے کی حسین جھلکیاں

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

رفعت سراج اور **شیریں حیدر** کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دینے والی اقساط

حیا بخاری کے سلسلے وار ناولٹ...... **محبت لفظ ہے لیکن**...... میں دیکھیے کردار نگاری کے حسین جوہر

ناهید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار افسانہ...... **چاک چاک قبائے دل**

فرحین اظفر...... **عورت کہانی** میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں

روشانے عبدالقیوم کا مکمل ناول...... **میرا عشق صوفیانہ**

کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے

ذکیہ بلگرامی اور **اختر شجاعت**

کے ایمان افروز کالم

شائستہ زریں نے مہمان بلایا **شہزاد شیخ** اور ان کی وکیل ہم سفر کو

اس کے علاوہ

مایہ ناز قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں **عقیلہ حق**، **طیبہ عنصر مغل**، **بشریٰ سیال**، **هما بیگ**، **ماہ وش طالب**، **نزہت جبین ضیا**، **حرا قریشی**، **صدف آصف** و دیگر مصنفات شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگارنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ......

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

انشائیہ

جون ایلیا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مشرق

ایک انگریزی فلم کے دوران میں پاکستان کی ایک آراستہ وپیراستہ بیٹی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ پاکستان اور انگلستان کے درمیان کھیل کا جو مقابلہ ہورہا ہے، اس کا انجام کیا ہوا؟ اسی نزدیکی میں ایک شخص نے جو ٹرانزسٹر سے کان لگائے کھیل کی روداد سن رہا تھا، بتایا کہ پاکستان ہار گیا اور پھر ان برومند اور ارجمند ہستیوں کے دلوں میں 1857ء کا دکھ تازہ ہوگیا۔ مغرب کے مقابلے میں مشرق کی بے حرمتی کا داغ پھر جل اٹھا۔

ہم جس بود وماند میں قائم ہیں، اس میں انگلستان سے ہارنا تو ہارنا، جیتنا بھی ہارنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بوزنے نے ایک انسان سے یہ شرط بدی کہ جو فلاں انسان کی ہوبہو نقل اتار دے، وہ اس پیڑ کے سارے پھلوں کا حقدار ہوگا۔ بوزنہ اس نقل میں جیت گیا اور خوش خوش اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ نے کہا۔ ”ارے میرے بیٹے! بوزنے کا انسان کی نقل اتارنے میں، انسان سے جیت جانا کیا تیرے خیال میں جیتنا ہے؟“

تمہارا ہر کام اور ہر کھیل مغربی ہے، پس تم ہارے تو کیا اور جیتے تو کیا؟ بلکہ دکھ تو یہ ہے کہ تم ان کی نقل اتارنے میں کبھی کبھی جیت بھی جاتے ہو۔ اے قوم! تیری مسخرگی دیکھنے کے قابل ہے۔ تیرا قومی احساس اب صرف کھیلوں کے میدان میں بیدار ہوتا ہے۔

ہم دانش وروں کے اس فطانت نصاب اور حکمت مآب گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے جراثیم کے ”قومی شعور“ پر خطبات دینے کی اہم ذمے داری قبول کر رکھی ہے۔ جو حشرات کے ”تہذیبی تشخصات“ کے باب میں دادِ تحقیق دیا کرتے ہیں۔ جراثیم کا قومی شعور، حشرات الارض کے تہذیبی تشخصات...... ایک کیڑا میز پر جھکا ہوا مشرق کے عظیم ادبی ورثے پر انگریزی میں مضمون لکھ رہا ہے۔ ایک مکوڑا، دیوانِ غالب ہاتھ میں لیے ہوئے، چاچا کی دھن میں بحرِ ہزج کی سرپرستی کررہا ہے۔

تم کیا اور تمہارے احساس کیا۔ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ جب نہیں ہو تو کیوں کان کھائے جاتے ہو۔ ذرا اپنے آپ کو چھو کر تو دیکھو۔ دیکھا تم نے...... یہ کچھ اور ہے۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالو۔ یہ کسی اور کی شکل ہے۔ تم جو چکھتے ہو، اس کی شیرینی اور ترشی پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ تمہارے کان دوسروں کے لیے سنتے ہیں۔ تمہارا شامہ دوسروں کے لیے سونگھتا ہے۔ تمہارا لمس غلام، تمہاری بصارت غلام، تمہارا مذاق غلام، تمہاری سماعت غلام، تمہارا مشام غلام۔ تمہیں وقت نے وہ مار ماری ہے کہ تمہارا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ تمہارا دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔ تمہارے ہونے کی اب محض ایک ہی دلیل رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ تم جگہ گھیرتے ہو۔ مشرق قائم دائم ہے کہ چشم بددور...... مشرق میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ خدا اس حجم کو قائم ودائم رکھے۔

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

آپ کے خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

مارچ 2018ء کا شمارہ اپنے باذوق قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ مہینا مارچ کا ہو اور قراردادِ پاکستان کا ذکر نہ ہو تو بات کچھ بنتی نہیں ہے مگر...... مشکل تو یہ ہے کہ 23 مارچ کے اغراض و مقاصد کا ذکر کر کے بھی بات بنتی نظر نہیں آتی کیونکہ...... جب انسان کو اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں بھی تحفظ کا احساس نہ ملے تو یہ کیفیت اسے ذہنی اذیت و ابتری کا شکار کر دیتی ہے۔ جی ہاں آج کل پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی کچھ ایسی ہی بے اعتباری کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ایک بار پھر سے معصوم بچوں کے اغوا، ظلم اور زیادتی کی وبا پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد معلوم ہو جانے کے باوجود قانون کے شکنجے سے آزاد نظر آتے ہیں۔ والدین غموں سے چور اور پولیس مجرمان سے دور جب کہ پاکستانی معاشرہ بے کس و مجبور...... یہ کیسی منظر کشی اور تاریخ رقم ہو رہی ہے اور دوسری جانب قانون کی وردیوں میں ملبوس اہل کاروں کے ہاتھوں بے قصور شہریوں کو کوئی بھی جھوٹا الزام دھر کر بے رحمانہ قتل کیا جا رہا ہے...... اب کوئی یہ بتلائے کہ ایسے میں بات کیسے بن سکتی ہے۔ اگرچہ الیکشن دھمال کے جال میں الجھا کر تمام سیاستدان اپنے اپنے مفاد کی بات بنانے کی کوشش تو کرتے نظر آرہے ہیں اور حسبِ دستور پاکستان کے دستور کی آڑ لے کر عوامی مسائل سے نظریں چرانے کی روایت پر بھی دل و جان سے عمل پیرا ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ماہ میں دو بار پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کر کے گیس، بجلی، پانی اور روزگار کو ترسے ہوئے لوگوں پر مہنگائی کا بم نہ گرایا جاتا۔ بے یار و مددگار یہ قوم جس کے بظاہر اتنے سارے ''قائدین'' چلتے پھرتے اور تقاریر کرتے نظر آتے ہیں، اپنی بے بسی پر جھنجلاہٹ اور ڈپریشن کا شکار نہ ہو تو کیا کرے، اولاد چھوٹی ہو یا بڑی...... اس وقت والدین کے لیے یہ دور بہت بڑی آزمائش بن چکا ہے۔ جنگل کے قانون کے بھی کچھ اصول ہوں گے...... کچھ نہیں تو جنگلی جانوروں میں بھی کچھ دیر لحاظ کی رمق ہوتی ہو گی، لیکن...... یہاں انسانی فعل...... انسانی معاشرہ اور قانون...... کس پر اعتبار کیا جائے۔ کیا ہم پھر سے پتھر کے زمانے کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں...... تعلیم، ترقی، جدت، ایجادات نے ہمیں اس شعور سے کیوں دور کر دیا ہے کہ یہ سب تو انسان کے لیے ہیں تو پھر یہ انسان کے ہی دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ بہرحال سوال تو بے شمار ہیں مگر جواب کسی ایک کا بھی ملنا دشوار ہے لہٰذا آخر میں ہم صرف یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یاالٰہی ہمارے رہنماؤں اور بااختیار طبقے کو وہ شعور دے جو انسان کے لیے صرف انصاف کی بنیاد پر بہترین معاشرہ تخلیق کر سکے، (آمین) اور اب اس سوالیہ نشان کو سوچ کی مٹھی میں دبائے کچھ اپنی محفل کی بھی خبر لیتے ہیں جہاں قارئین اپنے سندیسوں کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔

✠ **محمد رفاقت**، واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں ''فروری 2018ء کا شمارہ آب و تاب سے ہمارے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ خوبصورت اور شاندار رسالہ شائع کرنے پر میں ہی نہیں سب ہی آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ وقت پر ملنے سے اسے پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر خط بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس دفعہ بھی کہانیوں کا معیار پہلے سے بھی بہتر تھا۔ پہلی ہی کہانی ہٹ دھرم تاریخی تھی اور علی اختر صاحب نے اس کہانی کو بہت ہی اچھے انداز میں تحریر کیا جس میں چنگیزی اور تاتاری قوم کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ علی اختر صاحب نے حق ادا کر دیا اور خوبصورتی سے سب کرداروں کو ایک کہانی میں سمو دیا۔ بے شک وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (جی بالکل درست کہا۔ تاریخی کہانی بڑی عرق ریزی کا تقاضا کرتی ہے) دوسری کہانیوں میں تنویر ریاض کی جوشِ انتقام، زویا اعجاز کی میراث، محمد یاسر اعوان کی شراکت دار، ناہید سلطانہ کی بے خبر، ملک صفدر حیات کی جرم زادہ، محمد الیاس کی جمہوریت، اعتزاز سلیم وصلی کی مجرم کون، شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ، شاہ زین رضوان کی نادیدہ زخم، ایم زیڈ شیخ کی حقیقت، انجم فاروق ساحلی کی خطرناک، ثمر عباس کی رازداں، اسما قادری کی وارث، سب ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ (بہت خوب) محفلِ شعر و سخن نے بھی دل لوٹ لیا، بہت اچھے شعر پڑھنے کو ملے۔ خط بھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

خوب اچھے لکھے گئے ہیں۔ خاص کر منشی محمد عزیز صاحب عرصے سے پڑھ رہے ہیں مگر لکھتے سال کے سال ہیں۔ میں بھی آپ کی اس بزم میں ایک کہانی ارسال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ اسے اپنے پرچے میں جگہ دیں گے۔'' (جی ضرور جو پتا فہرست کے صفحے پر درج ہے اسی پر آپ ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہوئی تو ضرور پرچے میں جگہ پالے گی۔ سسپنس پسند کرنے کا بے حد شکریہ)

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے محفل میں شریک ہیں ''حسینہ کی بجھی بجھی مسکراہٹ اور اداس چوڑیاں یہ کہانی سنا رہی تھی کہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں۔ خیر، آگے بڑھے تو جون ایلیا صاحب نے اپنے قلم کی چبھتی ہوئی تحریر سے روشناس کرایا۔ غریب عوام کو ہر دفعہ بے وقوف بنانے والے سب اچھا ہے دکھائیں گے اور ووٹ لے کر چلتے بنیں گے۔ پھر یا مقدر یا نصیب۔ اس کے بعد اپنی پیاری محفل میں قدم رکھا۔ منشی محمد عزیز ہئے وہاڑی سے رقم طراز ہیں کہ یہ خط وہ بیس سال بعد لکھ رہے ہیں۔ بھئی بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے۔ چند مہربان جب بھی آئیں مہرباں ہی ہوتے ہیں۔ آپ کا خط بہترین ہے۔ میرا شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد صفدر معاویہ آپ نے یہ بات بالکل ٹھیک لکھی ہے کہ مال اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا مہربانی۔ آپ کا تبصرہ بھی قابلِ قدر ہے۔ ہر بات کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ایمانے زارا شاہ آپ تبصرہ خوب لکھتی ہیں۔ بابر عباس اور ماہین بابر آپ لوگوں کا کافی عرصے سے سسپنس کے ساتھ تعلق ہے۔ بابر عباس بھائی کافی اچھے اور گپ والے خط لکھتے رہے ہیں۔ ان کی ڈیڑھ روپے قیمت والی بات سن کر مجھے بھی یاد آ گیا کہ میرا تعلق بھی سسپنس سے اتنا ہی پرانا ہے۔ (بہت خوب) عبدالجبار رومی کیسے ہو بھئی۔ محفل میں آپ کا خط دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ویسے شاہانہ سلطان، ناہید یوسف اور کرن عمران کے تبصرے شاندار ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ کہانی ہٹ دھرم نے بھی خوب معلومات میں اضافہ کیا۔ عورتوں کی ضد نے تاتاریوں کو آسمان سے زمین پر پٹخ دیا۔ ضد تو کسی کی بھی ہو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد پڑھی ملک صفدر حیات صاحب کی جرم زادہ، مطلب ہے، جرم کی کوکھ سے جنم لینے والا بندہ۔ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی کہانی نے ہمارے ذہن کو بھی کئی قلابازیاں لگوائیں۔ آخر جب مجرم سامنے آیا تو حیرانی ہوئی۔ یہاں بھی آشنا سے اسے قتل کروا دیا اور بعد میں مکر گئی۔ بہرحال کہانی اچھی رہی۔ آج کل کی بلکہ میری ناقص رائے کے مطابق ہمیشہ کی سیاست سے پردہ اٹھاتی کہانی محمد الیاس کی جمہوریت عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اعتزاز سلیم وصلی کی تحریر مجرم کون ایک چونکا دینے والی تحریر ہے۔ نعمان نے جو کچھ کیا بظاہر اچھا نہیں کیا۔ لیکن اس نے معاشرے کو وہی لوٹایا جو معاشرے نے اسے دیا۔ انجم فاروق ساحلی کی کہانی خطرناک میں ایک بیوی نے اپنے خاوند کے قتل کا بدلہ بڑی ہوشیاری سے لیا۔ انجم فاروق ساحلی ویل ڈن، نفسیاتی جنگ، شراکت دار اور حقیقت بھی پسند آئیں۔ یہ بات میں برملا کہوں گا کہ آپ لوگوں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ جس نے ہمیں سسپنس کا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ (آپ کی پسندیدگی کے چند جملے ہمارے حوصلے مہمیز کر دیتے ہیں) اس بار میرا شعر شاید راستے میں رہ گیا تھا۔'' (لگتا تو یہی ہے)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''انشائیہ حسبِ معمول فکر انگیز تھا۔ خطوط کی محفل میں پہلے نمبر پر آنے والے منشی محمد عزیز صاحب کو مبارکباد، موصوف واقعی بہت پرانے تبصرہ نگار ہیں، یہ عاجز بھی اس زمانے سے وابستہ رہا ہے اور آج بھی وابستہ ہوں۔ (بہت شکریہ جناب) 1984ء سے لے کر اب تک کے میرے تبصرے میں نے محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اشعار کا ذخیرہ بھی محفوظ ہے۔ (بہت خوب جناب) مدیرِ اعلیٰ صاحب میں آپ سے شکایت نہیں کروں گا کہ فروری کے پرچے میں میرا خط شائع نہیں ہوا، ڈاک خانے والوں کی غفلت کا شاخسانہ لگتا ہے مجھے۔ (بالکل درست کہا آپ نے۔ آپ کا پہلا خط بھی آپ کے دوسرے خط کے ساتھ ہمیں ملا ہے) جوشِ انتقام کہانی معقول تھی، تعجب ہے سراغ رساؤں میں بھی ایسی بھونڈے بازیاں ہوتی ہیں۔ میراث نے بہت متاثر کیا، یہ ایک فکر انگیز کہانی تھی۔ کافی عرصہ یاد رہے گی۔ رنگِ آسماں نے اس بار بہت گہرے رنگ بکھرے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں تجسس اور سسپنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، بہت مزہ آ گیا۔ شراکت دار نہ صرف پر اثر تھی بلکہ سبق آموز بھی تھی۔ بے خبر، سعد اللہ کے بچے والدین سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ اس کا سبب جان کر حیرت ہوئی۔ جرم زادہ اس دفعہ ملک صاحب کی کہانی بہت ہی پھڑکتی ہوئی تھی، کہانی میں خوب لطف آیا۔ جمہوریت ہائیں، یہ تو کوئی کہانی ہی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے وطنِ عزیز کے حالات بیان کیے ہیں سو بہت خوب کیے ہیں۔ ''مجرم کون؟'' کافی دلچسپ کہانی تھی، لطف آ گیا۔ وقت پر تبصرہ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ نفسیاتی جنگ بھی خوب کہانی تھی۔ نادیدہ زخم، پسند نہیں آئی۔ حقیقت نے بھی خوب مزہ بہم پہنچایا۔

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

(لگتا ہے آپ چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں...... یہ تو ہماری حوصلہ افزائی ہے کہ آپ کو مزہ آجاتا ہے) خطرناک بھی اچھی کہانی تھی، اس میں سسپنس بھی تھا۔ رازداں کہانی چٹ پٹی تھی۔ کہانی وارث نے تو ہلا جلا کے رکھ دیا، کہانی کار بھی کون! اسماء قادری، موصوفہ کا شیش محل ابھی تک ذہن میں گونج رہا ہے۔ اشعار کی محفل میں کراچی کے عاصم خان اور جھنگ سٹی کے عظیم احمد، عرفان احمد اور کوئٹہ کے عادل خان کے اشعار قابلِ داد تھے۔ جن دوستوں نے اپنے اپنے تبصروں میں مجھ ناچیز کا ذکرِ خیر کیا، ان سب کا میں تہ دل سے شکر گزار و ممنون ہوں۔''

✠ اوشا راٹھی، مٹھی، سندھ سے خراماں خراماں چلی آرہی ہیں ''جنوری 2018ء کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی دل خوشیوں سے بھر گیا، دعا ہے اوپر والا پورا سال خوشیاں، سکون اور امن سے نوازے۔ آمین۔ ذاکر انکل کے ذوق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور ٹائٹل کی خوبصورتی میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ ڈائجسٹ کی قیمت میں جتنا بھی اضافہ کریں ہم چھوڑنے والے نہیں۔ بے فکر رہیں۔ (فکر تو ہوتی ہے لیکن آپ کی محبت مطمئن کر دیتی ہے) ایلیا جی نے قانون کے بارے میں لفظ لفظ سچ بولا، ویلڈن۔ ایما نے زارا شاہ صدارت پر نظر آگئی۔ تبصرہ بھی سپرہٹ تھا، مبارک ہو۔ زرین خان ہمیشہ سے باریک بین ہیں اور دور کی کوڑی لاتی ہیں۔ بہترین پوائنٹ آؤٹ کرتی ہیں۔ شاعری بھی کمال غضب ہوتی ہے۔ اس بار تو محفل نے سبھی ممبران کو اچھے برے، چھوٹے بڑے تبصروں کے ساتھ خوش کر دیا، محفل میں جگہ دے کر۔ بابر عباس بھائی ابھی تک پرانے زمانے والے ڈائیلاگ یعنی ٹانگ کھینچنے والی بات کر رہے ہیں۔ ہم پاکستانی بڑے دل والے ہیں۔ درماندہ، ناہید سلطانہ اختر جی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ سو سب سے پہلے ان کی کہانی پڑھی۔ بہت ہی زبردست اور لاجواب داستان رہی۔ جس جس نے مہرن کی زندگی خراب کی برے انجام سے نہ بچ سکا۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر دل اداس ہو جاتا ہے۔ منظر امام صاحب بھی کچھ عرصے سے نظر نہیں آرہے ورنہ ان کی اسٹوری میں ہنسانے کا مواد ہوتا ہے۔ (کبھی کبھی وقفہ بھی آجاتا ہے بھئی) اک دور تھا، ڈاکٹر ساجد امجد جی نے کافی دلچسپ ماضی کا آئینہ دکھایا۔ مرزا امجد بیگ جی کی گریبان بھی بہت اچھا ٹائم دے گئی۔ فرید احمد کو درپیش مسائل اور ذاتی زندگی پر مبنی دو حصے سامنے آئے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جی کی بچ کا آدمی پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ پاکستانیوں نے کیا کیا دکھ نہیں سہے مگر رفیق جیسے لوگ پھر بھی نہیں سدھرتے۔ امیدِ نو مظہر سلیم ہاشمی جی کی بہت پسند آئی۔ دعا چودھری کافی مضبوط اعصاب رکھنے والی لڑکی تھی، اتنی مشکلات کا سامنا کیا، لیکن کامیاب رہی۔ آخری فیصلہ اپنے کزن کلیم کے حق میں دیا۔ شاکر لطیف جی کی سنگی بھی خوب رہی۔ ڈیوڈ کو ایڈی جیسا سنگی ملا، پھر وہ بھی اس کی محبوبہ کا باپ، ایڈی پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آج کل میری پسندیدہ داستان حسام بٹ جی کی وقت ہے۔ اس میں حقیقت پر مبنی اسٹوری ہے اور آج کے دور پر ہے، لگتا ہے جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو۔ رنگِ آسماں، اے آر راجپوت جی بھی کسی سے کم نہیں، اس داستان کا پلاٹ پھیلاؤ کی طرف جا رہا ہے اور دلچسپی بڑھ رہا ہے۔ زبردست جناب اے آر راجپوت جی۔ کترنیں سدا کی طرح اے ون تھیں۔ محفل شعر و سخن بھی جگمگا رہی تھی۔''

✠ چلبلی ہیر، جھنگ صدر، پنجاب سے تشریف لائی ہیں ''میرے بابا جان عرصہ دراز سے یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں مگر کبھی لکھا نہیں۔ اب یہ ناچیز چلبلی ہیر پڑھنے اور ساتھ لکھنے کے قابل ہوئی تو سب سیریس اور انکل نما تبصرہ نگاروں میں رونق میلا کرنے حاضر ہے۔ (ماشاءاللہ...... انکل نما...... تبصرہ نگارو!...... اب دیں جواب) ٹائٹل پر خانہ بدوش نسل کی حسینہ سانولا رنگ اور چھوٹی آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں میں دوپٹا ڈالے کسی خوش گمانی میں مسکرا رہی ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا انکل مبارک ترین پیش کر رہے ہیں۔ آمین۔ اداریہ میں رسالے کی قیمت 70 روپے کرنے کے بعد ہمیں مکھن اور کریم لگانا نہیں بھولے۔ (بھلا مکھن کے دور میں کریم نہ لگائیں تو کب لگائیں...... یہ بھی بتا دیں) سسپنس ڈائجسٹ کا چسکا مکھن سے زیادہ مزہ دار ہے۔ (یہ ہوئی نا بات) تبصرے سب کے اچھے رہے۔ نئے ممبرز بھی اچھا تبصرہ کرنے میں کامیاب رہے۔ ساتھ ہماری پیاری مدیرہ یمنیٰ احمد کے تراش خراش کا بھی کمال ہوتا ہے جو یہ محفل سجتی ہے (بہت شکریہ) سلسلہ وار داستانیں میری فیورٹ ہیں۔ رنگِ آسماں موسٹ فیورٹ ہی..... اے آر راجپوت کئی پہلوؤں سے اس داستان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر ہنری کی اچانک موت سے کہانی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اب سفر رینا اور شوکی پورا کریں گے۔ دوسری طرف شاہ زمان، اریبہ اور علی کا ٹولہ بھی اپنے مشن کے قریب پہنچ چکا ہے۔ حسام بٹ صاحب نے بھی علی کی والدہ سلمیٰ بیگم کو بھی داستان میں ختم کر دیا۔ اب علی کا امریکا واپس جانا ممکن نہیں، نادر شاہ بھی مشکوک لوگوں میں شامل ہے۔ علی اختر صاحب کی ہٹ دھرم بھی سپرہٹ رہی۔ تاتاریوں کی تہذیب و تمدن، رہن سہن رسم و رواج اور ان کی تین مشہور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اور ضدی عورتیں......کی بالکل صحیح عکاسی کی۔ واللہ مزہ آ گیا، کیسے کیسے شہ زور اور ہٹ دھرم لوگوں کو موت چت کر جاتی ہے تو را کینہ کو بھی زوال آ ہی گیا۔ (یہی عبرت کا مقام ہے) رضوانہ ساجد اور داستان حضرت موسیٰؑ، بہت زبردست ویلڈن۔ اسماء قادری جی ہمیشہ بے مثال لکھتی ہیں۔ وارث بھی ان کی بہت زبردست اور شاندار تحریر ہے، بہت ہی تجسس اور سسپنس سے بھرپور داستان، دل موہ لیا۔ ڈاکٹر رفعت، عروسہ اور سویرا مظلوم اور اچھے کردار رہے۔ شاہ جہاں بڑا کردار اور بُرا انجام۔ محفل شعروسخن اور مراسلے بھی زبردست تھے۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

✠ زرین خان آفریدی، حیدرآباد، سندھ سے شریکِ محفل ہیں "ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ فروری 2018ء 15 جنوری کو مل گیا۔ سرورق حسینہ سرمئی آنکھوں والی ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے زرد اور سرخ ڈریس میں اوسم لگ رہی تھی۔ باقی سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی محفل پر نظر ڈالی تو منہ لٹک گیا۔ پچھلے دو ماہ سے میرا تبصرہ غائب ہے حتیٰ کہ بلیک لسٹ میں بھی نظر نہیں آیا۔ ساتھ پوسٹ آفس والوں کی بھی کلاس لی۔ ڈائجسٹ کے آفس بھی فون کیا کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔ (ماجرا یہ ہے کہ "بی بی یہ پاکستان ہے" آپ کے دونوں خطوط ایک ساتھ ملے) انشائیہ میں ایلیا صاحب اس کو مبارک ترین قرار دے رہے ہیں۔ انشاءاللہ ہم متفق ہیں۔ اداریہ اس بار بھی خوب سیر حاصل تھا جس میں پاکستان کے مسائل نمایاں کیے گئے۔ محفل میں منشی محمد عزیز مے، اپنے اولڈاز گولڈ کی خوشی منا رہے تھے۔ مبارک باد، محمد صفدر معاویہ صاحب بھی مستقل مزاج تبصرہ نگار ہیں۔ بابر عباس صاحب بھی کافی سے زیادہ اولڈاز گولڈ ہیں۔ ڈیڑھ روپے کا سسپنس خریدنے والے خوش قسمت انسان، ایمانے زارا شاہ بھی اپنی صدارت پر خوش ہوتی نظر آئیں۔ ریاض بٹ صاحب، ادریس احمد خان صاحب، عبدالجبار رومی صاحب عمدہ تبصروں کے ساتھ رونقِ محفل تھے۔ نئے ناموں میں شاہانہ سلطان اور طلعت مسعود صاحب اچھے تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ ناہید یوسف صاحبہ کا تبصرہ بھی بیسٹ رہا۔ جنوری 2018ء اور فروری 2018ء کے سسپنس ڈائجسٹ بہت ہی زبردست اور شاندار رہے۔ محمد الیاس صاحب کی عکس، ثمر عباس صاحب کی مدد اور چاندی کا چمکن ڈاکٹر بھٹی صاحب کی اے ون رہی' جنوری کے شمارے میں، اب فروری کی طرف آتے ہیں۔ ہسٹری اور تا تاری میرا پسندیدہ ٹاپک رہا ہے۔ ہٹ دھرم میں مجی اختر صاحب نے تا تاری عورتوں اور ان کے رہن سہن پر بہترین روشنی ڈالی۔ داستان میں تورا کینہ نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی دکھائی مگر پھر بھی ہار گئی۔ ویلڈن علی اختر صاحب، رنگِ آسماں میں اے آر راجپوت نے پروفیسر ہنری کو مار کر داستان کا رخ بدل دیا۔ حسام بٹ صاحب نے وقت میں علی کی والدہ سلمٰی کو راہِ اجل دکھائی، اس طرح علی کا پاکستان میں رہ کر اپنی والدہ کا بدلہ لینا ضروری ہو گیا۔ یہ دونوں سلسلہ وار داستانیں سسپنس ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ ویلڈن۔ بےخبر میں ناہید سلطانہ نے کافی سارے جاہل والدین کو خبردار کر دیا۔ نفسیاتی جنگ میں شاکر لطیف صاحب نے بہت عمدہ اور سسپنس سے بھرپور اسٹوری پیش کی۔ مارٹن نے تو کمال کر دیا۔ شراکت دار محمد یاسر اعوان نے دھوکا اور جرم پر اسٹوری پیش کی۔ گریگ جیسن نے دھوکا فراڈ کو ہلکا لے لیا تھا، ڈی ولسن کے قتل کو بھی چھپانا چاہا مگر جرم تو بولتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سبحان تیری قدرت......کہ جس سے خطرہ تھا وہی ان کی آنکھوں کے سامنے پلا، بڑھا۔ رضوانہ ساجد صاحبہ، جزاک اللہ، تیسرے حصے کا انتظار ہے۔ اسما قادری صاحبہ کی وارث نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ بہت ہی اثرانگیز اور عبرت ناک داستان رہی۔ شاطر لوگ دولت کے بل پر لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں لیکن قدرت اپنا کام کرتی ہے۔ شاہ جہاں جیسی عورت بھی ملیامیٹ ہو گئی۔ محفل شعروسخن بھی کلاسک رہی۔ مراسلے بھی اے ون تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ سسپنس کلاسک نئے سال سے شروع کریں گے۔" (اوہو......بھئی اداس نہ ہوں......بس جلد ہی شروع کرتے ہیں)

✠ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے چلے آرہے ہیں "سسپنس ڈائجسٹ کا پرانہ قاری ہوں۔ بہت دیر سے سسپنس کے ساتھ میرا گہرا رشتہ ہے۔ باقاعدہ سسپنس ہر ماہ خریدتا ہوں اور شوق سے پڑھتا ہوں لیکن خط کبھی کبھی لکھتا ہوں (بس یہی غلطی ہے آپ کی......کبھی کبھی نہیں خط ہر ماہ باقاعدگی سے لکھا کریں) جنوری کا سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے بہت خوش قسمت ہوں کہ سسپنس کے ٹائٹل کی خوبصورت حسینہ مجھے دیکھنے کو ملی، دلکش اور خوبصورت ٹائٹل دیکھ کر دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے (اوہ خدایا...... یہ کچھ کچھ کیا ہوتا ہے بھئی کچھ ہمیں بھی تو بتائیں) سسپنس سے دلی محبت ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کی ہر کہانی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے کبھی کہانیاں اور تبصرے ابھی زیرِ مطالعہ ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہر ماہ کی طرح ہمارے سسپنس کی ہر کہانی ہماری جان ہے جلد ہی ایک کہانی بھیجوں گا۔ (جی ضرور......)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

✠ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے جنوری کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں "نیا سال ہم تمام اہلِ وطن کو مبارک۔ جنوری نئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سال کا شمارہ بہت معصوم شکل لڑکی کے سرورق کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس دفعہ نظر پڑی تو شمارہ کی قیمت میں اضافہ نظر آیا۔ ویسے بھی اتنے پیارے شمارے کی قیمت کا اضافہ کوئی بات نہیں۔ ہم نے پڑھنا ہے اور پڑھتے ہی رہنا ہے۔ ماہنامہ کا تعلق دل سے ہے اور ویسے بھی شوق کی کوئی قیمت نہیں۔ انشائیہ بہت ہی با مقصد ہوتا ہے۔ قانون بے بس ہے یا بک چکا ہے۔ انسان نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ درندے بھی درندے کو جنگل میں نہیں مارتے۔ ایک زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے جب رات کو بہت دیر سے نکلتے، دفتر میں کام بھی بہت تھے۔ آدھی رات کو بھی بغیر کسی خوف کے گھر آجاتے لیکن اب دن بھی خوفناک ہیں۔ ہر نئے سال پر ایک نئی تمنا بہتری کی جانب نئے قدم پر مبارکباد دیتے اور قبول کرتے۔ 2017ء بہت ہی کربناک گزرا۔ سال کا آخر انتہائی سیاسی ابتری کا شکار ہو گیا ہے۔ کسی کو سکون نہیں۔ دہشت گردی کا خوف۔ ہر طرف دشمن وطنِ عزیز پر میلی نظر رکھے ہوئے۔ مہنگائی انتہائی اونچے درجے پر۔ نوجوان بیروزگار شوقیہ جرائم میں مبتلا۔ اللہ رحم کرے۔ (آمین) دوستوں کی محفل اس پُرآشوب دور میں بھی بڑی دل نشین ہے۔ میرے گزشتہ خط پر عزیز دوستوں عبدالجبار رومی انصاری، رانا بشیر احمد ایاز نے میری کچھ عرصہ غیر حاضری کو محسوس کیا اور بہت ہی دل بستگی کا اظہار کیا۔ خاص کر K الیکٹرک کے مجھ پر ظلم سے وابستہ۔ بہت شکر گزار ہوں۔ ایک دور تھا، ڈاکٹر ساجد نے برصغیر کے حکمران، جنگیں، سازشوں، حماقتوں کو بڑی تفصیل سے تحریر کیا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نایاب تحفہ۔ رنگ آسماں، بڑی لاجواب قسطیں، اس قسط میں محبت اور چاہتوں کا زیادہ اظہار تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ سنسنی خیز واقعات، مندروں میں کھیلے جانے والے ناپاک دھندے، راستے اور جنگلوں کی بہترین عکاسی۔ دو الگ کہانیوں کو انتہائی دلچسپ پیرائے میں لے کر چل رہے ہیں۔ بھنور، ایک پیچیدہ کیس، کوئی جرم نہیں بس غلطی۔ کچھ بے گناہ زد میں آئے مگر ذہین اور قانون کے پاسداروں نے کیس کو حل کر لیا۔ گریبان، وکیل امجد بیگ کا ذہین کارنامہ، لیکن ایک احمق اور عاقبت نااندیش جو اپنی ہی غلطی پر خدا کی مار کا شکار ہو گیا۔ وکیل صاحب نے تو بہت عمدگی سے اس کو جال سے باہر نکال دیا۔ لیکن وہ خود دوبارہ ایک دلدل میں گر پڑا۔ یہ کہانی امجد بیگ صاحب کی کہانیوں سے تھوڑا اختلف تھی مگر بہت عمدہ اور نصیحت آمیز۔ مدد، ایک ریٹائرڈ شخص سکون کی تلاش میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک عورت ظالم کے ہاتھوں گرفتار تھی، اس شخص کی عقل و فہم کا جواب نہیں کہ اپنی بے لوث خدمت سے ایسا انتظام کیا کہ ظالم بھی ختم اور وہ بھی بے گناہ ٹھہرا۔ وقت، حسام بٹ کی شاندار سلسلہ وار کہانی، ہر قدم پر تجسس، ہر لمحہ کچھ ہونے کا خطرہ، ایک عظیم نوجوان کی داستانِ حیات، معجزے اور تحیر سے بھرپور کہانی جس کا دائرہ امریکا سے پاکستان تک پھیلا ہوا۔ عکس، ایک عجیب نفسیاتی شخص کی داستان جس کی شخصیت دو الگ الگ زاویوں پر مشتمل تھی۔ زندگی کے عجیب دوراہے پر وہ کھڑا تھا۔ آخر اس کی دورنگی شخصیت نے پلٹا کھایا اور وہ اصل زندگی کی جانب چل پڑا مختصر لیکن دلچسپ کہانی۔ بیچ کا آدمی، ڈاکٹر شیر شاہ نے اس کہانی میں موجودہ دور کے ناسوروں پر نشتر لگایا۔ خوفناک زلزلے میں ہزاروں جانیں گئیں۔ معذور ہونے والے بے تحاشا، دنیا ہل گئی۔ ایک ڈاکٹر نے کوئی خوفِ خدا نہ کیا اور اس مرحلے پر بھی کمیشن سے نہ صرف مال بنایا بلکہ غیر ضروری سامان کا بوجھ خزانے پر ڈالا۔ امید نو، ایک دردناک کہانی، ایک عظیم اور برداشت والی لڑکی کی داستان۔ مفاد پرست اس کے پاؤں پر جھک گئے۔ بہت سبق آموز کہانی۔ چاندی کا چھگن، ایک چھوٹی لیکن بہت پیاری کہانی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون کی موت، دریائے نیل کا دولخت ہو کر راستہ دینا، بہت سنا، فلمیں دیکھ ڈالیں لیکن رضوانہ ساجد کی مفصل تاریخ اور تحریر پڑھ کر لگا بہت معلومات حاصل ہوئیں۔ اب تشنگی کا احساس نہیں۔ سنکی، ایک حیرت انگیز اور دلچسپ کہانی، ایک خطرناک خبطی شخص جو اتنا خوفناک انتقام کا عادی، لیکن اس کا واسطہ ایک ماہر فنکار سے پڑا جس نے اس کے انتقام کی حسرت بھی پوری کر ڈالی اور اس کو خوشی سے مرنے دیا۔ درماندہ، معاشرتی ناہمواری، بھیڑیے نما انسان، کمزور عورت، جس کی تذلیل کا کوئی موقع نہ جانے دیتے۔ اس دفعہ کے شمارے میں کترنوں کی مقدار کچھ زیادہ اور تفصیل دار تھی۔ بہت چٹخارے دار اور شمارے کے حسن میں اضافہ۔ اشعار کی کہکشاں بھی خوب سے خوب تر۔" (دیر سے آمد کا بھی بے حد شکریہ، یہ محفل آپ ہی کے خطوط سے سجی اچھی لگتی ہے)

✠ ایمانے زارا شاہ، اسلام آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں "ٹائٹل والی خاتون ٹھنڈ کی وجہ سے بنا منہ دھوئے لپ اسٹک لگا کر ہمارے پیارے سے سسپنس پر براجمان ہو گئیں۔۔! دانت میں دوپٹا اپنے آپ کو بالکل 1980ء کی ہیروئین سمجھ کر دیا ہوا ہے ان محترمہ نے ......!" "انشائیہ واداریہ" پڑھ کر صرف ایک بات پلے پڑی ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں...! (ارے بھائی ہم نہیں بڑھ رہے تو کیا ہوا۔ زمین تو اپنے مدار میں چکر پورا کرتی ہے نا بھئی) محمد عزیز مئے صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ یہ بتائیں آپ مئے ہی کیوں ہیں؟ جون جولائی کیوں نہیں! میں نے بھی نوٹ کیا ہے خواتین بہت کم شامل ہوتی ہیں...... بابر عباس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جناب عمر رسیدہ محبوبہ تو مغربی ممالک کی ہی ہوسکتی ہے...... 70 یا 80 سالہ...... مائی گاڈ اتنی اوسط عمر بھی پاکستان میں نایاب ہے اور آپ ٹھہرے پاکستانی اس لیے آپ تو ہاتھ جھاڑ لیجیے......! طلعت مسعود نے اتنا طویل تبصرہ غالباً جہاز میں بیٹھ کر لکھا ہے...... آپ کا تبصرہ پڑھ کر جنوری کا شمارہ ذہن میں تازہ ہوگیا! زبردست...... سب کا فرداً فرداً بہت شکریہ...... زویا اعجاز نے ''میراث'' میں نفسیاتی طور پر زبردست ہٹ کیا ہے...... اسپیشلی حکمرانوں کے علاوہ عام لوگوں کو بھی کشمیر کی آزادی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے...... ہم بھول جاتے ہیں ہم جسے ''اون'' کرتے ہیں اس کے لیے خالی خولی دعوے معنی نہیں رکھتے۔ عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہوتی ہے......! یوم سیاہ...... مہاراجا کے جانشین پرتاب سے تو ہمیں انصاف کی امید تھی لیکن رابرٹ خردماغ بھی نا...... اپنی دشمنی ضرور پنڈال میں ہی نکالنی تھی...... بے چاری ریتا! اب ''رنگِ آسماں'' دلچسپ موڑ کاٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے...... اریبہ شاہ زمان وریحان کا گٹھ جوڑ پتا نہیں کیا کچھ دکھانے والا ہے...... فی الحال تو ایک قتل تک بات بنی ہے...... بچہ یہ انگریز آفیسر نے بینڈ بجا دینی ہے آپ لوگوں کی...... حیرت انگیز بات لگی پروفیسر ہنری کی موت کو سرسری سا لینا حالانکہ وہ تو بڑا خاص مہمان تھا......! اور یہ مہارانی تو وہی روایتی فتنہ پرور مہارانی نکلی شاباش ہے......! ''وقت'' میں ایکشن کی کمی اب بور کرنے لگی ہے سلمٰی بیگم اوپر پرواز کر گئیں بہت ہی شاکنگ سین تھا... ابھی تو ماں بیٹے کے ملن کو چند ہی لمحے گزرے تھے...! ایک تو اس بیٹا سے ہم تنگ ہو رہے ہیں پتا نہیں کونسی کھچڑی پکا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے نادر شاہ کے کہنے پر اسد علی کے قریب سے قریب تر ہو رہی ہے پھر بھٹی صاحب کی پیشین گوئیوں نے دماغ چکرا کر رکھ دیا ہے...... ڈیلفی اب آ بھی جاؤ نا...... ''شراکت دار'' کے معصوم فراڈیے...... گریک نے کچی گولیاں کھیلیں اور سونے کی مرغی کو ایک ہی مرتبہ مار کر جان چھڑانا مہنگا پڑا۔ ورنہ آرٹ و آرٹسٹس دونوں کا بکنا بھی عام ہو چکا ہے اور کوئی تہ تک جا بھی نہیں سکتا...... ناہید سلطانہ اختر کی ''بے خبر'' بہترین پیغام پر مبنی رہی...... قلم واقعی امانت ہے اور اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے آپ نے...... ویلڈن...... پرائیویسی کے فقدان کے باعث کچے ذہن پھر ساری زندگی اس سے باہر نہیں نکل سکتے...... یہ ملک صفدر حیات کی کہانیاں اتنی پرانی کیوں ہوتی ہیں؟ (کیونکہ وہ خود اتنے ہی پرانے ہیں۔ اور وہ ان کہانیوں میں اپنے تجربات ہی تو لکھتے ہیں) لیکن کہانی پڑھ کر ماننا پڑے گا جرائم تو اس زمانے میں بھی عام تھے بس رپورٹنگ کی شرح کم تھی اور اس بار کی کہانی سے مجرم کا پہلے ہی سین میں معلوم ہوگیا تھا عموماً تھرڈ پرسن کا رول ہی ہوتا ہے جیسے کاکا کا رہا سو کچھ خاص نہیں لگی...... ''جمہوریت'' ہماری سیاست، سیاستدانوں و عوام کے کارناموں کی مضحکہ خیز داستان رہی۔ لو جی جہاں ہزار روپے اور ایک بریانی کی پلیٹ میں ووٹ بک جاتا ہو ہم خاک بہتری و شعور کی امید لگا سکتے ہیں، افسوس......! اعتزاز وصلی کی ''مجرم کون'' میں سسپنس تو خوب رہا مگر کہانی میں اتنے کردار ایڈ کر دیے اور پلاٹ کو اس قدر پھیلا دیا کہ لکھاری کے لیے تانے بانے جوڑنا ہی مشکل ہوگیا۔ خطرناک اور رازداں مختصر و پراثر تھیں...... اسما قادری نے ''وارث'' میں کیا خوب لکھا ہے۔ حرف حرف سنسنی خیز تحریر...... بالآخر اختتامی لمحات میں بلی تھیلے سے باہر آئی اور کیا خوب آئی۔ اپنے ہی بچھڑے نے اڑا دیا...... سپرب!''

⌘ خلیق ربانی انجم، رجڑ، چارسدہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ''فروری 2018ء سسپنس کا شمارہ 22/1 کو ملا۔ سرورق کو سرسری دیکھنے کے بعد اندرونی صفحات کی طرف قدم بڑھائے تو بڑھتے قدم سسپنس کے مضامین کی فہرست میں سرسری نگاہ ڈالنے کے لیے رکنے پڑے۔ سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد جون ایلیا کے انشائیہ سے ہوتے ہوئے آپ کے خط میں پہنچے۔ مختصر اداریے سے ہوتے ہوئے...... جس میں چند اہم مسائل پر نشتر زنی کی گئی تھی...... سے قارئین کے خطوط میں پہنچے۔ جس میں ہر کسی نے بھرپور تبصرے کیے تھے اور سب کے تبصرے بہت اچھے بھی لگے۔ جن میں منشی محمد عزیز، محمد صفدر معاویہ، ایمانے زارا شاہ، محمد رفاقت، مرزا طاہر الدین بیگ، بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس، ادریس احمد خان، ریاض بٹ، عبدالجبار انصاری، شاہانہ سلطان، ناہید یوسف، گلشن اقبال، طلعت مسعود کے تبصرے پسند آئے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کہانیاں بہت پسند آئیں۔ جن میں زویا اعجاز میراث، بے خبر، ناہید سلطانہ اختر، جرم زادہ، ملک صفدر حیات، جمہوریت، محمد الیاس، مجرم کون؟ اعتزاز سلیم وصلی، وقت، حسام بٹ، نفسیاتی جنگ، شاکر لطیف، حقیقت، ایم زیڈ شیخ، حضرت موسیٰ، رضوانہ ساجد، خطرناک، انجم فاروق ساحلی، رازداں، ثمر عباس اور اسماء قادری کی وارث پسند آئیں۔ محترم بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس آف کھاریاں نے قارئین کے خطوط میں بجا لکھا ہے کہ پتا نہیں کہ سسپنس کلاسک کی کہانیاں آپ کب سے شروع کر رہے ہیں؟...... اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اگر کہانی ''کزن'' سے بسم اللہ کی جائے تو کیا بات ہوگی۔'' (ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ آپ لوگ سسپنس کلاسک کے لیے اتنے بے چین ہوں گے۔ انشاء اللہ جلد ہی شروع

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کریں گے)

٭محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''سرورق پر دلربا سی ماڈل آویزاں ہے۔ محترم جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا آج اس دفعہ کے انشائیہ کے لفظوں میں وہ کاٹ ہے جو باضمیر آدمی کو جھنجوڑ کے رکھ دے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ حکومتِ وقت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اگر وہ سمجھے تو مگر انہیں کیا ضرورت ہے سوچنے سمجھنے کی۔ وہ تو مزے ہی مزے میں ہیں۔ ملک میں بے شک قتل و غارت ہو، زیادتی ہو، چوری ڈاکا عام ہو، زنا شراب کے اڈے چلیں، ہم کس کس کو روئیں زینب کو، اسماء کو، انتظار کو، نقیب اللہ کو جس کے مرکزی ملزم ابھی تک نہیں پکڑے گئے۔ پچھلی دفعہ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی درماندہ ایسے ہی درندہ صفت لوگوں کو بے نقاب کرتی ہوئی تحریر تھی۔ ساتھیوں کی محفل میں میرے پڑوسی شہر منشی محمد عزیز مئے نے کرسی صدارت پر قبضہ کیا ہوا ہے، مبارک۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے ابھی پڑھنے ہیں جو کہ بہت بہترین ہوں گے۔ کہانیوں میں رنگ آسمان پڑھی جو کہ ہنگامہ خیزیوں سے بھرپور رہی۔ ریناباپ کا مقدمہ ہار گئی۔ رابرٹ کی غداری کی وجہ سے۔ ادھر مجاہدین کا ٹولہ بھی مشکل میں ہے خدا خیر کرے۔ پھر وقت پڑھی جہاں علی کی تو دنیا ہی لٹ گئی اس کی ماں اس سے روٹھ کر خالقِ حقیقی کے پاس جا پہنچی۔ بہت بڑا صدمہ ہے مجھے تو شاہ جی پر شک ہو رہا ہے کہ یہ سب دولت کی خاطر اس کا کیا دھرا ہے۔ محمد یاسر اعوان کی شراکت دار پڑھی۔ اچھی تحریر تھی، واقعی خون کر کے بندہ بچ نہیں پاتا۔ ناہید سلطانہ اختر کی بے خبر بھی اچھی تھی۔ جہاں انسانی تقاضے کے اہم مسئلے کو اجاگر کیا گیا۔ اعتراز سلیم وصلی کی مجرم کون بھی عمدہ رہی۔ نومی نے بدلہ لینے کے لیے غلط قدم اٹھایا جو خود اس کی زندگی کو بھی برباد کر گیا۔''

٭راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادن خان سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں ''نئے سال کے پہلے سسپنس کے شمارے کے ٹائٹل پر مسکراہٹ بکھیرتی حسینہ مسرتوں اور کامرانیوں کی نوید سنا رہی تھی۔ جون ایلیا اپنے انشائیے میں قانون کی حرمت برقرار رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ خطوط کی محفل جاندار تبصروں سے بھرپور تھی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی کہانی اک دور تھا، پڑھی جو تجسس سے بھرپور اور بہت ہی سبق آموز تھی۔ دیگر کہانیوں میں گریبان، امید نو اور درماندہ دل کو چھو لینے والی تھیں۔ رنگِ آسماں اور وقت بہت ہی دلچسپ داستانیں ہیں۔ رضوانہ ساجد نے اس مرتبہ حضرت موسیٰ کی عظمت کو اجاگر کیا۔ محفل شعروسخن کے تمام اشعار اپنی نظیر آپ تھے۔'' (اتنا مختصر اظہارِ خیال...... ٹائم کی کمی لگتی ہے)

٭بابر عباس، ماہین بابر، فضل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں سے تشریف لائے ہیں ''سر جی بڑی خواری کے بعد اپنا پیارا اور جان دلارا آنکھوں کا تارا سسپنس جو کہ فروری کی شکل میں تھا کسی بچھڑے دوست کی طرح ملا۔ سرورق پر بھلا کیا تبصرہ کروں۔ ذاکر صاحب جب بھی کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ شاید بیوی کے زیر اثر ہیں۔ اس ماہ بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں جو دل خراش ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا مگر ہوگا کچھ بھی نہیں۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ قصور شہر کا زینب کا واقعہ جو سات جنوری کو ہوا آج 19 جنوری ہے قاتل گرفتار نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرا عزیز دوست میرا عزیز ساتھی میرا عزیز بھائی جو میرے لیے بہت کچھ تھا۔ افضال نادر 17 جنوری کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے) آپ سیاست پر بات کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کرتے ہیں۔ اس سے شدید قسم کی بدہضمی ہو جاتی ہے (شاید اسی طرح اس مرض کی کوئی دوا مل جائے) اس بار بیٹنگ کے آغاز کے لیے آپ نے منشی محمد عزیز مئے صاحب کو بھیجا ہے جو اپنی بیٹنگ کے جوہر دکھلاتے ہوئے سنچری کی طرف گامزن تھے مگر 99 کے پھیرے میں آکر آؤٹ ہو گئے۔ او پنر کے طور پر محمد صفدر صاحب آئے اور کیا خوب آئے زبردست کیا زوردار شاٹ لگائے ہیں۔ ریاض صاحب آپ کے کیس کا کیا بنا وہی کیس جو کرکٹ میں اکثر چلتا رہتا ہے، خیر بڑی زبردست بیٹنگ کی آپ نے۔ سر جی ایک بات تو بتائیں ٹیم میں گیارہ کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ بارھواں کھلاڑی غالباً پانی پلانے کے لیے ہوتا ہے آپ نے تیرہ کھلاڑی کیسے کھلا دیے ہیں۔ اچھا اچھا یہ پاکستان ہے یہاں سب چلتا ہے۔ سر جی پہلے بتا دیتے اپنے طلعت مسعود پانی پلانے والے کھلاڑی ہیں۔ کہانیوں کی شروعات دی گریٹ اور ایک خوبصورت رائٹر جناب عزت مآب جو اپنی کہانی کو ننھے ننھے پاؤں چلاتے ہوئے دل کو گرماتے ہوئے ہمیں رنگِ آسماں کی سیر کروا رہے ہیں، اے آر راجپوت صاحب رنگِ آسماں واہ واہ کیا کہنے۔ دوسرے نمبر پر حسام بٹ صاحب کو وقت کے ذریعے پکڑا۔ حسام بٹ صاحب یقین کریں بور کر رہے ہیں۔ آخری صفحات پر سسپنس نے ہمیشہ کلاسک اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شاندار کہانیاں دی ہیں جو پرانے قاری حضرات کو ابھی تک یاد ہیں۔ محی الدین نواب مرحوم کی پتھر اور کزن، اس کے علاوہ دوسرے مصنفین کی جج اکبر، عشق کا عین اور بہت سی دوسری، طاہر جاوید مغل کی کرب آشنائی اور حال ہی میں شکست کی فتح، کاشف زبیر مرحوم کی بہت سی یادگار تحریریں اور بہت سے خوبصورت رائٹروں نے بہت سی خوبصورت تحریریں پڑھنے کو دی ہیں، مگر اسما قادری صاحبہ کی وارث۔ مزہ نہیں آیا، سوری اسما قادری صاحبہ۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں ان کو پتا ہے میں نے قاری کو کیا دینا ہے، اس بار وہ بے خبر لے کر آئیں۔ بے خبر ایک اچھی تحریر تھی اور فکر انگیز بھی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی تحریر کردہ مجرم کون نے اُس طرح متاثر کیا جس طرح ایڈز زدہ مریض کا خون متاثر کرتا ہے بہت خوب۔ ویل ڈن محمد الیاس صاحب جمہوریت پسند آئی گو کہ ہمارے ملک میں نہیں۔ علی اختر صاحب نے اس بار ہٹ دھرم کے ذریعے تموجن عرف چنگیز خان کے خاندان کی سیر کرائی۔ بہت اچھے علی اختر صاحب، ہم کو آپ کی سیر پسند آئی ہم خوش ہوئے کچھ مانگ نہ لیں۔ حضرت موسیٰ کی حالاتِ زندگی پر مبنی رضوانہ ساجد کی زبردست پیشکش دلوں کو منور کرتی ہوئی روشن تحریر کا دوسرا حصہ پڑھا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ ثمر عباس صاحب جب بھی مغرب سے کچھ درآمد کرتے ہیں وہ بہت خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ فروری کے شمارے میں آپ نے میرے خط کا وہ حال کیا ہے جو امریکا بہادر نے ویت نام کا کیا تھا۔'' (خطوط کے آٹھ صفحات میں سے چار آپ کے نام کیسے کر سکتے ہیں...... اگلی بار یہ فارمولا ضرور بتایئے گا)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

✠ شاہانہ سلطان، جامع کلاتھ، کراچی سے خوشی خوشی تشریف لا رہی ہیں ''ارے واہ مدیرہ صاحبہ! آپ کے جواب نے تو ہمیں لاجواب کردیا اور کچھ کچھ شرمندہ بھی...... ہر بار آپ کو یہ کہوں گی کہ ہم نے پہلی بار انٹری ماری ہے (ظاہر ہے جب سالوں بعد تشریف آوری ہوگی تو کون سمجھے گا کہ آپ اسی مکان کے مکین ہیں) اسی ڈر کی وجہ سے ہم نے سوچا کہ اب جلدی جلدی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہنا چاہیے اور ہم نے سسپنس پڑھتے ہی قلم اٹھالیا۔ اس بار تاریخی کہانی تھوڑی ثقیل لگی...... علی اختر صاحب پلیز ذرا آسان زبان میں تاریخی منظرنامہ دکھائیں۔ ایسے تو ہم بھی ان موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر انہیں ہضم کون کرے گا۔ ویسے کہانی اچھی تھی۔ اس بار سب سے اچھی کہانی زویا اعجاز کی میراث لگی۔ سمجھنے والوں نے اسے جو بھی سمجھا ہو مگر ہماری سمجھ میں تو یہی آیا کہ دکھوں کی ایک زنجیر ہے جس نے اس دھرتی پر رہنے والوں کو جکڑ رکھا ہے۔ جانے کب اس زنجیر میں زنگ لگے گا اور وہ کڑی کڑی کر کے ٹوٹتی چلی جائے گی۔ حقیقت بھی اچھی لگی۔ لگتا ہے نئے مصنف کی کاوش ہے۔ بہرحال کوشش کامیاب رہی۔ مجرم کون بھی دلچسپ لگی۔ شاکر لطیف کی نفسیاتی جنگ نے واقعی کمال کردیا۔ آخری لمحوں تک انجام کا اندازہ نہ ہوسکا، ویلڈن۔ رضوانہ ساجد نے حضرت موسیٰ کا اگلا حصہ بھی بہت خوب لکھا۔ یہ سوانح محض واقعات نہیں بلکہ ان سے اللہ پر بھروسا اور توکل و یقین میں پختگی پیدا ہوتی ہے، جزاک اللہ...... انجم فاروق کی خطرناک نے بھی محظوظ کیا۔ ثمر عباس کی رازداں نے لطف دیا مگر وقت دکھوں کی طرح دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ تیزی لائیں حسام بٹ صاحب۔ بہت سست رفتاری کا شکار ہے۔ محمد الیاس کی جمہوریت نے تو پاکستان کا نقشہ کھینچ ڈالا ہے۔ رنگِ آسماں بھی اے آر راجپوت کے قلم سے بہت شاندار اور جاندار ہوتی جارہی ہے۔ کیا یہ کوئی طویل سلسلہ ہے یا بس چند حصوں پر مشتمل اسٹوری ہے (یہ تو کہانی کے حالات و واقعات پر منحصر ہے کہ طوالت کتنی ہوسکتی ہے) محفل شعر و سخن کا انتخاب بہت لاجواب ہوتا ہے۔ تمام اشعار اساتذہ کے کلام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بہت خوب۔ ہمارے قارئین کی حسنِ نظر کی داد دینا پڑے گی۔ شاہ زین رضوان اس بار نادیدہ زخم لے کر آئے اور چھا گئے۔ شاہ زین رضوان نے بھی بہت کم عرصے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ آپ کے قلم میں بھی جان ہے اور محمد یاسر اعوان نے تو شراکت دار لکھ کر کمال ہی کردیا ہے۔ جرم بھی آج کل تجربہ مانگتا ہے اور اگر ہمارے بس میں ہوتا کسی کو انعام دینا تو ہم بے خبر پر ناہید سلطانہ اختر کو ضرور نوازتے۔ بھئی بہت خوب...... بات اگرچہ بہت معمولی ہے جسے والدین نظرانداز کردیتے ہیں مگر فقط ایک جھلک بچے کے شعور میں ایسی محفوظ ہوجاتی ہے جو نکالے نہیں نکلتی...... ناہید ہر بار کسی نہ کسی اچھوتے موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ویلڈن۔ اور جناب اس کے ساتھ ہی دیجیے اجازت...... مدیرہ کو اب امید ہے کہ ہماری آمد نئی نہیں لگے گی۔'' (یہ ہوئی نا بات......)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ مہرین ناز، کراچی۔ اعجاز احمد شیخ، ملتان۔ انجم کمال، حیدرآباد۔ محمد جاوید، جہانیاں۔ عاصم خان، کراچی۔ سعود احمد، لاڑکانہ۔ تنویر شاہنواز اعوان، ڈی آئی خان۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موراں

علی اختر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بادشاہت ہو یا فقر و فاقہ... انسان تو ہر حال میں انسان ہوتا ہے اور انسانی فطرت کے تمام تر تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ انہی میں ایک احساس محبت کا بھی ہے۔ جہاں کارِ دنیا میں مشغول رہ کر دیگر ذمہ داریاں نباہنے کی کوشش کی جاتی ہے... وہیں دل کے جذبات اور احساسات سے بھی چھٹکارا ممکن نہیں... رنجیت سنگھ... تاریخ کا ایک اہم دور اور شخصیت... اس دور کے معاشی، عسکری اور مذہبی معاملات اپنی جگہ مگر اس کے دل کی دنیا کے بھی کچھ اہم معاملات نے اسے خود میں الجھائے رکھا... موراں... رنجیت سنگھ کی سب سے چہیتی محبوبہ اور بیوی۔ جس کے عشق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا اور یہ دیوانگی دنیا کو حیران کر رہی تھی۔ اقتدار کی مسند سے اتر کر وہ محبوبہ کے قدموں میں بیٹھ کر سکون محسوس کرتا تھا۔ یہ محبت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ ماضی کے اوراق سے ایک دلگداز داستان

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

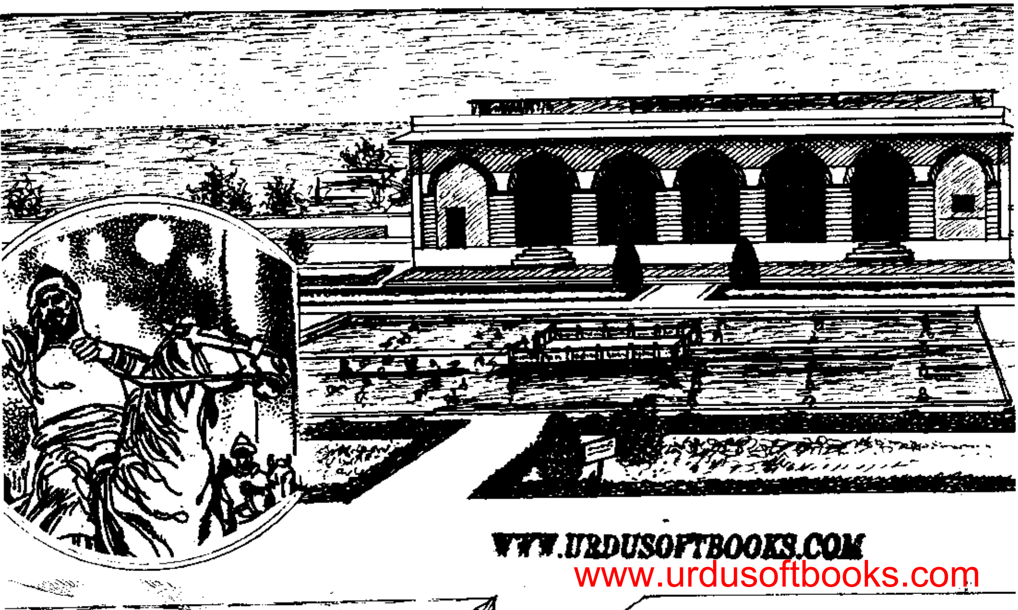

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اک کہرام مچا ہوا تھا۔ اک قیامت اتری ہوئی تھی۔

داخلی گڑبڑ اور بیرونی حملے سے بچنے کے لیے پیشگی اقدامات کرلیے گئے تھے۔ فوج میں بھاری اسلحہ بارود تقسیم کردیا گیا تھا۔ ستلج دریا کے داخلی اور خارجی راستوں پر مسافروں کو لے جانے اور لانے والی تمام کشتیوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ صرف ایک کشتی تھی جسے مسافروں کو پار لے جانے کی اجازت تھی۔ یہ 27 جون 1839ء کا دن تھا۔ ”لاہور اخبار“ نے اس کی یوں منظرکشی کی ہے۔

مہاراجا وفات پا گیا۔ رانیاں، کنور کھڑک سنگھ، راجا دھیان سنگھ، جمعدار خوشحال سنگھ اور دوسرے لوگ بلند آواز میں رونے لگے۔ وہ اپنے سروں پر مٹی ڈال رہے تھے۔ زمین پر لوٹ رہے تھے اور پتھروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ لاش کے قریب یہ عمل ساری رات جاری رہا۔ محل میں ایک کہرام بپا تھا۔ ایک قیامت اتری ہوئی تھی۔ جو کوئی لاش کو دیکھتا، بری طرح رونے چلانے لگتا......“

مہاراجا کی لاش ساری رات زمین پر پڑی رہی۔ اس کے اردگرد دیے جلتے رہے اور ساری رات گریہ و ماتم جاری رہا۔ راجا دھیان سنگھ سب سے زیادہ رو رہا تھا اور اونچی آواز میں چیخ رہا تھا کہ وہ مہاراجا کے ساتھ جل مرے گا۔ کھڑک سنگھ اور دوسرے سرداروں نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی کرنے کے لیے اس کے پیروں میں اپنی پگڑیاں رکھ دیں۔ تاہم چار رانیوں اور اس کی سات ملازمائیں اس کی چتا کے ساتھ جلنے کا عزم کیے ہوئے تھیں۔

اگلے دن مہاراجا کی لاش کو گنگا جل سے نہلایا گیا۔ بحری جہاز سے مشابہ شکل کی صندلی لکڑی سے بنی چتا پر اسے لٹایا گیا۔ اس جہاز کے بادبان ریشم اور مخمل کے بنائے گئے تھے۔ وزیروں اور درباریوں نے چتا پر اپنی اپنی شالیں ڈال کر عقیدت کا اظہار کیا۔ ستی ہونے والی چار رانیوں اور سات ملازماؤں نے شادی کے لباس اور زیورات پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی انہیں ڈولیوں میں بٹھا کر ان کے دُلہاؤں کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔

چتا اٹھائی گئی تو وہ چاروں سات ملازماؤں کے ساتھ ننگے پاؤں چتا کے پیچھے بڑی خاموشی سے چلنے لگیں۔ وہ وقفے وقفے سے اپنی کوئی چوڑی، کڑا یا زیور توڑ کر فقیروں کے ہجوم میں اچھال دیتی تھیں یا مقدس گیت گانے والے برہمنوں میں سے کسی کو دے دیتی تھیں۔ جنازہ شہر کی تنگ گلیوں سے گزرا جو روتے ہوئے لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں اور کھلی کھڑکیوں سے بھی لوگوں کی بڑی تعداد دھاڑیں مار کر جنازے کو دیکھ رہی تھی۔ پھولوں کی پتیاں اس پر نچھاور کی جارہی تھیں۔

شمشان گھاٹ پہنچ کر چتا رکھ دی گئی۔ ہندو، مسلمان اور سکھوں نے آخری بار مرنے والے کے لیے دعائیں کیں۔ پھر برہمنوں کے مقرر کردہ وقت پر کھڑک سنگھ نے چتا کو آگ دکھادی۔ یہ پنجاب کے حکمران راجا رنجیت سنگھ کی لاش تھی۔ اس کی چاروں رانیاں اور سات ملازمائیں وقفے وقفے سے چلتی ہوئی لاش پر کود کر ستی بن چکی تھیں۔ راجا دھیان سنگھ نے چار مرتبہ جلتی چتا پر کودنے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ دوسری بیوہ ہونے والی رانیاں اور وہاں موجود ہر عمر، مذہب اور جنس کا فرد دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

رنجیت سنگھ کی چتا دو دن تک سلگتی رہی۔ تیسرے دن راکھ اور ہڈیاں جمع کرکے مرتبانوں میں رکھ دی گئیں۔ یہ راکھ ہردوار کے مقام پر گنگا میں بہادی گئی۔ راجاؤں نے تین سو میل تک توپوں کی سلامی دی اور بہتی ہوئی راکھ پر اپنی قیمتی شالیں نذر کیں۔ لوگ اظہارِ محبت کے لیے پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کررہے تھے۔

یوں تو پچھلے دو سالوں سے راجا رنجیت سنگھ کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اپنی آخری عمر میں وہ شراب میں افیون گھول کر پینے لگا تھا اور وہ بھی زیادہ مقدار میں۔ ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں اور بارش کے دوران وہ بے تحاشا شراب پینے لگا تھا۔ وہ پہلی بار 1826ء میں شدید بیمار ہوا۔ اس وقت اس پر ملیریا کا حملہ ہوا تھا۔ حکیم عزیز الدین کی ہدایت پر اس نے لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے کو بلوایا۔ جو سات ماہ تک لاہور میں رہا۔ آہستہ آہستہ راجا رنجیت سنگھ کی صحت بحال ہوتی رہی۔ پھر وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا۔ 7 اگست 1835ء کو اس پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا جس نے اس کے چہرے اور دائیں پہلو کو مفلوج کردیا۔ اس کی وجہ سے وہ کئی گھنٹے بولنے سے قاصر رہا۔ وہ معجزے دکھانے والے عطائیوں کی باتوں کو مان لیتا تھا۔ اسے انگریز ڈاکٹروں کی تجویز کردہ کڑوی دوائیاں تو خصوصاً ناپسند تھیں۔ اس کے ڈاکٹر میک گریگور کو اس سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ......

”مہاراجا دوا کھانے سے گریز کرتا ہے اور مجھے اس کا علاج کرنے میں بہت مشکل ہورہی ہے۔ اس نے اپنا روزمرہ کا معمول بدلنے سے بھی انکار کردیا ہے۔“

راجا رنجیت سنگھ نے ڈاکٹر میک گریگور کی نصیحتوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنا روزمرہ کا معمول بدلنے سے انکار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کردیا تھا۔ وہ رات بھر بخار میں جلنے کے بعد بھی صبح کے وقت پالکی میں سوار ہوکر دریا پر یا کسی باغ میں چلا جاتا اور واپس آکر دربار لگاتا۔ جس میں درخواستیں اور مخبروں کی بھیجی ہوئی رپورٹیں سنتا اور احکامات جاری کرتا۔ جب وہ بہت تھکا ہوا ہوتا یا بخار اسے بے بس کر دیتا، تب ہی کام سے رکتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر میک گریگور نے اسے کسی حد تک نظم وضبط کا پابند کرلیا اور وہ ایک ماہ کے اندر اندر صحت یاب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کو لدھیانہ واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

''لگتا ہے اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں اب بہت جلد تھک جاتا ہوں!'' یہ بات راجا رنجیت سنگھ نے 1836ء میں اپنے نئے معالج بیرون ہیوگل کو کہی تھی۔

1837ء میں رنجیت سنگھ پر دوبارہ فالج ہوگیا۔ اس مرتبہ اس کا پورا دائیں پہلو متاثر ہوا تھا اور وہ تقریباً چھ ماہ مفلوج رہا پھر وہ دوبارہ پہلے کی طرح صحت مند نہ ہوسکا۔ گھوڑے پر خود سوار نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے اٹھا کر گھوڑے بٹھانا پڑتا تھا۔ 24 جولائی 1838ء کو ہونے والے ایک حادثے سے یہ بات ثابت ہوچکی تھی کہ وہ کس قدر کمزور ہوچکا ہے۔ وہ صبح کی سیر کو باہر گیا ہوا تھا کہ ایک ہاتھی نے اس کی پالکی پر حملہ کردیا۔ رنجیت سنگھ خود پالکی سے نہیں نکل سکا اور ہاتھی نے پالکی کے شیشے توڑ دیے۔ عطر سنگھ سندھاوالیہ نے اسے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے جانے سے بچایا۔ اس نے ہاتھی پر تلوار سے وار کرکے اس کی توجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ہٹائی تھی۔

رنجیت سنگھ پر تیسرا حملہ آک لینڈ کے دورے کے دوران ہوا۔ وہ اس وقت بے شمار تقریبات میں شمولیت کررہا تھا۔ جب کرسمس کی شام وہ سخت بیمار ہوگیا اور اگلے پانچ دن موت اور زندگی کے درمیان جھولتا رہا۔ اس حملے نے مہاراجا کی بولنے کی قوت پوری طرح ختم کردی اور اسے اشاروں سے بولنا پڑتا تھا۔ اس کے اشاروں کی زبان صرف دو اشخاص بھائیا رام سنگھ اور فقیر عزیز الدین ہی سمجھتے تھے۔ فقیر عزیز الدین تو اس کی بات سننے کے لیے اس کے منہ سے اپنا کان لگا دیتا تھا۔

سردیوں کی بارش اور جنوری کی کاٹ دار سردی نے مہاراجا پر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کا نزلہ بگڑ گیا اور اسے شدید کھانسی ہوگئی۔ فروری میں موسم قدرے بہتر ہوا اور مہاراجا دھوپ میں کمرے سے باہر آنے لگا۔ اس کی صحت بہتر ہوگئی تو اس نے درباریوں کو اپنے بستر کے قریب بلانا شروع کردیا پھر مہاراجا مکمل صحت یابی کے لیے امرتسر چلا گیا جہاں پہنچ کر اس نے بڑی رقم، سونا منڈھے سینگوں والی گائیں، سونے اور چاندی کے ہودے والے ہاتھی، سونے اور چاندی کی شبیہیں خیرات کیں۔ زیادہ خیرات برہمنوں کو دی گئی۔ تاہم باقی سب مذاہب کی عبادت گاہوں کو بھی حصہ دیا گیا۔ اب لوگوں کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ مہاراجا کی صحت بہتر ہوگئی ہے لیکن درحقیقت اس کی صحت خراب ہی تھی۔ تب انہوں نے لدھیانہ میں موجود ایجنٹ سے انگریز ڈاکٹر بھیجنے کی درخواست کی۔ لدھیانہ سے ڈاکٹر مرے اور ڈاکٹر سٹیل لاہور آئے۔

ڈاکٹر سٹیل نے ایک ہفتہ لگا کر مہاراجا کا پوری طرح معائنہ کیا اور گورنر جنرل کے لیے ایک خفیہ رپورٹ بھیجی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا کہ مہاراجا زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کی حالت ایسی ہے کہ اتفاقی بیماری اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی غیر معمولی قوت کی وجہ سے ایک سال تک زندہ رہ جائے۔ اس سے زیادہ عرصہ اس کے زندہ رہنے کا امکان نہیں ہے۔

جون 1839ء تک مہاراجا کے علاج کے لیے چھ یورپی ڈاکٹر اکٹھے ہوچکے تھے۔ ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہونگبرگر نے اسے قلعہ منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔ 10 جون کی شام بہت گرمی اور حبس زدہ تھی۔ رات کو شدید آندھی چلی۔ لاہور شہر کے دو دروازے اکھڑ گئے۔ قلعے کا بھی ایک دروازہ اکھڑ گیا۔ بے شمار درخت بھی گر گئے۔ شور اور مسلسل کھانسی کی وجہ سے رنجیت سنگھ کو رات نیند نہ آئی۔ مہاراجا کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی۔ مہاراجا نے حکم دیا کہ درج ذیل اشیا کی خیرات کی جائے۔

''سونا منڈھے سینگوں والی گیارہ گائیں، ساٹن کے پچیس ملبوسات، سونے چاندی کی دس شبیہیں.... سونے کے پانچ اور چاندی کے بہت سے ہرن، دو گھوڑے، ایک ہاتھی دو ہیرے کی انگوٹھیاں، مرجان کی گیارہ مالائیں اور دو ہزار روپے نقد برہمنوں کو دیے جائیں!''

اس کے علاوہ اس نے جواہرات اور لاتعداد دوسری قیمتی اشیا پورے ہندوستان کے مندروں میں بانٹنے کا حکم دیا۔ اسی روز کوہ نور ہیرا منگوا کر جگن ناتھ کے مندر کو دے دیا۔ اپنی تلواریں، ڈھالیں، خنجر، پستول اور توڑے دار بندوقیں کو فوجیوں میں بانٹ دیا۔ اس کے بعد 27 جون کو اس کی بھرپور گزاری زندگی کا سورج غروب ہوگیا۔

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

سدا کور اپنے شوہر گربخش سنگھ کے بعد بٹالہ کی سردار بنی۔ وہ بڑی معاملہ فہم، ذہین اور ریاست کے انتظامات کو بڑی خوش اسلوبی سے چلانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ وہ ایک بہادر، طاقتور اور تیز مزاج کی عورت تھی اور اپنے آپ کو ایک غیر معمولی عورت سمجھتی تھی۔

دوسری طرف چاڑہت سنگھ کا بیالیس سالہ بیٹا مہان سنگھ جو اپنے باپ کی طرح جنگجو تھا، اس نے اپنے آباؤ اجداد کے مقبوضہ علاقوں پر دوبارہ تسلط قائم کرلیا۔ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ مہان سنگھ نے جموں کو فتح کرکے سکر چاکریہ مسل کو گمنامی سے نکال کر نمایاں ترین مقام پر پہنچادیا۔ انہی لڑائیوں میں سدا کور کا شوہر ہلاک ہو گیا تھا۔

رنجیت سنگھ اسی مہان سنگھ کا بیٹا تھا۔ رنجیت سنگھ کی والدہ راج کور جند کے راجا گجپت سنگھ کی بیٹی تھی۔ جو مہان سنگھ سے بیاہ کر آئی تو اسے اپنے شوہر کے گھر والوں نے مائی ملوائن کہنا شروع کردیا یعنی مالوہ کی خاتون۔

رنجیت سنگھ اپنے بچپن سے ہی غصیلا تھا۔ شاید اس کے غصیلا ہونے کی ایک وجہ اس کی والدہ بھی تھی۔ اس نے جب اپنے والد کی وفات کے بعد سلطنت کا انتظام سنبھالا تو اس نے باپ کے معتمد منتظم لکھ پتی رائے کو سونپ دیا۔ رنجیت سنگھ کی والدہ کو لکھ پتی رائے پر اعتماد تو تھا اور اس کی وفاداری بھی کہیں مشکوک نہ تھی لیکن اس کے بھائی دل سنگھ اور سدا کور کو اس پر بھروسا نہ تھا۔ کچھ اس کے رشتے داروں اور قریب ترین لوگوں نے ان دونوں سے متعلق کئی ایسی باتیں رنجیت سنگھ کے گوش گزار کردی تھیں جن کی بنا پر رنجیت سنگھ بچپن سے ہی اپنی والدہ اور اس کے آشنا سے نفرت کرنے لگا تھا اور وہ اپنا زیادہ وقت گوجرانوالہ کے نواح میں واقع جنگلوں میں ہرنوں اور جنگلی جانوروں کے شکار میں گزارنے لگا تھا۔ شکار نے اسے گھڑسواری اور نشانے بازی میں ماہر بنادیا۔ چونکہ شکار کے بعد شراب نوشی کی محفل ہوا کرتی تھی اس لیے وہ اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں ہی الکوحل سے متعارف ہوچکا تھا۔

رنجیت سنگھ مہان سنگھ کی وفات کے اگلے دو سالوں تک ریاست کے انتظامی معاملات سے دور رہا۔ اس کی مصروفیات اور مشاغل نے اس کی والدہ راج کور کو پریشان کردیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر رنجیت سنگھ کی شادی کردی جائے تو ممکن ہے وہ زندگی کی ذمے داریوں میں دلچسپی لینے لگے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار سدا کور سے کیا۔

سدا کور تو پہلے سے ہی ایک ایسے رشتے کی خواہش مند تھی جس سے اس کی مسل کی اہمیت دوبارہ سے قائم ہوجائے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنی بیٹی مہتاب کور سے رنجیت سنگھ کی شادی قبول کرلی۔ جب رنجیت سنگھ برات لے کر گوجرانوالہ سے بٹالہ روانہ ہوا، اس وقت اس کی عمر پندرہ سال سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ دو اہم سکھ خاندانوں میں قائم ہونے والا یہ رشتہ پنجاب کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی شادی میں پنجاب کے تمام ممتاز سکھ سردار شریک ہوئے تھے۔

مگر یہ شادی کوئی خوشگوار تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اس لیے کہ مہتاب کور کے ذہن سے یہ بات نکالے نہیں نکل پائی تھی کہ رنجیت سنگھ اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی پوری زندگی رنجیت سنگھ سے گریزاں رہنے لگی۔ رنجیت سنگھ جو پہلے ہی رشتوں کی بے وفائی کا شکار تھا، وہ بھی اپنی ذات میں محو ہوگیا۔ سدا کور کو اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ مہتاب کور اور رنجیت سنگھ کی گھریلو زندگی کس ڈگر پر جارہی ہے۔ وہ بھی اندر سے رنجیت سنگھ کو پسند نہ کرتی تھی۔ اس کی تو بس ایک ہی خواہش تھی کہ مہتاب کور لڑکوں کو جنم دے جو سکر چاکریہ کی ریاست کے حکمران بن جائیں۔

دوسرا فائدہ سدا کور کو اس شادی سے یہ نظر آتا تھا کہ مہتاب کور، رنجیت سنگھ کی بیوی بن کر کنہیاؤں کے مفادات کا تحفظ کرسکتی تھی۔ شاید اس چالاکی کا رنجیت سنگھ کو بھی علم ہو۔ یہی وجہ تھی کہ رنجیت سنگھ نے وفاداریاں جیتنے کے بجائے تحکمانہ رویہ اختیار کرلیا تھا۔ وہ تو خود کو ایک طاقتور سردار کی حیثیت سے منوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے کنہیا خاندان ایک وسیلہ بن چکے تھے۔ سدا کور اور رنجیت سنگھ میں ایک انوکھا محبت اور نفرت کا رشتہ وجود میں آگیا۔ وہ دونوں برتری کے خواہش مند تھے اور ایک دوسرے کی اس خواہش کو جانتے بوجھتے ہوئے اس کا احترام کرتے تھے، جب معاملات اس سرد مہری کا شکار ہوکر رہ جائیں تو ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب دونوں کو ایک دوسرے کی خامیوں اور خوبیوں کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان بھی کامل ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا ہوگئی۔

سدا کور نے اپنے داماد کو اپنے زیادہ قریب کرنے کے لیے یہ پہل کی کہ 1797ء میں جب اس کی ریاست بٹالہ کو رام گڑھیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو اس نے رنجیت سنگھ سے مدد مانگی۔ رنجیت سنگھ نے رام گڑھیوں کا بٹالہ پر دباؤ کم کرنے کے لیے اس کے ایک قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رام گڑھیوں نے مفاہمت کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے رنجیت سنگھ نے فوراً قبول کرلیا اور اس طرح سدا کور کی ریاست پر سے خطرہ ٹل گیا۔

رنجیت سنگھ پر اب اقتدار کا نشہ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ سدا کور کے اس طرح مدد مانگنے سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اب کنہیا اتنے طاقتور نہیں رہے جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ایک اور مثل کو اپنے ساتھ ملانا چاہیے۔ اس نے نکیوں کے سردار سے روابط بڑھانا شروع کردیے اور 1798ء میں نکئی سردار کی بہن کے ساتھ دوسری شادی کرلی۔ اس کی یہ شادی پہلی شادی سے زیادہ کامیاب رہی۔ اس کی دوسری بیوی اس کی والدہ راج کور کی ہم نام تھی۔ راج کور، رنجیت سنگھ کی نکئی کو نجھتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ رنجیت اپنی ماں کے اصل پیار سے ہمیشہ محروم رہا ہے۔ لہٰذا وہ بڑا پیار بھرا سلوک اختیار کرنے لگی۔ بالکل مادرانہ انداز کا پیار۔ لہٰذا رنجیت سنگھ بھی اس کا احترام دل و جان سے کرنے لگا۔ اس نے راج کور کو پیار سے داتر کور کا نام دے رکھا تھا یا پھر مائی نکیین کہنے لگا تھا۔

دوسری شادی نے مہتاب کور کے دل میں رنجیت سنگھ کی نفرت میں مزید اضافہ کرڈالا تھا۔ اب مہتاب کور کو بٹالہ جانے کا ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ دراصل اس کے ذہن میں اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن پر وہ رنجیت سنگھ سے عمل کروانا چاہتی تھی۔

جن دنوں رنجیت سنگھ اپنے ازدواجی معاملات طے کرنے میں مصروف تھا، اس عرصے میں سکرچاکریہ ریاست کے انتظامی معاملات لکھ پتی رائے اور رنجیت سنگھ کے ماموں دل سنگھ کی باہمی چپقلش کی وجہ سے سنگین مرحلے میں داخل ہوگئے تھے۔ لکھ پتی رائے کو محاصل کی وصولی کے دوران قتل کردیا گیا۔ اگرچہ قاتل تو گرفتار نہ ہوسکے لیکن یہ افواہیں ضرور پھیل گئیں کہ اس قتل کے پیچھے دل سنگھ کا ہاتھ ہے۔ دوسری طرف مہتاب کور کسی بچے کی ماں نہ بن سکی لیکن بعد میں بیاہ کر آنے والی راج کور (نکیین رانی) کے بطن سے رنجیت سنگھ کا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام کھڑک سنگھ رکھا۔ بیٹا پیدا ہوا تو اسے اپنی سلطنت کا جانشین بنانے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ سدا کور اس بات سے مایوس ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی مہتاب کور رنجیت سنگھ کے پہلے بیٹے کو جنم کیوں نہ دے سکی۔ تاہم وہ ایک دوراندیش عورت تھی۔ اس لیے اس نے مہتاب کور کا اس معاملے میں دوسرا درجہ بھی قبول کرلیا اور ...... رنجیت سنگھ کو مہاراجا کا خطاب اپنانے کے لیے حوصلہ افزائی دی۔

☆☆☆

پنجاب رنجیت سنگھ کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں کا پوری طرح تعین نہیں ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ کے مہاراجا بننے سے پہلے بانوے سال کا عرصہ پنجاب میں افراتفری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اٹھارویں صدی پنجاب کے لیے مشکلات اور نقصانات کی صدی بنی رہی، جس میں نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ ابدالی کے نو حملے، مرہٹوں کی یلغار اور سکھ گردی کی لوٹ مار نے پنجاب کے عوام کا جینا حرام کررکھا تھا۔ رہی سہی کسر اس صدی کی دو قحط سالیوں نے پوری کردی۔ کھیتی باڑی برباد ہوگئی اور لوگوں کے کاروبار چوپٹ ہوگئے۔ وہ کاشتکار اور تجارت پیشہ افراد جو نقل مکانی کرسکتے تھے، وہ پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔

پنجاب کو قدرتی آفات نے اجاڑ کر رکھ دیا تھا، اوپر سے وہ اور اس کے عوام بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں بھی لٹتے رہے۔ اگر ایک دن احمد شاہ ابدالی مالیہ وصول کرنے کے لیے آدھمکتا تو دوسرے دن لٹیرے سکھوں کی کسی مثل کا سردار راکھی کے نام پر پیداوار کا پانچواں حصہ مانگنے آجاتا۔ لاہور کے کئی مغل اور ترک حاکم بھی لوٹ مار کی وجہ سے بدنام تھے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک پنجاب میں مسلسل لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ سکھوں کی بارہ مثلوں نے مختلف علاقے آپس میں بانٹ لیے جن میں پانچ مثلیں زیادہ اہم گردانی جاتی تھیں۔ بھنگیوں کی مسل لاہور کے علاوہ امرتسر اور مغربی پنجاب کے بیشتر علاقوں پر قابض ہوگئی۔ کنہیاؤں کی مثل کے پاس ہمالیہ کی ترائیوں کا علاقہ تھا۔ پھلکیوں کی مثل کے پاس پٹیالہ اور سرہند کے قرب وجوار کا علاقہ۔ اہلووالیہ کی مثل راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے پر قابض تھی۔ جبکہ سکرچاکریہ مثل جو کہ کم اہم مثل تھی، گوجرانوالہ اور اس کے اردگرد کی بستیوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ ان تمام مثلوں کے سردار الگ الگ تھے اور جب بھی کوئی اہم مسئلہ یا دفاعی معاملات ہوتے تو تمام مثلوں کے سردار سال میں دو مرتبہ اکٹھے ہوکر اسے سلجھاتے۔ ابتدا میں یہ سربت خالصہ (کل خالصہ اسمبلی) منظم انداز میں کام کرتی رہی مگر کچھ ہی سالوں میں ایسا ہونے لگا کہ مثلوں کے سردار مل کر کسی غیرضروری معاملات پر بحث کرتے ہوئے آپس میں جھگڑ پڑتے اور معاملہ ہاتھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پائی تک جا پہنچا جسے دیکھتے ہوئے سربت خالصہ کے اجلاس ہونا بند ہو گئے۔ غرض پنجاب میں ہر طرف افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا جس مقصد کے لیے سکھوں نے مثلیں قائم کی تھیں، وہ پورا نہ ہو سکا بلکہ اس کی جگہ نا اتفاقی نے سکھوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب جسا سنگھ اہلو والیہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں سے لڑ رہا تھا تو پھلکیوں نے احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کر لی اور پٹیالہ کے صاحب سنگھ کے رابطے ابدالی کے پوتے شاہ زمان کے ساتھ تھے جو کہ شمالی ہندوستان پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ 1645ء سے 1661ء تک گوجرانوالہ کے ایک سکھ بدھ سنگھ نے اپنے گاؤں کے نام پر ایک مثل سکر چاکر یہ بنائی اور نادر شاہ کے خلاف جنگ لڑی۔ اس کے بعد اس کے لڑکے نودھ سنگھ نے مثل کی سرداری سنبھالی۔ نودھ سنگھ کے چار بیٹے تھے جن میں چڑھت سنگھ سب سے بڑا تھا۔ نودھ سنگھ کے مرنے کے بعد اس مثل کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی جو کہ راجا رنجیت سنگھ کا دادا تھا جو 1771ء میں بندوق صاف کرتے ہوئے اچانک گولی چلنے سے زخمی ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ برسر اقتدار آیا۔ مہان سنگھ بڑا دلیر جوان تھا۔ اس نے اس افراتفری کے دور میں اپنے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کوٹلی لوہاراں نامی قصبے پر قبضہ کر کے تمام لوہاروں کو نئے طرز کی بندوقیں بنانے کی ذمے داری سونپی۔ ایک طرف اس نے روہتاس کے قلعے پر قبضہ کیا تو دوسری طرف جموں پھر پٹیالہ پر اپنا تسلط قائم کیا۔

رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوا۔ ابھی اس کی عمر دس برس تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی والدہ مائی ملوائن بڑی دانا اور مدبر عورت تھی۔ اس نے سکر چاکر یہ مثل کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی شادی اس وقت کی طاقتور مثل پھلکیوں کے سردار جس کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی والدہ سدا کور جو بڑی دانا اور مدبر عورت تھی، کی بیٹی مہتاب کور سے کر دی۔ جس برس رنجیت سنگھ کے والد مہان سنگھ کا انتقال ہوا، وہ گجرات میں اپنے والد کے ساتھ صاحب سنگھ بھنگی کے خلاف جنگ میں مصروف تھا کیونکہ صاحب سنگھ نے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مہان سنگھ محاصرے کے دوران بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہوا تو اس نے اپنے بیٹے رنجیت سنگھ کی پیشانی پر زعفران لگا کر اسے سکر چاکر یہ بنا دیا۔ سکر چاکر یہ مثل کا سردار بنتے ہی اس نے بھنگیوں کے خلاف جنگ کر کے انہیں اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کیا۔ بھنگی اس وقت لاہور، امرتسر، گجرات اور شمالی پنجاب کے ایک بڑے حصے پر قابض تھے۔ رنجیت سنگھ نے انہیں عبرتناک شکست سے دوچار کر کے ان کے زیرِ نگیں علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

رنجیت سنگھ بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ وہ ایک بار جس بات کا تہیہ کر لیتا جب تک وہ پوری نہ ہو جاتی، چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ ایک مقام پر آ کر وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ اسی اثنا میں اس پر اس کے پرانے دشمن حشمت خاں نامی سردار نے حملہ کر دیا۔ حشمت خاں اپنی سرداری بچانے کے لیے کئی بار شکست کھا چکا تھا۔ اب وہ اسے اکیلا دیکھ کر اس پر حملہ آور ہوا تا کہ اپنی ہزیمت کا بدلہ لے سکے۔ اس نے جب حملہ کیا تو رنجیت سنگھ کا گھوڑا خوف کے مارے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جس سے حشمت خاں کا وار خالی چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے فوراً تلوار نکالی اور ایک ہی وار میں حشمت خاں کا سر کاٹ ڈالا اور اسے اپنے نیزے کی نوک پر اٹھا کر واپس اپنے ساتھیوں میں آ گیا۔

رنجیت سنگھ کے بچپن سے متعلق بہت زیادہ معلومات نہیں ملتیں لیکن سوہن لال سوری کے مطابق......

''رنجیت سنگھ بچپن میں چیچک کی بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ شہزادے کی طبیعت خراب تھی۔ سربلند خاں کی قیادت میں دو سو گھڑ سواروں کے ساتھ طبیب لالہ حاکم رائے کو شہزادے کے علاج کے لیے بھیجا گیا۔ چیچک کی بیماری سنگین ہو گئی تھی۔ اس کے سارے بدن پر چھالے نمودار ہو گئے تھے جن سے مواد بہنے لگا تھا۔ خصوصاً بائیں آنکھ والے چھالے سے اور پھر اسی سبب اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔''

اور پھر چیچک کے یہ داغ ہمیشہ اس کے چہرے پر قائم رہے۔ رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ اپنی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے اس کی پرورش پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ رنجیت سنگھ گرودوارے میں عبادت کے لیے جاتا۔ اس نے سکھ مذہب کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم بھی برہمن پنڈتوں سے لی مگر اس نے اپنا زیادہ تر وقت کھیلوں اور شکار میں صرف کیا۔ اسے انہی دنوں گھوڑوں سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ لگاؤ آئندہ زندگی میں جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ رنجیت سنگھ بہت چھوٹا... تھا جب اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ اپنی عمر کے ابتدائی برسوں ہی میں الکوحل سے متعارف ہو گیا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کی شخصیت بھی عجیب وغریب تھی۔ ایملی ایڈن اس کی شخصیت کا یوں احاطہ کرتی ہے۔

”رنجیت سنگھ کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ کانا تھا (بالکل ایک بوڑھے چوہے) کی طرح خاکستری ڈاڑھی اور ایک آنکھ والا۔“

انگریز مورخ اسے عموماً ”عیار مشرقی“ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب وہ برسر اقتدار آیا تو اس کی شخصی زندگی اس کے سیاسی کیریئر کی طرح رنگین بن کے رہ گئی تھی۔

اگرچہ وہ ایک بدصورت انسان تھا تاہم وہ اپنے اردگرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اس کا قد اور قامت معمولی تھی لیکن وہ نہایت دلیر انسان تھا۔ متعدد معرکوں میں اس نے اپنی فوج کی قیادت خود کی اور تلوار اپنے ہاتھ سے چلا کر دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ انسانوں سے زیادہ گھوڑوں سے محبت کرتا تھا لیکن ہزاروں برسوں میں وہ واحد ہندوستانی حکمران تھا جس نے ملک کی شمال مغربی سرحدوں کے پار سے آنے والے حملہ آوروں کی سرکوبی کی۔ اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے سیکڑوں جاگیرداروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔ تاریخ میں کوئی ایسا دوسرا بادشاہ مشکل سے ہی ملے گا جس نے خون بہائے بغیر اتنی بڑی سلطنت قائم کی ہو۔ اس نے پنجاب کے مشکل پیدا کرنے والے سکھوں اور مسلمانوں کو قائل کر کے اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ کشمیر کے پٹھانوں کو اپنی رعایا بنانے میں کامیاب ہوا۔ یوں اس کی سلطنت شمال میں چین اور افغانستان کی سرحدوں تک جبکہ جنوب میں سندھ کے صحراؤں تک پھیل گئی۔

☆☆☆

امرتسر پنجاب کا دوسرا بڑا شہر کاروباری لحاظ سے لاہور سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہ شمالی پنجاب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وسطی ایشیا سے تجارتی قافلے یہاں آتے اور اپنی اشیا کے بدلے ہندوستانی اشیا لے جاتے تھے۔ اس کی تنگ اور پیچ دار گلیوں میں واقع دکانوں میں ہر شے کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہاں پر ریشم، ململ، مسالا جات، چائے، چمڑا، توڑے دار بندوقیں اور دیگر اسلحہ جات کے علاوہ سونے اور چاندی کے زیورات بنانے والے بھی بڑی تعداد میں کام کرتے تھے۔ امرتسر امیر شہر ہونے کی وجہ سے جہاں بیرونی حملہ آوروں کی نظروں میں کھٹکتا تھا، وہیں سکھوں کے لیے بھی مقدس شہر تھا کیونکہ اس کی بنیاد ان کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی تھی اور اسی شہر میں پانچویں گرو ارجن نے سکھوں کے صحیفے کو ترتیب دیا تھا اور مقدس تالاب کے وسط میں گردوارہ تعمیر کیا تھا۔ جن سکھوں کے لیے ممکن ہوتا وہ کم از کم سال میں دو مرتبہ اس تالاب میں نہانے، گردوارے میں چڑھاوے چڑھانے ضرور یہاں آتے تھے۔ سکھوں کے لیے امرتسر دنیا کا سب سے اہم شہر تھا۔ جو شخص سکھوں کا راہنما اور پنجاب کا مہاراجا بننے کا خواہش مند ہوتا، اسے امرتسر پر لازمی قبضہ کرنا پڑتا تھا۔ امرتسر تقریباً ایک درجن خاندانوں میں بٹا ہوا تھا جو اس کے مختلف حصوں پر حکمران تھے۔ ان خاندانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے اور ان کے مسلح کارندے علاقے کے تاجروں اور دکانداروں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔

مختلف سرداروں کے ٹیکس کلکٹروں میں ہمیشہ ٹیکس اکٹھا کرنے پر ان بن ہو جاتی اور شہر...... کے گلی کوچوں میں خون ریز لڑائیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ شہری اس صورت حال سے اکتائے ہوئے تھے۔ انہوں نے رازداری کے ساتھ رنجیت سنگھ سے رابطہ کر کے اسے شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ رنجیت سنگھ کے ایجنٹوں نے پہلے ہی اطلاع دے رکھی تھی کہ امرتسر کے سرداروں میں اتحاد نام کی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ جو واحد خاندان کوئی حقیقت رکھتا تھا، وہ بھنگی سردار کی بیوہ اور اس کے بیٹے گرودیت سنگھ کا تھا۔ بھنگی سردار چار سال پہلے شراب نوشی کی کثرت سے مر گیا تھا۔ اب اس کی بیوہ مائی سکھاں گوبند گڑھ کے قلعے پر قابض تھی اور اسے رام گڑھ مثل کی حمایت حاصل تھی۔

1802ء کے موسم خزاں میں سکھاں کے کارندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر شہر کا امیر ترین ساہوکار اروڑمل اپنا کاروبار سمیٹ کر شہر کے دوسرے علاقوں میں چلا گیا اور اس کا اروڑمل کو بے حد صدمہ بھی تھا۔ چنانچہ اس نے بھی رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ شہر کا نظم و نسق سنبھال لے۔

رنجیت سنگھ نے اس سلسلے میں سدا کور اور فاتح سنگھ اہلووالیہ سے مشورہ کیا جنہوں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بہترین کوئی دوسرا موقع نہیں مل سکتا چنانچہ ان تینوں کی متحدہ فوج نے امرتسر کا محاصرہ کرلیا۔ سرداروں کو رنجیت سنگھ کی اچانک کارروائی پر بڑی حیرانی ہوئی۔ انہوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے... بالآخر سرداروں نے شہر کی فصیل پر توپیں نصب کردیں اور مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھنگی کی بیوہ نے بھی مزاحمت کرنے کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تیاری کرلی تھی۔ اسے توقع تھی کہ رام گڑھیے اس کی مدد کو آئیں گے مگر وہ عین موقع پر آکر دغا دے گئے۔ رنجیت سنگھ نے تمام سرداروں کو یکے بعد دیگرے شکست دیتے ہوئے شہر کو بہ آسانی فتح کرلیا۔ مائی سکھاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ رنجیت سنگھ نے اس کی اور اس کے بیٹے کی ایک پنشن مقرر کردی۔

گووند گڑھ قلعے کی فتح ایک اہم کارنامہ تھا۔ یہاں سے رنجیت سنگھ کو پانچ توپیں مالِ غنیمت کے طور پر ملیں۔ ان میں احمد شاہ ابدالی کے تانبے اور پیتل سے ڈھالی گئی بہت بڑی توپ بھی شامل تھی۔ یہ وہی توپ تھی جس نے پانی پت میں مرہٹوں کو نیست و نابود کیا تھا۔ اس توپ کو بعدازاں بھنگیوں نے افغانوں سے چھین لیا تھا اور اب وہ ان کے قبضے میں تھی۔ اسے ''بھنگیوں کی توپ'' کہا جانے لگا تھا۔

رنجیت سنگھ نے اس توپ کو کئی مہمات میں استعمال کیا اور اس کی موت کے بعد انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں اسے استعمال کیا گیا۔ بعدازاں اسے متروک قرار دے کر لاہور کی ایک مرکزی سڑک پر نصب کردیا گیا۔

امرتسر کے شہریوں نے رنجیت سنگھ کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ وہ امرتسر فتح کرنے کے بعد ہاتھی پر سوار ہوکر شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا گردوارے پہنچا۔ وہاں اس نے مقدس تالاب میں غسل کیا۔ اس نے سنگِ مرمر اور سونے کے پتروں سے گردوارے کی تعمیرِ نو کے لیے خطیر رقم دی۔ امرتسر فتح کرنے سے رنجیت سنگھ کی شان و شوکت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور جو علاقے برطانوی کمپنی کے زیرِ نگین تھے، وہاں کے لوگ بھی جوق در جوق اس کی سلطنت میں آنے لگے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے سپاہی خصوصاً ہندوستانی اور کچھ یورپشیائی رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہونے کے لیے آنے لگے۔ مہاراجا پہلے ہی انگریزی فوج کی کارکردگی سے متاثر تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ انگریزی فوج نے اپنے محدود تر وسائل میں کن حربوں سے ہندوستانی نوابوں کی فوج پر برتری حاصل کی اور انہیں شکست سے دوچار کیا۔

انگریزوں کی فوج چھوڑ کر آنے والی ایک پلاٹون نے اس کے سامنے پریڈ کی اور اس نے پہلی مرتبہ فوجیوں کو سادہ سے احکاماتی الفاظ پر جنگی اقدام کرتے دیکھا تو راجا رنجیت سنگھ نے انہیں ''ڈرل سارجنٹ'' کی نوکریوں پر اپنی فوج میں بھرتی کرلیا۔ اس نے اپنے نوجوان فوجیوں کو سرحد پار ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں بھرتی ہوکر انگریزوں سے تربیت لینے کے لیے پہلی بار بھجوایا۔

سکھ فوجی ہندوستانی سپاہیوں سے تربیت لینے کو اپنی توہین جانتے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوکر لڑنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پیدل لڑنے والے دراصل احمقوں کا ناچ کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ایک سکھ ''سوالکھ'' اور پوری پوری فوج پر بھاری ہے۔ اگر کوئی انہیں ہندوستانی سپاہ سے تربیت لینے کا مشورہ دیتا تو وہ آگے سے طنز کرتے کہ ہندوستانی حقیر اور بیچارے ''خالصہ'' کو کیا سکھا سکتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کو یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ اس کے من میں سکھوں کو بہترین سپاہ بنانے کا خبط سمایا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک ترکیب اختیار کی۔ اس نے اپنی فوج میں یہ اعلان کروادیا کہ جو سکھ ہندوستانی اور یورپشیائی فوجوں میں موجود استادوں سے تربیت لینے پر رضامند ہوگا، ان پنجابی نوجوانوں کو دوسروں سے بہتر معاوضے اور مراعات دی جائیں گی۔

اس کے اس اعلان پر بہت سے فوجیوں نے ان اساتذہ سے تربیت لینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ اس طرح سکھوں کی ایک نئی انفنٹری بٹالین ترتیب پاگئی جس کی وہ ہر روز صبح و شام پریڈ دیکھتا اور ان فوجیوں کے ساتھ استادوں کو بھی پرکشش انعامات سے نوازتا تھا۔ اس طرح نو ماہ کی بھرپور تربیت کے بعد رنجیت سنگھ کی ایک نئی فوج تشکیل پاگئی جس نے پریڈوں اور 1803ء کے موسمِ خزاں میں دسہرہ کی تقریبات کے دوران جنگی مشقوں میں نمایاں حصہ لیا۔

اسی سال اس نے ملتان اور جھنگ کو دوبارہ اپنی سلطنت کا حصہ بنانے کے لیے ان پر چڑھائی کا سوچا۔ سارے سرداروں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ احمد خاں سیال نے اپنے اردگرد کے لوگوں کو اکٹھا کرکے میدانِ جنگ میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے جوابی حملے میں ان کے دانت کھٹے کردیے۔ اس کے ہاتھیوں نے قلعے کے دروازے توڑ ڈالے تو احمد خاں سیال موقع پاکر ملتان فرار ہوگیا۔ رنجیت سنگھ کا اگلا نشانہ ملتان تھا۔ نواب مظفر خاں نے اپنے اردگرد کے بہادر اور خوفناک قبائل کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اس نے مسلم کاشتکاروں کو اپنی مدد کے لیے بلالیا مگر رنجیت سنگھ کی تربیت یافتہ فوج کے سامنے ان کے پاؤں نہ جم سکے اور انہیں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ دونوں مہمیں بہت مختصر اور حوصلہ افزا تھیں۔ برطانوی تربیت اور جنگ کے طریقے اپنانے کا فیصلہ اس کے لیے بہت سودمند رہا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس لیے اس نے اپنی فوج کی تنظیم و تربیت پر زور دینے کا فیصلہ کیا۔

رنجیت سنگھ نے امرتسر میں ہونے والی اس تنظیم نو کے بعد اپنی فوج کو ہر حوالے سے بہتر بنانے کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ اسے کوئی جوان تربیت میں کمزور دکھائی دیتا یا اس کی یونیفارم درست نہ ہوتی تو وہ ذمے دار افسروں کو سزا دیتا۔ وہ ایسے افسروں کی تنزلی کر دیتا اور ان پر بھاری جرمانے لگاتا لیکن وہ عام طور پر اپنے جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں ڈرانے کے بجائے انعامات سے نوازتا تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتا اور اپنے جوانوں کی بہادری کا خود مشاہدہ کرتا تھا۔

اور اسی امرتسر کی سرزمین سے موراں کا بھی تعلق تھا۔

☆☆☆

موراں امرتسر کے مردم شناس شہر جہاں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ شوخیاں کرتے گزر رہی تھی، اسی کے بازارِ حسن کی ایک کنچنی تھی جو اپنی خوب صورتی، حسن اور جوانی میں بے نظیر ہونے کے ساتھ حاضر جوابی اور شوخیوں کی وجہ سے بھی مشہور تھی، جب سے تہذیب و ثقافت نے اپنی کروٹ بدلی تھی، تاریخ کے ساتھ ساتھ الفاظ نے بھی اپنے چولے بدلنے شروع کر دیے تھے۔ اب حدِ ادب، جان کی امان پاؤں، ظلِ الٰہی، جل جلالہ، عالم پناہ، جنت مکانی جیسے الفاظ دم توڑ چکے تھے اور ان کی جگہ ہز ایکسی لینسی، عزت مآب، عز و دولا شان جیسے الفاظ نے جگہ لینی شروع کر دی تھی۔ طوائفیں جو کبھی تربیت و تہذیب سکھانے میں یکتا اور ماہر سمجھی جاتی تھیں، اب کساد بازاری کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ ناچنے گانے والیوں کی شہرت کے چاند کو گرہن لگ چکے تھے۔ درباروں اور محلوں کی راہداریاں اداسیوں کی نذر ہو چکی تھیں۔ شہنشاہیت کا جبروت دم توڑ چکا تھا۔ تہذیب و ثقافت نے بھی کروٹ بدل لی تھی۔ وہ کنچنیاں جو درباروں میں قدم دھرتے ہی رانیوں اور مہارانیوں کے عہدوں پر پہنچ چکی تھیں، اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کر رہی تھیں۔ جو ان عہدوں تک نہیں پہنچ پائی تھیں، دوبارہ سے اپنی کھولیاں اور حویلیاں آباد کرنے لگی تھیں یا پھر سرداروں اور سرمایہ داروں کی چار دیواریوں میں فنکشن کرنے لگی تھیں۔ ایسی کنچنیاں جو کبھی دربار سرکار کی نک چڑھیاں تھیں، اب وقت کی گرد سے اپنا ماضی ڈھونڈنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ اب اگر کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سردار بھی انہیں بلا لیتا تو وہ اسے اپنا اعزاز جانتی تھیں۔ امرتسر کا مردم خیز شہر جو کبھی شہر نگاراں بھی سمجھا جاتا تھا، اب بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ فارسی زبان کی مانگ اجڑ گئی تھی۔ اب اس کی جگہ ملی جلی شکل میں نئی زبان نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جس میں کہیں کہیں فارسی زبان کے الفاظ بھی اپنی جھلک دکھانے لگے تھے۔

بازارِ حسن میں لگنے اور سجنے والے درباروں کا حسن بھی ماند پڑ چکا تھا۔ طبلچیے اور سارنگی نواز بھوک سے تنگ آ کر دوسرے کام ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی حویلی آباد رہ گئی تو وہ بڑی غنیمت سمجھی جاتی تھی۔

موراں جوان اور خوب صورت تھی۔ اوپر سے جب وہ چلتی تھی تو یوں لگتا جیسے مورنی چل رہی ہو۔ اس کے گلے میں سر سنگیت تو خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب وہ ناچتی تو لگتا جیسے جنگل میں کوئی مور اپنی مستی میں ناچ رہا ہو۔ کنچنی فارسی زبان سے لیا ہوا لفظ جس کا مطلب تھا...... سونے میں ڈھلی ہوئی پوری طرح کھلی ہوئی...... کسی گلاب کے مانند۔ یہ سچ ہے کہ موراں پر یہ لفظ پوری طرح سج رہا تھا اس کی ساتھی دوسری کنچنیاں اس سے اس بات پر حسد کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ سب اکٹھی بیٹھی تھیں اور خانم ان سے دور پاندان میں سے پورے پان کی کترنیں لگا کر انہیں تہ کر کے اس میں پڑے نمدے کے تلے رکھ رہی تھی، نہ جانے اسے کیا سوجی۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''بھلے دن ہوتے تھے وہ بھی جب مغلوں کے دربار سجتے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں کی روٹی روزگار ان سے وابستہ تھا۔ ہم جیسے معاشرے کے دھتکارے لوگوں کی بیٹیاں شہنشاہوں کے من کو بھا جاتیں تو وہ محلوں میں جا کر راج کرنے لگتیں اور پشت ہا پشت پورے خاندان کے عیش ہو جاتے مگر جب سے یہ موئے انگریزوں نے حکومتوں پر قبضہ کیا ہے، ہماری خوشحالی تو دم ہی توڑ گئی۔ محلوں میں اجاڑ پیدا ہو گئے۔ اب تو وہی عیش کرتی ہیں جو اپنے جسموں کی سرعام نمائش کرتی اور بیچتی ہیں۔ اللہ زندگی دے میری موراں کو۔ چمکتے چاند ایسا حسن ہے اور اوپر سے ناز نخرے ایسے کہ پرانا دور ہوتا تو اس کے قدموں سے کئی لاشے اٹھانے پڑتے۔''

ابھی وہ بات کر ہی رہی تھی کہ موراں بڑے انداز سے سج سج کر قدم رکھتے اندر آ گئی اور کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کس کی بات ہو رہی ہے۔''

''لو وہ بھی آ گئی۔'' ان میں سے ایک بولی۔

''بیٹھ جاؤ اور سن لو روز روز کی راگنی۔ جب بھی ذرا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

فرصت ملتی ہے دم لینے کو اور اکٹھے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو خانم کی زبان پر تمہارے سوا اور کسی کی تعریف ہی نہیں ہوتی۔ مجال ہے کسی اور کے لیے کوئی لفظ ان کی زبان سے اترے۔'' دوسری نے تنک کر جواب دیا۔

''اور کیا..... اللہ نے اسے حسن اور دوسری خوبیاں بھی تو اتنی دے رکھی ہیں۔ تمہیں جلاپا کیوں ہو رہا ہے۔'' کسی اور نے پہلی کی بات کاٹتے ہوئے اس پر چوٹ کی۔

''اری کم بختو! یونہی باتوں کے کنکوے (پتنگ) اڑاتی رہوگی یا کام کے بارے میں بھی کچھ سوچوگی۔ یہ وہ حویلی ہے جہاں کبھی تماش بینوں میں خوشبودار قواموں سے سجے پان بانٹے جاتے تھے۔ پھر یہ ٹکڑوں میں بانٹنا شروع ہوئے اور اب ان ٹکڑوں کو بھی وقت نے کترنوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ سوچو جب یہ بھی نہ رہے تو کیا ہوگا؟''

''خانم! اب ہم اپنے جسموں کے ماس تو چوکھٹوں اور کھڑکیوں میں لٹکانے سے رہے۔ یہ تمہاری چہیتی موراں بھی تو ہے۔ سارے بازار میں اس کی خوب صورتی کی دھوم مچی ہے۔ ناچتی ہے تو بقول لوگوں کے لگتا ہے کہ مورنا چتا ہے۔ اس کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم تو پھر اس سے ہر لحاظ میں کمتر ہیں۔'' وہ بھی شاید کتنے دنوں سے بھری بیٹھی تھیں۔ ایک بار ہی پھٹ پڑیں۔

ابھی ان کی گفتگو جاری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''پیاری جان! ذرا اٹھ کر دیکھنا کون آیا ہے۔ یہ موئے ملازم بھی بھوک دیکھ کر ہولے ہولے کھسکنے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے۔ دھن کا اونچا نام!'' خانم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

پیاری جان بھی کسماتے ہوئے اٹھی اور ڈھیلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ چٹخنی اتار کے ابھی اس نے دروازے کا پٹ کھولا ہی تھا کہ وہ دھم سے اندر آ گیا۔ پیاری جان کی بانہیں دروازے پر اٹکی رہ گئیں اور اس کی آنکھیں حیرانی سے آنے والے کو تک رہی تھیں۔

اس کے سر پر پگڑی بندھی تھی۔ کمر بند کے ساتھ ایک طرف طمنچہ اڑسا ہوا تھا۔ دوسری طرف اپنے ملفوف میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ قمیص کے اوپر سپاہیوں کے مخصوص نشان اور بیج لگے تھے۔ فوجی بوٹوں کو اس نے اتارنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ یونہی دندناتا ہوا وہ خانم کے قریب آ کر اونچی آواز میں بولا۔

''موراں کون ہے؟''

''ٹکٹکی پر لٹکانے کے آرڈر آئے ہیں اس کے۔'' موراں نے ہنستے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔ باقی سب ان کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ میں نے موراں کا پوچھا ہے۔'' وہ اسی لہجے میں دوبارہ دہاڑا۔

''میں ہوں موراں۔'' موراں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''میں دربار سے آیا ہوں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار سے۔''

''خیریت ہے، کوئی بھول ہوگئی، اس کرموں ماری سے۔ یقین جانو دروغہ جی۔ سیاست سے ہمارا کوئی لین دین نہیں ہے۔'' ایک کنچن نے مسکین سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

''بات تو پوری ہونے دو۔'' سپاہی نے رعب سے کہا تو وہ ایک بار پھر سہم گئیں۔

''برا کاہے کو مانتے ہو دروغہ جی۔ طوائفوں کے پاس دو ہی تو ہنر ہوتے ہیں۔ ایک چتون کاری اور دوسرا حاضر جوابی۔'' موراں نے پھر شوخی سے جواب دیا۔

''مہاراجا رنجیت سنگھ نے موراں کو اپنے دربار میں بلا بھیجا ہے۔'' سپاہی نے بتایا۔

''زہے نصیب۔ خوش آمدید۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ خوشبو جب پھیلتی ہے تو ہر جگہ اپنا جادو پھیلا دیتی ہے۔ بڑی خوش بخت ہے میری بیٹی۔ موراں! تجھے مبارک ہو۔'' خانم نے سب چھوڑ چھاڑ کر موراں کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

''کب حاضری ہوگی میری بچی کی۔ لاہور کے دربار میں ہی بلایا ہے یا امرتسر میں کہیں حاضری ہوگی؟'' خانم نے اسی چاپلوسانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''لاہور جانا ہوگا۔ آپ تیاری رکھیں۔ جب بھی حکم ہوا سرکاری پیادے آ کے اسے لے جائیں گے۔'' سپاہی نے دوبارہ جواب دیا اور پھر واپسی کے لیے مڑا۔

''اے دروغہ جی۔ کچھ کھا پی تو لیتے۔ اگرچہ اب ہم نگوڑیوں کے پاس آپ کے شایان شان تو کچھ نہیں مگر پھر بھی..... تھوڑا ٹھہرو۔'' خانم اسی انداز میں بولی۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس اسے تیار رکھیں۔ ہو سکتا ہے کل ہی اسے جانا پڑ جائے۔'' سپاہی نے پھر سے بتایا اور واپس چلا گیا۔

☆☆☆

موسم خزاں اور 1796ء کا سال تھا۔ جب شاہ زمان اپنے ملک سے فرار ہوا اور اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ یہ اس کا پنجاب پر تیسرا حملہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنے پہلے دو حملوں میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بری طرح سے ناکام ہوا تھا۔ تاہم اس بار افواہیں گرم تھیں کہ وہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ حملہ آور ہورہا ہے کہ ہندوستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس نے اپنی تیس ہزار مسلح افغانوں پر مشتمل فوج لے کر دلی کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے دریائے سندھ کو پار کیا۔ اس نے اپنی کثیر فوج کے علاوہ ہندوستان میں قصور کے نظام الدین کو اپنی مدد کرنے کے انعام میں لاہور کی صوبیداری دینے کا وعدہ کیا۔ ستلج کے پار پٹیالہ کا صاحب سنگھ تھا جو ہر فاتح کی اطاعت کرنے کی اپنی خاندانی روایت پر پوری طرح سے کاربند تھا۔ پنجاب کی دوسری طرف روہیلہ افغان تھے۔ اودھ کا وزیر اور جنوب میں میسور کا ٹیپو سلطان تھا۔ ان سب نے اصرار کرکے افغانوں کو ہندوستان بلایا تھا۔

شاہ زمان کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی خبر جونہی پھیلی، لوگ جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے مثل دار جو کہ لوگوں کو تحفظ دینے کے وعدے پر حفاظتی ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور ٹیکس، مالیہ وصول کرتے وقت لوگوں سے انتہائی ظالمانہ سلوک کرتے تھے، وہ بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ دسمبر تک افغانوں نے پنجاب میں جہلم تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ لاہور تک اب افغانوں کا راستہ روکنے والے دو سردار تھے۔ ایک گجرات کا صاحب سنگھ اور دوسرا لاہور کا رنجیت سنگھ۔ صاحب سنگھ نے پہلے پہل افغانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن بعد میں حوصلہ کھو بیٹھا اور مشرق کی طرف فرار ہوگیا۔

افغانوں کی توپوں اور بندوقوں سے مسلح افواج کے مقابلے میں رنجیت سنگھ صرف پانچ ہزار گھڑسوار اکٹھے کرسکا جن کے پاس تفنگیں (لوہے کی لمبی نالیاں جن میں آگے تیر رکھ کر انہیں دشمن پر سانس کے زور پر پھینکا جاتا تھا) اور نیزے تھے۔ افغانوں کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ سکھ متحد ہوجائیں اور ان کو جمع کرنے کا واحد مرکز امرتسر تھا۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج اور خاندان کو لے کر اس مقدس شہر کی طرف چل پڑا۔ سربت خالصہ کے بلاوے پر بہت سے سکھ سرداروں نے لبیک کہا اور امرتسر آگئے۔ ان کا اکثریتی فیصلہ تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ جائیں۔ جب افغان ان خالی شہروں کو لوٹ لیں گے، تب وہ چھپ کر ان پر حملے کریں گے۔

لیکن رنجیت سنگھ کی ساس سدا کور نے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

''تم کونسا ہندو ذات سے تعلق رکھتے ہو جو دشمن پر پیچھے سے چھپ کر وار کرو گے۔ سکھ ہوکر سکھ قوم کی تضحیک نہ کراؤ اور دشمن کی چھاتی پر وار کرو۔ سامنے سے۔ پہاڑوں میں بزدل چھپا کرتے ہیں۔''

''آپ کی بات میرے من کو لگی ہے۔ ہمیں یقیناً افغانوں کے سامنے رہ کر وار کرنا چاہیے۔ پہاڑوں میں نہیں جانا چاہیے۔'' رنجیت سنگھ نے سدا کور کی یہ تجویز اپنی سپاہ اور سرداروں کے سامنے رکھی تو سب نے اس بات کی پُرزور تائید کی۔ وہ سارے اس کی قیادت میں اکٹھے ہونے پر تیار ہوگئے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں سمیت لاہور کا رخ کیا۔ انہوں نے افغان فوج سے جھڑپ کے دوران اسے لاہور کے قرب و جوار سے نکال کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔ ہر رات وہ اور اس کے جوان شہر کے کسی نہ کسی حصے پر شب خون مارتے اور چند افغانوں کو ہلاک کرکے اندھیرے میں غائب ہوجاتے۔

جنوری 1797ء میں شاہ زمان کو اطلاع ملی کہ اس کا بھائی افغانستان میں بغاوت بپا کرنے کی تیاریاں کررہا ہے۔ اس نے جنرل شاہانچی خاں کی قیادت میں بارہ ہزار فوجیوں کو لاہور میں چھوڑا اور خود باقی فوج کو لے کر کابل روانہ ہوگیا۔ واپس جاتی فوج پر سکھوں نے جہلم تک کے سارے راستے حملے کیے اور ان سے بہت سا جنگی سامان اور دوسرا لوٹ مار کا سامان چھین لیا۔ جب اس بات کا علم شاہانچی خاں کو ہوا تو اس نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار کرکے آنے والے سکھوں کو رام گڑھ کے قریب گھیر لیا مگر سکھوں نے اس کی ساری توقعات کو برباد کرکے رکھ دیا اور اس کی فوج کو بری طرح شکست کا سامنا کرنے پر مجبور کردیا۔ اس موسم سرما میں رنجیت سنگھ شاہانچی کو شکست دے کر پنجاب کا ہیرو بن گیا۔

ادھر شاہ زمان کو اپنی شکست اور شاہانچی کا اس طرح میدان جنگ میں ہارنا اپنی تذلیل لگا اور اسے یہ تذلیل بڑی دیر تک ڈنک مارتی رہی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے مسئلے کو سلجھایا اور ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی سوچنے لگا۔ جب ہندوستان کے لوگوں کو اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ ایک بار پھر اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہوگئے۔ اکتوبر آتے آتے پنجاب کے سارے بڑے شہر ویران ہوگئے۔ شاہ زمان نے بھی سکھوں سے خوفناک انتقام لینے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو فوج میں شامل ہونے کی ترغیب

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دینے کا اعلان کیا کہ اس کے ساتھ ہر شخص کو ہندوستان میں لوٹ مار کی آزادی ہوگی۔

پنجاب میں ایک بار پھر افراتفری پھیل گئی، یہاں تک کہ امرتسر میں واقع مقدس عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے مٹھی بھر محافظ رہ گئے۔ دہلی میں مغل دربار میں متعین انگریز ریذیڈنٹ کونز کا کہنا ہے کہ سکھوں نے بدترین بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

صاحب سنگھ بھنگی گجرات چھوڑ کر بھاگ گیا۔ افغانوں نے شہر کو لوٹ لیا اور شہریوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ ہندو اور سکھ تو پہلے ہی فرار ہوچکے تھے۔ افغانوں کی لوٹ مار کا شکار ہونے والے پنجابی مسلمان تھے۔ رنجیت سنگھ خود گوجرانوالہ فرار ہوگیا۔ افغانوں نے گوجرانوالہ میں بھی خوب لوٹ مار کی اور شہریوں کا قتلِ عام کیا۔

امرتسر میں منعقد ہونے والے سربت خالصہ کے شرکاء کی اکثریت نے پہاڑوں میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس بار بھی سدا کور نے انہیں احساس دلایا کہ وہ جن لوگوں سے حفاظتی ٹیکس وصول کرتے ہیں، ان کو تحفظ فراہم کرنا بھی ان کی ذمے داری ہے۔ اس نے کہا کہ اگر پھر بھی انہوں نے پہاڑوں میں جانے کا فیصلہ کیا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت یہیں مرے جیے گی۔ اس نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اسے مکمل طور پر یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ امرتسر ایک مقدس اور پوتر شہر ہے۔ اس نے رنجیت سنگھ کو بلا کر کہا کہ وہ ایک سکھ ہونے کی حیثیت سے یہ گوارا کرے گا، کوئی اس کے مقدس شہر کو یوں اجاڑتا پھرے۔

''نہیں۔ کبھی نہیں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔'' رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔

''جو لوگ یہاں سے بھاگ رہے ہیں، وہ نہ صرف بزدل ہیں بلکہ سکھوں کے نام اور عزت پر ایک دھبا ہیں۔ فتح گرو کی دین ہوتی ہے۔ ہم ایک بار پھر شاہ زمان سے ٹکر لینے کی کوشش تو کریں۔'' سدا کور نے رنجیت سنگھ کو دوبارہ سمجھایا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے یہی بات دہرائی۔ رنجیت سنگھ کے ماموں دل سنگھ نے حاضرین کو بتایا کہ افغان اتنے دلیر نہیں ہیں جتنا انہیں سمجھا جا رہا ہے اور سکھوں کے لیے انہیں مار بھگانا مشکل نہیں ہے۔ اس نے خود اکیلے ہی شاہ زمان کے لیے پھل لے جانے والے ایک کارواں کو لوٹا ہے اور اس میں کامیاب رہا ہے۔

دل سنگھ کی باتیں سن کر تمام سرداروں نے ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو اپنا سالار منتخب کرلیا۔

افغانوں نے اپنی کارروائی کا آغاز پھر پہلے کی طرح کیا۔ اگرچہ شاہ زمان کا ٹارگٹ سکھ تھے اور اس نے سکھوں کو نیست و نابود کرنے کا اعلان بھی کردیا تھا اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ چونکہ افغان ان کے ہم مذہب ہیں، اس لیے وہ افغان فوجیوں کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رہیں گے مگر افغان فوج نے اپنی ضرورت کی ہر چیز مسلمان کاشتکاروں سے چھین لی۔

27 نومبر 1798ء کو شاہ زمان لاہور میں داخل ہوگیا۔ اس مرتبہ اس نے اپنی فوج کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے سخت احکامات جاری کردیے کہ لاہور میں لوٹ مار بالکل نہیں کی جائے۔ جنگ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ اگر سکھوں کو پنجابی مسلمانوں اور ہندوؤں سے الگ کردیا جاتا تو آدھی جنگ ویسے ہی جیتی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ سکھوں کو ماجھے والوں (ستلج اور راوی کے درمیان رہنے والوں) اور مالوے والوں (ستلج کے مشرق میں رہنے والوں) میں تقسیم کردیا جاتا تو پنجاب کو ایک گولی بھی چلائے بغیر فتح کیا جاسکتا تھا۔ شاہ زمان کا یہ منصوبہ بظاہر بہت زبردست لگتا تھا۔ اردگرد کے سردار اپنی اپنی سرداریاں بچانے کی خاطر شاہ زمان کی حمایت کررہے تھے۔ قصور کے نظام الدین کی یہ خواہش تھی کہ پنجاب کا قبضہ شاہ زمان کے ہاتھوں میں چلا جائے تاکہ اسے لاہور کی صوبیداری مل جائے۔ کانگڑہ کا سنسار چند اپنے آپ کو ہندوؤں کا ترجمان بتاتا تھا جبکہ صاحب سنگھ اپنی روایت نبھاتے ہوئے زمان خاں کا ساتھی اور خود کو مالوے کے سکھوں کا نمائندہ ظاہر کرتا تھا۔ ایسے میں صرف رنجیت سنگھ تھا جو کانٹے کی طرح زمان خاں کو چبھ رہا تھا۔

شاہ زمان نے افغانوں کا ایک لشکر امرتسر کی طرف بھیجا۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے پانچ میل باہر آکر افغانوں کا راستہ روک لیا۔ تین گھنٹوں کی لڑائی کے بعد افغان لاہور کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ رنجیت سنگھ نے ان کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کا محاصرہ کرلیا اور افغانوں کی رسد کے تمام راستے بند کردیے۔ اس نے نواحی علاقے کی کھڑی فصلوں کو جلوا دیا تاکہ افغانی افواج ان میں نہ چھپ سکیں۔ اس وجہ سے افغان دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہوگئے۔

دن گزرتے جارہے تھے۔ کوئی دن ایسا نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا امکان دکھائی دیتا تھا کہ افغان سکھوں کا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

محاصرہ توڑ کر دہلی کی طرف پیش قدمی کریں۔ شاہ زمان نے پہلے تو پیار کے ساتھ اپنے فوجیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا پھر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی مگر افغانوں پر سکھوں کی اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ رات ہونے کے بعد اپنی بیرکوں سے نکلنے پر تیار نہیں تھے۔

بالآخر شاہ زمان نے سکھوں کو فنا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے سکھ سرداروں کو یہ یقین دہانی کروانے کے لیے اپنا ایک ایجنٹ امرتسر بھیجا کہ وہ سکھوں کی املاک اور شہریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اگر وہ یہ بتا دیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ سکھوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ افغان اپنے ملک واپس چلے جائیں۔ شاہ زمان نے اپنے ایجنٹوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ سکھوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں اور اس کے لیے سرداروں کو بھاری رقوم کی پیشکش کریں۔ شاہ زمان کی یہ چال کامیاب رہی۔ بہت سے سرداروں نے اپنے نمائندے لاہور بھیج دیے۔ شاہ زمان خاں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس نے شاہانہ انداز میں انہیں کہا کہ میں یہ ملک تمہیں عطا کرتا ہوں۔ آزادی کے ساتھ رہو اور اپنی زمینیں کاشت کرو۔

ادھر عین وقت پر ایک نجات دہندہ اٹھا۔ یہ صاحب سنگھ بیدی تھا جس نے سرداروں کو سمجھایا کہ وہ غیر ملکی حملہ آور سے مذاکرات نہ کریں۔ سرداروں نے اس کی بات مان لی۔ جب دوبارہ شاہ زمان کے ایجنٹ ان سرداروں کے پاس آئے تو انہوں نے کہا۔

”ہم نے یہ ملک تلوار سے حاصل کیا تھا اور تلوار ہی سے اس کا تحفظ کریں گے۔“

اس پر شاہ زمان کو بے حد غصہ آیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ سکھوں کو جنگ ہی کے ذریعے سبق سکھائے گا مگر شاہ زمان کا لشکر ہر وقت سکھوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ رہتا تھا۔ سکھ رات کو لاہور میں گھس آتے اور تفنگوں کے فائر کرتے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔

شاہ زمان کے بھائی محمود نے ایک بار پھر افغانستان میں گڑبڑ پھیلا دی تھی۔ شاہ زمان نے کئی ماہ سے اپنے فوجیوں کو تنخواہیں بھی ادا نہ کی تھیں اور وہ شہر کو لوٹنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ جب شاہ زمان نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے فوجیوں نے مزید جنگ لڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر شاہ زمان نے اپنی فتح کے تمام منصوبے ختم کیے اور کابل واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اعلان کیا کہ جونہی محمود کے ساتھ اس کا معاملہ طے ہو جائے گا، وہ دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے واپس آئے گا۔

یقیناً اس نے ایسا کیا۔ پورے بارہ برس کے بعد وہ پنجاب میں دوبارہ واپس آیا مگر ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ لاٹھی ٹیکتا ہوا پناہ کی درخواست لے کر رنجیت سنگھ کے پاس آیا کیونکہ اس کے بھائی محمود نے اسے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں گرم اور تپتی ہوئی سلاخیں پھروا کر اسے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا تھا۔

☆☆☆

بات کو پر لگ گئے تھے۔ منٹوں میں یہ خبر پورے... امرتسر کی کنچنیوں میں پھیل گئی تھی کہ رنجیت سنگھ نے بازارِ حسن کی موراں کو دربار کے لیے لاہور منگوانے کی دعوت دی ہے۔

ایک طرف موراں کی خانم اپنی پوری برادری میں اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ وہ جس سے بات کرتی موراں کے حسن، اس کی گلوکاری اور ناچنے کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھی۔ وہاں اسی کی برادری کی کچھ کنچنیاں، موراں کی بدخواہی میں حسد کی تمام حدود پھلانگ رہی تھیں۔

”چشم بددور......! میری موراں تو لاکھوں میں ایک ہے۔ دیکھ لو پورے امرتسر سے مہاراجا کی نظر بھی میری ہی موراں پر پڑی ہے۔“ خانم بتا رہی تھی۔ جب وہ ذرا نظروں سے ہٹی تو سننے والیوں میں سے ایک ناک چڑھا کر بولی۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ کس کس کی سفارشوں سے موراں مہاراجا رنجیت سنگھ کی نظروں میں چڑھی ہے۔ ایڑھی چوٹی کا پورا زور لگا رکھا تھا خانم نے۔“

تب دوسری نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”موراں کے مقدر کیا کھلے، خانم کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ دیکھتی نہیں کیسے باتیں کتر کتر کر پھینکتی ہے۔“

”مہاراجا کو بھی تو بس پورے امرتسر میں یہی دانہ پسند آیا۔“ پہلی نے آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا۔

”دیکھنا تو اب یہ ہے کہ موراں کو مہاراجا پسند آتا ہے یا نہیں۔ ایک آنکھ اور چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا۔ سنا ہے ویسے بھی تنکے کی طرح کمزور اور قد میں بھی بس ایویں ہی ہے۔ اور ماشاءاللہ اپنی موراں تو ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔“ قریب کھڑی ایک اور کنچنی نے ان کی باتوں میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"مہاراجا ہے پورے پنجاب کا۔ مہاراجا تو کاٹھ کا الو بھی ہو تو مہاراجا ہی کہلاتا ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے سارا حسن دولت میں چھپا ہوا ہے۔ ماس میں نہیں۔"

"سچی بات ہے۔ اب مہاراجا دیکھو اور اس کی پسند دیکھو!" ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ اندر سے موراں نکل آئی۔ اسے دیکھتے ہی پہلی نے دوسری کو کندھا مارا۔

"موراں آ گئی ہے۔" تقریباً پہلی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ مجھے کونسا کسی سے خوف آتا ہے۔ بات سچی ہے!" دوسری نے جواب دیا۔

"کیا سچ ہے؟" موراں نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا مگر اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے وہی بولی۔

"اے موراں! کب اتر رہی ہے دربار میں؟"

"ابھی تو صرف سندیس آیا ہے۔ اللہ جانے کب کہار ڈولی لینے آئیں گے۔" موراں نے شوخی سے جواب دیا۔

"اے میں تو کہتی ہوں، خوب بن سنور لو جتنے دن ہیں۔ ابٹن، مسی، پوڈر، لالی لگا لو۔" اس نے ہنستے ہوئے مشورہ دیا۔

"بنے سنورے تو وہ جو پہلے سے خوب صورت نہ ہو۔ اللہ کا شکر ہے اس نے سارے حسن کے خزانے موراں کی جھولی میں ڈال دیے۔" موراں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"میں تو کہتی ہوں، جاتے ہوئے بننے سنورنے کا سارا سامان ایک گٹھڑی میں باندھ کر ساتھ لے جانا اور اپنے ہونے والے عاشق پر اچھی طرح لگا لینا تاکہ اس کے چہرے کے داغ چھپ جائیں۔" اس نے ہنس کر چوٹ کی۔

"مگر کانی آنکھ کا کیا ہوگا؟" دوسری نے اپنا حصہ ڈالا۔

"مہاراجا ہے۔ سب عیب قبول ہیں۔" موراں نے کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ وہ شرمندہ سی ہو کر رہ گئیں۔

"ہاں بابا۔ بھوکے پیٹ تو پتھر کو چاٹ کر بھی دلاسا مل جاتا ہے۔" اس نے بات بڑھائی۔

"کیوں جلتی ہو۔ اگر میں وہاں ان کے دل میں گھر بنا پائی تو تمہیں بھی وہاں بلاؤں گی۔ دیکھ لینا۔ موراں کیسے رہتی ہے محلوں میں۔" موراں نے ان کے حسد کو آگ دکھائی۔

"اے موراں! مجھے تو ضرور بلانا۔ سنا ہے وہاں ولایتی شراب بھی ملتی ہے۔ سچی...... دیسی شراب پی پی کر میرے تو ہونٹوں پر سکری جم گئی ہے۔ اب تو پینے میں مزہ بھی نہیں آتا۔" پہلی نے بات بدلی۔

"بڑی لالچی ہے۔ خیر سے موراں اب وہاں جا کے رانی بن جائے گی۔ کچھ اور مانگا ہوتا۔" دوسری نے اسے چھیڑا۔

"تو ایسے کرنا وہاں کسی صوبیدار سے، کسی سردار سے میرا بھی مٹکا لگوا دینا۔ بس تم میرا تعارف کروا دینا۔"

"اسے پھانس میں خود لوں گی۔" پہلی نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"نہ مشتری بی بی۔ قاضی کا پیادہ میں تو نہیں بن سکتی۔ خود ہی کوشش کر کے کسی سرکاری درباری کو پھانس لو۔" موراں نے پہلی بار اس کو نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

"او ہو۔ نہ اپنے ایسے نصیب ہوں اور نہ ہمیں کسی دربار یا سرکار سے سندیس آئے کہ مشتری مرنے جوگی...... تو بھی کسی کانے، خاکی مریل چوہے کو پسند آ گئی ہے۔" مشتری نے جلاپے سے جواب دیا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ جب سے میری بچی کا دربار میں جانے کا سنا ہے، سب جل کر خاک ہوئی جاتی ہیں۔ کیوں ری بدبختو۔ کیوں گھیر رکھا ہے موراں کو!" خانم نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے۔ یہ کون سا اپنی چال بھول گئی ہے۔ باتیں ہی ہیں نا۔ ہم نہ کریں گے، دوسرے کریں گے اور اب تو پورے امرتسر میں یہ پھیل چکا ہے کہ موراں رنجیت سنگھ کے دربار میں مجرا کرنے جا رہی ہے۔" مشتری نے چڑتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو پتر یو...... اپنے اپنے کمروں میں اور بیگا جان تم میری ذرا... بات سنو۔" خانم نے سب کو جانے کے لیے کہا تو وہ سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"بیگا جان! تمہیں یاد ہے۔ آج کتنی تاریخ ہو گئی ہے اور تم نے ابھی تک کمرے کا کرایہ نہیں دیا۔"

"خانم آپ کو پتا ہے۔ کتنے دنوں سے میں بخار میں تھی۔ میرے کمرے میں تو جلسہ بھی نہیں ہو سکا۔"

"بوا! تمہیں پتا ہے۔ حالات کس طرح کے جا رہے ہیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر گزارہ کر رہی ہوں۔ اگر ساری نوچیاں یونہی ہاتھ دھر کر بیٹھ رہیں تو خرچہ کہاں سے نکلے گا۔"

"خانم! جلد ہی حساب چکتا کر دوں گی۔ ذرا دم لے لو۔" بیگا جان بولی۔

"فکر ہو رہی تھی، اس لیے تمہیں کہا۔ سب کے سامنے تمہیں پتا ہے مجھے بات کہنے کی عادت نہیں ہے۔ سبکی ہوتی ہے اس لیے اکیلے میں کہا ہے۔ دوبارہ سے کہنے کی ضرورت نہ رہے۔" خانم نے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''خانم! ایک بات میں بھی کہوں۔'' بیگا جان نے بڑے کمزور لہجے میں بات کی۔

''کہو......'' خانم نے ملائمت سے پوچھا۔

''خانم! سرکارے دربارے تمہاری بڑی واقفیت ہے۔ مانا کہ میں موراں سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوں۔ ناز و ادا میں بھی وہ ہم سب سے بڑھ کر ہے۔ میں بڑی دیر سے آپ کی کوششوں کو دیکھ رہی ہوں جو آپ موراں کے لیے کرتی رہی ہو اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ موراں کو مہاراجا کی محفل سجانے کا موقع مل گیا۔ اگر تم اتنے خلوص کے ساتھ میرے لیے بھی کوشش کرو اور میرا مقدر بھی کسی دربار، مہاراجے یا سردار کے ہاں کھل جائے تو یقین کرو، آپ کو نہال کر دوں گی۔ میں کتنے دنوں سے بات کرنے کی جراٴت کر رہی تھی مگر یقین جانو، حوصلہ ہی نہیں پڑ رہا تھا۔''

بیگا جان نے آہستہ آہستہ اپنے دل کی بات خانم پر واضح کر ہی ڈالی تو خانم نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرتے ہوئے پہلی بار اسے اپنی نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔

''بیگا جان! پھل اونچے درخت سے خود بخود تمہاری جھولی میں نہیں آ گرتا۔ اس کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ موراں نے جتنی محنت اس مقام تک پہنچنے کے لیے کی ہے، اتنی کوئی پتری بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بات درست ہے کہ میری مدد کے بغیر وہ اتنی اونچی اڑان نہیں بھر سکتی تھی۔ تم بھی میری بات مانتی رہو۔ میرے قدموں کے نشانات پر قدم دھرتے چلی آؤ گی تو کامیابیوں کے دروازے تم پر بھی کھل جائیں گے۔ مگر پہلے کمرے کے کرائے کا بندوبست تو کر لو۔'' خانم نے موراں کی کامیابیوں کا سارا صلہ اپنی جھولی میں ڈالتے ہوئے کہا اور بیگا جان کو سوچتا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

شاہ زمان جب ناکام ہو کر واپس پلٹنے لگا اور اس کی اطلاع امرتسر میں موجود سکھ سرداروں کو ہوئی تو وہ فوراً اپنی اپنی ریاستوں کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ان میں سے رنجیت سنگھ ایسا واحد سردار تھا جس نے یہ جنگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے نہیں لڑی تھی۔ وہ فوری طور پر افغانوں کے تعاقب میں نکل پڑا اور گوجرانوالہ کے قریب افغانوں کو عقب سے جا لیا۔ دوسری طرف سے اس نے افغانوں کو سامنے سے بھی گھیرنے کی کوشش کی تاکہ وہ پنجاب سے نکلنے نہ پائیں مگر افغان اس کے نرغے میں نہیں آئے اور بچ کر نکل گئے۔ رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ کے کنارے تک ان کا تعاقب کیا اور جب تک وہ ہندوستان کی حدود سے باہر نہیں نکل گئے، ان پر حملے کرتا رہا۔ اب رنجیت سنگھ پورے پنجاب کا ہیرو بن چکا تھا۔ اگر وہ اتنی جراٴت کا مظاہرہ نہ کرتا تو سارا پنجاب برباد ہو گیا ہوتا کیونکہ ان شمالی وحشیوں کو جنہیں افغان کہا جاتا تھا، ان کے گھوڑے جہاں جہاں سے گزر جاتے، اس زمین پر گھاس تک نہیں اگتی۔

افغانیوں کی شکست خوردہ فوج واپس ہوتے ہی لاہور پر تین سرداروں نے قبضہ کر لیا۔ ان میں چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور موہر سنگھ شامل تھے۔ انہوں نے برسر اقتدار آتے ہی کھل کھیلنا شروع کر دیا۔ اچانک دولت اور سرداری ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنی اوقات بھول گئے۔ وہ ہر وقت شراب نوشی اور زنا کاری میں گزارتے یا آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جس سے لاہور شہر کا امن و سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ سوہن لال کا کہنا تھا۔

''لاہور کے لوگوں پر اتنے ظلم ہو رہے تھے کہ ان کی آہ و فغاں آسمان تک پہنچ رہی تھی مگر حکمرانوں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔''

نظام الدین کے ایجنٹوں نے لاہور کے ممتاز مسلمانوں سے رابطہ کر کے انہیں تجویز دی کہ وہ ان کے آقا نظام الدین کو شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دیں۔ مسلمانوں نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ہندو اور سکھ شہریوں کے ساتھ مل کر انہوں نے رنجیت سنگھ کو خفیہ طور پر لاہور آنے کی دعوت دی۔

شہریوں کے نمائندے رنجیت سنگھ سے ملے اور اسے ساری صورت حال بتا کر لاہور پر قبضہ کرنے کو کہا۔ رنجیت سنگھ ان کی دعوت سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دعوت لاہور کے شہریوں نے ہی بھجوائی ہے یا لاہور کے سرداروں نے اسے پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہے۔ اس کا ذکر اس نے شہریوں کے نامہ بروں سے بھی کیا۔ ''لگتا ہے، مجھے لاہور کے سرداروں نے پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہے اور تم سب کو مہرے بنا کر میرے پاس بھیجا ہے۔''

''مہاراجا! آپ کا خدشہ بجا مگر ہمیں کسی سردار نے نہیں بھجوایا۔ ہم لاہور کے شہری خود ان سے اتنے تنگ اور پریشان آ چکے ہیں کہ ان سے جان چھڑانے کے لیے آپ کی مدد مانگنے آئے ہیں۔'' نمائندوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

''اس کا کوئی ثبوت؟'' مہاراجا رنجیت سنگھ نے پوچھا۔

''اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ اپنا کوئی بااعتماد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ملازم ہمارے ساتھ بھجوا دیں تاکہ وہ صحیح صورتِ حال کا جائزہ لے کر آپ کو درست اطلاعات دے۔'' وہی نمائندہ دوبارہ بولا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ میں اپنے بااعتماد ملازم عبدالرحمان کو آپ کے ہمراہ صورتِ حال کا درست مشاہدہ کرنے کو بھجواتا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں گا'' مہاراجا رنجیت سنگھ نے عبدالرحمان کو ان کے ہمراہ لاہور روانہ کر دیا اور خود اپنی ساس سدا کور سے مشورہ کرنے چلا گیا...... عبدالرحمان کچھ دن لاہور میں رہ کر وہاں کے ممتاز شہریوں سے گفت و شنید کر کے اس کے پاس بٹالہ پہنچ گیا۔

''ہاں تو عبدالرحمان تمہارا کیا اندازہ ہے؟'' مہاراجا نے عبدالرحمان سے پوچھا۔

''مہاراج! لاہور کے شہریوں نے واقعتاً آپ کو بلایا ہے۔ وہاں کے عیاش سرداروں میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ حضور کی فوج کا سامنا کر سکیں۔ ان میں سے جو واحد اہل سردار ہے، وہ اس وقت شہر سے دور ہے۔'' عبدالرحمان نے بتایا۔

''آپ کا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟'' رنجیت سنگھ نے اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رنجیتے! فوری طور پر اپنی فوج کو اکٹھا کرو اور لاہور پر حملہ آور ہو جاؤ۔ تم فوراً امرتسر جا کر اپنی فوج کو ساتھ لو۔ تاخیر نہیں کرنی اور میری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔'' سدا کور نے رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا۔

سخت سردیاں ہوں یا گرمیاں اپنے پورے عروج پر ہوں تو یہ وقت کسی بھی ملک کے فوجیوں کے لیے بدترین وقت ہوتا ہے۔ جس وقت رنجیت سنگھ نے لاہور پر حملہ آور ہونے کا سوچا، اس وقت گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں اور کسی وقت بھی مون سون شروع ہونے کی توقع تھی۔ اگر حملے کے وقت مون سون شروع ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ ہونے والے میدان دلدل میں تبدیل ہو سکتے تھے۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے بھی موقع گنوائے بغیر لاہور پر جلد حملہ کرنے کی ٹھانی۔ اس نے اچانک حملہ کر کے عیش و عشرت میں ڈوبے سرداروں کو حیران کرنے کا سوچا اور رنجیت سنگھ نے 10 محرم کو لاہور پر حملہ کر دیا۔ تمام سردار رات کے بعد معمول کے مطابق اپنی عیاشیوں میں مشغول ہو گئے جو کہ نہ جانے کب تک جاری رہنے کا پروگرام تھا۔ وہ سب مے نوشی میں مصروف تھے۔ جب لاہور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ساری فضا سوگ منا رہی تھی تو رنجیت سنگھ لاہور سے چند میل کی دوری پر تھا۔

اگلی صبح کی آنکھ کھلتے ہی لوگوں نے اپنی چھتوں پر سے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی فوج نے خاموشی کے ساتھ لاہور شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ سورج کی روشنی پھیلنے تک رنجیت سنگھ کے پچیس ہزار جوان اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے اور وہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھے۔

رنجیت سنگھ نے سدا کور اور اس کے جوانوں کو شہر کی مشرقی سمت دہلی دروازے پر چھوڑا اور خود جنوب کی طرف سے انارکلی بازار تک پہنچ گیا۔ یہاں اسے لاہور کے شہریوں کی جانب سے خوش آمدید کا خفیہ پیغام پہنچا۔ اس نے شہر کی فصیل میں مختلف مقامات پر بارود رکھوا دیا۔ جونہی پہلی توپ چلی، لاہوری مسلمانوں کے سالار مہر محکم دین نے نقارہ بجوا کر اعلان کر دیا کہ لاہور شہر پر مہاراجا رنجیت سنگھ نے حملہ کر دیا ہے اور اس نے شہر کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ لہٰذا شہر کے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور مہاراجا کی فوج کو خوش آمدید کہا جائے۔ رنجیت سنگھ اپنے جتھے سمیت جنوب میں واقع لاہوری دروازے سے داخل ہوا۔ سدا کور اپنے گھڑ سواروں کو لے کر دلی دروازے سے داخل ہوئی۔

حاکمان لاہور شہر کے لیے یہ اچانک اور حیران کن حملہ تھا۔ موہر سنگھ اور صاحب سنگھ کے خاندان کے لوگ اور ان کے ساتھی دوسرے دروازوں سے فرار ہو گئے۔ چیت سنگھ قلعہ بند ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے اعلان کرا دیا کہ شہر کے لوگ امن و سکون سے رہیں۔ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے فوجیوں کو بھی سختی سے حکم دیا کہ وہ شہر میں کسی قسم کی لوٹ مار نہیں کریں گے اور جو فوجی ایسا کرتے ہوئے پایا گیا یا اس نے حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔

☆☆☆

لاہور کی فتح رنجیت سنگھ کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس شہر پر قبضہ کرنے سے وہ شمالی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی رنجیت سنگھ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مغل شہنشاہ اورنگزیب کی تعمیر کردہ عظیم شاہی مسجد میں پہلی حاضری دی۔ اس کے بعد وہ مسجد وزیر خاں گیا۔ اس نے قلعے کی فصیل کے نیچے بادشاہی مسجد کے قریب اپنی فوج کا پڑاؤ ڈالا پھر اپنی ساس کے مشورے پر چیت سنگھ کو ہتھیار ڈالنے اور اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ چیت سنگھ نے پس و پیش کی تو اس نے کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چیت سنگھ کے حواریوں نے رنجیت سنگھ کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اقدام سے چیت سنگھ کو آگاہ کیا۔ اگلے روز چیت سنگھ کے قاصد آئے۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اگر رنجیت سنگھ ان کے سرداروں کی جان بخشی کا حکم دیں تو قلعہ بند چیت سنگھ نہ صرف خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے گا بلکہ قلعہ بھی رنجیت سنگھ کے حوالے کر دے گا۔

رنجیت سنگھ حکومتی معاملات میں بے حد ذہین تھا۔ اس نے سوچا کہ چیت سنگھ پر اگر اس کی جان بخشی کر کے آج احسان کر دے تو وہ تمام عمر اس کے زیر نگین رہے گا اور اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جونہی اسے چیت سنگھ کی تجویز ملی، اس نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنے دشمن کو معاف کرنے کا اعلان کر دیا بلکہ اس کے لیے تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔

اس طرح 7 جولائی 1799ء کو لاہور قلعے کے دروازے اس اٹھارہ سالہ فاتح پر کھول دیے گئے۔ رنجیت سنگھ قلعے میں داخل ہوا تو اسے توپوں سے سلامی دی گئی۔

دہلی اور آگرہ مغلوں کے دارالسلطنت تھے لیکن لاہور کی ایک اپنی منفرد اور الگ حیثیت تھی۔ ان شہروں کے بعد لاہور سلطنت کا مرکزی شہر تھا۔ لاہور دارالحکومت اور شمال مغربی سرحدی علاقے کے درمیان واقع تھا۔ سکھوں کے نزدیک لاہور امرتسر کے بعد دوسرا مقدس شہر تھا کیونکہ یہ امرتسر کی بنیاد رکھنے والے ان کے چوتھے گرو رام داس کی جائے پیدائش تھا۔ اس بنا پر رنجیت سنگھ اب لاہور کا حکمران بنتے ہی شمالی پنجاب کا سب سے طاقتور سردار بن گیا تھا۔

رنجیت سنگھ لاہور کے تخت پر کیا بیٹھا، سکھ مثل داروں کا پوشیدہ حساب کھلی نفرت میں بدل گیا۔ شاہ زمان کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر افغانوں کا مقابلہ کرنے والے سابقہ حلیف بھی اب اس کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔ انہوں نے لاہور سے نہایت ذلت کے ساتھ بے دخل کیے جانے والے بھنگی سرداروں کے ساتھ اتحاد بنا لیا۔ نظام الدین خاں بھی جو اپنے آپ کو لاہور کا صوبیدار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ رنجیت سنگھ کے سارے دشمن امرتسر میں اکٹھے ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اکٹھے ہو کر امرتسر میں ایک منصوبہ بنایا کہ کسی طرح رنجیت سنگھ کو لاہور سے بے دخل کر کے اپنی شکست کا بدلہ لیں۔ چنانچہ 1800ء کے موسم بہار میں بھنگیوں کی متحدہ فوج نظام الدین خاں کی فوج کے ساتھ مل کر لاہور کی طرف بڑھنے لگی۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے دس میل باہر آ کر بھسین نامی بستی کے قریب ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ وقت اور حالات رنجیت سنگھ کے ساتھ تھے۔ شہر سے اسے ضروری رسد مسلسل مل رہی تھی۔ اس کے مخالفوں کے اتحاد میں صرف ایک قدر مشترک تھی اور وہ قدر رنجیت سنگھ کے ساتھ دشمنی اور اسے ہر حال میں شکست سے دوچار کرنے کا جذبہ تھا تاکہ لوگوں کو بتایا جا سکے کہ رنجیت سنگھ ہی اکیلا سورما نہیں ہے۔

ایک ایک سکھ سوا لاکھ پر بھاری ہے مگر ان کا سالار گلاب سنگھ حسن و شباب کا دلدادہ تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا، نشے اور ناچنے والیوں میں اپنا وقت گزارنے کو ترجیح دیتا تھا۔ ایک روز کثرت شراب نوشی سے اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ مر گیا۔ اس کی موت نے سکھوں کی اتحادی فوج کو بے حوصلہ کر دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ رنجیت سنگھ اپنی فوج کو لاہور واپس لے آیا۔

قسمت نے رنجیت سنگھ پر ایک اور مہربانی کی۔ حکومتی اخراجات پورے کرنے کے لیے وسائل اور دولت کی ضرورت تھی جو رنجیت سنگھ کے پاس بہت کم تھی کیونکہ اس نے اپنی تمام تر توجہ تو جنگی منصوبوں پر لگائی ہوئی تھی۔ ان وسائل کو پورا کرنے کے لیے اس نے سوچا کہ شہر کے ساہوکاروں سے قرض لے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شہر کی فصیل کے باہر واقع ''بدھو دا آوا'' نامی کھنڈرات سے سونے کی بیس ہزار مہریں دریافت ہو گئیں۔ دشمن کے بھاگ جانے اور خزانے کے اچانک مل جانے سے لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اب رنجیت سنگھ ہی لاہور کا حقیقی حکمران ہے اور وہ پنجاب پر اپنی حکومت قائم کر لے گا۔ اس کی پختہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے سارے ملک سے نوجوان سکر چاکریہ کے دربار کا رخ کرنے لگے۔ سرداروں کے بیٹے اس کی فوج میں شامل ہونے، عالم اور طبیب اس کی ملازمت حاصل کرنے، دستکار اور ہنرمند شاہی سرپرستی حاصل کرنے...... نیز بے شمار کنیزیں بھی اس کا قرب حاصل کرنے کو پہنچ گئیں۔ رنجیت سنگھ قلعے میں رہنے لگا اور باقاعدگی کے ساتھ اپنا دربار لگانے لگا تھا۔ افغانوں کے سالار شاہ زمان نے بھی اس کے لیے صلح کے پیغام کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جسے رنجیت سنگھ نے کمال مہربانی سے قبولیت کا درجہ دے کر اسے جوابی تحائف میں اس توپ کے ٹکڑے بھی روانہ کیے جسے شاہ زمان فرار ہوتے وقت پنجاب کے ایک دریا میں کھو بیٹھا تھا۔

لاہور پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ کا اگلا منصوبہ پورے پنجاب کا حکمران بننے کا تھا۔ ویسے بھی اب اس کے دشمن بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ اس نے جموں کے راجے کے خلاف اقدام اٹھانے کا سوچا تو جموں کے راجا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے بغیر لڑے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اسے ایک ہاتھی کے ساتھ بیس ہزار روپے نذرانہ پیش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گجرات کے سردار صاحب سنگھ بھنگی کے خلاف قدم اٹھایا جس نے اکال گڑھ کے سردار کے ساتھ مل کر گوجرانوالہ پر حملے کی سازش کی تھی۔ صاحب سنگھ بیدی وہی انسان تھا جس نے تین سال پہلے سکھوں کو افغانوں سے لڑنے پر متحد کیا تھا۔ اسے جب پتا چلا کہ بھنگیوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان چپقلش جاری ہے تو وہ فوراً گجرات پہنچا اور گرو کے نام پر دونوں فریقوں کو حکم دیا کہ اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دیں۔ سردار اس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ وہ صاحب سنگھ بیدی کو بابا صاحب کا رتبہ دیتے تھے۔ انہوں نے اس کے احترام میں اپنی تلواریں زمین پر رکھ دیں۔

سوہن لال اس منظر کو یوں بیان کرتا ہے۔

”رنجیت سنگھ نے تلوار اپنی کمر سے کھولی اور بابا صاحب سنگھ کے سامنے زمین پر رکھ دی۔ تمام سرداروں نے ایسا ہی کیا۔ تلواریں ایک گھنٹے تک زمین پر پڑی رہیں۔ اس کے بعد بابا صاحب سنگھ نے رنجیت سنگھ کی تلوار اس کی کمر سے باندھ دی اور دعا دی کہ اس کے سارے دشمن جلد ہی نیست و نابود ہو جائیں گے اور پورے ملک پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔“

چھوٹے موٹے جھگڑے نمٹاتے ہوئے اب رنجیت سنگھ پنجاب کا قائد مانا جانے لگا تھا۔ تاہم وہ مہاراجا کا خطاب اپناتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس سے دوسرے سرداروں کو اس کے خلاف سازش کرنے کا موقع ملے جبکہ اسے یہ بھی علم تھا کہ ایک قانونی خطاب اپنانے کے... کتنے فوائد ہوتے ہیں۔ جب اس نے مہاراجا کا خطاب اپنایا تو عوام نے اس کے اقدام کو بہت سراہا۔

رنجیت سنگھ باقاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا۔

☆☆☆

اب رنجیت سنگھ باقاعدہ تاج پوشی کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ اس نے مسجدوں، مندروں اور گردواروں میں عبادات کروانے کا اعلان کیا۔ صاحب سنگھ بیدی نے رنجیت سنگھ کے ماتھے پر زعفران لگا کر اس کے پنجاب کے راجا ہونے کا اعلان کیا۔ اسے شاہی قلعے سے توپوں کی سلامی دی گئی۔ سہ پہر کے وقت نوجوان مہاراجا ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں نکلا تو خوشی سے سرشار عوام نے اس پر پھول اور چاندی کے سکے نچھاور کیے۔ رات کو شہر میں چراغاں کیا گیا اور آتش بازی کا زبردست مظاہرہ کیا گیا۔

رنجیت سنگھ کی یہ سیاسی بصیرت اور دانش مندی تھی کہ اس نے .... مغلوں کی طرح اپنے دربار کی نہ تو شان و شوکت بڑھائی اور نہ ہی خوشامدیوں کی باتوں میں آ کر خود کو مہاراجا بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شاہی تاج سر پر پہننے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ دہقانوں والی پگڑی کو ترجیح دی۔ اس نے علی الاعلان کہا۔

”میری تلوار ہی مجھے سب سے ممتاز بناتی ہے۔ مجھے اس کے علاوہ کسی نام و نمود کی ضرورت نہیں۔“

اس نے تخت پر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا اور پہلے کی طرح ایک معمولی سی کرسی پر پالتی مار کر بیٹھتا تھا یا پھر مشرقی روایت کے مطابق قالین پر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر ملاقاتیوں سے گفتگو کرتا تھا۔ اس نے نئے سکے ڈھالنے کا حکم دیا اور یہ حکم دیا کہ سکوں پر اس کا نام یا شبیہہ کے بجائے گرو نانک کی شبیہہ نقش کی جائے۔ اس سکے کو نانک شاہی کا نام دیا گیا۔ اب سدا کور ہر مہم اور ہر معاملے میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے کانگڑہ کا رخ کیا تو کانگڑہ کا سردار سنسار چند اپنا حوصلہ ہار بیٹھا۔ رنجیت سنگھ نے سنسار چند کی ریاست کے کچھ حصوں کو اپنی سلطنت میں ملا لیا اور نور پور، نوشہرہ کے علاوہ سجان پور کے قرب و جوار کا علاقہ سدا کور کو دے دیا۔ اسی زمانے میں وہ..... ملتان کے مظفر خاں کو شکست دے کر تاوان ادا کرنے کی شرط پر علاقہ مظفر خاں کے پاس چھوڑ کر واپس لاہور آ گیا۔

رنجیت سنگھ فتح مند ہو کر گھر واپس آیا تو فتح کی خوشی میں اس نے تین سالہ بیٹے کھڑک سنگھ کی منگنی کی تقریبات کا اعلان کیا۔ اس کی منگنی کنہیا مثل کے جیمل سنگھ کی شیرخوار بیٹی چاند کور سے کرنے کا ارادہ باندھا گیا۔ اسی کھڑک سنگھ کی منگنی پر موراں کو امرتسر سے بلوانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

☆☆☆

اہمیت تو موراں کی اسی روز ہو گئی تھی جب اسے رنجیت سنگھ کے دربار میں مجرے کا پیغام ملا تھا۔ پورے امرتسر کو پتا چل گیا تھا کہ موراں نام کی کنچنی اس شہر کے بازارِ حسن میں موجود ہے مگر جب کتنے دنوں تک دربار کی طرف سے اگلا سندیس نہیں ملا تو چہ میگوئیاں اپنی موت آپ مر گئیں۔ باتیں وقت کی گرد تلے بیٹھ گئیں لیکن پھر اچانک ایک روز ایک سجی سجائی پالکی اس کے گھر کے دروازے پر آ کر رکی جس کے ساتھ چند حفاظتی سپاہی بھی موجود تھے۔ بازارِ حسن میں ایک بار پھر کھلبلی سی مچ گئی۔ ہر کوئی اس ٹوہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں تھا کہ وہ کون ہے جس کو لینے کے لیے یہ پالکی اور محافظ آئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے دروازے سے منہ نکالے سن گن لینے کے چکر میں تھا۔ باتیں ایک بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی تھیں۔

''پتا چلا ہے موراں کو مہاراجا کے دربار میں لے جانے محافظ آئے ہیں۔'' ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے ایک چہرے نے آواز نکالی۔

''جب کچھ روز پہلے پیغام ملا تھا میں نے تو اسی روز کہہ ڈالا تھا کہ موراں بہت بھاگوں والی ہے۔'' ایک اور آواز ابھری پھر تو جیسے اس کنجی کی برداشت سے یہ سب باہر ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور اس میں سے گردن نکال کر سپاہی کو آواز دی۔

''اے دروغے۔''

داروغہ نے آواز کی سمت کا تعین کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو جیسے قریب ہی سے بڑی مترنم ہنسی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔

''ارے ادھر ادھر کیا کنکوے اڑا رہے ہو۔ میں ادھر ہوں۔''

داروغہ نے دوبارہ آواز کی جانب دیکھا۔

''یہ سب کیا ہے۔'' ایک گورے سے بازو نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر اشارتاً پوچھا۔

''دیکھتی نہیں ہے، موراں کا بلاوا آیا ہے مہاراجا کے دربار سے!'' داروغہ نے نخوت سے کہا۔

''ارے واری جاؤں۔ کبھی یہ بلاوا ہمارا بھی آ جائے تو جیون سپھل ہو جائے۔'' وہ دوبارہ بولی۔

''آ جائے گا۔ بہت جلد آ جائے گا۔'' داروغہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے سچ۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ تو پھر میں بھی آس لگا رکھوں؟'' وہ ایک بار پھر سے گویا ہوئی۔

''ہاں ہاں۔ ذرا عزرائیل کو فارغ ہونے دو۔ بلاوا خود بخود آ جائے گا۔'' داروغہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا تو ٹھک سے دروازہ بند ہو گیا۔

''بڑی آئی بلاوا لینے والی۔ سرکار دربار سے بلاوا ایسے آ جاتا ہے جیسے یہ پتریا سمجھتی ہے۔'' داروغہ نے دوسرے ساتھی سے کہا۔

ابھی ان کی باتیں جاری ہی تھیں کہ موراں حویلی سے باہر آ گئی۔ یوں جیسے پری آسمانوں سے اتر آئی ہو۔ کوئی حور راستہ بھول گئی ہو۔

''کہاں جانا ہوگا۔'' آواز کی گھنٹیاں بجیں۔

''لاہور۔ مہاراجا کے تین سالہ بیٹے کھڑک سنگھ کی منگنی ہے۔ اس کی تقریبات میں شمولیت کرنا ہے۔'' ایک سپاہی نے جواب دیا۔

''پھر یہ پالکی کیوں؟'' موراں نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ اس میں تشریف رکھیں گی تو کہار آپ کو لے چلیں گے۔'' ایک دوسرے سپاہی نے موراں کی حیثیت بڑھاتے ہوئے کہا۔

''موراں اپنے پاؤں چل سکتی ہے۔'' موراں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لاہور دور ہے۔'' وہی سپاہی دوبارہ بولا۔

''بیٹھ جا میری بیٹی۔ بسم اللہ کر کے دایاں پاؤں رکھنا پہلے کہ برکت ہوتی ہے۔'' خانم نے موراں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ موراں نے خانم کی نصیحت کے مطابق پہلے دایاں پاؤں پالکی میں رکھا۔ جب وہ بیٹھ رہی تو کہاروں نے پالکی اٹھالی۔ دیکھنے والیوں کی نظریں ابھی تک اس کی ایک ایک حرکت کا تعاقب کر رہی تھیں۔

شام ڈھلنے سے پہلے پہلے ان کا چھوٹا سا قافلہ لاہور پہنچ گیا تھا۔ لاہور کی عمارتیں ننھے کھڑک سنگھ کی منگنی کی خوشی میں جگمگا رہی تھیں۔ لاہور شہر کو بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ موراں کی پالکی اس وقت کے گاؤں مکھن پورہ کے میدان میں اتاری گئی تھی۔ اس پورے میدان کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ایک بڑا سا پنڈال چھوڑ کر اردگرد چھولداریوں کے کمرے بنائے گئے تھے جن میں اردگرد کے علاقوں اور ریاستوں کے آئے ہوئے راجے اور سردار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

موراں کے لیے بھی ایک ایسی ہی چھولداری کا کمرا بنایا گیا تھا جسے کم خواب اور بہترین کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ جھلملاتے خوب صورت اور مہین پردے لہرا رہے تھے۔ موراں کو اس کے کمرے کے سامنے اتارا گیا تو وہ میدان کی سجاوٹ اور اس کی حسن ترتیب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''کیا دربار میں نہیں اتارو گے؟'' موراں نے پالکی سے باہر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہیں کا حکم ملا تھا۔ تقریبات کا سارا انتظام ادھر ہی کیا گیا ہے۔ تمام امراء سردار اور روٴسا ادھر ہی ٹھہرے ہیں۔ آپ کا جلسہ بھی اسی پنڈال میں ہوگا۔'' انتظامیہ کے ایک شخص نے بتایا۔

''واہ ری موراں۔ دل میں کیا کیا امیدیں لگا کر آئی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھی اور کہاں آ کے اتاری گئی۔ دل میں تو تھا کہ محل کی روشنیں اور رراہداریاں دیکھنا نصیب ہوں گی مگر ملا کیا...... ایک چٹیل میدان۔" موراں نے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا۔ محل اپنے نصیبوں میں کر کے نہ چھوڑا تو موراں نام نہیں۔" ایک دوسری سوچ نے اس کے ارادوں کو مہمیز دی۔
"او ہو۔ چل ری موراں۔ جو ہو، دیکھا جائے گا۔"
اس نے اپنے ساتھ لائے ملبوسات اور بجنے سنورنے کا دوسرا سامان اپنے بنائے کمرے کی ایک جانب رکھتے ہوئے آہ بھری۔ اس کے ساتھی طبلچیے اور سارنگی نوازوں کے لیے ایک ایسا ہی الگ سا کمرا بنایا گیا تھا۔ موراں اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ رات کے پچھلے پہر جب ساری نجی مصروفیات ختم ہوئیں تو ایک بانکی چھیل چھبیلی سی باندی اس کے کمرے میں آئی۔ موراں نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ کسی انگریزی گڑیا کی طرح سجی بنی ہوئی تھی۔
"مہاراجا نے یاد فرمایا ہے۔"
موراں جو پہلے سے ہی تیار بیٹھی، مہاراجے کے حکم کی منتظر تھی، جلدی سے اٹھی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ "یہ کمرا اسی طرح کھلا رہے گا، اس کے اندر میرا سامان پڑا ہے۔" موراں نے نکلتے ہوئے سوال کیا۔
"یہ رنجیت سنگھ کا شہر ہے۔ پنجاب کے شیر کا گھر ہے۔ یہاں پاکٹ ماروں اور اٹھائی گیروں اور چوروں کا کیا کام۔" لڑکی نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔
پنڈال کے اردگرد حیثیت کے مطابق کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے اور پورا پنڈال بھرا ہوا تھا۔ اس کے سازندے پہلے سے ہی وہاں موجود تھے، سامنے ایک عام سی کرسی پر پالتی مارے دہقانوں کی سی پگڑی باندھے جس پر موتیوں کی جھالر لگی ہوئی تھی اور پگڑی کے اوپر مور پنکھ لگا ہوا تھا...... اس کی ایک آنکھ موندی ہوئی اور بڑی مونچھوں کے تلے لمبی ہوا میں جھولتی ہوئی ڈاڑھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ ایک مریل سا چوہا لگتا تھا۔ قمقموں کی روشنی میں اس کے چہرے پر چیچک کے داغ واضح ہو رہے تھے۔
موراں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے گئی اور جا کر حسب روایت فرشی سلام کیا تو بوڑھے چوہے کی خاکستری ڈاڑھی نے بھی جھولتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔
"باندی کا سلام قبول کیجیے۔" موراں نے دل کھینچنے والی ادا سے کہا۔
"تو گویا تم موراں ہو۔ لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔" رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
موراں ایک کنچنی تھی۔ امرتسر جیسے پھیلتے شہر کی جہاندیدہ طوائف۔ جو بندے کو دیکھتے ہی اس کی نیت جان جاتی تھی۔ وہ بھی چھوٹی سی ہنسی ہنس دی۔
"چلو پھر آج ہم بھی نظارہ کرتے ہیں کہ مورا اپنی مستی میں کس طرح ناچتا ہے۔" رنجیت سنگھ نے رکتے رکتے کہا۔
"زہے نصیب۔" موراں نے ایک بار پھر اسے فرشی سلام کیا اور پھر ناچ کے لیے اس کے قدم تھرکنے لگے۔

☆☆☆

"چاند پھر کب ہمارے آنگن میں اترے گا؟" رنجیت سنگھ نے تقریب کے آخری روز موراں کو انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔
"مہاراج اس چاند کو زوال نہیں ہے۔ یہ چاہے انتیسویں کا بھی ہو، اسی طرح جگمگاتا اور چمکتا ہے جیسے پورے دنوں کا ہو کر روشنی بکھیرتا ہے۔" موراں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"خوب ہے۔ رنجیت سنگھ کو کہتے ہیں دو ہی چیزیں پسند ہیں۔ ایک اتھری گھوڑی اور...... دوسری اتھری رن (عورت) مجھے تمہارا جواب پسند آیا ہے۔" رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ میرا حسن ظن ہے یا کچھ اور لگتا ہے، چاند کی روشنی اور چکاچوند چٹیل میدان اور کھلی جگہ زیادہ چاندنی بکھیرتی ہے۔" رنجیت سنگھ نے پوچھا۔
"یہ چاند اپنے محل میں اتار کر دیکھیے۔ آپ کے محل کی روشوں اور رراہداریوں کو بھی ایسے ہی اجال دے گا۔" موراں نے ترت جواب دیا۔
"ہوں۔" رنجیت سنگھ نے بات ایسے ختم کی جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہو اور موراں کو بھاری انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔ رنجیت سنگھ اگرچہ ان عیاشیوں میں پوری طرح ڈوبا ہوا تھا مگر وہ سلطنت کے کاموں سے بھی نظریں نہ چراتا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا لیکن کسی چیز کا حساب کتاب رکھنا پڑتا تو وہ نرم لکڑی (چوب) پر اتنے ہی نشان ڈالتا جاتا تھا۔ وہ انگریزوں کا پکا دوست تھا۔ دانا اور زبردست حاکم بھی تھا جو اپنے افسروں اور اہلکاروں کو اچھی طرح قابو میں رکھتا تھا۔ رعایا بھی اس سے بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے پاس بہت سی توپیں اور لشکر جرار جمع کر رکھا تھا جس کو فرانسیسی فوجی افسروں نے سدھایا تھا اور فن حرب میں یکتا بنا دیا تھا۔ اس نے پنجاب میں ایک بڑی زبردست

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سلطنت بنالی تھی اور شیرِ پنجاب کہلانے لگا تھا۔

انسانی سرشت ہمیشہ سے تضادات کا شکار رہی ہے۔ اگر ایک طرف رنجیت سنگھ بہترین حاکم اور ہر دلعزیز حکمران تھا تو دوسری طرف اس کی شخصیت میں بے پناہ خامیاں بھی موجود تھیں۔ رنجیت سنگھ کے لاہور کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے پنجاب ایک ایسے خطے کا نام تھا جس کی حدود اور سرحدوں کا تعین نہیں ہو سکا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ نے جب اس کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے پنجاب کی سرزمین کو متحد کیا اسے مضبوط بنایا اور اس کے دفاع کے لیے ایک جدید طرز کی فوج قائم کی اور پورے علاقے میں عدل و انصاف کی بنیادیں استوار کیں مگر بعض تاریخ نگار اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق رنجیت سنگھ عیش دوست، حسن پرست تھا۔ اس کے دور میں استعمال کی چیزوں اور عیاشی کے سامان کی قیمتوں میں کوئی فرق نہ رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایندھن، اناج، سبزیوں تک پر محصول طلب کیا جاتا تھا۔ اس کی سلطنت میں جگہ جگہ کسٹم ہاؤس بنائے گئے تھے جہاں بیوپاریوں کے ساتھ بڑا برا سلوک کیا جاتا تھا ہر چیز پر کئی کئی بار چنگی دینی پڑتی تھی۔ پہلی بار خریداری پر، دوسری بار دکان کے اوپر جا کے بیچنے پر، تیسری بار دکاندار خود اس چیز پر محصول وصول کرتا۔ یہاں تک کہ رنجیت سنگھ کے دور میں کپڑا بنانے والے جولاہوں پر بھی ٹیکس لگا رکھا تھا۔ یہ ٹیکس دو روپے فی کھڈی اور ایک روپیہ فی تانا بانانے پر لاگو کیا گیا تھا مگر رنجیت سنگھ ان تمام باتوں سے چشم پوش ہو کر اپنی عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے جب بھی امورِ سلطنت کی دشواریوں سے ذرا فراغت ملتی، وہ اپنی عیاشیوں میں کمی نہ آنے دیتا۔ اس کے دور میں عیش پرستی زوروں پر تھی۔ وہ اپنے اردگرد خوب صورت مردوں اور عورتوں کو دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اربابِ نشاط کا ایک بڑا طائفہ یا عملہ اس کا دائمی ملازم تھا اور ایک بہت بڑی رقم ماہوار اس عملے پر مہاراجا صرف کرتا تھا۔ مہاراجا کنچنیوں اور ان ملازم عورتوں کو جنگی لباس پہناتا۔ ڈھال، تلوار اور تیر کمان سے انہیں آراستہ کرتا اور اس پر اپنی تسکین کی خاطر انہیں آپس میں لڑنے کا حکم دیتا۔ جب وہ لڑتیں تو ان کی حرکات و سکنات دیکھ کر تالیاں بجاتا اور خوش ہوتا۔ جب یہ عورتیں اس طرح سپاہیوں کا لباس پہنتیں تو انہیں مہاراجا کا باڈی گارڈ رکھا جاتا۔ مغل شہنشاہ اکبر... اور بہادر شاہ نے دہلی میں اپنے برائے نام دور میں خوب صورت اور نوجوان لڑکوں کی ایک اسی طرح کی پلٹن ''بچھیرا پلٹن'' رکھی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ عورتوں کو مردانہ لباس پہنایا اور سپاہی بنایا۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے باڈی گارڈ سپاہی مجھے تنگ کرتے ہیں۔ وہ لڑائی میں تو لڑنے کے لیے نکلتے نہیں لیکن ان کی آپس کی لڑائیاں میرا ناک میں دم کر دیتی ہیں۔ سارے پنجاب کا میں نے بندوبست کیا۔ اسے اپنی مرضی اور عوام کی فلاح کے قابل بنا دیا لیکن باڈی گارڈ کا مجھ سے بندوبست نہ ہو سکا۔ میری ساری تدبیریں ان کی شرارتوں کے آگے عاجز آ گئیں اور دوسرے باڈی گارڈ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ اس لیے بھی میں نے انہیں اپنے ہمراہ نہیں رکھا بلکہ ان کی جگہ عورتیں باڈی گارڈ ہوں تو مہاراجوں کی شان و شوکت بڑھتی ہے اور دوسرا ان سے کسی قسم کا جان کو خطرہ نہیں رہتا۔

اسی طرح جب ناچ گانے..... کا جلسہ گرم ہوتا تو رنجیت سنگھ بڑے شوق سے ان خوب صورت پتریوں کو اپنے ہاتھوں سے شراب کے جام بنا بنا کر متواتر دیتا تھا۔ ایک کا جام ختم ہوتا تو دوسرا جام اس کے آگے پیش کر کے وہ بہت خوش ہوتا۔ خود بھی شراب پیتا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر تیز شراب پینے کا عادی تھا کہ انگریز بھی وہ شراب نہ پی سکتے تھے۔ ولایتی شراب ہو اور کنچنیاں ہوں جو اپنے کوٹھوں پر دیسی شراب ہی پی سکتی تھیں اور ولایتی نت نئی شراب پینے کے صرف خواب ہی دیکھتی تھیں، وہ مہاراجا کی ایسی محفل میں جی جان سے شریک ہو کر اس قدر شراب پیتیں کہ صراحیاں چھوڑ کر مٹکوں تک کو خالی کر دیتیں پھر جب نشہ زور کرتا تو آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتیں۔ ایک کا ہاتھ ہوتا تو دوسری کی چوٹی۔ کھینچا تانی میں ایک دوسرے کے خوب کپڑے پھٹتے۔ غرض کہ ایک طرح کی مکروہات ہوتیں۔ مہاراجا ان کی حرکات سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا، قہقہے لگاتا، تالیاں بجاتا بلکہ انہیں اور لڑنے پر اکساتا۔ ان کی خوب کشتیاں کرواتا۔ خوب دست و گریبان کرواتا اور ان پر روپیوں کی بوچھاڑ کر دیتا جو کپڑے رات کو پھٹتے دن کو ان سے بہتر اور ہر قسم کے نفیس کپڑے ان بہادروں کو مل جاتے۔ رنجیت سنگھ کے یہ چونچلے خوب صورت اور جوان عورتوں کے لیے تھے تو اس کے علاوہ اس کا دوسرا شوق خوب صورت اور اتھرے گھوڑوں کا تھا۔ وہ صرف ایک گھوڑا حاصل کرنے کے لیے قتل و غارت بھی کر سکتا تھا۔ رڈیارڈ کپلنگ نے رنجیت سنگھ کی انہی حرکات کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''چار چیزیں ہر چیز پر غالب ہیں۔ عورت، گھوڑا، اقتدار اور جنگ۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موراں جب تحائف کے ساتھ بھاری انعام واکرام لے کر امرتسر پہنچی تو اس کا پتریوں نے والہانہ استقبال کیا۔ خانم تو اس کے آگے پیچھے بچھی بچھی جاتی تھی اور بار بار اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ اس کی ساتھی کنچنیاں اس کے اردگرد جمع تھیں اور بازارِ حسن کی وہ طوائفیں جن کا موراں سے رابطہ اور صاحب سلام تھی وہ بھی آ آ کر اسے مبارکباد دے رہی تھیں، جب ذرا فرصت ہوئی تو مشتری اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''کیسا رہا تیرا جلسہ..... مہاراجا سے کوئی بات ہوئی؟'' مشتری نے لگاؤ سے پوچھا۔

''اری مشتری! بس کیا بتاؤں۔ اتنا شاندار تھا جلسہ اور مہاراجا کا کیا پوچھتی ہو۔ وہ تو بس مجھ پر لٹو ہوا جا رہا تھا۔ سرداروں اور مہاراجوں کا کیا پوچھتی ہو، نوٹوں کی بارش... برسا دی تھی۔ اس طرح کہ زمین کا منہ بھی اس میں چھپ گیا۔ ہر کوئی تمہاری بہن کے حسن کی تعریف کرتے مرا جا رہا تھا۔'' موراں نے الفاظ کو خوب سجا سنوار کر بیان کیا اور اس کے اشتیاق کو اور ہوا دی۔

''اب کب جاؤ گی؟'' مشتری نے دوبارہ پوچھا۔

''بہت جلد وہ پھر بلا بھیجیں گے۔''

''کوئی ایسا بندوبست نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تمہاری سنگت میں لاہور دیکھ آؤں۔ بجی بڑا دل کرتا ہے۔'' مشتری کی خواہش ڈرتے ڈرتے بھی زبان پر آ ہی گئی۔

''ارے ذرا میرے پاؤں تو جمنے دو۔'' موراں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا کچھ ملا مہاراجا سے؟'' مشتری کا اشتیاق گویا باقی تھا۔

''اتنا کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' موراں نے بتایا۔

''میں نے تو خانم سے بھی کہا تھا کہ اب موراں کے بعد وہ بھی میرے لیے کچھ کرے۔ اس نے ذمے داری بھی لی ہے مگر موراں مجھے پتا ہے۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر پائے گی۔ حالانکہ وہ تمہیں شاہی دربار میں پہنچانے کا سارا صلہ اپنے کھاتے میں ڈال رہی ہے۔'' مشتری نے بتایا تو موراں اک دم بھڑک اٹھی۔

''اس بوڑھی کھوسٹ نے میرے لیے کیا کرنا تھا۔ یہ تو میری شہرت تھی جو خوشبو کی طرح امرتسر سے نکلی اور لاہور تک پہنچ گئی۔ اس میں خانم کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، یقین کرو۔ وہ سب جھوٹ کہتی ہے۔'' موراں نے غصے میں بتایا۔

''لگتا مجھے بھی یہی تھا مگر میں خاموش رہی۔'' مشتری

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ مارچ 2018ء کی جھلکیاں

میاں میر علیہ الرحمۃ
ڈاکٹر ساجد امجد کی لاجواب تحریر
ایک پیر کامل کی زندگی کے واقعات

تلاش
زویا اعجاز کے شرربار قلم کا شہکار
ایک بڑی شاعرہ کی حالاتِ زندگی

بلبلِ بنگال
انور فرہاد کی ایک دلچسپ تحریر،
پاکستان کی مشہور گلوکارہ کا احوال

مزار بیکسی
اس شاعر کا تذکرہ جو والی ہند تھا مگر اسے بے بسی کی موت ملی

پچھتاوا
نضہ خان کی ایک ایسی
سچ بیانی جو برسوں یاد رہے گی

اس کے علاوہ
''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال کا ایک دلچسپ سفرنامہ۔ ''ناسور'' ایک لھورنگ آپ بیتی اور بھی بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیانیاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم بھی یہیں ہو میں بھی ادھر ہی ہوں، پتا چل جائے گا کہ وہ تمہارے لیے کیا کارنامہ سرانجام دیتی ہے۔'' موراں نے اسی انداز میں کہا تو مشتری اداس سی ہنسی ہنس کر بولی۔

''مجھے پورا یقین ہے وہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ بازارِ حسن میں آنے والے سپاہیوں اور داروغہ صاحبان سے واقفیت ہمارے بازار تک ہی محدود ہوتی ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک ہم ان کی مٹھی گرم کرتی رہیں۔ اب اگر ہم یہ کہیں اور دعویٰ کریں کہ ہم پورے پنجاب کے صوبیداروں اور فوج کے افسروں سے کام نکلوا سکتے ہیں، جھوٹ ہی تو ہے۔ مجھے علم ہے، خانم ایسی ہانکا کرتی رہتی ہے۔'' مشتری نے اداسی سے کہا۔

''بہرحال تم رنجیدہ مت ہونا۔ مجھے ذرا مہاراجا کی قربت حاصل کر لینے دو، میں تمہیں بھی وہاں تک لے جاؤں گی۔ بس تم صرف دعا کرتی رہو۔'' موراں نے جواب دیا تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

بسنت کی تیاریاں اس وقت پورے ہندوستان میں بڑے زوروں پر تھیں۔ رنگ برنگ کی پتنگیں اور کنکوے بنانے کی اور ڈوریں لگوانے، انہیں خریدنے میں لڑکے بالے پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں، عورتیں اور بوڑھیاں بسنتی رنگ کے ملبوسات تیار کر چکی تھیں۔ امرتسر میں بھی لوگ اس روز کو منانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے مگر سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ اگر بسنت کا میلا دیکھنا ہو تو لاہور میں دیکھنا چاہیے۔

لاہور کے شہری شروع دن سے ہی ایسے میلے ٹھیلے منانے میں مشہور تھے۔ یہاں کے لوگ پورے جذبے اور پوری دل جمعی سے ایسے دن تیوہار منانے میں اپنی مثال آپ تھے۔

اس بار بھی لاہور کے شہریوں نے بسنت منانے میں اپنا پورا جوش جذبہ لگا رکھا تھا۔ شالیمار باغ میں باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں میلے کا انتظام کیا جاتا تھا جس میں حکومتی اہلکاروں کے ساتھ ساتھ بھنگڑے، ناچ اور عیش و طرب کا پورا سامان موجود ہوتا تھا۔ نوجوان لڑکے ڈھول تاشے بجا کر پتنگوں کے پیچ لڑاتے ہلا گلا کرتے۔ اندر بنائی گئی دکانوں پر کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ لڑکیاں جھولے جھولتیں اور بسنت سے متعلقہ گیت گاتی پھرتی تھیں اور ایک جگہ حکومتی سرپرستی میں باقاعدہ ناچ گانے کا انتظام کیا جاتا تھا جس میں لاہور کے حکومتی اہلکار، افسران، فوجی سپاہی اور راجے مہاراجے شریک ہوتے تھے۔

اس بار بھی اسی باغ میں ناچ گانے کا ایک وسیع پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں رنجیت سنگھ بہ نفسِ نفیس شرکت کر رہا تھا اور اس نے ملک بھر سے طوائفوں کو اس میلے میں شرکت کی دعوت دے رکھی تھی۔ امرتسر کے بازارِ حسن کی مشہور طوائفوں کو بھی بسنت میلے میں شرکت کے لیے باقاعدہ دعوت نامے بھجوائے گئے تھے۔ ان میں موراں کو خصوصی طور پر بلوایا گیا تھا۔

موراں بے حد خوش تھی کہ بہت جلد اسے دوبارہ مہاراجا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں مہاراجا کی پہلی ملاقات میں ہونے والی تمام خوشگوار یادیں اور باتیں دوبارہ سے جاگنے لگی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے۔ اس بار اسے از خود لاہور شالیمار باغ میں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ رنجیت سنگھ کے حاکم لاہور ہونے سے شالیمار باغ اس کا پسندیدہ تفریحی مقام بن گیا تھا۔ حکومتی اہلکاروں کے علاوہ یہاں دوسری ممتاز شخصیتیں بھی سیر و تفریح کے لیے آیا کرتی تھیں۔ رنجیت سنگھ تو اکثر جب لاہور شہر کی حبس زدہ فضا سے تنگ آ جاتا تو یہاں آ جاتا تھا اب تو بسنت میلا منانے کے لیے خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ ولایتی شرابوں کی صراحیاں منگوائی گئی تھیں۔ رات گئے جب موراں شالیمار باغ پہنچی تو اس وقت باغ میں میلے کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ ملک کی اطراف و اکناف سے ناچنے گانے والیاں یہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ رنجیت سنگھ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ان کے گانوں اور ناچ سے محظوظ ہو رہا تھا اور کبھی جب انتہائی موڈ میں ہوتا تو تالیاں بجا کر ان کو داد دینے کے ساتھ شراب کا جام بنا کر دیتا۔ گویا یہ اس بات کی نشانی سمجھا جاتا تھا کہ مہاراجا کو اس کا ناچ گانا بہت پسند آیا ہے۔

جب موراں شالیمار باغ میں پہنچی تو کسی باندی نے رنجیت سنگھ کو اس کی خبر دی۔ رنجیت سنگھ فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور راہداری تک موراں کا استقبال کرنے پہنچ گیا۔

''زہے نصیب۔ آج پھر دیدارِ یار ہو گیا۔'' موراں کو دیکھتے ہی وہ گویا ہوا۔

''مہاراج! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ اتنا نہ بنائیے کہ بندی اپنی اوقات ہی بھول جائے۔'' موراں نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ادا سے کہا۔

''یہ سچ ہے اور میرے دل کی آواز ہے۔'' رنجیت سنگھ دوبارہ بولا۔

''خوب صورتی، حسن، دل پذیر اور خوش شکل موراں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ سچ ہے اور کم ہے۔'' رنجیت سنگھ نے ہنستے ہوئے مزید کہا۔

''حضور کی ذرہ نوازی ہے ورنہ موراں کہاں اور مہاراج ذی وقار کہاں۔ کہاں آسمان اور کہاں زمین کی خاک۔'' موراں نے جواب دیا۔

''تو آیئے۔ قدم رنجہ فرمائیں لیکن ایک بات کی چلتے چلتے اور اجازت دے دیجیے کہ جب بھی بندے کی طبیعت چاہے وہ آپ کو طلب کر سکے۔'' رنجیت سنگھ نے اسی انداز میں دوبارہ کہا تو موراں جی جان سے خوش ہوگئی۔

''یہ میری خوش قسمتی اور بلند نصیبی ہوگی۔ آپ طلب فرمائیں اور بندی حاضر نہ ہو۔ اسے موت کیوں نہ آجائے۔ مرجائے ایسی موراں جو آپ کی حکم عدولی کرے۔'' موراں نے ادا سے جواب دیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے پنڈال میں پہنچ گئے۔ رنجیت سنگھ اپنی نشست پر دوبارہ جلوہ افروز ہوگیا۔ رات گئے تک ناچنے والیوں کے گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دیتی رہی۔ شرابیں چلتی رہیں۔ وہ پتا نہیں رات کو کونسا پہر تھا جب موراں کو ناچنے کی اجازت ملی۔

محفل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ موراں خراماں خراماں مورنی کی طرح چلتی ہوئی پنڈال میں پہنچی۔ اس نے حسب روایت پہلے مہاراجا کی خدمت میں سلام پیش کیا اور پھر ناچنا شروع کر دیا۔ ایک تو رت بدلنے کا موسم، بہار آنے کی سوندھی خوشبو۔ ہلکی ہلکی خنکی نے موسم کو اور بھی دو آتشہ کر ڈالا تھا۔ پھر اوپر سے مہاراجا کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کی خوشی میں موراں مستی میں آئے مور کی طرح ایسا جھوم کر ناچی کہ اسے خود اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ ادھر وہ ناچ رہی تھی اور ادھر رنجیت سنگھ اس پر سکوں کی بارش کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی بسنت میلے میں شرکت کرنے والے دوسرے مہمان بھی مہاراج کی خوشنودی حاصل کرنے اور توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے نوٹ اور سکے لٹانے میں ایک سے آگے نکلنے کی کوششوں میں تھے۔ جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی تھی، محفل کا حسن اور عروج بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا پھر نہ جانے کب موراں تھک کر نیچے گری۔ رنجیت سنگھ بے ساختہ اٹھا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ ایک والہانہ محبت کرنے والے کا اپنی محبوبہ کے لیے انمول تحفہ تھا!

☆☆☆

دھنوئی کلاں کا گاؤں پاکستان اور ہندوستان بارڈر سے تین میل واہگہ امرتسر کی طرف واقع ایک چھوٹی سی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہ امرتسر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً 35 کلومیٹر دور ہے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ اسی راستے سے گزر کر امرتسر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ دھنوئی کلاں میں عین بارڈر کے سرے پر مہاراجا نے اپنے ٹھہرنے کے لیے ایک بارہ دری بنوائی ہوئی تھی۔ وہ جب لاہور سے زمینی راستے کے ذریعے امرتسر جاتا تو کچھ دیر کے لیے اس بارہ دری میں ٹھہر کر آرام کرتا پھر آگے کی طرف روانہ ہوتا تھا۔

مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے ایک نہر دریائے راوی سے نکال کر شالیمار باغ تک پانی پہنچانے کو نکالی تھی جو دھنوئی کلاں اٹاری سے گزر کر باغ تک پہنچتی تھی۔ یہ نہر اتنی زیادہ گہری نہ تھی۔ اس کا مقصد صرف پانی...... شالیمار باغ اور تھوڑا بہت قریبی زمینداروں کی زمینوں تک پہنچانا تھا۔ نہر چونکہ بارڈر پر تھی اس لیے اس پر آنے جانے کے لیے کسی پل وغیرہ کا انتظام نہ تھا کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر سفر گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ لہٰذا امرتسر کو جانے والے گھوڑے نہر میں سے ہو کر گزر جاتے تھے۔

رنجیت سنگھ بھی جب لاہور سے کسی سلطنتی امور کے لیے یا پھر زیارت کے لیے امرتسر جاتا تو یہی نہر عبور کر کے جاتا تھا۔ موراں سے اب اس کے تعلقات محبت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ مکھن پورہ گاؤں کے قریب دربار مہاراجا رنجیت سنگھ میں ناچنے کے لیے بلائی جانے والی موراں اب رنجیت سنگھ کی سوچوں بلکہ اس کے خواب و خیال پر پورے طور پر قبضہ کر چکی تھی۔ یہ موراں کی ذہانت تھی۔ ادائیں، حاضر جوابی یا پھر وہ اتھرا پن تھا جس کا رنجیت سنگھ دیوانہ ہو چکا تھا۔ امرتسر کے بازار حسن سے روزانہ لاہور کے دربار میں مہاراجا سے ملنے کے لیے آنا یا مہاراجا کا لاہور سے امرتسر .... جا کر موراں سے ملنا جہاں دونوں کے لیے ناممکن تھا، وہاں یہ دونوں کی رسوائی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لہٰذا یہ رنجیت سنگھ کی تجویز تھی کہ جب وہ موراں کو بلائے گا، اس بارہ دری میں جو کہ اٹاری سے امرتسر کی جانب تقریباً 500 گز کے فاصلے پر ہے۔ اس کی دائیں جانب ایک سڑک ہے جو اٹال گڑھ کو جاتی ہے۔ اٹال گڑھ سے آگے موڈی گاؤں ہے جہاں جا کر نہر کے کنارے یہ سڑک ختم ہو جاتی ہے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موراں کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ بلاوے پر اس بارہ دری میں آجایا کرے۔

پھر یہی ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ جب بھی موراں کو بلاتا، وہ اس بارہ دری میں کس طرح پہنچتی تھی، اس بارے میں کسی تاریخ میں کچھ نہیں لکھا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ موراں رنجیت سنگھ کے بلانے پر سر کے بل چل کر وہاں پہنچ جاتی۔ پھر محبت کے دو دیوانے جی بھر کر راز و نیاز کرتے۔ موراں رنجیت سنگھ کے سامنے ناچا کرتی اور کچھ دیر گزار کر وہ واپس امرتسر پہنچ جاتی۔ اب وہ جہاں عوام کی نظروں سے دور ہو کر ملاقاتیں کرتے، وہاں حکومتی اہلکاروں کی نظروں سے بھی چھپ چھپ کر یہاں ملاقاتیں کرنے لگے تھے۔ موراں امرتسر سے آتی۔ اس نہر کو عبور کرتی۔ پانی کی روانی میں اپنے نازک اور سپید پاؤں دھو کر در محبوب پر حاضری دینے آجاتی اور رنجیت سنگھ کے سامنے مور کی طرح ناچتی۔ پیار محبت کی باتیں کرتی اور واپس چلی جاتی۔ اب دونوں کے راستے میں موسم کی سختیاں بھی حائل نہ ہوتی تھیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے موراں کو چاندی کے جوتے بنوا کر دیے ہوئے تھے جنہیں پہن کر وہ عموماً پیدل نہر میں اتر کر اسے عبور کرتی تھی۔

گرمیوں کی تیز اور چبھتی دھوپیں ختم ہو چکی تھیں۔ سردیوں کی آمد تھی اور ٹھنڈا موسم اتر آیا تھا۔ جب ایک روز موراں کو رنجیت سنگھ کا پیغام ملا اور وہ دھنوئی کلاں کی بارہ دری میں اس سے ملنے کے لیے امرتسر کے بازار حسن سے نکل کر نہر تک آپہنچی تھی۔ وہ حسب معمول نہر کے اندر اپنے چاندی کے جوتوں سمیت قدم رکھ چکی تھی کہ اچانک پانی کے ایک تیز ریلے نے اس کے ایک پاؤں سے جوتی کو نکالا اور بہا کر دور لے گیا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اس کے پاؤں کو بھی برف کر ڈالا۔ اس نے کچھ دیر تک جوتی کو ڈھونڈا مگر وہ اس کی پہنچ سے نکل کر دور چلی گئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک پاؤں میں جوتی اور دوسرا یخ پانی سے سرد پاؤں لے کر بارہ دری تک تو پہنچ گئی جہاں رنجیت سنگھ پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔

”کیا معاملہ ہوا۔ نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے اور یہ چہرے پر اس قدر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ اتنا انتظار تو پہلے کبھی نہیں کروایا تھا۔“ مہاراجا رنجیت سنگھ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ وہ ادھر آپ کی کم بخت نہر نے میرے ایک پاؤں کی جوتی کھالی جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میرے محبوب کا تحفہ تھا وہ۔ میں اسے ڈھونڈتی رہ گئی مگر وہ مجھے نہ مل سکی۔“ موراں نے اتراتے ہوئے جواب دیا۔

”بس اتنی سی بات تھی۔ ہم آپ کے لیے نیا جوتا بنوا دیں گے۔“ رنجیت سنگھ نے دلار سے جواب دیا۔

”بات یہ نہیں، مجھے فکر یہ ہو رہی ہے کہ میں اب واپس کس طرح جاؤں گی۔“ موراں بولی۔

”یہ انتظام بھی ہم کر دیں گے۔ آپ کی واپسی بھی ہماری ذمے داری ہے۔ ہم اپنے کسی خادم کو کہیں گے، وہ تمہیں امرتسر پہنچا دے گا۔“ رنجیت سنگھ نے محبت سے کہا۔ ”آج کیا میری مورنی مجھے اپنا ناچ نہیں دکھائے گی؟“ رنجیت سنگھ نے دوبارہ سے پوچھا۔

”اوں ہوں۔ نہر کے یخ پانی سے گزرتے ہوئے میرے پاؤں شل ہو چکے ہیں۔ بہت تکلیف میں ہوں۔ ایسے موسم اور اتنے ٹھنڈے پانی سے میں پوری زندگی نہ گزرتی اگر آپ کی محبت کی زنجیر میرے پاؤں میں نہ بندھی ہوتی۔ آج میں معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے سرکار کی طبیعت پر میرا یہ انکار گراں نہ گزرے گا۔“ موراں نے بڑے نخرے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ رنجیت سنگھ نے گہرے تفکر سے کہا اور پھر اپنے ایک گھڑ سوار خادم کو بلا کر حکم دیا۔ ”اسے امرتسر پہنچا دو۔ جہاں اس کا حکم ہو۔“

”ٹھیک ہے مہاراج......“ گھڑ سوار نے کہا اور موراں کو لے کر امرتسر روانہ ہو گیا۔ رنجیت سنگھ اسی وقت لاہور واپس آگیا۔ اس نے آتے ہی اس جفت ساز کو حکم دیا جس نے موراں کے لیے پہلے جوتا بنایا تھا کہ اسی سائز کے دوبارہ چاندی کے جوتے بنا دے اور دوسری طرف اس نے فوراً حکم دیا کہ دھنوئی کلاں کی نہر جس کا پانی شالیمار باغ کو زندگی بخشتا ہے، اس کے اوپر فوراً پل تعمیر کر دیا جائے تاکہ امرتسر سے لاہور اور لاہور سے پیدل امرتسر آنے جانے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو جائے۔

چنانچہ حکم کی تعمیل میں فوراً اس نہر پر پل تعمیر کر دیا گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو رنجیت سنگھ اور موراں کی ملاقاتوں کا تو علم ہو ہی چکا تھا مگر وہ خاموش اس لیے تھے کہ معاملہ لاہور کے مہاراجا رنجیت سنگھ کا تھا۔ پل کیا تعمیر ہوا، دونوں اطراف کے لوگوں کو ایک سہولت مل گئی۔

ان دنوں ناچنے والیوں کی اتنی قدر نہ رہی تھی۔ مغل دور میں جوانی کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی تہذیب اور تمدن اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ اقتدار کے ختم ہوتے ہی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اقدار نے بھی اپنا پانسا بدل لیا تھا۔ نئی زبانوں کے اشتراک سے ایک نئی زبان نے جنم لینا شروع کر دیا۔ پنجابی زبان کے الفاظ سفر کرتے ہوئے نئی زبان سے باہم گلے ملنے لگے تھے۔ بازارِ حسن میں تہذیب سکھانے والی طوائفوں نے اپنے بستر لپیٹ لیے تھے اور ان دنوں رقاصاؤں کی بھی اس قدر وقعت نہ رہی تھی۔ اب انہیں کنچنی یا پتریا نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ان کی تکذیب اور تضحیک کے لیے انہیں کنجری کہا جانے لگا تھا۔ جب موراں کی سہولت کے لیے اس پل کی تعمیر کی گئی تو اس پل کو کنجری کہا جانے لگا اور یہ نام اس قدر مشہور ہوا کہ بہت جلد زبان زدِ عام ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کی محبوبہ نے اس پل کو دیکھا اور پہلی بار اس سے اتر کر بارہ دری میں داخل ہوئی تو اس کو پہلی بار رنجیت سنگھ کی چاہت کا یقین ہوا۔ اس ملاقات میں اس نے پہلی بار اپنے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! ہم کب تک دنیا کی نظروں سے چھپ چھپ کر اس بارہ دری میں ملتے رہیں گے؟ کیا اب بھی آپ کو موراں کی محبت کا یقین نہیں آیا؟''

''یہ تم سے کس نے کہا؟ ہم نے تو پہلے دن ہی اپنا دل ہار دیا تھا۔'' رنجیت سنگھ نے آگے سے جواب دیا۔

''پھر اس قدر تشنگی کیوں؟'' وہ مزید بولی۔

''مہاراجے تو اپنی محبتوں کو فوراً اپنے محلوں میں ڈال لیتے ہیں۔'' موراں نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

''اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ دراصل محبت کی لذت ہی اس قدر شدید تھی، چاہت کا مزہ ہی اتنا زیادہ تھا کہ کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ ہم آج ہی تمہیں اپنے محل میں ڈالنے کو تیار ہیں۔'' پھر مہتاب کور اور راج کور (مائی نکین) کے بعد وہ تیسری عورت تھی جو مہاراجا رنجیت سنگھ نے اپنے محل میں داخل کر لی۔ موراں اپنے مذہب کو گلے لگائے مہاراجا رنجیت سنگھ کے محل میں تو آ پہنچی تھی مگر یہ اس کی عالی ظرفی تھی کہ اس نے کبھی موراں کو نہ تو مذہب تبدیل کرنے کو کہا اور نہ ہی اس کو دین پر عمل کرنے سے روکا۔ یہ 1802ء کی بات ہے، جب موراں رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی۔

☆☆☆

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے جب اس بات کو محسوس کیا کہ جب تک دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنا پیروکار نہیں بناؤں گا، میری سلطنت کا قیام نہ ہوگا تو اس نے دل میں ٹھان لیا کہ مذہب اور قومیت سے قطع نظر ہندوستان کی کل قومیتوں کو اور اس کے باشندوں کو اپنا کر ہی ملک میں استحکام اور ترقی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زیادہ تر ہندوؤں کی لڑکیوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا شروع کر دیا کیونکہ ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بھی زیادہ تھی۔ شہنشاہ اکبر کے اس عمل سے ایک مخلوط قسم کی قومیت نے جنم لیا جس میں ہر مذہب کے مردوں اور عورتوں کو یہ کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ کسی دوسری قوم کے مردوں اور عورتوں سے بلاتفریق رنگ و نسل شادی کر سکتے ہیں اور سردار و مہاراجوں سے ماورا عام لوگوں کو بھی اس امر کی کھلی اجازت معاشرے نے خود ہی دے دی۔ یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا جو دن بدن آگے بڑھتا رہا۔ سکھوں کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اس لیے جب موراں کو رنجیت سنگھ نے اپنے حرم میں داخل کیا تو اس کے مذہب پر کوئی پابندی نہ لگائی اور نہ ہی اسے اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حرم میں داخل ہونے کے باوجود موراں کے لیے رنجیت سنگھ کے پیار میں کمی نہ آئی۔

انہی دنوں ایک روز موراں اور رنجیت سنگھ محل میں اپنے کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے مذاق کر رہے تھے کہ اچانک موراں کو نہ جانے کیا سوجھی، وہ بڑے پیار سے بولی۔

''مہاراج! ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ کی طبیعت پر گراں نہ گزرے تو؟''

''پہلے ہم نے آپ کی کسی بات کا برا منایا ہے اور پھر یہ کونسی اہم بات ہے جس کی پیشگی اجازت مانگی جا رہی ہے؟'' ....رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے خاموش ہو رہا کچھ توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

''کہو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟''

''مہاراج! بات بڑی اور منہ چھوٹا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ ناراض ہو جائیں گے۔'' موراں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''وعدہ جو کیا ہے۔ نہیں دل کو لگائیں گے۔ آپ کچھ پوچھو تو سہی۔'' رنجیت سنگھ نے بھی اسی انداز میں اصرار کیا۔

''حضور یہ بتائیں کہ جب خدا خوب صورتی بانٹ رہا تھا تو......اس وقت......آپ کہاں تھے؟'' موراں نے رکتے رکتے کہا۔

''بس اتنی سی بات تھی جسے پہیلی بنایا جا رہا تھا۔ سیدھی سی بات ہے......جس وقت خدا حسن بانٹ رہا تھا، اس وقت میں بادشاہت کی تلاش میں گیا ہوا تھا!'' یہ کہہ کر رنجیت سنگھ اور موراں دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موراں خوش تھی کہ وہ گناہ کی تاریکی سے نکل کر شاہی حرم میں آ پہنچی تھی۔ موراں نے برسوں تک رنجیت سنگھ کی رفیقہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ اکثر مورخین موراں کو رنجیت سنگھ کی بیوی کہتے ہیں جبکہ کچھ اسے مصاحب کی حیثیت دیتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، جب سے موراں رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل ہوئی تھی وہ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔ رنجیت سنگھ کے متعلق جو کہا جاتا تھا کہ اسے اتھری گھوڑی اور اتھری رن (عورت) پسند ہے۔ وہ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ رنجیت سنگھ کو موراں کا چلبلا پن اور اتھرے انداز بے حد پسند تھے۔ دھنوئی کلاں پر تعمیر کیا گیا "پلِ کنجری" اس بات کی واضح دلیل تھا کہ رنجیت سنگھ موراں سے کس قدر پیار کرتا تھا۔ یہ نشانی اس وقت کی تھی جب موراں رنجیت سنگھ کے حرم میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ حرم میں داخل ہونے کے بعد ایک روز اس نے اپنے ٹکسال میں یہ حکم جاری کر دیا کہ موراں کے نام کا سکہ جاری کیا جائے۔ اس کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں جاری کیا سکہ جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہہ بنی ہوئی تھی، اسی طرز کا ایک نیا سکہ جاری کیا گیا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہہ کی جگہ مور کی شبیہہ نقش کروائی گئی کیونکہ پنجابی زبان میں لفظ مور کی جمع موراں ہوتی ہے۔ یہ تاریخ میں خاص طور پر ہندوستانی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ کسی عورت کے نام کا سکہ جاری کیا گیا ہو۔ موراں پردہ نہیں کرتی تھی اور اکثر مہاراجا کے ساتھ رہتی تھی۔ اب وہ کھل کر ریاست کے نہ صرف کاموں میں حصہ لینے لگی تھی بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کو از خود ترتیب دینے لگی تھی۔

کسی دوسرے مذہب کی عورت کو اپنے حرم میں داخل کرنے اور اسے اس قدر اہمیت دینے پر سکھ قوم کے ماتھے پر اپنے آپ تیوریاں بن گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار امرتسر میں رنجیت سنگھ جتھے دار سری اکال تخت صاحب کے سامنے گیا تو وہاں اس سے یہی سوال کیا گیا۔ تب رنجیت سنگھ نے برملا موراں کی محبت کا اعتراف کیا۔

جب موراں کی حیثیت تسلیم کر لی گئی تو تاریخ اور آرٹ کی بہتری کے لیے دانشوروں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ کنجری کا لفظ تضحیک کا باعث ہے اور تاریخ میں جب اس کا بار بار ذکر ہوگا تو ایک مہاراجے کی تذلیل کا موجب ٹھہرے گا اس لیے امرتسر کے اسکول ہیپرین ڈالے کی پرنسپل ستوین کور سندھو نے پہلی بار یہ مہم چلائی کہ "پل کنجری" کا نام تبدیل کیا جائے۔ بڑی ردوکد کے بعد نہ صرف امرتسر کی انتظامیہ بلکہ پاکستانی حکام نے بھی ستوین کور سندھو کی تجویز پر عملدرآمد کرتے ہوئے اسے "پل کنجری" سے "پل موراں" میں تبدیل کر دیا۔ تب سے یہ پل موراں کے نام سے مشہور ہے۔ شہرت تو موراں کے سکے کی بھی ہوگئی تھی۔

آج بھی اگر کسی پرانے اور اس دور کے کسی بوڑھے سے پوچھ لیں، وہ آج بھی اس دور کے روپے کو موہراں ہی کہہ کر بلائیں گے۔ موہراں ذومعنی لفظ ہے جس کا ایک مطلب تو مہر کے لیے جاتا ہے یعنی حکومت وقت سے تصدیق شدہ مہر لگا ہوا اور دوسرے معنی موراں کے لیے جاتے ہیں یعنی موراں کے اعزاز میں جاری کیا گیا سکہ۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو سرحدی علاقہ ہونے کی حیثیت سے 1965ء میں ہوئی جنگ کے دوران پل موراں پاکستانی افواج کے قبضے میں تھا مگر 1971ء کی دوسری پاک بھارت جنگ میں یہ پل سکھ رجمنٹ کے قبضے میں چلا گیا۔ ایک تعزیتی ریفرنس کے ذریعے دونوں اطراف کی حکومتوں نے اس پل کی تاریخی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں ایک یادگار بنائی جو وقت کی یورش میں آ کر برباد ہوگئی۔ اسے دوبارہ منسٹری آف ٹورازم ہندوستان نے پنجاب گورنمنٹ کی تحویل میں دے کر اس کی تزئین و آرائش بحال کروائی۔ اس پل کے نزدیک ایک چھوٹی سی مسجد یا مندر بھی موجود ہے جسے از سرنو تعمیر کر کے سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ یہ بارہ دری تین مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ بارہ دری کے نزدیک شیو مندر تعمیر ہے جو پل موراں کی دائیں جانب نانک شاہی اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کی دیواروں اور چھت کو جھلملاتے اور چمکیلے پتھروں سے سجایا گیا تھا اب جس کی چمک وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑنے لگی ہے۔

اس مندر کے قریب ہی پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ اس میں رنجیت سنگھ کے زمانے میں قریبی نہر سے پانی لا کر بھرا جاتا تھا۔ یہ تالاب دو حصوں پر محیط ہے۔ ایک کھلا ہوا حصہ مردوں کے نہانے کے لیے ہے اور دوسرا ڈھانپا ہوا حصہ خواتین کے لیے ہے۔ اسی تالاب میں ایک کشتی جگہ بھی موجود ہے جو جانوروں کے پانی پینے کے لیے رکھی گئی ہے۔ ان سے ہٹ کر بارہ دری ہے۔ وہی مشہور زمانہ بارہ دری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جس میں دو محبت کرنے والے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس کے چہار اطراف بارہ دروازے تھے جو اب وقت کی گردش اور اس بارہ دری کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں مگر آج تک اپنی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

محبت اور دھوکا دو ایسے ستون ہیں جن پر پوری دنیا کی تاریخ اپنی عمارت لیے کھڑی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کو کسی دور سے بھی اٹھا کر دیکھ لیں، انہی دو الفاظ پر یہاں کی تاریخ محیط ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت بنانے اور اسے پایۂ تکمیل تک لے جانے میں بھی یہی دو عمل کارفرما رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ اپنے والد کے مرنے کے بعد دس سال کی عمر میں اپنی مثل کا سردار بنا تو اس میں اس کی والدہ راج کور کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ایک ذہین اور دوراندیش عورت تھی اور انتظامی امور میں بھی بہت ادراک رکھتی تھی۔ بالکل اسی طرح اس کی ساس سدا کور بھی بڑی معاملہ فہم اور بہادر عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کے سردار بننے سے لے کر آخر تک اس کے حکومتی معاملات میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔ رنجیت سنگھ بھی ہر معاملے میں جب تک سدا کور کا مشورہ نہ لے لیتا، کوئی اگلا قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ سدا کور کو ہمیشہ ایک ہی دکھ رہا کہ اس کی بیٹی مہتاب کور اپنے بطن سے رنجیت سنگھ کے لیے کوئی بیٹا کیوں نہیں پیدا کرسکی۔

جب رنجیت کی دوسری بیوی راج کور (مائی نکین) کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور رنجیت سنگھ نے اس کی پیدائش پر نہ صرف بہت بڑا جشن منایا بلکہ تین سال کی عمر میں اس کی منگنی کرکے اسے اپنا جانشین بھی بنا دیا تو سدا کور کے دل میں حسد پیدا ہوگیا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر تلملاتی رہتی تھی کہ مہتاب کور کیوں جانشین پیدا نہ کرسکی۔ اس کے اندر پلنے والا حسد اسے رنجیت سنگھ کی سادگی اور اعتماد کو دھوکا دینے کے منصوبے بنانے لگا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ رنجیت سنگھ ایک اور پری وش اور دلربا مسلمان رقاصہ موراں کو اپنے حرم میں ڈالنے کے منصوبے بنانے لگا اور پھر بہت جلد وہ اسے اپنے محل کی زینت بنانے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کے جلاپے میں اور بھی اضافہ ہوگیا کہ اگر اس کے بطن سے بھی کوئی کھڑک سنگھ پیدا ہوگیا تو وہ بھی راج سنگھاسن کا حصہ دار بن جائے گا۔ لہٰذا اسے جلد از جلد اس کا کوئی تدارک کرنا ہوگا۔ اس وقت تک رنجیت سنگھ لوگوں اور اپنے رشتے داروں کی باتیں سن سن کر زچ ہوچکا تھا کہ اس کی والدہ راج کور اور لکھ پتی رائے کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں۔ اس معاملے کو رنجیت سنگھ نے برسراقتدار آتے ہی سلجھا لیا تھا۔ لکھ پتی رائے کو محاصل کی وصولی کے دوران کسی نے قتل کردیا۔ قاتل گرفتار تو نہ ہوسکے البتہ یہ افواہیں ضرور گردش کرنے لگیں کہ اسے مروانے میں رنجیت سنگھ کا ہاتھ ہے۔ اس قتل کی بازگشت باقی تھی کہ رنجیت سنگھ نے اپنی والدہ راج کور کو بھی زہر دے کر مروا دیا۔ اب سدا کور کے لیے بھی راستہ صاف ہوچکا تھا۔ کیونکہ رنجیت سنگھ کو کسی ایسے باوفا مشیر کی ضرورت تھی جو اس کے معاملات میں اس کی مدد کرسکے۔ سدا کور نے بہ احسن وخوبی ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمہ وقت رنجیت سنگھ کو بہتر سے بہتر مشوروں سے نہ صرف نوازتی رہی بلکہ اکثر مہمات میں رنجیت سنگھ کے شانہ بشانہ کھڑی رہی۔

لیکن اس کا کیا حل تھا کہ جتنا رنجیت سنگھ سدا کور پر اعتماد کرتا تھا اور اس کے ہر مشورے کو قبول کرتا، یہاں تک کہ جب اس نے اپنی سلطنت کی راج دھانی لاہور منتقل کی تب بھی وہ سدا کور سے مشورہ کرنے بٹالہ تک سفر کرتا تھا لیکن اس کی بیٹی اور رنجیت سنگھ کی پہلی بیوی مہتاب کور کو شروع دن سے ہی رنجیت سنگھ سے نفرت تھی۔ دونوں ماں بیٹی کے اپنے اپنے دکھ تھے۔ سدا کور کے دکھ میں کھڑک سنگھ کی پیدائش اور اوپر سے موراں سے رنجیت سنگھ کی مصاحبت نے اور بھی اضافہ کر ڈالا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔ اس منصوبے پر وہ جی جان سے عمل کرکے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی تاکہ وارثانِ حکومت کے بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا تدارک کرسکے۔ 1807ء میں جب رنجیت سنگھ ستلج کی طرف مہم کے لیے گیا ہوا تھا تو دونوں ماں بیٹی کے لیے یہ وقت انتہائی اہم اور شاندار تھا۔ سدا کور جانتی تھی کہ مہتاب کور جب تک ماں نہ بنی رنجیت سنگھ کے دل میں بھی اپنی جگہ نہ بنا سکے گی اور وہ صرف مہتاب کور ہی کے ذریعے اپنے داماد پر اپنے اختیارات کو بڑھا سکتی تھی۔ اب اس کے سوچے ہوئے منصوبے کے لیے وقت آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے پورے علاقے میں یہ افواہ پھیلا دی کہ مہاراجا کی بیوی مہتاب کور حاملہ ہوگئی ہے۔ اسے اس بات کا قوی یقین تھا کہ جب تک رنجیت سنگھ اپنی اس مہم سے واپس پلٹے گا، اس وقت تک بچے کی پیدائش کا وقت پورا ہوچکا ہوگا۔ ہوا بھی وہی۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو سدا کور نے انتہائی خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ رنجیت سنگھ کی پہلی بیوی مہتاب کور نے جڑواں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بچوں کو جنم دیا ہے۔ مہاراجا کی عدم موجودگی اس کی ساس کے منصوبوں کے لیے بہتر ثابت ہوئی۔ جس رات عوام میں یہ اعلان کیا گیا کہ رانی مہتاب کور نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے، اس سے ایک روز پیشتر دونوں بچوں کو ان کے والدین سے خریدا گیا تھا۔ سدا کور نے ان بچوں کو رانی مہتاب کور کی گود میں ڈالتے ہی ان کے نام بھی تجویز کر دیے تھے۔ شیر سنگھ کو ضلع ہوشیار پور میں ایک جولا ہے سے خریدا گیا تھا جو ایک جاگیردار کی حیثیت سے مائی سدا کور کا ملازم تھا اور دوسرے بچے تارا سنگھ کو سدا کور نے ایک مسلمان کنیز مانگی کی بیٹی سے خریدا تھا۔

ان دونوں بچوں کی ماؤں اور خاندان کو بہترین نوازشات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا تاکہ ان کے منہ ہمیشہ کے لیے بند رہیں۔ سدا کور کو معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ باپ بن جانے کے تصور کو پسند کرتا ہے لہٰذا اس نے بھی ان کو بطور اولاد قبول کر لیا اور اپنی پوری زندگی ان کے ساتھ حقیقی اولاد کا سا سلوک کیا۔

شیر سنگھ کی نانی اور رنجیت سنگھ کی ساس سدا کور ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک عورت تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کی طاقت کا سرمایہ اور اس مہاراجا کے لیے ایک ایسی سیڑھی تھی جس کی مدد سے وہ عظمت کی چوٹی پر پہنچنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ اس کی کوششوں میں اس کی ساتھی تھی اور اس کی توانائی، سازشوں اور اثر رسوخ کے باعث اپنے ابتدائی کارناموں میں کامیابی حاصل کر پایا تھا۔ وہ ایک بہادر، طاقتور تیز مزاج کی عورت تھی جس نے ایک منصوبے کے تحت اپنے داماد کے اعتماد کو دھوکا تو ضرور دیا مگر اپنی بیٹی کا اپنے داماد کی نظروں میں مقام ضرور بحال کرا دیا۔ یوں ایک طرف دھوکا تھا، فریب، خود غرضی اور مکارانہ منصوبوں کی تکمیل کے ارادے تھے تو دوسری طرف محبت تھی...... صرف محبت جس میں نہ تو کوئی فریب تھا، نہ دھوکا تھا۔ موراں اور رنجیت سنگھ کی یہ محبت اپنے مصمم ارادوں سے پروان چڑھتی جا رہی تھی۔

محبتوں بھرے ایسے ہی ایک دن موراں نے رنجیت سنگھ کے پیار سے معمور لمحوں میں پوچھا۔

''مہاراج! آپ کی یہ کنیز ایک اور بات کی اجازت چاہتی ہے۔''

''موراں! تم کنیز نہیں ہو۔ میرے دل کی رانی ہو۔ سکھ اپنا وچن دے کر بھی اس سے منہ نہیں موڑا کرتے۔'' رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! جس طرح آپ کے امیروں اور وزیروں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے فلاحی اور عوام کے لیے بنائے منصوبوں کی از خود تکمیل کراتے ہیں، بندی کو بھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی جائے کہ وہ بھی اپنے من میں سوچے منصوبوں کو مکمل کروا سکے۔'' موراں نے رکتے رکتے اپنی بات پوری کی۔

''یہ تو کوئی بات نہیں۔ تمہیں اس کا مکمل اختیار ہے بلکہ میں آج ہی یہ احکام جاری کر دیتا ہوں۔'' رنجیت سنگھ نے پیار سے جواب دیا۔

''میں یہاں ایک باغ بنوانا چاہتی ہوں۔ موری دروازے کے سامنے۔'' موراں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جگہ پسند کرو۔ موری دروازے کے اندر کی جگہ خالی ہے۔ وہاں باغ بنوا سکتی ہو۔'' رنجیت سنگھ نے کہا۔ ''تم تو یہی سوچ رہی ہو۔ لاہور سے شرقپور جانے والی سڑک سے ذرا اتر کر ایک جگہ خالی ہے۔ میں وہاں تمہارے نام سے گاؤں بسانے کا ارادہ کر چکا ہوں اور میرے اس منصوبے پر کام بھی جاری ہے۔'' رنجیت سنگھ نے توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''وہ تمہارے نام پر موراں والا گاؤں کہلائے گا۔''

''میں کس زبان سے آپ کی محبت کا اعتراف کروں۔ آپ واقعی عظیم ہیں۔'' موراں نے کمال تشکر آمیز لہجے میں کہا اور اپنا سر رنجیت سنگھ کی چھاتی سے لگا دیا۔

☆☆☆

انسانی زندگی وقت کے بحر زخار میں ایک کشتی کے مانند ہوتی ہے جو خراماں خراماں چلتے، لمحات کی لہریں جھیلتے ہوئے اپنے اتم ساحل کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور جونہی وقت آتا ہے، وہ کنارے سے لگ جاتی ہے۔ اس سفر میں آنے والی اتھری اور اونچی نیچی لہریں رکاوٹیں بھی پیدا کریں تو منزل کی طرف جانے والے راستے خود بخود بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ قدرت جہاں منزل تک پہنچنے کا راستہ استوار کرتی ہے، وہاں وہ منزل سے بھٹکا بھی دیتی ہے۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ گناہوں کی دلدل سے نکل کر مذہب کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی فلاح کا راستہ ٹھہرتا ہے۔

موراں رنجیت سنگھ کے حرم میں کیا اتری، گویا اس کے ذہن نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ گناہوں کی دلدل میں بہت دیر تک ہاتھ پاؤں مارتی رہی مگر اسے کہیں بھی ذہنی سکون نہ مل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پایا تھا۔ اب اسے ایک بے پناہ پیار کرنے والے انسان کی ہمراہی کیا ملی، اس نے اپنے ذہن کی ساری گندگیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا سوچا اور اپنا رجحان دینی، فلاحی کاموں کی طرف لگالیا۔ جب سے اس بات کی آزادی ملی تھی کہ وہ جو چاہے منصوبہ بنا کر اس پر عملدرآمد کرا سکتی ہے، رنجیت سنگھ نے بھی اس کے ان کاموں کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ تمام حکومتی مشینری کو احکامات جاری کردیے تھے کہ جو موراں کہے، اس پر من وعن عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ہوا بھی یہی۔ اس نے جس چیز کی بھی خواہش کی، وہ فوراً اسے مہیا کردی گئی۔ موراں اب نری طوائف ہی نہیں تھی جو امرتسر کے بازارِ حسن کی جان تھی بلکہ رنجیت سنگھ کے دل کی ملکہ تھی اور اسے موراں سرکار کا لقب مل چکا تھا۔ اس کے لیے پل موراں بنایا گیا۔ اس کے نام پر موراں والا گاؤں بسایا گیا اور اسی کے نام کا سکہ ڈھالا گیا جسے ان پڑھ اور عام لوگ موہراں کا سکہ کہتے تھے۔ یہ سارے اعزازات صرف ایک ہی عورت کو ملے تھے جسے تاریخ موراں کے نام سے جانتی اور پہچانتی تھی۔

ان دنوں نہ جانے موراں کے دل میں کیا سمایا کہ اس نے شاہ عالمی اور لوہاری دروازے کے درمیانی بازار میں ایک خالی جگہ دیکھ کر وہاں مسجد بنوانے کا سوچا۔ اس کا ذکر اس نے رنجیت سنگھ سے کیا تو اس نے نہ صرف اس کے ارادوں کو پسند کیا بلکہ وہ بولا۔

"موراں سرکار! تم نے مسجد کا سوچا۔ یہ بہت ہی اچھا منصوبہ ہے مگر میرے کہنے سے اس میں تھوڑا اضافہ اور کرلو۔"

"کیا مطلب......؟" موراں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ جہاں مسجد میں تمہارے دین اور مذہب کی عبادت کرنے والے لوگوں کا اجتماع ہوگا اور وہ تمہاری بخشش کی دعا کریں گے، وہاں اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کا تم پر اور بھی حق بنتا ہے۔" مہاراجا بات کرتے کرتے رکا۔

"وہ کیا؟ میں ان ہی کے لیے تو مسجد بنوا رہی ہوں۔" موراں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"بجا کہا لیکن اگر اس مسجد کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے کا مدرسہ بھی بن جائے تو سونے پر سہاگا ہوگا۔" رنجیت سنگھ نے کہا۔

"مہاراج! آپ کا دل تمام مذاہب کے لیے کس قدر وسیع اور فراخ ہے میں یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔" موراں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"موراں سرکار! دنیا کے تمام مذاہب گروؤں کے بنائے ہوئے ہیں اور ہمارے مہان گرو گرونانک کا کہنا ہے کہ سارے مذہبوں کا احترام کرو۔ رنجیت سنگھ مذاہب کے ساتھ ساتھ ان تمام علما کی بھی قدر کرتا ہے جو اپنے اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے پہلے یہاں حکمرانی کرنے والے سکھوں نے مسلمانوں پر کس قدر مظالم ڈھائے تھے۔ اکثر مساجد، مزارات اور عبادت گاہوں کو تباہ وبرباد کیا گیا۔ مسلم بادشاہوں، امراء اور بزرگانِ دین کے مقابر سے سنگِ مرمر اور سرخ پتھر تک اکھاڑ لیے گئے مگر اب یہ نہیں ہوگا۔ میں نے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے مساجد، بزرگانِ دین کے مقابر پر سلامی دی۔ میں نے مولوی غلام حسین چشتی، نور احمد چشتی، لال مسجد کے خلیفہ غلام رسول، مولوی جان محمد اور میاں وڈا کے مدرسوں میں جہاں درس وتدریس کا کام ہوتا ہے، میری نظروں میں وہ جگہیں قابلِ قدر اور قابلِ احترام ہیں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ میری سرکار جو مسجد تعمیر کرنا چاہتی ہے، اس کے ساتھ بچوں کو دینی تعلیم دینے والا مدرسہ بھی لازمی ہونا چاہیے۔" رنجیت سنگھ نے تفصیل سے موراں کے ذہن اور اس کی سوچوں میں اضافہ کیا۔

"مہاراج! میں اس بارے میں سوائے ممنونیت کے اور کیا کرسکتی ہوں۔ اگر آپ میرے ان منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں تو اس کی جزا میرا رب آپ کو دے گا۔" موراں کی آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے۔

"تم ابتدا تو کرو...... کیا ہوا اگر رنجیت سنگھ تمہارے مذہب سے نہیں ہے مگر اس کے ذہن میں تمہارے مذہب کا اتنا ہی احترام ہے جتنا شاید تمہارے اپنے ذہن میں بھی نہ ہو۔" رنجیت سنگھ نے موراں کی آنکھوں سے اترتے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

پھر بہت جلد اس علاقے میں ایک خوب صورت مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر ہوگیا۔ صاحبانِ فہم وادراک حکام بالا نے اس کو بھی مائی موراں کی مسجد کا نام دے دیا۔ مائی موراں کے دورِ اقتدار کی یہ تمام نشانیاں آج بھی قائم ودائم ہیں۔

☆☆☆

ستر سال کی عمر میں بھی رنجیت سنگھ کی سانس سدا کور کی ریشہ دوانیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں چھپا ہوا بغض اور حسد ابھی تک زندہ تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ابھی اپنی بیماری سے پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کئی سال سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دبا ہوا ایک گھریلو مسئلہ دوبارہ سے ابھر کر سامنے آ گیا۔ رنجیت سنگھ کے تعلقات سدا کور سے کتنے سالوں سے کشیدہ چلے آ رہے تھے کیونکہ میٹکاف کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں وہ اس کے خلاف رہی تھی۔ اس نے شہزادہ کھڑک سنگھ کی شادی میں بھی شرکت نہیں کی تھی اور اپنے نواسوں شیر سنگھ کے ساتھ تارا سنگھ کو بھی اس شادی میں شرکت کرنے سے روک دیا تھا۔

کھڑک سنگھ کے ولی عہد قرار پانے کے بعد اس نے شدید احتجاج کیا تھا کہ کھڑک سنگھ کو تو بہت زیادہ جاگیریں دی گئی ہیں جبکہ اس کی بیٹی مہتاب کور کے بیٹوں کو کچھ نہیں دیا گیا۔ مہتاب کور کچھ عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھی۔ مہاراجا سدا کور کی مستقل شکایات سے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ سدا کور کا شیر سنگھ اور تارا سنگھ کے علاوہ کوئی وارث نہیں تھا چنانچہ رنجیت سنگھ نے سدا کور کو کہا کہ وہ اپنی ریاست کا انتظام اپنے نواسے شیر سنگھ کو سونپ دے۔ سدا کور رنجیت سنگھ کو خوب جانتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ تجویز یونہی نہیں دی، اس میں لازماً کھڑک سنگھ کی والدہ راج کور (نکیین مائی) اور مسلمان بیوی موراں کا مشورہ شامل ہے۔

اس نے داماد سے بچنے کے لیے انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کا سوچا۔ اس کی ریاست ستلج کے دونوں کناروں پر محیط تھی۔ اس نے زمینوں کا انتظام دیکھنے کے لیے دریا پار جانے کا بہانہ بنایا' جب رنجیت سنگھ کو اس کے منصوبوں کا پتا چلا تو اس نے دونوں لڑکوں کی جاگیروں کے حوالے سے گفتگو کرنے کے لیے اسے لاہور بلایا۔ سدا کور کو شک بھی نہ گزرا کہ جس انسان پر وہ کئی سالوں سے غالب ہے، وہ اچانک یوں پینترا بدل جائے گا۔ اس نے رنجیت سنگھ کی دعوت قبول کر لی۔ جب وہ لاہور پہنچی تو مہاراجا کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس کی ریاست اس کے نواسوں کو دے چکا ہے۔ اب اسے اقتدار سے الگ ہو جانا چاہیے۔ سدا کور نے بہت دلیلیں دیں، بہت کوششیں کیں مگر رنجیت سنگھ نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔ سدا کور کو علم تھا کہ اب لاہور میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا تاہم اگر وہ بٹالہ پہنچ جاتی ہے تو کچھ عرصے کے لیے دربار کی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ پھر بھی اسے مجبور کیا جاتا تو وہ ستلج پار انگریزوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ لاہور کے دارالحکومت سے کھسک لی۔ تاہم ابھی زیادہ دور نہ گئی تھی کہ رنجیت سنگھ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر گھڑسواروں کا ایک دستہ بھیجا اور اسے قیدی بنا کر واپس لاہور لے آیا۔ دیوان چند اور شام سنگھ کو سدا کور کی ریاست کا انتظام سنبھالنے بھیج دیا گیا۔ کنہیا قلعوں پر قبضہ کر کے ان کی ملیشیا کو ریاستی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ بٹالہ جو کہ کنہیا سرداروں کا آبائی گھر تھا، شہزادہ شیر سنگھ کو دے دیا گیا۔ باقی علاقہ کانگڑہ میں ضم کر دیا گیا۔ سدا کور قید ہی میں مر گئی۔

مہاراجا رنجیت سنگھ اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین بنا کر اسے دھیان سنگھ کی سرپرستی میں دے چکا تھا۔ جب 27 جون 1839ء کو اس کا انتقال ہوا۔ مہاراجا کے ساتھ اس کی چار رانیاں اور سات کنیزیں بھی جل کر ستی ہو گئیں۔ اس کے بعد شہر بھر میں اس کا ماتمی جلوس نکلا۔ تیرہ روز تک اس کی موت کا سوگ منایا گیا۔ شاہی مسجد کے پاس اس کی سمادھی تعمیر کی گئی۔ گیانی گیان سنگھ جی کے مطابق مہاراجا نے 8 لڑکے اور 32 رانیاں چھوڑی تھیں جن میں سے چار ستی ہو کر جل گئیں اور باقی زندہ رہیں۔ زندہ رہنے والوں میں موراں بھی تھی۔ رنجیت سنگھ کی چہیتی اور پیاری جس کے ساتھ رنجیت سنگھ نے پورے خلوص کے ساتھ جی جان سے پیار کیا اور آخر دم تک اس کا ساتھ دیا۔ موراں کا انتقال 1874ء میں ہوا۔ اس وقت لاہور کی سلطنت پر رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ حکمران تھا جو کہ مائی جنداں کا بیٹا تھا۔ اسی کے حکم پر موراں کی قبر کو پختہ کروایا گیا۔ سچ کہتے ہیں، مرنے والے مر جاتے ہیں، مگر ان کی یادیں اور نشانیاں باقی رہتی ہیں۔ سیانوں کا یہ کہا موراں پر بھی صادق آتا ہے!

ماخذات:

·عمدۃ التواریخ: سوھن لال سوری ترجمہ ·حاکمانِ پنجاب: اسد سلیم شیخ ·تاریخِ پنجاب: کنہیا لال
·مہاراجا رنجیت سنگھ: خوشونت سنگھ ·مجلہ نقوش: لاہور نمبر ·تاریخ پنجاب معہ حالاتِ شہر لاہور:
سید محمد لطیف ·مہاراجا رنجیت سنگھ: سیتا رام کوہلی ·کنجری کا پل (ناول): یونس جاوید ·پنجاب
اور بیرونی حملہ آور: پروفیسر عزیز الدین احمد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس نے نیوی بلیو اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ایسی تصاویر چالیس کی دہائی میں ناولوں اور میگزین کے سرورق پر شائع ہوا کرتی تھیں تاکہ پڑھنے والے ان میں کشش محسوس کریں۔ یہ بات اور تھی کہ ان ... کا میگزین یا ناول کے مواد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ رچرڈ بھی بچپن میں یہ ناول اور رسالے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

لیکن وہ کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو سرورق کے لیے تصویریں بنواتی اور نہ ہی کوئی مقتدر عورت یا خاتون حکمران جس کا حکم ماننے پر مرد مجبور ہو جائیں بلکہ وہ ایک نوجوان

محبت کی چاشنی میں لپٹی دھوکا دہی کی تلخیوں کا قصہ

وقت اور مستقبل کو پوشیدہ رکھ کر اللہ نے انسان پر احسان فرمایا ہے۔ اگر ان کا پہلے سے علم ہو جاتا تو وہ بے بسی پھر کہاں سے آتی جو طاقتور، مکار اور مجرموں کے حصے میں بھی اکثر آجاتی ہے۔ جیسے کہ اس نے ایک چھوٹی سی چوری کرکے شاید اپنی ہوشیاری کا جشن بھی منایا ہوگا مگر اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ محض بھروسے کی بنیاد پر عنقریب ملنے والی کتنی بڑی جائداد اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے کیونکہ ... اسے آنے والے وقت کی کچھ خبر نہ تھی۔

نفع، نقصان

تنویر ریاض

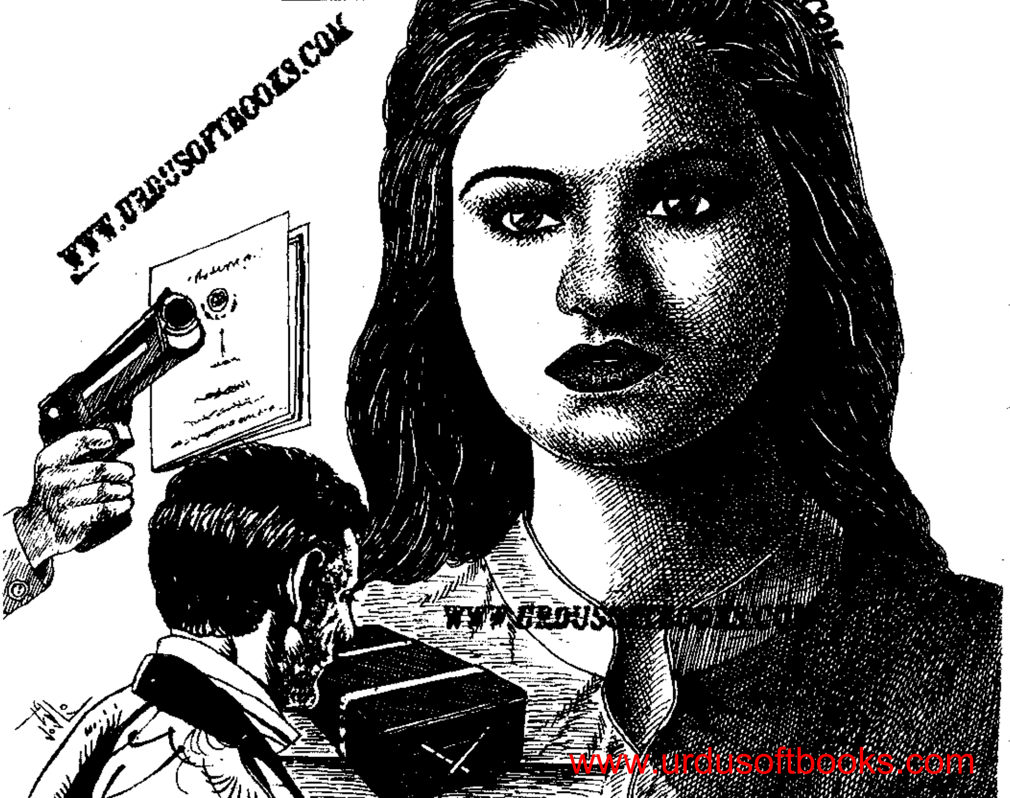

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

خوب صورت لڑکی تھی جس نے اپنے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ وہ بریٹا 380 پستول تھا جس نے اسے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پستول کا رخ براہِ راست رچرڈ کی جانب تھا جو اس وقت لائبریری میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ڈائمنڈ کا نیکلس مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جسے پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ہار اس کی مرحومہ بیوی کی نشانی تھا۔

رچرڈ نے نظریں گھما کر دیکھا تو اسے صوفے پر ایک برساتی پڑی ہوئی نظر آئی جو یقیناً اس لڑکی کی ہی ہوگی۔ گویا باہر بارش ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بارش کب شروع ہوئی پھر اس نے سوچا کہ کتنے دن سے لارا نے اس کے لیے کھانا نہیں بنایا۔ وہ کتنے عرصے سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ان دنوں کا حساب نہیں رکھ سکا۔ اس کا دماغ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اسے کوئی بھی مرض لاحق ہو سکتا تھا، چاہے وہ الزائمر ہو' فالج، ہارٹ اٹیک یا بڑھاپے کی وجہ سے ہونے والی کوئی بھی بیماری۔ اسی لیے موت کی خبر دیتے وقت کہا جاتا ہے کہ سب کو ایک دن جانا ہے۔ ممکن ہے کہ اور جانے کے لیے کسی خوب صورت عورت کے پستول سے نکلی ہوئی گولی اتنی بری نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ ابھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کہانی کا آغاز اکتوبر کے آخر میں جمعے کی ایک سہ پہر سے ہوا۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور زرد و سرخ پتے سبز گھاس پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گھر کی صفائی کے لیے آئی تھی جو کمپنی اس کی بیوی کی زندگی میں گھر کی صفائی کی ذمے داری سنبھالے ہوئے تھی وہ اچانک ہی بند ہو گئی۔ رچرڈ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کس کو فون کرے پھر اس کی نظر اخبار میں ہاؤس کلیننگ سروسز کے اشتہار پر گئی جس میں ایک عورت کا مسکراتا ہوا چہرہ نمایاں تھا اور اس کے اوپر کمپنی کا نام ایس جے فائن کلیننگ کمپنی درج تھا۔

لارا اپنے ساز و سامان کے ساتھ اس کے دروازے پر آئی جس میں برش، جھاڑو وغیرہ شامل تھیں۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی فورڈ وین میں آئی تھی۔ اس نے کمپنی کا یونیفارم سرخ اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے کالر کے نزدیک نیلے رنگ میں اس کا نام کندہ تھا۔ دیکھنے میں وہ بیس کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رچرڈ کو نابوکوو کے ناول کی ہیروئن لولیتا یاد آ گئی جو کم عمری میں ہی کام کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑی تھی۔

اس کی آنکھیں حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھیں، جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو رچرڈ کو یوں لگا جیسے وہ اس پیشے سے تعلق نہیں رکھتی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صفائی کرنے والی عورت ہے۔ رچرڈ نے اسے پورا گھر دکھایا۔ وہ ایک ایک کمرے میں گئے۔ رچرڈ نے غور کیا کہ اس کا یونیفارم کس طرح اس کے متناسب جسم سے چپٹا ہوا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود رچرڈ کی نظریں بار بار اس کے جسم کا طواف کر رہی تھیں گو کہ وہ جانتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں کوئی بھی عورت اس کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتی اس کے باوجود وہ اپنی نظروں کو بھٹکنے سے نہیں روک سکا۔

لڑکی کے ہاتھ میں ایک پروں والا جھاڑن تھا جس سے وہ بار بار میز، الماری اور کھڑکیوں کی طرف اشارہ کرتی۔ اس نے کہا کہ مکان کو مکمل صفائی کی ضرورت ہے اور وہ نہیں سمجھتی کہ اس دھول گرد اور بے ترتیبی میں کوئی کس طرح رہ سکتا ہے۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اتنے اچھے مکان کا یہ حال کر دیا ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی، جس میں غصہ اور ناراضی کی جھلک تھی۔ رچرڈ نے اس کی بات کا برا نہیں منایا بلکہ اسے مکان کی تعریف سن کر خوشی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ وکٹورین طرز کا عالی شان مکان تھا۔ بہت سے لوگ اسے حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ مکان مرکزی سڑک سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک پختہ سڑک تعمیر کی گئی تھی جس کا اختتام وسیع وعریض پارکنگ لاٹ میں ہوتا تھا۔

'' یہ مکان بہت بڑا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اس نے رچرڈ کو صاف صاف بتا دیا کہ اسے مناسب حالت میں لانے کے لیے ایک ہفتہ یا ممکن ہے کہ ایک مہینا بھی لگ جائے۔ رچرڈ نے کہا کہ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس مکان کی صفائی میں... جتنا وقت دے گی وہ اس کے لیے باعثِ مسرت ہوگا۔ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا کام کرے۔ وہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کتنا اچھا لگے گا جب ایک پرکشش اور جوان عورت مینٹل پیس اور فرنیچر سے گرد صاف کرے گی۔ اس کے علاوہ باتھ روم، بیڈ روم اور کچن کاؤنٹر کی بھی صفائی کرے گی۔ اسے سب سے زیادہ فکر چاندی کے برتنوں کی تھی جو مناسب توجہ اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے خراب ہو رہے تھے۔

اس مکان کو نظر انداز کرنے اور مناسب توجہ نہ ملنے کی ایک ہی وجہ تھی کہ رچرڈ کو حالات کے مطابق ڈھلنے میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وقت لگ گیا۔ اس کی بیوی لیزا تیس سالہ رفاقت کے بعد نو ماہ قبل دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ بیوی کی موت اس کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد تباہیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر پھولوں کی دکان میں جز وقتی ملازمت کرلی۔ ایک دن وہ گاہک کے لیے پھولوں کا ایک بڑا گل دان اٹھا رہا تھا، اسے یہ گل دان فرش سے اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھنا تھا کہ اچانک اسے کمر کے نچلے حصے میں جھٹکا محسوس ہوا۔ اس کی پوری ٹانگ میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی۔

آنے والے مہینوں میں کمر کی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ اسے چلنے میں دشواری محسوس ہونے لگی اور چھڑی کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ جسم سے توانائی ختم ہوتی جارہی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس نے مکان میں گھومنے کے لیے وہیل چیئر استعمال کرنا شروع کردی، گوکہ وہ اس کا محتاج نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے موٹر سے چلنے والی وہیل چیئر کا بھی آرڈر دے دیا جو اس نے ٹی وی کے اشتہار میں دیکھی تھی۔ چند ہفتے اس وہیل چیئر پر سواری کرنے کے بعد وہ اس سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا اور اس نے اس کا استعمال ترک کردیا اور وہ بھی لائبریری کے ایک کونے میں رکھ دی گئی جس پر گرد و غبار کی تہ جم گئی تھی۔

پھولوں کی دکان میں کام کرنے کے دوران وہ لوگوں کے لیے گلدستے تیار کرکے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر چھٹیوں مثلاً ویلنٹائن اور مدرز ڈے وغیرہ پر اس کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ اسے یہ کام کرکے محسوس ہوتا کہ وہ کوئی نیکی کررہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ پھول امن، محبت اور خوشی کی علامت ہوتے ہیں تاہم کمر کی تکلیف بڑھتی گئی اور اسے ملازمت چھوڑنا پڑی۔ ویسے بھی اسے کام کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بیوی بہت دولت مند تھی اور باپ کی جائداد میں سے اسے معقول حصہ ملا تھا اور اب رچرڈ اس کے اثاثوں کا وارث تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ دن بہ دن تنہا ہوتا جارہا تھا۔ وہ دن بھر گھر میں اکیلا پڑا رہتا۔ اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ٹی وی دیکھے یا کتابیں پڑھتے میں وقت گزارے۔ اس کا قریبی دوست ارل بھی اسی سال کے شروع میں وفات پاچکا تھا۔ دوسرے دوست بھی دنیا سے رخصت ہوگئے یا دوسری ریاستوں میں چلے گئے اور وہ خاص خاص مواقع پر بھی اس کی فون کال کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے پاس.... کوئی مصروفیت نہیں تھی اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا تھا۔

پھر لارا اس کی زندگی میں آگئی۔ وہ بڑی محنتی لڑکی تھی۔ گھٹنوں کے بل جھک کر کچن کا فرش رگڑ رگڑ کر صاف کرتی یا ساری کھڑکیوں کو پانی سے دھو ڈالتی۔ اس نے پہلے دن کے بعد کچھ نہیں کہا جب اس نے گھر کی حالت دیکھ کر رچرڈ کا مذاق اڑایا تھا تاہم اس کی کچھ باتیں رچرڈ کو بڑی عجیب لگتیں اور وہ انہیں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت گہری لپ اسٹک اور آئی شیڈو لگاتی ہے۔ اسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ وہ بار بار باغ میں جاکر سگریٹ نوشی کرے۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد لارا نے کہا کہ وہ اگلے سوموار کو آئے گی۔ دوسرے ہفتے کے دوران اس نے رچرڈ سے اس کے گھر والوں خاص طور پر اس کی بیوی کے بارے میں سوالات کرنا شروع کردیے۔ گوکہ اسے اس کا حق نہیں تھا تاہم وہ خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتا رہا۔ وہ گفتگو کے دوران بعض مواقع پر ایسا رویہ اپناتی جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا جس نے رچرڈ کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ وہ مشکوک کیریکٹر کی حامل ہے۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ اس سیاہ رنگ کی ٹویوٹا سیڈان کا انتظار کرتی جو اسے گھر لے جانے کے لیے آتی تھی۔ رچرڈ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ ٹویوٹا چلانے والا کون ہے۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ، شوہر یا کمپنی کا کوئی ملازم ہوسکتا تھا۔

کچھ بھی ہو۔ اس کی موجودگی کے دوران رچرڈ کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا، صبح کافی پینے یا اخبار پڑھنے کے دوران وہ لارا کو گھر میں مٹک مٹک کر چلتے پھرتے دیکھتا تو اسے بہت اچھا لگتا اور اسے اپنی جوانی کے دن یاد آجاتے۔ کبھی کبھی... کام کے دوران وہ کوئی گانا گانے لگتی جسے سن کر رچرڈ مسکرانے لگتا۔

دن گزرتے رہے لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ ابھی بہت کام باقی ہے۔ اسے اوپر کی منزل پر قالینوں، ڈائننگ روم کے پردوں اور لائبریری کے فرش کی صفائی کرنا ہے۔ وہ یہی سمجھا کہ لارا کام کو کھینچ رہی ہے کیونکہ وہ اسے فی گھنٹا کے حساب سے ادائیگی کررہا تھا۔ شاید وہ اسی لیے اس کوشش میں تھی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھ سکے۔ رچرڈ کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ یہ اس کے لیے ایک تفریح

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھی۔ اس کے آنے سے رچرڈ کا دل بہل جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ نہ کرتی تب بھی وہ اسے صرف آنے جانے کے پیسے ہی دیتا رہتا۔ کم از کم اس کی وجہ سے گھر میں عورت کی موجودگی تو محسوس ہو رہی تھی۔

عرصہ ہوا رچرڈ کے لیے پیسے کی اہمیت ختم ہو گئی تھی جس کی بڑی وجہ اس کی صحت تھی۔ وہ ذیابیطس، بلڈ پریشر اور ہائی کولیسٹرول کی دوائیں لیتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ اس کا کوئی رشتے دار حیات نہیں تھا جس سے ملنے وہ جا سکتا۔ اس کی پرانی مرسڈیز گیراج میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک معقول رقم کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جس کی نگرانی اس کے بینکر کرتے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی تیس سال پہلے کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اور سوتیلا بیٹا کشتی رانی کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا جب وہ لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ تعطیلات منانے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بھائی، کزن، بھتیجا یا بھانجا تھا جس کے نام جائداد منتقل ہوتی۔ اس کے وکیل نے اسے بارہا یہ بات یاد دلائی اور کئی خیراتی اداروں یا درس گاہوں کے نام تجویز کیے لیکن وہ ان اداروں کو قانونی طور پر جائداد منتقل کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کا ماننا تھا، وارثت کے حقدار صرف خونی رشتے یا وہ ہستی ہوتی ہے جس سے محبت کی جائے۔

لارا مستقل طور پر اس کے ساتھ اس بڑے گھر میں برا جمان تھی جو پانچ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سرسبز قطعۂ اراضی تھا۔ وہ چھڑی کا سہارا لے کر اس کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کرتا۔ وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی حالانکہ رچرڈ کو اس کے ساتھ چلنے میں دشواری ہوتی تھی اور وہ نقاہت محسوس کرنے لگتا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور یہ واضح طور پر الزائمر کی علامت تھی جس میں وقت سے پہلے عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ لارا دن بہ دن اس کے خیالات پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ شام کو اس کے گھر چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

کچھ عرصہ رچرڈ نے اس کی نگرانی کی کہ وہ کن کمروں میں کام کر رہی ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نے بھی اس پر نظر رکھنا چھوڑ دی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ گھر کے کس حصے میں کام کر رہی ہے اور نہ ہی وہ اس سے اس بارے میں پوچھتا بلکہ بعض اوقات تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کام پر آئی ہوئی بھی ہے۔ اس کا پتا اسے ویکیوم کلینر یا لانڈری ڈرائر کی آواز سے چلتا۔ جمعے کی سہ پہر وہ اس کی اسٹڈی میں آ کر اس ہفتے کا بل دیتی اور وہ بخوشی اسے چیک یا نقد رقم کی صورت میں ادائیگی کر دیتا۔

ایک مرتبہ وہ سوموار کے دن نہیں آئی تو رچرڈ کو بے چینی ہونے لگی لیکن جب وہ منگل کو بھی نہیں آئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ایس جے فائن کلیننگ کمپنی کا کارڈ اٹھایا جو لارا نے اسے پہلے روز دیا تھا۔ رچرڈ نے اپنی عادت کے مطابق اسے اپنے ڈیسک کی خالی دراز میں رکھ لیا تھا۔ اس نے کارڈ پر لکھا ہوا کمپنی کا نمبر ملایا۔

''یس!'' دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

''میں مس لارا وائٹ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' رچرڈ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کون بول رہا ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میرا نام رچرڈ آن اسٹیڈ ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی پھر اسی آواز نے کہا۔ ''مسٹر رچرڈ! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مس وائٹ اب یہاں کام نہیں کرتی۔ اس نے پچھلے ہفتے ہی یہ ملازمت چھوڑی ہے لیکن ہمارے پاس اور بھی اچھے لوگ ہیں اور مجھے یقین ہے ہم تمہارے لیے دوسرا بندوبست کر سکتے ہیں جو تمہیں پسند آئے گا تاکہ آئندہ بھی تمہارے مکان کی صفائی ہوتی رہے۔''

رچرڈ خالی نظروں سے اسٹڈی کی دیوار کو گھورنے لگا پھر اس نے کہا۔

''مس وائٹ کے ساتھ کیا ہوا، وہ تمہارے یہاں کام کیوں نہیں کر رہی؟''

ایک بار پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''میں مس وائٹ کے لیے ہی اصرار کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہی میرے مکان کی صفائی کرے۔''

''میں منیجر سے تمہاری بات کروا دیتی ہوں۔'' اس آواز نے کہا۔

کچھ دیر بعد اسے ایک اور زنانہ آواز سنائی دی۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ مس وائٹ ہی میرے مکان کی صفائی جاری رکھے۔''

''مجھے افسوس ہے جناب۔'' منیجر نے کہا۔ ''لیکن اب مس وائٹ یہاں کام نہیں کرتی۔''

رچرڈ میں ان لوگوں سے بحث کرنے کی مزید طاقت

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نہیں تھی۔ اس نے جھلا کر فون رکھ دیا۔ چند قدم چلتا ہوا ..... کرسی تک گیا اور آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ وہ سہ پہر اسے بہت طویل محسوس ہو رہی تھی... شام میں بارش شروع ہو گئی۔ اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

ایک اور دن گزر گیا۔ اس نے چھڑی کی مدد سے پورے گھر میں ٹہل ٹہل کر وقت گزارا۔ کبھی وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا۔ کبھی ٹیرس پر کھڑے ہو کر باغ کو دیکھتا پھر گھر میں واپس آ جاتا۔ جمعرات کی سہ پہر وہ اسٹڈی میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے لارا کھڑی ہوئی تھی، البتہ اس نے کمپنی کی یونیفارم کے بجائے بلیو جینز اور سفید قمیص پہن رکھی تھی اور بال بھی ڈائی کروالیے تھے اور اب وہ سنہری ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت چھپی نہ رہ سکی کہ اس کی بائیں آنکھ زخمی تھی جیسے اس کا کسی سے جھگڑا ہوا ہو۔ اسے دیکھ کر رچرڈ کو مارلن منرو کی جوانی یاد آ گئی۔

اس کے خیال میں یہی لارا کا اصل روپ تھا۔ ایک بدکار عورت جو مرد کو بہکانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وہ لارا تھی جسے اس نے اپنی جوانی میں رسالوں کے سرورق پر دیکھا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ ایسی عورتیں منشیات فروشوں، دلالوں اور چوروں کی ساتھی ہوتی ہیں۔ اس نے پہلے ہی ہفتے میں یہ تاثر دے دیا تھا لیکن وہ اس پر انگلی نہ اٹھا سکا۔ شاید کمپنی کی ملازمت نے اسے بھیس بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے تنگ جینز اور ٹی شرٹ پہنے یوں کھڑی ہوئی تھی جیسے اس کے لیے پوز بنا رہی ہو اور کہہ رہی ہو، یہ میرا اصلی روپ ہے۔ کیا اب بھی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟

اس کے عقب میں پورچ پر کچھ نیا سامان رکھا ہوا تھا جس میں ایک بالٹی ایک ڈسٹ پین، صفائی کے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بیگ اور کلینزر کی بوتلیں شامل تھیں۔ اس نے ہونٹوں سے سگریٹ نکالا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوپر کی منزل کے کمروں میں کچھ کام باقی ہے۔'' اس نے نرم لیکن جھجکتی ہوئی آواز میں کہا۔ رچرڈ کا دل بوجھل ہو گیا اور وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ اس کے پاس سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف جانے لگی تو رچرڈ پوچھ بیٹھا۔ ''کیا بات ہے۔ آج تم کمپنی کی یونیفارم میں نہیں ہو؟''

''ہاں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی ہے اور ذاتی حیثیت میں صفائی کا کام کر رہی ہوں۔''

''وجہ؟'' رچرڈ نے پوچھا۔

''وہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تھے۔'' اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ فضول قسم کے لوگوں کے سوالات کے جواب دوں۔ خاص طور پر وہ منیجر جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ ماتحتوں سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔''

''میں نے تمہارے بارے میں پوچھنے کے لیے کمپنی فون کیا تھا۔'' رچرڈ نے کہا۔

''ہاں۔ میں جانتی ہوں۔''

اس جواب نے رچرڈ کو حیران کر دیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بس چپ چاپ کھڑا اسے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ چند منٹوں بعد ہی اوپر سے بالٹی کھینچنے اور فرش رگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ واپس اسٹڈی میں چلا گیا اور وہ ناول اٹھا لیا جسے وہ کئی مہینوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نظریں اسٹڈی کی دیوار پر جم گئیں۔ لارا کی موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی۔ دوسری جانب وہ اس کے واپس آنے پر خوش بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے دوبارہ مل گئی ہے گو کہ وہ قناعت پسند تھا.... زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ بہت سی چیزیں، تعلق اور رشتے عارضی ہوتے ہیں پھر وہ لارا کی اتنی پروا کیوں کر رہا ہے جبکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک حماقت ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی نظر میں وہ پرانی فلموں کا ایک زنانہ کردار تھی جو ایک حقیقی عورت کے روپ میں اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور وہ کوشش کے باوجود اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

لارا نے ایک بار پھر صفائی کا کام سنبھال لیا تھا۔ اسے باتیں کرنے کا مرض تھا اور رچرڈ بھی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر اس کے ساتھ رہے۔ لارا کو کریدنے کی بہت عادت تھی۔ بہت کچھ جان لینے کے باوجود اس کے سوالات کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی اس کے خاندان، بیٹی اور بیوی کے بارے میں پوچھا کرتی۔ ایک دن وہ سٹنگ روم کے فرنیچر پر پالش کر رہی تھی کہ رچرڈ کو اپنی بیٹی ایملی یاد آ گئی۔ اس نے بیٹی کی پیدائش سے لے کر اس کے بڑے ہونے تک کے واقعات بیان کر دیے۔ لارا اس کی باتیں غور سے سنتی اور سر ہلاتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ اس کی بیوی کے قریبی رشتے داروں کے بارے میں بھی پوچھتی۔ اس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے باتوں باتوں میں رچرڈ سے اس کے مکان کی مالیت اور دیگر اثاثوں کے بارے میں بھی دریافت کرلیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ رچرڈ کے قریبی رشتے داروں میں کون کون زندہ ہے اور اس نے اپنی سادگی میں اعتراف کرلیا کہ ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا۔

ٹھیک پانچ بجے لارا کو لینے کے لیے ٹویوٹا وین آگئی۔ رچرڈ نے کھڑکی میں سے گاڑی کو دیکھا، اس کی کھڑکیوں پر سیاہ شیشے تھے۔ اس لیے اسے کبھی بھی ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آئی۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی لارا نے کبھی اس کا تعارف کروایا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ایک طرف تو اس عورت نے رچرڈ سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک ایک بات پوچھ لی تھی اور دوسری جانب ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان کچھ ایسی حدود ہیں جنہیں وہ عبور کرنا نہیں چاہتی۔ اب رچرڈ کو اس کے بارے میں تجسس ہونے لگا کہ یہ عورت کون ہے جو اس کی زندگی میں دھڑلے سے داخل ہوگئی ہے۔

اس نے ایک بار پھر کمپنی کو فون کرکے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف یہ تصدیق کرسکے کہ لارا وائٹ نامی عورت نے صرف تین ماہ اس کمپنی میں کام کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کے عرصۂ ملازمت کی تاریخیں بتاسکتے ہیں کہ اس نے کس تاریخ کو کمپنی میں شمولیت اختیار کی اور کب وہ چھوڑ کر چلی گئی۔

لارا کی ڈیوٹی آٹھ گھنٹے کی تھی لیکن اب اس نے دیر تک رکنا شروع کردیا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے کام پر آتی اور رات نو بجے سے پہلے واپس نہ جاتی پھر ایک دن اس نے ٹویوٹا کے ڈرائیور کے بارے میں بھی بتادیا۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ لیری تھا لیکن اب ان میں علیحدگی ہوگئی تھی۔

''وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔'' لارا نے کہا۔ ''ہمارے درمیاں آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں .وہ کوکین کا عادی ہے اور اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں اسے چھوڑ رہی ہوں۔''

اس کے بعد رچرڈ نے اس وین کو ڈرائیو وے میں نہیں آتے دیکھا۔ لارا چند ہفتوں تک ٹیکسی سے آتی رہی اس کے بعد ایک اور تبدیلی آئی۔ وہ بھی جمعے کا ہی دن تھا جب رچرڈ نے کھڑکی سے اسے سوٹ کیس سمیت اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے یہ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا اور یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور ناگزیر تھا کہ وہ اس کے ساتھ آکر رہے۔ لارا نے رسماً بھی رچرڈ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ اس طرح اپنا سامان لے کر آگئی جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس پر بھی رچرڈ نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے اسے خوشی ہورہی تھی کہ اب لارا مستقل اس کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ اس نے لارا کو ایملی کا کمرا دے دیا۔

سردیاں گزر گئیں اور بہار کا موسم آگیا۔ لارا چاہتی تھی کہ اسے ہفتے کے اختتام پر معاوضے کی رقم نقد ادا کی جائے لیکن جب اسے بتایا گیا کہ قانونی طور پر وہ چیک کے ذریعے معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہے تو وہ مان گئی۔ رچرڈ نے ٹیکس کے حسابات تیار کرنے کے لیے اس کا پورا نام اور سوشل سیکیورٹی نمبر لے کر کاغذاتی کارروائی مکمل کی تاکہ وہ بھی ایک ایمان دار اور ٹیکس گزار شہری بن جائے۔ وہ اسے فراخ دلی سے معاوضہ ادا کرتا جبکہ بعض اوقات صفائی کا کام برائے نام ہوتا اور بعض اوقات بالکل نہیں ہوتا تھا۔

وہ اپنا زیادہ وقت باغ میں گزارتی اور رچرڈ اسے اکثر و بیشتر سیل فون پر باتیں کرتے دیکھا کرتا۔ لارا نے بتایا کہ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ان سے باتیں کرتی رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس وقت گزارنے اور دل بہلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کبھی وہ لیونگ روم میں بیٹھی اپنے ناخنوں کو پالش کررہی ہوتی یا ایک باکس میں سے چاکلیٹ نکال کر کھاتی رہتی، وہ چاکلیٹ کے باکس لیونگ روم میں رکھتا تھا کہ یہ اسے اپنی بیوی کی یاد دلاتے تھے جسے چاکلیٹ بہت پسند تھے۔ ایک دفعہ اس نے لارا کو کچن میں کاؤنٹر پر رکھے ٹی وی پر پروگرام دیکھتے ہوئے پایا۔ ساتھ ساتھ وہ مائیکرو ویو میں گرم کیے ہوئے پاپ کارن بھی کھارہی تھی۔

ایک روز رچرڈ کسی ناول کی تلاش میں لائبریری آیا تو وہ صوفے پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اگست کا مہینا تھا اور موسم گرم مرطوب ہوگیا تھا۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی اور پنکھے کی ہوا سے اس کی قمیص کچھ اوپر کھسک گئی تھی۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی، رچرڈ نے سوچا کہ اگر اس کی بیٹی ایملی زندہ ہوتی تو وہ بھی اس جیسی ہوتی۔ اسے اعتراف تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ شاید وہ اچھا باپ نہیں تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں لارا کو دیکھے جارہا تھا اور اس کے دل میں اس کے لیے پیار اور ہمدردی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

کسی زمانے میں وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ایک

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لیفٹیننٹ ولیم فیلسن کے ساتھ کنٹری کلب میں باقاعدگی سے گولف کھیلا کرتا تھا۔ بہت جلد ان دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ ایک دن اس نے ایس جے فائن کلاننگ کمپنی کو فون کیا اور منیجر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً ہی لائن پر آ گئی۔

''میں پولیس ڈیپارٹمنٹ سے لیفٹیننٹ فیلسن بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ہم تمہاری ایک سابق ملازمہ مس لارا وائٹ کے بارے میں تحقیقات کررہے ہیں۔ کیا میں تم سے اس سلسلے میں کچھ سوالات کرسکتا ہوں؟''

اس بار منیجر نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اس کے جانے کی وجہ بتادی۔ ''ہاں۔ ہم نے اسے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ کمپنی کی کئی چیزیں چوری کررہی تھی۔ آخر میں اسے کیش رجسٹر سے رقم چراتے ہوئے پکڑا گیا گو کہ ہم کسی جز وقتی ملازم کا پس منظر جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن لارا کے معاملے میں ایسا کرنا پڑا۔ جب اس کا گزشتہ ریکارڈ چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سنگین جرم کے سلسلے میں کافی وقت اصلاحی مرکز میں گزار چکی تھی۔''

''شکریہ'' رچرڈ نے کہا۔ ''اگر ضرورت ہوئی تو ہم تم سے دوبارہ رابطہ کریں گے۔''

لارا کے ماضی کے بارے میں جاننے کے باوجود رچرڈ کی عنایات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اس پر اسی طرح مہربان رہنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے اس کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ وکیل کی شدید مخالفت کے باوجود رچرڈ نے اپنی وصیت دوبارہ لکھوائی اور سب کچھ لارا وائٹ کے نام کردیا۔ اب وہ اس کے تمام اثاثوں بشمول مکان، کار اور لاکھوں کے اس سرمائے کی وارث تھی جو اس نے اسٹاک، بانڈز اور پراپرٹی میں لگا رکھی تھی لیکن اس نے لارا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس وہ چاہتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد لارا کو اس وصیت کے بارے میں معلوم ہو۔

لارا کے شب و روز بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تو تھوڑا بہت صفائی کا کام کرلیتی ورنہ سارا دن اِدھر اُدھر پھرتی رہتی۔ گھر کی ہر چیز اس کے تصرف میں تھی۔ وہ کبھی باغ میں چلی جاتی تو کبھی اسٹڈی میں بیٹھ کر کتابیں الٹ پلٹ کرتی۔ رچرڈ نے اسے کبھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن وہ اسٹڈی میں بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ رچرڈ بھی ٹہلتا ہوا اس طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی جیسے وہ سستی اور اکتاہٹ محسوس کررہی ہو۔ رچرڈ کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو کوئی مشغلہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے لیے فرانسیسی شراب کا پیگ بنایا۔ اس نے لارا سے کہا۔ ''تم اسٹڈی میں خالی بیٹھ کر وقت ضائع کرتی ہو۔ کوئی کتاب کیوں نہیں پڑھتیں؟''

لارا نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور بولی۔ ''میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔''

''کیا تم نے اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی؟'' رچرڈ نے پوچھا۔

''میں نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تھا لیکن پڑھائی میں دل نہیں لگا۔ میں کبھی بھی اچھی طالبِ علم نہیں رہی۔ مجبوراً مجھے اسکول چھوڑنا پڑا۔''

اس نے سگریٹ سلگایا اور لارا کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی سادگی اور معصومیت نے رچرڈ کا دل موہ لیا۔ اسے لارا کے سنہری بال، سیاہ چمڑے کی پتلون اور سبز کاٹن کی قمیص سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

''اسکول ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے ایم......'' وہ اسے ایملی کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے پچھلے چند ماہ میں اس عورت کے ساتھ جو وقت گزارا، اتنا زندگی بھر اس کی بیوی کے حصے میں نہیں آیا۔ لارا اس کے حواسوں پر بری طرح چھا گئی تھی۔

رات کے کھانے پر لارا نے اس کے لیے بھنا ہوا گوشت اور اسٹیم میں ابالی ہوئی گوبھی بنائی۔ کھانے کے دوران اس نے رچرڈ کو وائن بھی پیش کی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کی بیوی کا زیور پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں ہیروں کا ہار، ہاتھ میں انگوٹھیاں اور زمرد کا بریسلیٹ۔ وہ سوچنے لگا کہ لارا کب سے یہ زیور پہن رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ یہ زیور ایک مہاگنی کے باکس میں اس کی بیوی کی دوسری چیزوں کے ساتھ بیڈروم کی الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے لیزا کی موت کے بعد اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب لارا صرف زیور ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی کا سیاہ لباس، سیاہ موزے اور اونچی ایڑی کے سینڈل بھی پہنے اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

رچرڈ کو اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ لارا نے اس کی بیوی کا زیور یا کپڑے پہنے، اس کے برعکس اسے خوشی ہوئی کہ وہ ان چیزوں میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ ہر جگہ موجود تھی۔ اس کے بارے میں رچرڈ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے ایک ہی بات سوچی کہ وہ عورت اس کی بن چکی تھی، صرف اس کی۔

اس طرح پورا ایک سال گزر گیا۔ لارا بالکل اسی طرح اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی جیسے کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی۔ ایک برس قبل یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی لیکن اب یقین ہو چلا تھا کہ اسے لارا سے محبت ہوگئی ہے۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ لارا کو اس کے گھر میں رہتے ہوئے کتنے مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا لارا بھی اس سے محبت کرتی ہے اور اس کا جواب اسے بہت جلد مل گیا۔

وہ آخر اکتوبر کی ایک سہ پہر تھی جب لارا اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ وہی عورت تھی جس سے اس نے ساری عمر محبت کی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو کھو چکا تھا اور اب ان کی جگہ لینے کے لیے یہ عورت آ گئی تھی۔

اس نے نیوی بلیو اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے جسے دیکھ کر رچرڈ کو اپنی جوانی میں رسالوں کے سرورق پر براجمان بے باک دوشیزائیں یاد آ گئیں۔ تو کیا یہ بھی ان جیسی ہی تھی جو اس کا سکون غارت کرنے آ گئی تھی یا محض ایک سانولی خوب صورت لڑکی جس نے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔

وہ بریٹا 380 پستول تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں ہیروں کا ہار پکڑ رکھا تھا۔ رچرڈ نے غور کیا کہ اس نے اپنا سوٹ کیس بھی تیار کر لیا تھا جو اس کے عقب میں دروازے کے پاس فرش پر رکھا ہوا تھا۔

''میں زیور لے جا رہی ہوں۔'' اس نے کہا لیکن وہ اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی اس عورت نے گن کا استعمال کیا ہے؟ اسے اس بارے میں شبہ تھا۔ اس وقت بھی وہ پورے میک اپ میں سجی سنوری کھڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ اپنے پرانے کیمرے سے اس کی ایک تصویر بنا لے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس یہ گن کتنے عرصے سے ہوگی اور کیا اس نے اس کا لائسنس بنوایا ہے؟ اس بارے میں بھی اسے شبہ تھا۔ ایک صفائی کرنے والی عورت کے پاس گن کا کیا کام۔ ممکن ہے کہ یہ اس نے اپنے پرانے بوائے فرینڈ سے چرائی ہو جو اسے مارتا یا منشیات کا دھندا کرتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اسی نے یہ گن لارا کو دی ہو۔ شاید وہ دونوں اب بھی مل کر وارداتیں کرتے ہوں۔

رچرڈ نے اطمینان سے سر ہلایا اور اس سے کہا کہ وہ پُرسکون رہے۔ وہ یہ سارا زیور اپنے ساتھ لے جا سکتی ہے۔ اسے ان چیزوں سے محروم ہونے کی بالکل پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک بار لارا کو اپنے بازوؤں میں لینا چاہ رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے اس فضول خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ غیر طبعی موت نہیں مرنا چاہ رہا تھا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بارش شروع ہوئی۔ لارا نے لپک کر صوفے سے اپنا رین کوٹ اٹھایا اور پہن لیا۔ پھر رچرڈ نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھ تمام زیور، نقد رقم اور گھر کی تمام قیمتی چیزیں لے گئی تھی۔ وہ چیزیں جو سوٹ کیس میں بہ آسانی سما سکتی تھیں۔

رچرڈ کو اس بارے میں ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھے تو لارا سیاہ رنگ کی ٹویوٹا کی طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر لیری اس کا منتظر ہوگا۔ اس لیے اسے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لارا نے صرف اپنا اعتبار جمانے کے لیے لیری سے قطع تعلق کی کہانی سنائی تھی، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اب بھی اس کا شریک کار تھا۔

لیکن جو کچھ وہ حاصل کر سکتی تھی، وہ اس واردات میں لوٹی گئی نقدی اور زیورات سے کہیں بڑھ کر تھا یعنی رچرڈ کے مرنے کے بعد... وصیت کے مطابق وہ اس کی لاکھوں کی جائداد اور اثاثوں کی واحد وارث تھی لیکن وہ اس وصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسی لیے اس نے دولت حاصل کرنے کے لیے یہ گھٹیا طریقہ اختیار کیا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ کبھی چھوٹے سے فائدے کے لیے اتنا بڑا نقصان برداشت نہ کرتی۔ رچرڈ نے سب سے پہلے اپنے وکیل کو فون کر کے وصیت منسوخ کرنے کو کہا۔ اسے نئی وصیت لکھوانے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور وہ سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی رچرڈ نے فون اٹھایا اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں فون کر کے کہا۔ ''آفیسر! میں ایک جرم کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔''

اسے یقین تھا کہ لارا کے سوشل سیکورٹی کارڈ کی مدد سے پولیس اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کا جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ کم از کم دوسرے لوگ تو اس کی کارروائیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اس نے تو نیک نیتی سے اسے فائدہ پہنچانا چاہا تھا لیکن وہ خود ہی اپنا نقصان کر بیٹھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

التجا

محمد شوکی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

برے وقتوں میں دوست تو دوست ساتھ چلنے والے سائے کی بھی بڑی قدر ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے ضرورت کے وقت سب سے پہلے ساتھ چھوڑنے والے یہی ہوتے ہیں۔ وہ خاندان جو طبقاتی اونچ نیچ کا شکار اور ہمدردی کا مستحق تھا لیکن نفرتوں کے تیر معصوم بچوں کو بھی زخمی کر گئے کیونکہ... اونچی ذات والوں کو ہر طرح سے برتری حاصل تھی جبکہ انہیں کھل کر سانس لینے کی بھی اجازت نہ تھی۔

بعد از مرگ...... بھٹکتی روحوں کی دردانگیز التجاؤں کا قصہ

ٹھک ٹھک ٹھک ......آواز سن کر کمرے میں بیٹھا ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک آدمی اپنی عینک ٹھیک کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور کچھ کہے بغیر مجھے گھورنے لگا جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

''جی مجھے کرائے پر کمرا چاہیے۔'' میں نے جلدی سے کہا تو اس کے چہرے پر حیرت مزید گہری ہوگئی۔ اس لیے میں نے خود ہی اس کی توجہ اس عمارت کے بالکل اوپر لگے بڑے سے بورڈ پر مرکوز کروائی جس پر لکھا تھا...... ''شہر کے مرکز میں کرائے پر کمرا...... کرایہ نہ ہونے کے برابر۔'' جسے دیکھ کر وہ ایسا ٹپٹایا جیسے کوئی عجیب چیز غیر متوقع طور پر دیکھ لی ہو...... مگر اسی اثنا میں ایک موٹی سی عورت جو اس کی بیوی لگ رہی تھی، باہر نکل آئی اور معاملہ سمجھتے ہوئے خود ہی میرا بیگ کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

''کرائے کے لیے آئے ہو نا؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ بس پھر تو وہ خاتون بولنا شروع ہوگئی۔

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''بہت اچھا کمرا ہے ایک...... چوتھی منزل پر ہے، بس تھوڑا اوپر ہے۔ خیر تم تو جوان آدمی ہو...... عمارت کے مالک مسٹر جیمس نے چوتھی منزل پر وہ کمرا اسٹور روم کے طور پر چھوڑ رکھا ہے۔ ویسے چوتھی منزل پر رہتا ہی کون ہے، سارا حصہ ہی اسٹور روم سمجھ لو۔'' پھر خود ہی منہ پھاڑ کر ہنسنے لگی۔

باقی نچلی منزلوں میں کرائے پر مختلف کمپنیوں کے آفس تھے شاید مگر مجھے کوئی نظر نہیں آیا، نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ مسز بیکر میرا بیگ لیے آگے آگے چلنے لگی اور مجھے اشارے سے پیچھے آنے کو کہا۔ مجھے یاد ہے جب میں جانے لگا تو وہی بڑے میاں جنھوں نے دروازہ کھولا تھا، مجھے حسرت بھرے انداز میں گھورنے لگے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں نے ان کی نظروں میں چھپا پیغام پڑھ لیا ہوتا جو گویا مجھ سے منت کر رہا تھا کہ یہاں کرائے پر مت رہو۔ شاید بڑے میاں اس عمر میں اس خرانٹ عورت سے کوئی جھگڑا مول لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

بہرکیف وہ خاتون جس نے اپنا نام مسز بیکر بتایا تھا، مجھے کمرے کی بے شمار خصوصیات بتاتی رہی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بلڈنگ بہت پرانی ہے اور اس کے مالک مسٹر جیمس شہر کے مرکزی حصے میں رہتے ہیں مگر اس وقت مسٹر جیمس کی ملکیت میں اس بلڈنگ کے کچھ ہی حصے رہ گئے ہیں۔ باقی وہ بیچ چکے ہیں اور جو باقی ہیں، وہ کرائے پر دے دیے ہیں...... اور اس مقصد کے لیے مسز اور مسٹر بیکر کو چوکیدار کے طور پر نگران رکھا ہوا ہے۔

چوتھی منزل پر کچھ عرصہ پہلے آگ لگ گئی تھی جس کے بعد مرمت کی نوبت نہیں آئی اس لیے یہ دونوں منزلیں خالی پڑی تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے مسز بیکر نے خالی عمارت ہی کہا تھا مگر میں سمجھا کہ لوگ کم ہوں گے مگر جب میں چوتھی منزل پر پہنچا تو بھونچکا رہ گیا اس لیے کہ پوری راہداری ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔

دیواریں سیاہ اور دونوں جانب ادھ جلے دروازے اور دیواریں...... البتہ آخر کے دو کمرے ٹھیک نظر آرہے تھے۔ غالباً آگ اس طرف سے شروع ہوئی ہوگی مگر آخر تک پہنچ کر بجھ گئی ہوگی۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا دل خراب ہونے لگا اور میں نے کہا، میڈم یہاں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، براہ کرم میں چلتا ہوں۔ کہیں اور دیکھ لوں گا۔ میری یہ بات سن کر اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔

''دوسری جگہوں کے کمروں کا کرایہ پتا ہے؟ شہر کے اس حصے میں تم نہیں جانتے کہ... کرایہ کیا ہوتا ہے۔'' اور یہی میری دکھتی رگ تھی۔ اس لیے کہ یہ میری زندگی کی پہلی جاب تھی...... میرا آفس شہر کے مرکز میں تھا اور یہ عمارت بھی مرکز میں تھی اور یہاں سے آفس پہنچنا بہت آسان تھا...... اور چونکہ شروع میں مجھے کچھ مہینے انتہائی کم تنخواہ میں بطور ٹرینی کام کرنا تھا اس لیے میرے لیے کسی اور آپشن کا سوچنا بھی ناممکن تھا۔

اسی اثنا میں ہم کمرے کے سامنے آگئے۔ مسز بیکر نے ایک بڑے سے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ میری امیدوں کے برعکس کمرا اندر سے بہت اچھا اور سجا سجایا لگ رہا تھا جس کو دیکھ کر میرے اعصاب پر جو منفی تاثر چھایا تھا، وہ زائل ہوگیا۔ اس بڑے سے کمرے میں قالین، بیڈ، میز، کرسیاں وغیرہ سب کچھ تھا...... میری حیرت کو دیکھ کر مسز بیکر خود ہی بولی۔ ''اصل میں یہاں ایک اور بھلا مانس لڑکا رہتا تھا، تمہاری ہی عمر کا ہوگا...... بے چارہ۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''کیا ہوا...... بے چارہ کیوں کہا آپ نے؟''

''اس لیے کہ اس نے کرائے پر آنے کے چند دن بعد ہی کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔''

''خودکشی کر لی......؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں...... خودکشی...... مگر اس میں کمرے کا کیا قصور...... اس کا خود ہی کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی کہنے لگا ساری رات آوازیں آتی ہیں۔ بچوں کے دوڑنے کی، بچوں کے کھیلنے کی آوازیں۔ اب بھلا دیکھو، یہ عمارت جب سے جلی ہے کوئی پانچ سال ہوگئے۔ اس کا کیس عدالت میں لٹکا ہوا ہے جس کی بنا پر اس کی مرمت بھی نہیں کی جاسکتی اس لیے اگر اب مسٹر جیمس نے اونے پونے پر کرائے پر کمرا چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں میرا بھی فائدہ ہے۔ اس بہانے مجھے بھی کچھ کمیشن مل جاتا ہے۔'' مسز بیکر نے اصل بات بتا ہی دی۔

مسز بیکر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا مجھے کون سا یہاں سارا دن رہنا ہے۔ صبح سے شام تک آفس، صرف رات کو ہی آنا ہے اور چھٹی والا دن تو ویسے بھی اکثر دوستوں کے ہاں ہی گزرتا ہے۔

بہرحال اس طرح میں نے کمرا کرائے پر لے لیا۔ کرائے پر گھر لینے کے بعد کے چند دن بہت مصروف رہے۔ سامان کی منتقلی کے ساتھ جاب کے نئے دن اکثر اوقات رات گئے واپسی ہوتی اور آتے ہی نیند کی وادیوں میں کھو جاتا۔ کچھ دنوں بعد میں اس نئی روٹین کا عادی ہوگیا اور مجھے اس ویران اور ادھ جلے فلور کے آخری کونے میں موجود اپنے کمرے سے ایک طرح کی انسیت ہوگئی اور خوف کا جو احساس سا تھا، وہ نہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

صرف ختم ہوگیا بلکہ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا کہ شہر کے اس حصے میں کم ۔۔۔۔ کرائے پر مجھے کمرا مل گیا۔

روز جب میں آفس جانے کے لیے سیڑھیوں سے نیچے اترتا تو مسز بیکر کے کمرے کے سامنے سے ہوتا ہوا گزرتا اور اکثر ایسا ہوتا اگر وہ دروازے پر ہوتی یا ان کا مظلوم سا شوہر ہوتا تو مجھے دیکھ کر ہاتھ ہوا میں لہرا دیتا۔ مسز بیکر کے برعکس مسٹر بیکر کی آنکھوں میں نظر آنے والا خوف البتہ مجھے ہر بار بے چین سا کر دیتا تھا۔

کوئی تین ہفتے بعد ایسا ہوا کہ مجھے دفتری ٹریننگ کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا اور شاید میں چار دن بعد رات دیر گئے واپس آیا۔ واپسی پر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میں جس فلور پر رہتا تھا، وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جلی ہوئی عمارت کے بجائے ایک صاف ستھری سی عمارت، صحیح سالم کمروں کے دروازے...... میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اتنی جلدی عمارت کیسے مرمت کر دی گئی...... بہرحال میرا کمراجوں کا توں تھا اور میں جلدی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ غالباً رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپری منزل پر بچے دوڑ رہے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا...... کیونکہ اوپری منزل خالی بلکہ صرف چھت تھی۔ ہاں ایک دو خالی کوارٹر سے بنے ہوئے تھے جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ پہلے عمارت کے ملازمین کے کمرے ہوا کرتے تھے۔ میں نے کچھ دیر سونے کی کوشش کی مگر آواز بار بار آ رہی تھی۔ مجھے کافی کوفت محسوس ہوئی اور سوچا کہ صبح مسز بیکر سے شکایت کروں گا۔

رات کو آخرکار کسی پہر نیند آ ہی گئی۔ صبح مسز بیکر سے شکایت کے لیے سوچا مگر پھر یہ خیال آیا کہ عمارت کی مرمت کے بعد مسز بیکر لازمی کرایہ بڑھانے کا کہے گی جس سے بچنے کے لیے میں جان بوجھ کر کنی کترا کر نکل گیا۔ اسی طرح واپسی پر بھی میں نے کوشش کی کہ مسز بیکر کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کی نظر نہ پڑنے پائے۔

واپسی پر بھی وہی منظر تھا۔ ایک دو لوگ بھی نظر آئے جو غالباً نئے کرائے دار تھے اور وہ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک عجیب سی بے نوری اور زندگی سے دوری کا احساس غالب تھا۔ یہ لوگ اپنے لباس اور چہروں مہروں سے مجھے کافی امیر کبیر اور متکبر سے نظر آئے مگر میں نظرانداز کرتا ہوا حسبِ معمول اپنے کمرے میں جاتے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ رات کے کسی پہر پچھلی رات کی طرح دوبارہ بچوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا آج اوپر جا کر ذرا ان بچوں کی خبر لیتا ہوں۔ ہمت کر کے میں نے دروازہ کھولا اور چھت پر آ گیا۔ وہاں واقعی چند گندے سندے سے بچے کھیل رہے تھے۔ یہ چہروں سے بڑے معصوم لگ رہے تھے مگر ان کے پھٹے پرانے معمولی کپڑے دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ مجھے دیکھ کر بچے سہم کر رک گئے۔ میں نے قریب جا کر ایک بچی کو ہاتھ سے پکڑا۔ اس کا ہاتھ برف کے مانند ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچوڑ دیا گیا ہو۔ خوف کے احساس سے میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ البتہ بچی کی آنکھوں میں موجود ایک گہری مظلومانہ معصومیت سی تھی جو مجھے متاثر کر رہی تھی۔ آخرکار خوف کے تاثر اور رحم کا جذبہ غالب آ گیا۔ میں نے پیار سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ڈیبی!“ بچی نے معصومیت سے کہا۔

”تم اتنی رات گئے کیوں کھیل رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اتنے میں ایک عورت جو غالباً اس کی ماں تھی کمرے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ ”مسٹر! دن بھر بیچاری بچی کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ رات کو بھی کبھی بچوں کے ساتھ کھیل لیتی ہے۔ چودھویں کی رات کے چاند میں ذرا روشنی ہو جاتی ہے نا یہاں۔“ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔

ماہر ریاضی

ایک اسٹور کے مالک نے نئے ملازم کو گودام دکھا کر کہا۔ ”تمہیں اس گودام کے سارے سامان کی فہرست بنانی ہے۔“

دوپہر کو مالک نے آ کر پوچھا۔

”کہاں تک پہنچے؟“

ملازم فخریہ انداز میں بولا۔ ”جناب! ابھی مونگ پھلی کی ایک ہی بوری سے فارغ ہوا ہوں۔ اس میں کل پندرہ ہزار نو سو ساٹھ مونگ پھلیاں ہیں۔ یہ بالکل صاف ہیں۔ کچرے کی گنتی ابھی باقی ہے۔“

اچھی بات

مالک ملازم سے۔ ”بے وقوف لوگ بھی کبھی کبھی اچھی بات کہہ جاتے ہیں۔“

ملازم۔ ”یہ بات آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔“

مرسلہ: ریاض بٹ ۔ حسن ابدال

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

واقعی چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں بچی کی ماں کی بات سن کر مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہوں اچھا کھیلو، خوب کھیلو اور کچھ دیر بعد نیچے آ گیا۔ وہ آوازیں نہ جانے کتنی دیر تک اور آتی رہیں مگر جب میری آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا اور آفس کو دیر ہو رہی تھی۔ اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ آوازیں اب بھی کبھی کبھی آتی رہتی تھیں مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔

چند دن بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ رات کے کسی پہر دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سات آٹھ افراد جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہی تھے، ایک وفد کی سی صورت میں کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ ان میں سے ایک آدمی بولا۔ ”مسٹر؟“ وہ رکا۔ میں خود ہی بولا۔

”شون۔“

”جی مسٹر شون...... جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب معززین ہیں اور ہم سب کو صبح دفاتر جانا ہوتا ہے۔ ملازمین کے بچے جو چھت پر رہتے ہیں، رات بھر شور کرتے ہیں۔ ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔“ یہاں تک کہہ کر وہ رکا اور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر دوبارہ کہنے لگا۔ ”ہم یہاں ایک درخواست لکھ کر لائے ہیں جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط لے رہے ہیں جس کا مقصد ملازمین اور ان کے بچوں کو سزا دینا ہے۔“

”سزا دینا؟“ میں نے نہ سمجھنے کے انداز میں کہا۔

”جی ہاں، سب کے دستخط جب ہم لے لیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہم سب ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ ملازمین کے بچوں کو سزا دی جائے۔ اس طرح انتظامیہ کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اور پھر ہم سب مل کر ان کو سزا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر انتہائی سفاکانہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے دیکھا بقیہ تمام لوگوں کے چہروں پر بھی ایسی ہی بھیانک اور مکروہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اسی لمحے مجھے دائیں جانب کونے میں سکڑی سمٹی سی وہ بچی اور اس کی ماں نظر آئی جن سے رات کو میں نے بات کی تھی۔ ان کی آنکھوں میں، میں نے ایک واضح التجا محسوس کی۔ مجھے ایسا لگا یہ بغیر کہے مجھ سے بھیک مانگ رہی ہوں کہ خدارا اس پر دستخط نہ کرو...... میرا دل پسیج گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دستخط نہیں کروں گا۔ میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

”دیکھیں حضرات! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے خود بھی صبح آفس ہی جانا ہوتا ہے مگر اس کا حل یہ نہیں کہ ہم یوں ان معصوم بچوں کو سزا دیں۔ اس کا کچھ اور حل مل بیٹھ کر نکال لینا چاہیے۔“

”کیا...... ؟ یعنی آپ دستخط نہیں کر رہے؟“ اس نے انتہائی کرخت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا تمام لوگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ غالباً اس جواب کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی۔

”جی ہاں، میں دستخط نہیں کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک مجھے دروازے سے باہر غصے میں بھری کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں پھر وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ایسا لگا دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دے رہا ہو۔ میں جھلا کر اٹھا اور بیزاری سے دوبارہ دروازہ کھولا مگر اس دفعہ دروازے کے باہر وہی مظلوم عورت اور اس کی معصوم بچی کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر نجانے کیوں ہمیشہ کی طرح میرا دل رحم سے بھر گیا۔

”ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آپ نے دستخط نہیں کیے...... ورنہ...... ورنہ......“ وہ رک گئی۔

”ورنہ کیا؟“

”ورنہ یہ ہمیں جان سے مار دیتے؟“

”کیا مطلب...... جان سے کیسے مار دیتے؟“

”جی ہاں، یہ سب لوگ بہت ظالم ہیں۔ پہلے ہمیں بہت مارتے پھر چھت سے دھکا دے دیتے اور یہ کہہ دیتے کہ ہم نے غربت سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔“ عورت روتے ہوئے بولی۔ میں نے دل میں سوچا یہ عورت بھی ڈر اور خوف کی ایک انتہا پر پہنچی ہوئی ہے۔

”نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہوگا۔ آپ جائیں آرام کریں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے بہلا پھسلا کر چلتا کر دیا۔

صبح اٹھ کر جب میں آفس جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو میرے قدم وہیں رک گئے بلکہ خوف کی ایک لہر سی میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میری نظروں کے سامنے وہی جلی ہوئی خالی عمارت، ادھ جلے دروازے تھے۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ چند دن پہلے جو مرمت شدہ عمارت دیکھی تھی، کبھی یہاں تھی۔ کیا راتوں رات دوبارہ آگ لگ گئی؟ میں نے خود سے سوال کیا پھر جلدی جلدی نیچے آیا۔ اب مسز بیکر کو بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے سارا ماجرا مسز بیکر کو سنا دیا۔ میری بات سن کر مسٹر بیکر جو پاس ہی تھے، ہانپتے کانپتے میرے نزدیک آ گئے۔ میں وہ لمحات بھول نہیں سکتا جب مسٹر بیکر کو میں نے پہلی بار بولتے سنا تھا اور ان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کے الفاظ میں بھلا بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

”سارہ (غالباً مسز بیکر کا نام) اب مجھے اس نوجوان کو بتا ہی لینے دو۔“ مسز بیکر نے لمبا سانس کھینچا جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ ”بیٹا! اس عمارت کی ایک تاریخ ہے جو ہم تم سے چھپانا چاہتے تھے اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ہم کو ابھی تک خود یقین نہیں آیا تھا اس لیے بھی کہ اس بات کو چند مہینے ہی تو ہوئے ہیں...... آج سے چھ ماہ قبل اس بلڈنگ میں اسی طرح لوگ رہتے بستے تھے۔ خصوصاً چوتھا فلور جہاں رہائشی کمرے ہیں اس پر کافی لوگوں نے کرائے پر کمرے لیے ہوئے تھے۔ یہ کچھ امیر قسم کے اور کافی حد تک مغرور اور سخت دل تھے۔ سب سے اوپری منزل پر دو کمرے تھے جس میں اس بلڈنگ کے ملازمین کا ایک خاندان رہتا تھا جس کے کچھ بچے بھی تھے۔ کبھی کبھار بچے رات کو کھیل کھیل میں چھت پر اودھم مچا دیتے تھے جس کی شکایت ان لوگوں نے عمارت کے مالک سے کی۔ اس پر عمارت کے مالک نے کہا۔ کہ اگر سب ہی کو یہ شکایات ہیں تو ایک درخواست لکھی جائے جس پر تمام کرائے داروں کے دستخط ہوں۔ اگر سب راضی ہوں گے تو ان کو سزا کے طور پر برطرف کیا جاسکتا ہے۔ ان کرائے داروں نے ایسا ہی کیا البتہ مزید یہ... کیا کہ سب نے دستخط کرنے کے بعد مظلوم ملازمہ کی بچی کو خود سے بہت مارا حتیٰ کہ زخمی بھی کر دیا۔ جس کے کچھ دن بعد بچی مرگئی۔ کچھ دن بعد اس غم میں اس کی ماں نے بھی عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ اس پر سنگ دل کرائے داروں نے بجائے افسوس کرنے کے اور خوشیاں منائیں کہ جان چھوٹی...... مگر اس اندوہناک واقعے کے چند دن بعد ہی عمارت میں اچانک رات کو آگ لگ گئی اور بہت سے لوگ مرگئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ملازمہ کی بچی پر تشدد کیا تھا اور ان کو نکالنے کے لیے درخواست پر دستخط لیے تھے۔“

”درخواست؟“ مسٹر بیکر کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا تھا اور وہ خوفزدہ سے ہوگئے تھے۔

”کیا ہوا، کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، ساتھ ہی میں خوفزدہ بھی تھا۔

”ہاں، مسٹر شون! آگ لگنے کے بعد عمارت سے ایک صفحہ ملا، یہ وہی درخواست تھی جس پر سب نے دستخط کیے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ بالکل بھی نہیں جلا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک دراز میں سے ایک پرانا مگر صحیح سالم صفحہ نکالا جس میں کوئی بیس کے قریب نام لکھے تھے۔

”یہ آخری نام...... یہ تو لگ رہا ہے بعد میں خود لکھا گیا ہے۔“

”آخری نام...... ؟“ مسز بیکر ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ”یہ نام ان لوگوں کا نہیں لکھا ہوا۔ یہ اس کرائے دار کا ہے جو تم سے پہلے اس کمرے میں رہا تھا۔ اس کمرے میں رہنے کے کچھ دنوں بعد اس نے عجیب عجیب سی شکایات کرنا شروع کی تھیں کہ رات کو بچوں کے کھیلنے کودنے کی آوازیں آتی ہیں۔ جس پر میں نے غور نہ کیا مگر بعد میں اس نے یہ بھی ذکر کرنا شروع کردیا کہ اس فلور پر نئے لوگ آ گئے ہیں اور فلور کی بھی مرمت کر دی گئی ہے اور یہ کہ دوسرے لوگ بھی اس کھیلنے کودنے سے تنگ ہیں اور وہ سب مل کر مالکِ عمارت سے ایک شکایت کی درخواست لکھ رہے ہیں تو ہمیں اس کے نفسیاتی ہونے پر کوئی شبہ نہیں رہا اس لیے کہ ایسے لوگ پہلے بھی آتے رہے ہیں لہٰذا ہم تو اسے عام سا نفسیاتی مریض ہی سمجھے کیونکہ ہمیں نہ تو نئے کرائے دار نظر آئے تھے، نہ ہی عمارت مرمت شدہ نظر آئی تھی...... پھر...... پھر ایک دن صبح کو اس کی لاش عین کھڑکی کے نیچے سڑک پر پڑی نظر آئی جس پر ہم نے یہی سمجھا کہ اس نے خودکشی کرلی۔ اس کے اگلے دن یہ صفحہ ہمیں دوبارہ باہر عین اسی جگہ نظر آیا جہاں پہلے ملا تھا اور اس میں واضح طور پر نئے کرائے دار کے نام کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔“

یہ کہہ کر مسز بیکر تو خاموش ہوگئی مگر مجھ پر صورتِ حال واضح ہوگئی تھی اور میرا خیال ہے مسٹر اور مسز بیکر بھی سمجھ چکے تھے ۔۔ نئے کرائے دار نے درخواست پر دستخط کر دیے ہوں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ملازمہ کی بچی (روح) کو سزا دینے پر راضی تھا جس کے بدلے میں وہ ملازمہ اور اس کی بچی (روحوں) کے انتقام کا نشانہ بنا۔ اس کا صاف مطلب تھا اگر میں کل دستخط کر دیتا تو آج میری لاش بھی ملتی۔ گویا یہ دستخط موت کے پروانے پر دستخط تھا۔

مسٹر اور مسز بیکر خاموش تھے۔

میں عجلت کے انداز میں ان کے کمرے سے نکل آیا اور اس بلڈنگ سے تھوڑا ہٹ کر لمبے لمبے سانس لے کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ اسی اثنا میں میں نے جو مڑ کر دیکھا تو چوتھی منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی پر میری نگاہ پڑی۔ میں نے واضح طور پر دیکھا اور میں یہ بھول بھی نہیں سکتا کہ کھڑکی کے اس پار وہی ملازمہ اور اس کی معصوم سی بچی میری طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کے چہروں پر ایک مسکراہٹ سی تھی جو میرے لیے اب اجنبی نہیں تھی۔ البتہ میں پسینے میں شرابور دہشت زدہ انداز میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں آج آفس سے واپس اس آسیبی عمارت میں رات بسر کرنے دوبارہ آسکوں گا؟

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پانچواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مہاراجا چندر گپتا کے لیے بڑی مشکل صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔

اسے مقدمے کی کارروائی اور اس دوران ہونے والے جھگڑے کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی بلکہ یہ اطلاع ایک شکایت کے طور پر مہاپجاری بدری ناتھ نے خود راج محل آکر اس کے گوش گزار کی تھی۔ اس کے ہمراہ اس کا چیلا پرس رام بھی تھا۔

بدری ناتھ نے حسبِ سابق ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ باقی جسم برہنہ تھا۔ شانے میں جنیو پڑا تھا۔ ماتھے پر بڑا سا نمایاں تلک تھا۔ گھٹے ہوئے سر پر موٹی سی چوٹی تھی۔

مہارانی نجو بائی بھی چندر گپتا کے بائیں ہاتھ والی ایک نشست پر شاہانہ تمکنت کے ساتھ براجمان تھی۔ بدری ناتھ کو اسی نے شکایت کے لیے بلوایا تھا اور اب بہ ظاہر خاموشی سے محوِ تماشا تھی۔

"حضور! آپ کے مہمانوں نے تو مقدمہ ہارتے ہی کالی کے مندر جیسی پوتر جگہ پر دنگا فساد کر ڈالا۔ میرے پجاریوں کے ساتھ خوب مار پیٹ کی۔" بدری ناتھ خوب نمک مرچ لگا کر رینا وغیرہ کے خلاف مہاراجا کو بھڑکانے لگا۔ وہ مکار آدمی تھا۔ اس نے دانستہ شوکت حسین کا نام نہیں لیا تھا، وہ جانتا تھا کہ شوکت کی حیثیت محض ایک ملازم کی سی تھی جبکہ ان کی "سالار" اب رینا تھی۔

"یہی نہیں حضور!" پرس رام نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ "مقدمے کی ہار نے اس فرنگن دوشیزہ کے ساتھیوں کے درمیان آپس میں بھی پھوٹ ڈال دی تھی۔ پھر ان کے ہی ایک مسلے نوکر شوکت نے اپنے ہی مالکوں کے ایک آدمی کو سچی گواہی دینے پر پیٹ ڈالا اور جب ہمارے ساتھیوں نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانا چاہا تو وہ مسٹنڈا مسلا ان کے ساتھ بھی مار پیٹ کرنے لگا۔ بہت سرچڑھا رکھا ہے اس فرنگن دوشیزہ نے اپنے اس نوکر کو۔"

"مجھے تو حضور! اس رنگین مزاج فرنگن اور اس مسلے نوکر کے درمیان کوئی چکر لگتا ہے۔" بدری ناتھ نے مہارانی نجو بائی والی آگ کو مہاراجا کے دل میں مزید فروزاں کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجیے گا حضور! اوپر سے ولی عہد نے اس مقدمے کی کارروائی کو عام کر ڈالا تھا، یوں سب لوگوں نے یہ مناظر دیکھے اور اب ریاست میں عام لوگ باگ مشتعل ہو رہے ہیں کہ کالی کے مندر میں دھارمک پجاریوں کے ساتھ اس مسلے نوکر اور فرنگن نے بڑا اپمان کیا ہے۔ لہٰذا انہیں راج محل سے ہی نہیں بلکہ ریاست سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ ورنہ پرجا پر اس کا برا اثر پڑے گا۔" پرس رام نے پھر زہر میں بجھا لقمہ دیا۔

ان دونوں سازشیوں نے راج محل میں آنے اور مہاراجا چندر گپتا سے ملاقات سے پہلے ہی ایک گل کھلایا تھا۔ ایک شرپسند ٹولا تیار کر کے ریاست کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا، تاکہ وہ عام لوگوں کو راج محل کے مہمانوں کے خلاف بھڑکانے کا کام انجام دے سکے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ٹولے کو سختی سے تاکید کی تھی کہ مہاراجا یا راج محل کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالیں، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ اس معاملے میں مہاراجا چندر گپتا کس قدر سخت تھا، وہ ایک لفظ بھی اپنے خلاف سننا پسند نہیں کرتا تھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

اچانک کمرے میں ایک بارعب سی آواز ابھری۔ بدری ناتھ اور پرس رام نے چونک کر نظر اٹھا کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ولی عہد پرتاب بڑی شاہانہ چال کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا، اس نے ان دونوں شاطریوں کی باتیں سن لی تھیں۔ مہاراجا چندر گپتا کے بائیں بازو پر بیٹھی نجو بائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے، ساتھ ہی وہ کچھ فکرمندی بھی نظر آنے لگی تھی۔

راج محل میں صرف ولی عہد اور مہارانی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بغیر اجازت کے مہاراجا چندر گپتا کے کمرے میں داخل ہو سکیں۔

یہ کہنے کے بعد راج کمار پرتاب نے بڑے احترام کے ساتھ باپ کو سلام پیش کیا اور اس کے قریب والی ایک نقشین مسند پر براجمان ہو گیا۔ وہ اب مہاراجا سے مخاطب ہو کے بولا۔

"پتاجی! یہ درست ہے کہ مقدمے میں جیت ہماری ہی ہوئی تھی، لیکن بلوے کے ذمے دار وہ مہمان لوگ نہیں بلکہ وہ چار ہٹے کٹے پجاری تھے جنہوں نے نہتے اور اکیلے شوکی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔"

مہارانی نجو بائی جواب تک دانستہ مکارانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی، فوراً بولی۔

"یہ غلط ہے.. جھگڑے کی ابتدا اس آوارہ فرنگن دوشیزہ کے مسلے عاشق شوکت حسین نے کی تھی۔ مقدمے کی شکست پر آگ بگولا ہو کر وہ اپنے ہی ساتھی رابرٹ کو مارنے کے لیے لپکا تھا۔ بیچ بچاؤ کی صورت میں اس نے دھارمک پجاریوں کو بھی نہ چھوڑا۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایسے میں بدری ناتھ کے چیلے پرس رام نے مکاری سے کہا۔ "میرا خیال ہے اگر ہم اسی بحث میں الجھے رہے تو کہیں ایک اور مقدمے کی نہ ضرورت پیش آجائے۔ بہتر یہی ہے کہ اب اس تازہ صورتِ حال سے نمٹنے کے بارے میں سوچا جائے جس سے ریاست اور پرجا پر غلط اثر پڑنے لگا ہے۔ کیونکہ ہم پراور کالی کے مندر کی پوترتا پر الزام لگانے والے مقدمہ ہار چکے ہیں اور اب حضور کو اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

پرس رام اپنی بات پوری کر کے چپ ہو رہا۔ اس نے بڑی مکاری سے اس طرف سے دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی۔ تب ہی مہارانی نجو بائی اپنے پتی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"گپتا جی! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس فضول اور لاحاصل مسئلے سے ترنت جان چھڑالی جائے۔ جس کا سیدھا سا حل یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مہمانوں کو یہاں سے فوری طور پر چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ پرجا شانت ہو جائے گی۔ ریاست اس سے زیادہ کئی اہم معاملات میں اس وقت الجھی ہوئی ہے۔ ان پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔"

مہاراجا چندر گپتا اپنی بیوی اور بیٹے پرتاب سے بعض اہم ریاستی معاملات کے سلسلے میں صلح و مشورہ کیا کرتا تھا۔ مائیکل شا کے ایلچی جان پال سے کی گئی اہم نشست کے بارے میں اگرچہ ابھی وہ ان دونوں سے کوئی مشاورت نہیں کر سکا تھا، وجہ یہی نیا مسئلہ تھا۔ تاہم نجو بائی، جان پال کے علم میں تھوڑا بہت تھا کہ برٹش گورنمنٹ اس کے پتی سے کیا چاہتی تھی اور جب جان پال کی آمد ہوئی تو وہ بھانپ چکی تھی کہ سرکار انگلشیہ ان سے کون سا اہم کام لینے والی تھی۔ چنانچہ نجو بائی کا یہ چلتر چل گیا اور مہاراجا گپتا بڑے پریشان کن لہجے میں بیٹے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پرتاب! میں نے تمہیں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانے کی ہدایت کی تھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے بجائے اس معاملے کو نمٹانے کے مزید الجھا کر رکھ دیا ہے۔ کاش! جان پال کے ساتھ میں مصروف نہ ہوتا تو خود ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اب ہم کیسے ان مہمانوں کو یہاں سے چلے جانے کا کہیں؟ یہ بات ہماری شان کے ہی خلاف نہیں بلکہ مائیکل شا سے ناراضگی کا بھی سبب بن سکتی ہے اور اس وقت ہم ان کے ساتھ ایک اہم ریاستی معاملہ داری کے معاہدے میں ہیں جو متاثر ہو سکتا ہے۔"

شوہر کی بات سن کر نجو بائی دل ہی دل میں خوش ہوئی کیونکہ آج پہلی بار اس نے اپنی آنکھوں میں کھٹکنے والے ولی عہد پرتاب کے لیے شوہر کی زبان سے اس طرح کی عدم اعتمادی کا اظہار کرتے سنا تھا۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ کی بولی۔

"یہ تو پھر واقعی مشکل پڑ جائے گی۔ ریاست کے وسیع تر مفادات میں سرکار انگلشیہ کو ناراض کرنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔" وہ ذرا رکی اور پھر شوہر کی پریشانی کو مزید ابھارتے ہوئے دوبارہ مکاری سے بولی۔

"گپتا جی! ابھی تو جنرل مائیکل شا کا ردعمل سامنے نہیں آیا ہے کہ اپنے دوست پروفیسر ہنری برنارڈ کی موت پر اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی۔ میں نے سنا ہے کہ ہنری، مائیکل شا کے بہت پیارے اور قریبی دوستوں میں سے ایک تھا۔"

"یہی تو میرے لیے سب سے زیادہ چنتا کی بات ہے نجو بائی!" حسب توقع مہاراجا گپتا نے انتہائی ژولیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے اسی کے ردعمل کا انتظار ہے، مگر یہ بھی سوچتا ہوں کہ اسے جواب کیا دوں گا؟ پروفیسر ہنری کے سلسلے میں جنرل نے مجھے خصوصی طور پر کہا تھا کہ ان کا خیال رکھا جائے لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔"

"گپتا جی! آپ ابھی سے اپنے دل پر کوئی بار نہ لیں۔" نجو بائی بولی۔ "پہلے مائیکل شا کا ردعمل سامنے آنے دیں۔ بلکہ انہیں پہلی فرصت میں ساری تفصیل لکھ کر روانہ کر دیں کہ ان کے مہمانوں نے یہاں کیا گل کھلایا اور اگر انہیں جلد ہی یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا تو صورت حال کسی کے حق میں نہیں رہے گی، پھر دیکھیں وہ کیا... ردعمل ظاہر کرتا ہے۔"

"پتاجی! آپ چنتا کیوں کرتے ہیں؟" ولی عہد پرتاب اپنی ماں کی بات پر باپ سے بولا۔ "میں خود ہی اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لوں گا۔"

"جیسے پہلے کیا تھا؟" نجو بائی، جو ولی عہد کی سبکی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی، فوراً طنزیہ لہجے میں پرتاب کی طرف تیکھے چتونوں سے دیکھ کر بولی۔ "تم اب رہنے ہی دو، پہلے کی طرح پھر اسے الجھا دو گے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے پتاجی پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ میں اپنے بیٹے ایش کمار سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت ذہین اور سمجھدار ہے۔ اگر پہلے ہی یہ مسئلہ اس کے سپرد کر دیا جاتا تو اب تک خوش اسلوبی سے حل ہو چکا ہوتا۔" نجو بائی نے بڑی مکاری سے اپنے بیٹے کی توصیف کر ڈالی۔

"وہ کیا کر سکتا ہے نجو بائی! اسے تو سیر سپاٹوں اور بھاگن رلیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔" مہاراجا نے کہا تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نجوبائی ذرا خفا ہو کے شوہر سے بولی۔
"آپ تو بس ایسے ہی میرے بیٹے ایش کو بُرا کہتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو بس پرتاب ہی اچھا لگتا ہے اور ہر سے آپ اسے ہی میرے بیٹے پر فوقیت دیتے رہتے ہیں۔"
"بات اچھے یا بُرے لگنے کی نہیں ہے۔ پرتاب کی طرح ایش بھی میرا بیٹا ہے، میرا ہی خون ہے وہ......" بیوی کو ناراض پا کر مہاراجا بولا۔
"آپ نے بھی ایش کو کچھ کرنے کا موقع ہی کب دیا ہے بھلا؟ بھی کہتی ہوں کہ ایک بار تو آپ کو اس کی ذہانت کو آزما ہی لینا چاہیے۔" نجوبائی بدستور اسی لہجے میں بولی تو مہاراجا حیرت سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔
"ایک بار......! ہم تو اسے کئی بار آزما چکے ہیں۔ اول تو وہ کسی معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لیتا اور چار و ناچار لیتا بھی ہے تو الٹی گنگا بہا دیتا ہے۔"
"رہنے دیں اب...... آپ کے لاڈ کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہوگا آپ ایک بار اسے کہہ کر تو دیکھیں۔ وہ تو خود بھی آنا چاہ رہا تھا آپ سے اس مسئلے کے بارے میں بات کرنے کے لیے میں نے ہی منع کر دیا۔ کیا فائدہ، جب آپ اسے اہمیت ہی نہیں دیتے۔"
"یہ غلط ہے، ہم اپنے چھوٹے راجکمار کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی کہ بڑے کو مگر......" مہاراجا نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور بولا۔
"اچھا ذرا بلاؤ...... ایش کو۔"
"وہ اس وقت مہمانوں کے ساتھ ہے اور ان کی...... دلجمعی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" نجوبائی نے بڑی مکاری سے جھوٹ بولا۔ "آپ کے کہنے سے پہلے ہی وہ اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ پتاجی سے کہہ دینا چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، میں کل تک اس پورے مسئلے کو سنوار دوں گا۔"
بیوی کی بات سن کر مہاراجا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی مگر پوری طرح وہ مطمئن نہیں ہوا۔ تاہم خاموش رہا۔
درحقیقت نجوبائی کے شاطرانہ ذہن میں ایسے نازک وقت میں ایک اور چلتر کاری چلنے کی ترکیب سجھائی دی تھی۔ کرنا کرانا اس نے خود ہی تھا مگر وہ اس کا "کریڈٹ" اپنے بیٹے ایش کمار کو دینا چاہتی تھی تاکہ مہاراجا چندر گپتا کے دل میں بھی ایش کے لیے اتنی ہی اہمیت اجاگر ہو سکے جتنی کہ بڑے راج کمار پرتاب کے لیے تھی۔
سازشی عناصر یعنی مہاپجاری بدری ناتھ کا ٹولا مہارانی نجوبائی کے ساتھ تھا اور اس کے اشارے پر ہی وہ ناچتا تھا۔ نجوبائی کے شاطرانہ ذہن میں جو ترکیب آئی تھی، وہ اب اس گفتگو کے بعد فوراً اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا یہ نشست تمام ہوتے ہی وہ فوراً نہایت خاموشی مگر چابک دستی سے اپنی راہ پر ہولی۔
نجوبائی نے اپنے خاص غلام بھورام کو بلایا اور اسے مہاپجاری بدری ناتھ کے لیے خصوصی ہدایات دیں اور اسی وقت کالی کے مندر کی جانب روانہ کر دیا۔ وہاں سے وہ اپنے بیٹے چھوٹے راج کمار ایش کے پاس آئی تو وہ ماں کو دیکھتے ہی بے چینی سے بولا۔
"ماتاجی! پتاجی نے مہمانوں کے لیے کیا عندیہ دیا ہے؟ کہیں انہیں راج محل سے بے دخل ہونے کا حکم تو نہیں دے ڈالا؟" لاڈلے بیٹے کی بات سن کر نجوبائی نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولی۔
"کیا ہو گیا ہے تمہیں ایش! تم آخر یہ بچوں والی باتیں کرنا کب چھوڑو گے اور کب جوان ہو گے؟"
"کیا ہوا ماتاجی! بہت غصے میں ہیں آج آپ......؟" ایش کمار، ماں کے تیور دیکھ کر فوراً دبو سا ہو کے بولا۔ وہ دراصل اپنی ماں سے دبتا تھا۔
"غصہ تو مجھے اپنے آپ پر ہے کہ تمہارے جیسے بے وقوف اور ناسمجھ بیٹے کو جنم دیا۔" نجوبائی ماتھا پیٹ کر بولی۔ "میں تمہیں ریاست کے ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہ رہی ہوں اور تم...... آخر تمہارا ان لوگوں سے کیا لینا دینا ہے جن سے پوری ریاست کی پرجا نفرت کرنے لگی ہے۔" نجوبائی کا اشارہ رینا وغیرہ کی طرف تھا۔
"لیکن ماتاجی! وہ سب جھوٹ اور محض پروپیگنڈا ہے۔"
"ایش!" نجوبائی کو غصہ آ گیا۔ ماں کو برہم دیکھ کر ایش بھی خفیف سا ہو گیا۔ "میں تمہیں جو بات کہنے اور سمجھانے آئی ہوں، تم صرف اسی پر اپنی توجہ رکھو سمجھے تم......"
"جی ماتاجی! حکم کریں، میں سن رہا ہوں۔" بالآخر ایش نے سر جھکا لیا۔ اسے اب اپنی ماں کا ہر وقت دباؤ والا لہجہ کھلنے لگا تھا مگر وہ چپ تھا۔
"تم اسی وقت اپنے پتاجی کے پاس جا کر کہو گے کہ تم یہ مسئلہ آسانی سے حل کرنے کی سکت رکھتے ہو۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ تمہارے ذہن میں ایسا کیا ہے، تم نہایت ادب سے کہنا کہ میں ابھی مصلحت اندیشی سے کام لوں گا۔ آپ بس ابھی مجھ پر کیول وشواس کریں...... اور جنرل مائیکل شا کے جوابی خط کا انتظار کیا جائے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اور اگر...... پتاجی نے بتانے پر اصرار کیا تو......؟"

"بے وقوف! وہ نہیں کریں گے۔ جاؤ تم......" نجوبائی جھڑک کر بولی اور ایش اسی وقت چل دیا۔ اس نے اپنے باپ سے وہی جا کر کہہ دیا جو اس کی ماں نے اسے سکھایا تھا۔

اس کے بعد متفقہ فیصلے سے درمیانی راہ اختیار کی گئی تاکہ سب زیادہ نہیں تو تھوڑے بہت راضی رہیں۔ مہمانوں کو موجودہ حالات کے پیش نظر نہایت معذرت اور احترام کے ساتھ ریاست سے تو نہیں البتہ راج محل سے چلے جانے کا کہہ دیا جاتا۔ اس کے لیے نجوبائی نے بدری ناتھ کو سکھا پڑھا دیا تھا کہ اس فیصلے کے بعد "غلغلہ" نہ مچایا جائے...... بلکہ اس معاملے کو فراموش ہی کر دیا جائے۔ جب تک کہ رینا ان کے خلاف خود سے کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔ ایسا ایش کے ایما پر ظاہر کیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کے درپردہ نجوبائی کے دماغ کی کارستانی ہی کارفرما تھی۔ جبکہ بدری ناتھ نے وہی کرنا تھا جو مہارانی نے اسے پہلے سے ہی سمجھا رکھا تھا۔

اب صرف جنرل مائیکل شا کے جوابی خط کا انتظار تھا۔

☆☆☆

دہلی کے قلعہ بند کمرے میں بیٹھے جنرل مائیکل شا کو راج محل میں متعین کار اپنے لیفٹیننٹ بروجر کا اطلاع نامہ ملا تو وہ سناٹے میں آ گیا۔

اپنے دوست پروفیسر ہنری کی اس جانکاہ موت پر جہاں اسے بے حد افسوس ہوا تھا، وہیں وہ بہت برہم بھی ہوا۔

لیف بروجر نے رینا کی زبانی یہ سارا قصہ سننے کے بعد من وعن ویسا ہی لکھ دیا تھا، جیسا کہ رینا نے اسے بتایا تھا کہ اس کے باپ ہنری کی موت کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ جس کے مطابق...... اس کے باپ کی موت کو، جو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ایک قتل تھا مگر اسے حادثاتی موت کا شاخسانہ قرار دیا جا رہا تھا وغیرہ۔

اپنے عزیز دوست کی بیٹی رینا کے اس خط پر جنرل مائیکل شا کچھ الجھن آمیز سوچ کا بھی شکار ہو گیا، بھلا ایک سادہ لوح پروفیسر، جو سیاست اور اس قسم کے معاملات سے دور تک کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا، وہ بھلا کیونکر کسی سازش کا شکار ہو سکتا ہے؟

لیکن ایک دو روز بعد اسے لیف بروجر کا دوسرا خط ملا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ کیونکہ اس خط میں رینا نے نہ صرف تفصیل سے بتایا تھا بلکہ لیف بروجر نے اپنے بھی کچھ مخدوش خیالات کا اظہار کیا تھا۔ رینا نے لکھا تھا......

"ڈیئر انکل شا! فار گاڈ سیک! میری مدد کیجیے، میں یتیم ہو گئی ہوں بلکہ کر دی گئی ہوں۔ میرا اب دنیا میں آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خدارا میری مدد کریں۔ میرے پیارے پاپا کو یہاں ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا ہے اور اسے دانستہ ایک حادثے کا رنگ دیا جا رہا ہے۔

"آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا ایک سادہ لوح انسان کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ تو آپ کی یہ بات صحیح ہے۔ وہ آپ کے بچپن کے اور سب سے عزیز ترین دوست تھے۔ آپ ان کی فطرت جانتے تھے کہ انہیں نیچر سے کتنی محبت تھی۔ اسرار و تجسس کے سربستہ راز جاننے کا انہیں کس قدر جنون تھا۔ وہ تحقیق اور ریسرچ کے کس قدر دلدادہ تھے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے "مشرق کے سربستہ راز" یہ کتاب وہ انگلستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں متعارف کروانا چاہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کتاب ان طالب علموں کے لیے کس قدر راہنما اور مددگار ثابت ہوتی۔ اپنے ملک کا نام پوری دنیا میں روشن ہوتا۔ خیر! میں آپ کو وجہ بتاتی ہوں جو میرے پاپا کے قتل کا محرک بنی۔

"دراصل...... ناگرہ میں پہلے ہی سے محلاتی سازشیں درپردہ پروان چڑھ رہی ہیں۔ پاپا نے ایسی ہی کسی درون خانہ پرورش پانے والی سازش سے نادانستہ طور پر پردہ اٹھانا چاہا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے......"

اس کے بعد رینا نے اطلاع نامے میں مقدمے کی کارروائی سے لے کر وہ سب بتا دیا تھا کہ کس طرح اب ایک سازش کے تحت انہیں...... ریاست ناگرہ سے بے دخل کرنے کی ایک نئی سازش تیار کی جا رہی ہے۔ جبکہ وہ اپنے آنجہانی پاپا کا مشن پورا کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے، جو اب اس کی زندگی کا ایک اہم مقصد بن گیا ہے۔ "لہٰذا مائی ڈیئر انکل! آپ برائے مہربانی چندر گپتا کے سلسلے میں سخت احکامات جاری کریں کہ وہ آپ کے عزیز دوست اور میرے پاپا کے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کریں بلکہ انہیں کیفر کردار تک بھی پہنچائیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔"

رینا نے کچھ اس طرح خط میں آہ وزاری کی تھی کہ مائیکل شا کا دل پسیج گیا۔ یوں بھی انگریز اپنے ملک اور قوم کے ساتھ بہت سچے اور بہت سخت اصول پرست ہوتے ہیں۔ ان کی قوم کا یا ان کے ملک کا چاہے عام آدمی ہی کیوں نہ ہو وہ اگر کسی اور دیس میں قتل یا ہلاک ہو جائے یا اس پر کوئی مشکل آن پڑے تو وہ اسے اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اس کی مدد کے لیے ہر قسم کا انتہائی قدم اٹھا لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے، چاہے وہ قصوروار ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی قوم اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اپنے ملک کے فردِ واحد کی مدد اور اس کی کامیابی کو وہ اسے پوری دنیا میں اپنی سرخروئی سمجھتے ہیں۔

مائیکل شا جیسے فرنگی کا بھی یہی حال تھا۔ دراصل فرنگیوں کو اپنے دیس انگلستان کے مقابلے میں مشرق کا یہ دیس (برصغیر) بہت بھایا تھا۔ وہ اس پر اپنے غاصبانہ قبضے پر بہت فخر کرتے تھے، سچی بات تو یہی تھی کہ لندن میں اس وقت الو بولا کرتے تھے، وہاں کی معاشی و اقتصادی حالت ابتر تھی۔ ہاں! یہ ضرور کہا جاسکتا تھا کہ وہ مسلم سائنسدانوں کی تھیوری سے استفادہ ضرور کرتے تھے اور اب اسی روش پر قائم تھے۔ انگریز کتنا ہی متعصب ہو لیکن وہ غیروں کی اچھی اور مفید باتوں سے استفادہ اٹھانے میں کسی قسم کے بخل یا تعصب سے کام نہیں لیتا۔ نفرت اپنی جگہ لیکن اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور شاید یہی ان کی ترقی کا راز بھی ہے۔ پھر برصغیر میں ایک طویل عرصہ گزارنے اور ہندو دیٔ بنیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے دوران تو ان کی مکاریاں دو چند ہو گئی تھیں۔

رینا سے متعلق اطلاع نامے کی بین السطور پڑھنے کے بعد اس نے آخر میں لیف بروجر کی سطور بھی ملاحظہ کیں۔ اس نے لکھا تھا۔

”آنریبل میجسٹی جنرل مائیکل شا......! راج محل میں مجھے کچھ باغی گروپ کے جاسوسوں کی آمد کا شبہ ہے۔ ان کی تعداد تین ہے اور میں ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں مہاراجا چندر گپتا اور ان کے سیناپتی موج سنگھ میرے ساتھ بالکل بھی تعاون نہیں کررہے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنی کوششوں میں لگا ہوا ہوں جس کے لیے مجھے آنریبل میجسٹی نے یہاں تعینات کر رکھا ہے۔“ آخر میں لیف بروجر نے اپنا نام اور عہدہ درج کر دیا تھا۔ اس اطلاع نامے نے جنرل مائیکل شا کو گہری اور پُرتشویش سوچ میں غلطاں کر ڈالا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اپنے متعین کار لیف بروجر کی اس اطلاع پر کوئی نہ کوئی ایکشن ضرور لیتا لیکن ابھی وہ مجبور تھا۔ اثنائے راہ......اسے مہاراجا چندر گپتا کا بھی اطلاع نامہ موصول ہو گیا۔ اس نے من وعن وہی کچھ لکھ ڈالا تھا جیسا کہ اس کی بیوی مہارانی نجو بائی اور مہا پجاری بدری ناتھ نے اسے بتلایا تھا۔ اس خط نے تو مائیکل شا کی سوچوں اور تفکرات کو اور بھی گمبھیرتا میں بدل ڈالا۔ وہ پہلے ہی ریاست تاگرہ میں سیاسی کھچڑی پکانے میں مصروف تھا۔ ایسے میں اس نے سوچا کہ اگر وہ مہاراجا کی بات رد کرتا ہے تو اس کے دیرینہ مقاصد کے متاثر ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے اور اگر اپنے عزیز۔۔۔ دوست کی بیٹی کی باتیں رد کرے تو اپنوں کے طعن وتشنیع کا نشانہ بنتا تھا۔ اس نے کوئی درمیانی راہ سوچی اور پھر اس کے بعد اس نے رینا اور لیف بروجر کو جواب میں لکھ دیا۔

”رینا ڈیئر! تم خود کو بالکل تنہا مت سمجھنا۔ مجھے اپنے عزیز ترین دوست ہنری کی موت کا دکھ ہے۔ اگر تم واقعی سمجھتی ہو کہ ایسا ہے یعنی وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے ہیں تو اس بارے میں شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے لیے میں ابھی مہاراجا چندر گپتا کو بھی ایک خصوصی پیغام بھیج رہا ہوں۔ کچھ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ہم ابھی کوئی سخت قدم اٹھانے سے قاصر ہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ اپنے طور پر تم جو کچھ وہاں کرنا چاہتی ہو کرتی رہو، تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو راج محل یا ریاست تاگرہ سے کوئی بھی بے دخل کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا اور اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تم حالات کے مطابق کوئی بہتر فیصلہ کرسکتی ہو۔ لیف بروجر وہاں تمہاری مکمل پشت پناہی کرے گا۔ لیکن مائی ڈیئر بے بی! میں اس وقت مجبور ہوں لیکن میری یہ مجبوری عارضی ہے۔ کوہ شمالیہ میں ہماری کٹھ پتلی حکومتیں قائم ہونے کے بعد جس کا وقت کچھ زیادہ دور نہیں، میں تمہارے یہ سارے مسائل تلوار کی دھار اور بندوق کی نال سے بہ یک قلم حل کر دوں گا۔“

دوسرا خط جنرل شا نے اپنے متعین کار لیف بروجر کو لکھا۔

”بروجر! تمہیں جن پر شبہ ہے، ان پر کڑی نظر رکھے رہو کہ تمہیں وہاں اسی اہم مقصد کے لیے راج محل میں متعین کیا گیا ہے اور ایسا باہمی رضامندی اور مشترکہ مفادات کے لیے ہی کیا گیا ہے۔ رہی بات راج محل میں عدم تعاون کی تو ابھی تمہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا تاگرہ میں اصل مشن کیا ہے۔ اتنا لکھے کو کافی جانو اور جن جاسوسوں پر تمہیں شبہ ہے ان کے خلاف تم خفیہ کارروائی عمل میں لاسکتے ہو۔ تاہم میں پھر بھی اس بارے میں تعاون کے لیے مہاراجا گپتا کو بھی ایک پیغام رسید کر رہا ہوں۔“

تیسرا خط اس نے گپتا کو لکھا جسے دانستہ مائیکل شا نے مختصر ترین رہنے دیا تھا۔ اس میں پروفیسر ہنری اور رینا سے متعلق اور بروجر سے تعاون کے علاوہ یہ مسئلہ اس کی اپنی (مہاراجا وغیرہ کی) صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

مائیکل شا......ابھی مہاراجا کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے سے قاصر تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ وہ ان کے وسیع تر مفادات میں ان کا حلیف تھا۔ جان پال سے کامیاب

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نشست کے بعد جنرل مائیکل شا نے تریپال اور پالن پور سمیت ناگرہ پر اپنا فوجی قبضہ قائم کرنا تھا۔ فرنگیوں کی چال ایسی تھی کہ دشمن کو اپنا حلیف بنا کر اسی کے کاندھوں پر بندوق چلاتے، اپنا الو سیدھا کرتے اور پھر آخر میں اسی کی پشت پر چھرا گھونپنے کی صورت میں اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا کرتے تھے۔ وہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی اس دیرینہ پالیسی پر ہمیشہ سے کارفرما تھے۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب یہ فرنگی ''حکومتوں کا کاروبار'' کرنے لگے تھے۔

جان پال کی اسی روز واپسی کے بعد جنرل شا نے تریپال اور پالن پور کے خلاف جنگی حکمتِ عملی تیار کرنا شروع کردی تھی۔

یہ جنگی حکمتِ عملی گورنر رڈنی کاسٹوفر کی شاہانہ رہائش گاہ کے ایک کمرے میں...... ''بلیئرڈ روم'' کی میز پر تیار ہوئی تھی۔ تجارت کا کاروبار کرتے کرتے اب حکومتوں کا کاروبار کرنے والے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سات اعلیٰ دماغ کے جغادری افسران اس وقت میز کے گرد موجود تھے۔

ان میں ادھیڑ عمر اور بھاری جسامت کے گورنر رڈنی کاسٹوفر سمیت جنرل مائیکل شا، تکونی اور لمبوتری شکل کا مالک دراز قامت کرنل بلسٹر وڈ، مضبوط اور چوڑے شانوں مگر درمیانے قد کا مالک میجر ڈی فارسٹ، جو تیسویں لائٹ کیولری کا کمانڈنگ افسر بھی تھا۔ بریگیڈیئر ڈان کیورشم، کرنل بلسٹر وڈ کی اپنی رجمنٹ کا ایک کمانڈنگ آفیسر جیرالڈ...... اور ساتواں آدمی ایک پستہ قامت ہندوستانی تھا۔ وہ راج پور کا دیوان تھا۔ تمام حکم ناموں کو قانونی شکل دینا اسی کا کام تھا۔ اس کا نام شیورائے بھولکر تھا۔ مہاراجوں کی محلاتی سازشوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا، بلکہ ان ''نتائج'' کو برٹش سرکار کے لیے'' مفید کیسے بنانا ہے''...... یہ بھی اس کا کام تھا۔ اس کی رنگت..... سیاہ تھی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے، آنکھیں چندی چندی سی تھیں، وہ بار بار اپنی کمر پر بندھے خنجر پر ہاتھ پھیرتا تھا، جس پر جواہرات جڑے ہوئے تھے تو اس کی انگوٹھیوں کی ہیرے روشنی میں چمک اٹھتے تھے۔

خانساماں نے ایک ٹرالی کھسکا کر کمرے کے ایک طرف کھڑی کردی تھی اور خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ ٹرالی پر ایک دس لیٹر کا براس ٹینک دھرا پڑا تھا، اس پر چھوٹا سا نلکا لگا ہوا تھا۔ اس کے گرد سات بلوریں پیگ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ ٹرالی کے دوسرے نچلے حصے پر ایک بڑا سا باؤل رکھا تھا جس میں برف کی ڈلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا جام بنایا اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

''جنرل شا......!'' گورنر رڈنی کاسٹوفر نے کیو (cue) بال کو ''بیلنس پوائنٹ'' پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری کمپنی گیریسن الارم ڈیوٹی پر ہے نا؟'' یہ کہتے ہی اس نے اپنی اسٹک سے کیو بال کو ہٹ کیا۔ مثلث کی شکل میں رکھی مختلف رنگوں کی بالز پھیل گئیں اور ان میں سے ایک رنگ کی بال پاکٹ ہوگئی۔

''یس سر!'' جنرل شا نے فوراً سر ہلایا۔ 1809ء کے سول اینڈ آرمی معاہدے کے تحت گورنر رڈنی کاسٹوفر کے اختیارات واضح تھے۔

''ہوں......'' گنگناتی ہوئی ایک لمبی ہمکاری خارج کرتے ہوئے رڈنی کاسٹوفر نے ذرا ٹھہر کر میز پر نظری اسکیچ بنایا پھر کیو اسٹک کی ٹپ کو وائٹ چاک سے رگڑا اور میز پر جھک گیا۔ لائن نہ بن سکی تو دوبارہ کھڑا ہوگیا۔ بولا۔

''آپریشن گرین انر جمنٹ کی تفصیل بتاؤ دوستوں کو؟''

جنرل شا نے مخصوص شارٹ لینگ کوڈز میں مختصر ترین پیرائے میں اپنے مشن کی صراحت سے چند منٹوں میں آگاہ کردیا جو ماسوائے شیورائے بھولکر کے سب نے سن کر بڑے توصیفی انداز میں مسکرا کے اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی تھی۔ دیوان بھولکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر وہ خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے الجھن آمیز تاثرات دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ یوں...... جیسے وہ اپنا کام بہ احسن خوبی نمٹا چکا ہو۔

''گڈ......!'' رڈنی کے منہ سے نکلا۔ ''بریگیڈیئر! حکمتِ عملی پلان کرو۔''

ایک لائن اور گھوسٹ بال کا نظری خاکہ تیار ہوتے ہی وہ دوبارہ میز پر جھک گیا۔ تلے اوپر تین بالز پاکٹ کرنے کے بعد اس نے میجر ڈی فارسٹ کی طرف دیکھا اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈی فارسٹ اپنی باری لینے کے لیے آگے بڑھا اور غور سے میز کی سطح پر پھیلی گیندوں کی لائن اسٹڈی کرنے میں مصروف ہوگیا۔

''سر......!'' بریگیڈیئر ڈان کیورشم نے کہتے ہوئے اپنے قریب کھڑے کرنل بلسٹر وڈ کی طرف ایک نظر دیکھا تھا۔ شا ان سے پہلے ہی ڈسکس کرچکا تھا اور کرنل انہیں اپنے قیمتی مشورے سے آگاہ کرچکا تھا۔ بلسٹر وڈ نے کیورشم کو سر کا مخصوص اشارہ کیا، جیسے کہہ رہا ہو، کہہ دو جو آپس میں ڈسکس ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ رڈنی سے بولا۔

''ناگرہ میں چونکہ ایک سازش پروان چڑھنے کا انکشاف ہوا ہے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ پہلے اس کے نتائج

www.urdusoftbooks.com

سامنے آجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ایکشن پلان تو تیار ہے، لیکن وار اسٹریٹجی کو ابھی محفوظ رکھا جائے، یوں بھی کوہِ شالیہ میں ابھی سخت برف باری کے موسم کی آمد آمد ہے۔ تاہم جنگی حکمتِ عملی کے مکمل ہوتے ہی بہرصورت ایکشن پلان پر عمل کیا جاسکتا ہے۔"

برفیلے موسمی اثرات کا ذکر رڈنی نے محض اس لیے کیا تھا تاکہ یہ افسران سلیقے ... سے اپنا کام نمٹا سکیں۔

"تم کیا کہتے ہو کرنل؟" رڈنی کا سٹوفر نے بلسٹروڈ کی طرف دیکھا جو میجر ڈی فارسٹ کی باری کے بعد اپنی باری کی تیاری میں تھا۔ وہ جواباً بولا۔

"میں مسٹر ڈان کیورشم کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ کوہِ شالیہ اس وقت ہمارا سب سے زیادہ ہاٹ ٹارگٹ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارا مقصد صرف پالن پور اور ترپال پر چڑھائی کرنا نہیں، بلکہ ناگرہ کو بھی قبضے میں لینا ہے۔ ناگرہ چونکہ ہمارے حلیف کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس پر قابض ہونے کا یہی طریقہ ہوگا کہ وہاں کوئی ایسا جواز بنایا جائے جو نقضِ امن کی زد میں آتا ہو۔ ورنہ دیگر ریاستوں کے نواب اور مہاراجے ہماری اس سیاست کو سمجھ جائیں گے اور یوں وہ ہم سے خیرسگالی اور مشترکہ مفادات کی آڑ میں معاہدہ کرنے سے کترائیں گے۔ یوں ہمارا آزاد ریاستوں پر قبضے کا خواب ..... ادھورا رہ جائے گا۔"

"ہوں....." رڈنی نے ایک بار پھر خیال انگیز ہمکاری بھری۔ پھر اس نے استفساریہ انداز میں میجر ڈی فارسٹ کی طرف دیکھا۔

"یس میجر ڈی فارسٹ......؟"

"سر! میں ان باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔" گھٹی ہوئی جسامت اور درمیانے قد کے جثے کے مالک میجر ڈی فارسٹ نے ترنت کہا۔

"جنگ کی صورت میں وہاں کتنے پونڈ کی توپوں کی ضرورت پڑسکتی ہے؟" رڈنی کا اگلا سوال بریگیڈیئر ڈان کیورشم کے لیے تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"چٹانوں کی سختی اور جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے بارہ پونڈ کی چھ توپیں کافی ہوں گی۔"

"ان کے پاس توپوں کی کیا صورتِ حال ہے؟" رڈنی کا اگلا سوال تھا۔

"ان کے پاس صرف چار سے چھ پونڈ کی توپیں ہیں اور ان کا اسلحہ زیادہ تر "بھرتو" بندوقوں پر مشتمل ہے، جو ہماری تیز رفتار "لی انفیلڈر"..... رائفلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔"

اس کی بات پر گورنر رڈنی نے اپنے سر کو پُرطمانیت انداز میں اثباتی جنبش دی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کی چست و چالاک نظروں نے قریب کھڑے پستہ قامت ہندوستانی شیورائے بھولکر کے چہرے کو تاڑ لیا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شیورائے! برٹش آرمی تمہارے مشورے کے بغیر ایک انچ بھی پیش قدمی نے کرسکتی۔ تم ان خودمختار ریاستوں کی ساری داخلی صورتِ حال سے واقف ہو۔"

شیورائے بھولکر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

"ہزایکسی لینسی! خودمختار ریاستوں کو اندرونی خانہ جنگی کی زد میں لیتے ہوئے جو جواز ہمیں درکار ہے وہ جنگ کی راہ ہموار کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی ہمیں ان نوابوں اور مہاراجوں کے کاندھے کی محتاجی رہے گی اور یہی روش جنگ کے لیے بہتر بھی رہے گی۔ اسی لیے ان کی محلاتی سازشوں کے نتائج پر نظر رکھتے ہوئے اور ان کے دوسری ریاستوں پر قبضہ کرنے کے خواب اور لالچ کو خفیہ طریقے سے ابھارتے رہنا ہمارے منصوبوں کے لیے مفید رہے گا۔"

"ہوں....." رڈنی نے ایک گمبھیر ہنکارا خارج کیا تھا۔ شیورائے بھولکر کی رائے ان کے عسکری عزائم کے لیے کافی تھی۔

اس کے بعد رڈنی اپنی رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر جیراللہ پیکہم کے ساتھ نیچی آواز میں باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتا رہا۔ سیاست کے کھیل کے ساتھ بلیئرڈ کا کھیل بھی جاری رہا اور کاروبارِ حکومت بھی......

سب سے آخر میں یہی طے پایا... کہ ایکشن پلان کو وہیں روک کر پہلے جنگی حکمتِ عملی پر توجہ دینی چاہیے، تاہم اس عرصے کو مختصر رکھا جائے تاکہ باغی مسلم گروپس کو زیادہ عرصے تک وہاں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنانے کا موقع نہ مل سکے۔

فرنگیوں کو اپنے اقتدار کے لیے سب سے زیادہ خطرہ کوہِ شالیہ سے تھا۔ اس کی سب سے بڑی مسلم ریاست ترپال تھی جس کے نواب شہباز خان سے انہیں یہی خطرہ تھا کہ ...... وہ ان باغی گروپوں کو سپورٹ کرسکتے تھے تاکہ انہیں اپنی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کرنے کا پورا موقع مل سکے۔ یوں بھی فرنگی یہاں اپنے اقتدار کے قبضے کا خواب دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ قبضہ کٹھ پتلی کی شکل میں ہی ممکن تھا، یعنی ایسا مہاراجا جو ان کی (فرنگیوں کی) غلامی کا دم بھرتا ہے اور ریاستی معاملات کو بھی ان کے حق میں ہموار رکھے۔

اس "بلیئرڈ روم میٹنگ" کے بعد مائیکل شا اپنی اقامت گاہ میں آکے کمرے میں بند ہوگیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کچھ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

کوہِ شمالیہ کی سنگلاخ پہاڑیوں اور اس کی شنگرفی ڈھلانوں کے جنگلوں میں ایستادہ برگد اور کھرنی کے سایہ دار درختوں اور گل پوش جھاڑیوں پر کاسنی اور شنگرفی ڈنڈیوں والے پھولوں نے رنگ بدلنا شروع کردیا تھا۔ سبزے سے ڈھکی چٹانوں اور بسنت رچنا کی بہار دکھاتی چوٹیوں پر اب کہرے کا ڈیرا پڑنے لگا تھا۔ ہوائیں سرد اور کاٹ دار ہوچلی تھیں۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو محفوظ جگہ پر لے جانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے۔

مختلف جانور، ٹھٹھرتے موسموں کی برف باری کے سرد جہنم سے بچنے کی تیاری میں اپنی گپھائیں، غار اور ٹھکانے بدلنے لگے تھے۔

کہرے کے بادلوں نے صبح کے سورج کی روپہلی کرنوں کو روکے رکھا تھا۔ ہوا مرطوب اور فضا رکی رکی تھی۔ سردی کا احساس بڑھ گیا تھا اور علی ریحان ڈھلوانی جنگلوں کی آڑ لیتا ہوا تیز تیز قدم اٹھائے مقررہ سمت کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یوں تو اس کی منزل تریپال تھی، لیکن یہ منزل ابھی اس کے لیے، ہنوز دلی دور است والی بات تھی، مگر اریبہ نے اس کی راہنمائی کرتے ہوئے یہ ہدایت کی تھی وہ راج محل سے نکلتے ہی پورب کی سمت والی ڈھلان سے تقریباً پندرہ کوس تک پیادہ گام ناک کی سیدھ میں چلتا چلا جائے، حتیٰ کہ جنگل پار ہوجائے۔ جب چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع جائے تو...... ایک پختہ راہ گزر آجائے گی۔ اس راہ گزر پر اسے چند کوس چلنا پڑے گا کہ سامنے ایک پٹڑی نظر آئے گی۔ یہ پٹڑی پورب سے پچھم کی طرف جا رہی ہوگی، اسے پچھمی سمت کی راہ لینا ہوگی جہاں دائیں جانب ایک پہاڑی ندی بہتی نظر آئے گی۔ اسی ندی سے ایک چٹانی کاریز نکل کر ٹین کے کھالے سے پٹڑی کے اوپر ایک نلکا سا بنا رہی ہوگی۔ یہاں کوئلے والے انجن کی ریل کار آکر ٹنکیاں بھرنے کے لیے تھوڑی دیر رکتی ہے۔ وہ اس میں سوار ہوکر تریپال کی سرحد کے قریب سہ پہر یا شام سے پہلے پہلے پہنچ سکتا ہے۔

علی ریحان اب اریبہ کے بتائے ہوئے اسی راستے کی راہ پر تھا۔ اسے سخت سردی بھی لگ رہی تھی، حالانکہ وہ تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا، مگر سردی کی کاٹ سوا تھی۔ وہ پچھتانے لگا تھا کہ وہ عام سے کپڑوں میں ہی نکل پڑا تھا۔ مقصد اور مشن کو پورا کرنے کی دھن میں وہ اس طرف توجہ نہ دے سکا تھا اور فوراً ہی راج محل سے روانہ ہوگیا تھا۔ ورنہ وہاں سے وہ گرم پوشاکیں بہ آسانی اٹھا سکتا تھا۔

خاصی دیر تک پیدل چلنے کے بعد اس نے ذرا رک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس نے کتنا فاصلہ طے کرلیا ہوگا۔ مگر وہ کچھ صحیح اندازہ نہیں کر پایا اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد پھر چل پڑا۔

اس کے لیے یہی طمانیت بھرا یقین کافی تھا کہ وہ بالکل درست راستے اور صحیح سمت پر رواں دواں ہے۔ کچھ اور منزل مارنے کے بعد اسے لگا کہ وہ تقریباً آٹھ نو کوس کا فاصلہ طے تو کر ہی چکا ہوگا۔

صبح تازہ دم اور بھرے پیٹ ہونے کے باعث...... ابتدائی پیادہ سفر بہ آسانی کٹ گیا تھا مگر اب وہ بھوک کے ساتھ تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اریبہ نے اسے ایک مقررہ وقت پر کھالے والی جگہ تک پہنچنے کی تاکید کی تھی... بہ صورت دیگر تاخیر کی صورت میں اسے اگلے دن کی صبح کا انتظار کرنا پڑتا کیونکہ ہر روز ریل کار ایک ہی جاتی تھی، البتہ ایک مال گاڑی تین دنوں بعد گزرتی تھی۔ اب یہ اندازہ اریبہ لگانے سے قاصر تھی کہ اس روز مال گاڑی کا گزر تھا یا نہیں؟

علی کی کوشش یہی تھی کہ وہ وقت پر پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ تاکہ وقت پر مسافر ریل کار پر سوار ہوسکے۔

یہ سوچ کر اس کی ہمت کچھ اور سوا ہوگئی اور اس نے آہستہ روی چھوڑ کر ایک بار پھر تیز گامی اپنالی لیکن کب تک......؟ آخر کو وہ بھی گوشت پوست کا ایک عام سا انسان تھا۔ جلد ہی تھک کر چور ہوگیا۔ بھوک کے ساتھ اب پیاس بھی اسے ستانے لگی تھی۔ ہرے بھرے جنگل سے آب و دانہ ملنا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن بات وقت بچانے کی تھی۔ وہ جلد سے جلد تریپال پہنچ کر نواب شہباز خان سے ملنا چاہتا تھا۔ خالی پیٹ ہوجانے کی وجہ سے سردی اور زیادہ لگنے لگی تھی۔

بالآخر یہ سوچ کر کہ کھائے پیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں اس نے کچھ تازہ رسیلے پھل توڑ کر کھائے اور انہی سے پیاس بجھائی۔ پانی کے لیے ندی یا چشمہ تلاشنے میں وقت صرف ہو سکتا تھا۔ اس نے رسیلے پھلوں سے ہی کام چلایا اور ایک بار پھر چل پڑا۔

بادلوں اور دبیز کہر سے سورج کی چھدری چھدری دھوپ پڑنے لگی تھی۔ اسی دھوپ سے علی نے اندازہ لگایا کہ وہ منزل سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔ اریبہ کے مطابق جب تک دھوپ تیز نہیں ہوجاتی، وہ اپنے مطلوبہ مقام تک بروقت پہنچ سکتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ کہرے اور بادلوں کی وجہ سے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ دھوپ کتنی نکل آئی تھی اور سورج نے اس کے ساتھ کتنا سفر طے کرلیا تھا۔

ابھی وہ اسی مخمصے کا شکار تھا کہ سفید دودھیا پڑے آسمان کا رنگ سنولانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ پڑ گیا۔ علی ریحان کو تشویش ہوئی۔ یوں بارش پڑنے اور سردی میں اضافے کی ایک نئی مصیبت نازل ہونے کا اندیشہ ستانے لگا۔ لیکن اس کے سر پر بھی بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر تریپال پہنچ جائے اور نواب شہباز خان کو فرنگیوں کی نئی سازش سے فی الفور آگاہ کردے۔ اسے ڈر تھا کہ اسے تریپال پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوگئی تو کہیں فرنگی اپنی اس گھناؤنی سازش میں کامیاب نہ ہوجائیں۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ بعض حریت پسند مسلمانوں کے مجاہد گروپ، کوہ شالیہ کو اپنی خفیہ کمین گاہ ہی نہیں بلکہ یہاں اپنا مستقل ٹھکانا قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کرسکیں۔ ان کی اسی سازش کو سبوتاژ کرنے کے لیے علی ریحان کو ساتھیوں کے ساتھ یہاں روانہ کیا گیا تھا۔ ان کے تین ساتھیوں نے تو راہ ہی میں جامِ شہادت نوش کرلیا تھا جبکہ...... ان پانچوں میں صرف علی ریحان اور شاہ زمان ہی باقی بچے تھے اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بڑی بہادری، پامردی اور دلیری کے ساتھ مصروفِ کار تھے۔

علی ریحان اور شاہ زمان نے تو بلکہ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اس سازش کا کھوج لگایا تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کے بدلے میں انہیں اریبہ کی صورت میں ایک ایسی مجاہدہ بھی ملی تھی جو تربیت یافتہ تو نہ تھی لیکن اس نے ان پر ظاہر بھی کردیا تھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ ساتھی سے کم بھی نہیں ہے۔ دیکھا جاتا تو علی ریحان اور شاہ زمان یہاں تک اریبہ کی مدد سے ہی پہنچے تھے اور آئندہ بھی وہ ان کے کام آنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھی۔

علی ریحان یہ سب باتیں سوچتا ہوا بارش میں بھیگتا اور ٹھٹھرتا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جنگل بھیگ رہا تھا، ترائیوں سے برساتی پانی اب ریلوں کی شکل میں تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ڈھلان پھسلواں ہونے لگی تھی۔ جنگل جل تھل ہو رہا تھا۔ آن کی آن میں امڈ آنے والی کالی گھٹاؤں نے دن میں رات کا سا سماں پیدا کردیا تھا۔ علی کو تفکر آمیز تشویش و پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ اسے اپنا مشن کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا۔ موسلا دھار بارش نے طوفان بادوباراں کا سماں پیدا کردیا تھا۔ اب تو اسے اپنا پیدل سفر کرنے میں بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ نہ ہی وقت کا اندازہ ہو پا رہا تھا۔ بس ایک اندھا جذبہ تھا کہ منزل پر جلد از جلد پہنچ جائے۔ بارش میں سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ کئی جگہوں پر وہ پھسلا بھی تھا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈھلان ختم ہوگئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

اچانک اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ یہ انجن کے وسل کی آواز تھی۔ بارش کے شور میں اگرچہ آواز رل مل گئی تھی مگر اس کے مخصوص آہنگ سے اس کی شوریدہ سماعتوں تک پہنچ ہی گئی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ انجن کی وسل کا مطلب تھا کہ وہ منزل کے قریب تر تھا۔ وہ کسی نے کہا ہے ناکہ بے خبری بھی ایک نعمت ہوتی ہے، علی بھی وقت سے بے خبر تھا مگر سر پر جلدی پہنچنے کی فکر سوار تھی۔ اسی لیے وہ بغیر رکے چلتا رہا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں وہ ٹھہرا بھی تھا مگر پھر چل پڑا تھا۔ اسی کوشش پیہم نے اسے شاید بروقت منزل پر پہنچا دیا تھا۔

امید جاگی تو ہمت و حوصلہ بھی سوا ہوا۔ وہ رکا نہیں، اگرچہ اب اس کے چلنے کی رفتار پہلے کی نسبت کم ہوگئی تھی۔ تاہم اب اسے نیا دھڑکا ستانے لگا کہ کہیں ریل کار چھوٹ نہ جائے۔

باوصف کوشش کے وہ اپنی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ نہ کرسکا۔ ایک بار بے دم اور تھک کر گرا تو اٹھ نہ پایا۔ وہ مولسری کی بھیگی ہوئی جھاڑیوں پر گرا، سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ جسم تھک کر چور ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے سمیٹ کر اور بازوؤں کے سہارے کھڑے ہونے کی سعی کی اور ذرا اٹھا مگر پھر گر گیا۔ مسلسل تیز گامی، تھکاوٹ اور سانس پھولنے کے باعث آکسیجن کی کمی واقع ہونے لگی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ دھواں دھار بارش نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ کیونکہ ایسی حالت میں طوفانی بارش بھی آکسیجن کی کمی کا سبب بنتی ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب اس پر غشی سی طاری ہونے لگی تو اس کی ڈوبتی سماعتوں سے ایک تیز سی آواز ٹکرائی۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

لیف بروجر...... بڑا گھاگ اور زیرک دماغ شخص تھا۔ اسے تو پہلے ہی یقین کی حد تک ان تینوں کو یوں پر حریت پسند گروپ کے جاسوس ہونے کا شبہ تھا اور اب جب اس نے یہ سنا کہ ان کا ایک ساتھی سوشیل (علی ریحان) مہاراجا اور جان پال کے درمیان ہونے والی اہم نشست (میٹنگ) کے فوراً بعد راج محل سے کہیں نکل گیا ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے ان تینوں کو مشکوک اور جاسوس ثابت کرنے کے لیے ٹھوس

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ثبوت کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ سیناپتی موج سنگھ کو منہ توڑ جواب دے سکے۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے سرحدوں پر ناکابندوں کو علی ریحان کا ناک نقشہ بتا کر ہوشیار کر دیا۔ اس کے بعد بہت غور وخوض کے بعد وہ اپنے فوجی دماغ کے ساتھ سوچنے لگا کہ سوشیل (علی ریحان) ریاست کی حدود پار کرنے کے لیے خفیہ اور چور راستہ ہی اپنا سکتا ہے۔ ریاست سے باہر نکلنے کے دو ہی چور راستے تھے۔ ایک ایسٹ اور دوسرا نارتھ ویسٹ۔ ایسٹ کا راستہ اس عظیم کوہستانی سلسلے سے باہر کو نکلتا تھا اور وہ بہت زیادہ طویل اور دشوار گزار تھا۔ متوقع طور پر میٹنگ کے اغراض و مقاصد جان لینے کے بعد سوشیل کبھی بھی اتنا طویل راستہ اختیار نہیں کر سکتا تھا، جبکہ دوسرا چور راستہ نارتھ ویسٹ کا تھا اگرچہ یہ بھی دشوار گزار تھا مگر اس راستے کے ڈھلوانی راستے پر پٹڑی تھی۔ وہاں سے ہر روز ایک ریل کار اور دوسرے تیسرے روز مال گاڑی گزرتی تھی۔ اسے شک تھا کہ سوشیل، پالن پور یا تریپال پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اول الذکر طویل راستہ اس نے بعد میں چیک کرنے کا سوچا تھا، اس کے گھڑسوار سپاہیوں کے لیے بھلا کیا مشکل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو سپاہی الگ الگ گھوڑوں پر نارتھ ویسٹ والے راستے پر روانہ کر دیے۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بارش نے انہیں آن لیا۔ ڈھلوان پھسلواں ہوگئی تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار آہستہ کر دی۔ گھوڑے پھسلنے لگے تھے، تاہم سدھائے ہوئے تھے اسی لیے ڈھلوان سے اترنے لگے۔ انہوں نے لمبے رین کوٹ پہن رکھے تھے۔

ابھی یہ جنگل میں ہی تھے کہ ان کا سامنا خونخوار بھیڑیوں کے ایک غول سے ہوگیا۔ انہیں ایسی ''افتاد'' کا تجربہ تھا۔ ایک سپاہی نے سور اور گائے کی چربی والا ایک کارتوس چاٹ کر (منہ سے کھول کر) بندوق میں ڈالا اور غول کے بیچ میں فائر کر دیا۔ دھماکا ہوا۔ بھیڑیوں کا غول ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔

اسی وقت انہیں کسی ریل کے انجن کی وسل سنائی دی۔

''جیکب! لگتا ہے، ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' ایک فرنگی سپاہی نے گردوپیش کے طوفانی مناظر میں ایک نظر ڈال کر اپنے ساتھی سے کہا۔ ''لیکن اس جاسوس کا کہیں پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''ریل کار کی سیٹی گونجی تھی۔ پٹڑی تک پہنچتے ہیں، ضرورت پڑی تو ریل کار کو چیک کرنے کے بعد جانے کی اجازت دیں گے۔'' جیکب نامی اس کے ساتھی نے کہا۔

پہلے والے نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے کر اس سے اتفاق کیا۔ اس کا نام روب تھا۔

دونوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیے۔ اچانک روب کو اپنے دائیں جانب گیلی..... گھاس پر ایک درخت کے پاس کوئی گرا پڑا نظر آیا۔

''جیکب.....!'' اس نے اپنے آگے جاتے سپاہی کو آواز دی۔

''کیا ہوا؟'' جیکب نے اپنا گھوڑا روک کر گردن موڑ کر پوچھا۔

''اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔'' روب نے کہتے ہوئے فوراً اپنی بغل میں جھولتے ہوئے کارتوسوں کے تھیلے سے ایک کارتوس نکال کر چاٹا اور بندوق میں بھر لیا۔ اپنے ساتھی کی دیکھا دیکھی جیکب نے بھی یہی کیا تھا۔

روب نے فوراً مذکورہ سمت کی جانب اپنا گھوڑا موڑ دیا اور بے سدھ پڑے آدمی کے قریب لے جا کر روک دیا۔ دونوں محتاط انداز میں اپنی بندوقیں سنبھالے نیچے اتر آئے۔

''ارے.....'' روب کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ''یہ تو وہی ہے..... ہمارا شکار..... سوشیل۔''

''مگر..... اسے کیا ہوا ہے روب!'' جیکب بولا۔ ''دیکھو ذرا..... مر تو نہیں گیا ہے کہیں؟''

روب آگے بڑھا اور سوشیل جو درحقیقت علی ریحان ہی تھا، پر جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا پھر سیدھے کھڑے ہو کر جیکب سے بولا۔

''یہ زندہ ہے، بیمار لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سرد موسم اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر کے بے ہوشی پر مجبور کر دیا ہے۔''

''میرا خیال ہے اسے ادھر ہی گولی مار کر واپس چل پڑتے ہیں۔'' جیکب نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ''موسم بہت خراب ہو رہا ہے۔ کہاں اس مصیبت کو ساتھ لیے پھریں گے۔''

''تجویز تو تمہاری بری نہیں، لیکن..... لیف بروجر.....''

روب نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو جیکب بولا۔

''اس کی پروا مت کرو..... بتا دیں گے کہ ہمیں دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش میں چلتی ہوئی ریل کار پر سوار ہو رہا تھا، ہم نے گولی ماردی۔'' جیکب نے تجویز سجھائی۔

''چلو پھر جلدی کرو۔'' بالآخر روب نے اس کی سفاکانہ تجویز پر صاد کرتے ہوئے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"کون گولی مارے گا؟"

"یہ کام میں ہی کرتا ہوں، تم ذرا گھوڑوں کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا، دھماکے کی آواز پر یہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔" جیکب نے اس سے کہا۔

"میں انہیں ذرا دور ہی لے جاتا ہوں تم ذرا جلدی اپنا کام نمٹالو....." روب نے کہتے ہوئے..... قدم بڑھائے اور دونوں گھوڑوں کی رسیاں پکڑے اس سے چند قدم دور جانے لگا۔

ادھر سفاک جیکب نے اپنی بندوق سنبھالی، چند قدم پیچھے ہٹا اور نرم گھاس پر بے سدھ پڑے علی ریحان کے سینے کا نشانہ لینے لگا۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھرکنے لگی اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی بندوق نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

مہمان گاہ کے کمرے میں رینا افسردہ سی بیٹھی تھی۔ شوکت اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا متفکر نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور امجد خان، نندو بابا اور شانتا مہمان گاہ کے گوشۂ عام میں موجود تھے جبکہ رابرٹ باہر کہیں تھا۔

البتہ کمرے میں رینا اور شوکت کے علاوہ ایک تیسرا فرد بھی موجود تھا۔

یہ گارشیا تھی۔ وہ ایک قریب دھری پڑی ایک مسہری پر گاؤ تکیے سے پشت ٹکائے بہ ظاہر کوئی کتاب پکڑے بیٹھی تھی، مگر اس کی ساری توجہ اور گاہے بہ گاہے نگاہیں ان دونوں کی جانب اٹھتی تھیں..... اسے ان چند ایام میں ہی ادراک ہو چلا تھا کہ شوکت حسین اور رینا ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں اور گارشیا اس کی وجہ پروفیسر ہنری کی موت یا قتل اور بعد میں اس کے بھائی رابرٹ کی جھوٹی گواہی دینے کو سمجھتی تھی۔ اگرچہ کچھ دن پہلے گارشیا نے یہ جھوٹ بول کر شوکت کا رینا سے دل خراب یا اس کی طرف سے مایوس کرنے کی کوشش کی تھی کہ..... رابرٹ اور رینا ایک دوسرے کو بچپن سے چاہتے آرہے ہیں اور بہت جلد شادی بھی کرنے والے ہیں۔ مگر اب گویا چند ہی دنوں میں جیسے بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا تھا۔

یہی سبب تھا کہ گارشیا کے دل میں رینا کے لیے پہلے سے زیادہ رقیبانہ جذبات پروان چڑھنے لگے تھے۔ اس نے ان دونوں کا جتنا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اتنا ہی ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے اور اب آئندہ کے حالات بھی مزید اسی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

"مجھے رابرٹ سے ایسی گھٹیا حرکت کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔" رینا نے ہولے سے کہا۔ شوکت نے کن انکھیوں سے ایک ذرا..... مسہری پر نیم دراز سی بیٹھی گارشیا کی طرف دیکھا اور رینا سے بولا۔

"رابرٹ کی اس حرکت پر ہم سب کو ہی افسوس ہے مس رینا!" وہ صرف تنہائی میں رینا کو مس سے نہیں پکارتا تھا، نیز کسی تیسرے کی موجودگی پر وہ اس سے گفتگو میں تکلف بھی برتتا تھا۔ "لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے آپ نے اپنے انکل شا کو تو مطلع کر دیا ہے نا......؟"

"ہاں!" رینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں نے خط میں سب کچھ لکھ دیا ہے مگر میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اپنے پاپا کے قاتلوں کو نہ صرف بے نقاب کر کے رہوں گی بلکہ انہیں کیفر کردار تک بھی پہنچا کر رہوں گی۔" کہتے ہوئے رینا کے خوبصورت چہرے پر عزم کی پختگی اور جوش بھرے جذبات کا ارتعاش سا اُمڈ آیا تھا۔

"تم کیا کیا کرو گی یہاں...... رینا ڈیئر......؟" گارشیا نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اپنے پاپا کا مشن پورا کرو گی، یا ان کے قاتلوں کو بے نقاب کرو گی...... یا پھر...... کسی سے محبت کو پروان چڑھاؤ گی......" کہتے ہوئے اس نے شوکت کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا تھا۔

رینا اور شوکی دونوں ہی اس کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ کر لحہ بھر کو خفیف سے ہوئے تھے، شوکت خاموش رہنے پر مجبور تھا لیکن رینا نے گارشیا کی طرف تیز سی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا چہیتا بھائی جھوٹی گواہی نہ دیتا تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ ویسے میں تمہاری آخری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ محبت...... کس سے محبت؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔"

"اوہ...... کس سے محبت......؟" گارشیا نے زہریلے طنز سے کہا۔ وہ کتاب بند کر کے مسہری پر پاؤں جھلائے اٹھ بیٹھی۔ پھر ایک نگاہ شوکی پر ڈال کر مزید بولی۔

"ایک نوکر سے محبت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی رینا! تم نے میرے بھائی کو ٹھکرا کے اس سے دشمنی مول لی ہے۔ اس نے اگر جھوٹی گواہی دی ہے تو اس کی وجہ تم اور انکل ہنری تھے جنہوں نے ایک نوکر کو ترجیح دی اور اب تم بھی وہی کچھ کر رہی ہو۔"

"اچھا! تم تو...... ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں اپنے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لاڈلے بھائی رابرٹ کی حرکتوں کا علم ہی نہ ہو۔اس کے کرتوتوں سے بھلا ایک بہن سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے۔" رینا کی اس چوٹ پر گارشیا گرم ہوگئی اور مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند قدم ان دونوں کے قریب آئی اور رینا سے پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔

"میں پھر یہی کہوں گی کہ رابرٹ کو تم لوگوں نے خود اپنا دشمن بنایا ہے۔اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور واپس دلی کی راہ لو۔"

"تو جاؤ تم...... تمھیں بھلا کس نے روکا ہے جانے سے......؟" رینا نے بھی غصے سے کرسی سے کھڑے ہوکر اسے جواب دیا۔شوکت پریشان ہوگیا۔ایک نوکر کی حیثیت سے دونوں ہی اس کے لیے قابل احترام تھے۔اس پر مستزاد گارشیا ان کی محبت سے واقف ہوچکی تھی۔شوکت کو یہی ڈر تھا کہ کہیں رابرٹ کی طرح گارشیا بھی کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔ان حالات میں وہ ان دونوں غبی اور کینہ پرور بھائی بہن کی مخالفت مول لینے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔تاہم غیر جانبدارانہ انداز میں ثالثی کا کردار نبھانا اس کا فرض تھا،اسی ناتے اس نے دونوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے آپس میں لڑنے کے بجائے موجودہ صورتِ حال کو اپنے حق میں بہتر کرنے پر غور کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ہماری آپس کی لڑائی سے ہمارے دشمن فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

گارشیا نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے شوکی کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں بولی۔"یہ سارا کیا کرایا تمہارا ہی ہے، مسٹر شوکی! تم نے ہی رینا سے اپنی ذاتی دلچسپیاں بڑھانے کے لیے اس کی ہر جائز و ناجائز باتوں کو درست قرار دیا اور نوبت یہاں تک آپہنچی۔"

شوکت جانتا تھا کہ وہ کس برتے پر ایسا کہہ رہی تھی۔وہ بھی خاموش نہ رہا۔بولا۔"مس گارشیا! آپ کو میری طرف سے یقیناً کوئی خطرناک قسم کی غلط فہمی رہی ہے۔میں تو ایک ملازم ہوں اور میرے امور فرائض سب کے لیے سانجھے ہیں۔"اس کی بات پر گارشیا نے بڑی جلتی سلگتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو رینا بول پڑی۔

"گارشیا! زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔تم اور رابرٹ سمیت ہم سب پاپا کے ساتھ اپنی مرضی اور سیر سپاٹے کی نیت سے ہی چلے تھے۔میرے پاپا اس قافلے کے سالار تھے اور شوکی کی شجاعت اور جانثاری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہی اسے اپنا نائب سالار مقرر کیا تھا اور یہ اب بھی ہے۔اس لیے برائے کرم تم اس کے ساتھ الجھنے کی کوشش مت کرو،تم نے یا رابرٹ نے یہاں سے جانا ہے تو خوشی سے جاؤ مگر یوں بے جا تنقید کر کے ہمیں مزید پریشان نہ کرو۔"

شوکی نے دیکھا رینا یہ کہتے ہوئے روہانسی ہونے لگی۔رینا کو رنجور اور آزردہ خاطر دیکھ کر اس کا دل بھی اندر سے گھٹنے لگا تھا،مگر گارشیا کی موجودگی میں وہ رینا کی ڈھارس بندھانے سے قاصر تھا۔تاہم اس کے چہرے سے رینا کے دکھ کا کرب ضرور جھلکنے لگا تھا۔گارشیا کسی گندی مکھی کی طرح بھانپتی نگاہوں سے شوکت کے چہرے کے یہ تاثرات تاڑ رہی تھی اور اس کی صورت کوئی نیا گل کھلاتی ہوئی جوش آتش و انتقام سے جلتی نظر آنے لگی تھی۔

"سنبھالو اسے اور اپنا فرض نبھاؤ، ہونہہ......" گارشیا بالآخر اپنے اندر کی گندگی ظاہر کیے بنا نہ رہ سکی تھی اور غصے سے پاؤں پٹخ کر پلٹی اور دوبارہ مسہری پر جا کر کتاب تھامے لیٹ گئی۔وہ حسد اور کینہ پروری کی اپنی ہی آگ میں اندر ہی اندر سلگنے لگی تھی۔شوکت نے اس کے لیے یہی سزا تجویز کر رکھی تھی۔اس کے منہ لگے بغیر ہی اسے اپنی ہی آگ میں جلتا چھوڑ دے کہ یہی سزا اس کے لیے کافی تھی کیونکہ یہی اس کا مقدر بھی تھی۔

وہ اب کی بار گارشیا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر رینا کے ساتھ ہولے سے مخاطب ہو کے بولا۔

"مس رینا! پلیز، آپ دل چھوٹا نہ کریں اور نہ ہی اس بات کی پروا کریں کہ کون ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے۔میں آپ کے ساتھ ہوں، ہم مل بیٹھ کر کوئی حل سوچ لیں گے۔" کہتے ہوئے شوکی نے رینا کے معصوم اور دلکش چہرے پر اپنی نظریں گاڑے رکھیں۔اس نے دانستہ اپنی آواز نیچی رکھی تھی کہ کہیں گارشیا کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور وہ پھر نہ زہر اگلنا شروع کردے۔ادھر گارشیا بھی بہ ظاہر کتاب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی مگر درون خانہ وہ ان دونوں کے کان کترنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس نے شوکی کو رینا سے بڑی آہستگی سے کچھ کہتے تو سنا تھا مگر اس کے کہے ہوئے الفاظ نہ سن سکی۔

اچانک شوکی کو رینا کے چہرے سے کچھ عجیب سی بے چینی کے تاثرات مترشح ہوتے محسوس ہوئے۔وہ اپنا نچلا ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں کی بالائی قطار تلے دبائے ہوئے تھی اور ساتھ ہی چور سی نگاہوں سے کونے میں بچھی مسہری پر نیم دراز کتاب پڑھتی گارشیا کی طرف دیکھنے لگی۔تب ہی اس نے اپنی پوشاک سے ایک خط نکال کر شوکی کو تھمایا اور ہولے سے بولی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اسے پڑھ لو جلدی سے...... یہ مجھے انکل مائیکل شا نے بھیجا ہے۔''

شوکی نے حیران سی نظروں سے خط لیا اور پڑھا۔ پڑھنے کے بعد اس نے وہ خط رینا کو واپس کر دیا۔

''کیا کہتے ہو اس خط کے بارے میں...... تم؟'' رینا نے اس کی رائے لینا چاہی۔

''انکل شا بھی اس معاملے میں کوئی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔'' خط پڑھنے کے بعد شوکی فقط یہی کہہ سکا اور رینا کا دل ایک بار پھر اندر سے گھٹنے لگا۔ وہ شوکی کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

مائیکل شا کا دوسرا خط لیف بروجر اور تیسرا مہاراجا چندر گپتا کو موصول ہوا۔

ان خطوط کے آنے کی دیر تھی کہ مہمانوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ نقصِ امن کی خاطر راج محل کو چھوڑ کر کہیں اور ٹھکانا بنا لیں۔ ریاست کی طرف سے ان کے ساتھ ہر قسم کی مدد شامل حال رہے گی۔

رینا پر یہ حکم بجلی بن کر گرا۔ رابرٹ کا منہ لٹک گیا۔ گارشیا بھی تلملا گئی لیکن راج محل کے دو افراد ایسے بھی تھے جنہیں اس حکم پر بے حد افسوس ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو خود ایش کمار ہی تھا۔ رینا سے وہ انسیت رکھنے لگا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اداس ہو گیا تھا جبکہ ولی عہد پرتاب کو قلق اس بات کا تھا کہ مہمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تھا۔ رینا کی دوری نے اس کے دل پر زبردست چوٹ کی تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا، اس کی دل جمعی اور دلداری کرنا چاہتا تھا مگر اس میں اس فیصلے کے بعد رینا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

اس فیصلے کے بعد مہاراجا شدت سے منتظر تھا کہ پرجا کی طرف سے کیسا ردِعمل ظاہر ہوتا ہے؟ لہٰذا وہی ہوا جیسا کہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہونا تھا۔ اس فیصلے کے بعد سب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ مہاراجا چندر گپتا کو اپنے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔ مہارانی نجو بائی نے خوب بڑھا چڑھا کر مہاراجا کے سامنے اپنے ایش کمار کی تعریفوں کے پل باندھ دیے اور وہ بھی سر دھننے لگا۔

ادھر ان باتوں اور گمبھیر معاملات سے بے خبر رابرٹ...... سونجنا کے گرد اپنا جال ڈالنے میں مشغول تھا۔ وہ دونوں ایک بارہ دری اور شہ نشین کے قریب قدرے تنہا گوشے

مالی حیثیت

ایک آدمی نے اپنے ڈاکٹر دوست سے پوچھا۔ ''تم جس مریض کو بھی دیکھتے ہو سب سے پہلے یہی پوچھتے ہو کہ رات کو کیا کھایا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اس سے مریض کی مالی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔''

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ دنیا کا قدیم ترین پرچم ڈنمارک کا ہے۔
☆ پھولوں اور بلبلوں کا شہر شیراز (ایران) کو کہا جاتا ہے۔
☆ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی امریکا کے شہر کیلیفورنیا میں ہے۔
☆ دنیا میں سب سے زیادہ اسکول چین میں ہیں۔
☆ افریقا کے شہر ''ٹیم زا'' میں تمام مکانات نمک سے بنے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: غلام حسین اختر۔ بھچرانوالہ

میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سونجنا نے آج گلابی رنگت کی بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک کم عمر اور نازک اندام نظر آنے والی دوشیزہ تھی۔ اس کی طبیعت میں شرمیلا پن مگر سوچوں میں متلون مزاجی تھی۔ ہر لمحے کا نیا پن اس دوشیزہ کے لیے ایک تجسس کا درجہ رکھتا تھا۔ اب بھی وہ رابرٹ کی باتوں پر ایک تحیر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف تکے جا رہی تھی۔ کبھی وہ اس کی کسی بات پر شرم سے سرخ ہو جاتی تھی اور سر جھکا لیتی تھی۔ رابرٹ اسے انگلستان اور لندن کی باتیں بتا رہا تھا۔ وہاں کی آزاد خیال زندگی، نیا ماحول اور ہر قسم کی اقدار بھری پابندی سے عاری زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہاں کے کلبوں کا بھی اس نے خاص طور پر ذکر کیا تھا اور کچھ ایسے انداز میں کیا تھا کہ سونجنا کا چہرہ ایک بار تو شرم سے سرخ ہو گیا، مگر پھر وہ بھی رابرٹ کی ایسی باتوں پر دلچسپی لینے میں مجبور ہو گئی۔

''میرا دل کرتا ہے تمہیں ایک بار انگلستان ضرور لے کر جاؤں۔ وہاں تمہیں سب سے پہلے لندن کی سیر کراؤں، کلبوں میں لے جاؤں۔ مجھے یقین ہے تم بہت انجوائے کرو گی۔'' رابرٹ کسی ندیدے لومڑی کی طرح اس پر ڈورے ڈالنے میں مصروف تھا۔

''دل...... لیکن میں بھلا کیسے اتنی دور سمندر پار جا سکتی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوں؟'' سونجنا نے بھی اندر ہی اندر رابرٹ کے کھینچے ہوئے نقشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''پانی کے جہاز میں......'' وہ بولا۔ ''کیا ہے سفر بھی تم نے پانی کے جہاز میں؟''

''نہیں تو......'' سونجنا نے سادہ لوحی سے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''تو پھر کیا دیکھا ہے تم نے دنیا میں......؟'' رابرٹ اس کے معصوم سے تجسس کو ابھارتے ہوئے بولا۔ ''کبھی کر کے دیکھو پانی کے جہاز میں سفر...... کتنا مزہ آتا ہے، بیکراں پھیلے ہوئے سمندر کی گود میں ہلکورے لیتے ہوئے۔''

''ہے بھگوان! مجھے تو سمندر بہت اچھا لگتا ہے، مگر کبھی دیکھا ہی نہیں میں نے۔'' وہ بولی۔

''معاف کرنا...... تم کہنے کو تو ایک راج کماری ہو...... لیکن سچی بات کہوں گا، تمہاری حیثیت یہاں ایک قیدی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔'' وہ مکار لومڑی کی طرح بولا۔ ''ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھری ہوئی یہ قلعہ بند زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ہونہہ......''

سونجنا کو رابرٹ کی باتوں میں بے حد کشش محسوس ہو رہی تھی پھر وہ اداس بھی ہوگئی جسے رابرٹ کی لومڑ جیسی مکار آنکھوں نے فوراً تاڑ لیا۔ یوں اسے ایک ذرا ''جسارت'' کا موقع ملا اور اس نے سونجنا کی نرم و نازک ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا سونجنا کچھ نہیں بولی تو وہی ہاتھ پھیل کر سونجنا کی گردن اور پھر اس کے دائیں مہین سے گال تک چلا گیا۔

سونجنا جیسی ان چھوئی دوشیزہ کے لیے ایک بھرپور مرد کے کھردرے ہاتھ کا یہ لمس بہت سنسنی خیز اور الگ انوکھے پن کا احساس دلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرخ ہونے لگی اور دھیرے سے اس نے اپنا کومل سا چہرہ تھوڑا پیچھے سرکا لیا۔ وہ اپنے لطیف اور رعنا وجود پر ایک جوان مرد کے لمس کی گرمی کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

''سونجنا! سچ کہتا ہوں۔ یہ کوئی زندگی نہیں۔'' وہ ہمت کر کے آگے بولا۔ ''بے شک تم ریشم و کم خواب میں سوتی ہو، شاہانہ زندگی گزارتی ہو لیکن کبھی تم نے ان چوباروں سے کھلے نیلے آسمان پر اڑتے آزاد پنچھیوں کو دیکھا ہے؟ کتنے خوش ہوتے ہیں یہ...... اپنی آزادی پر...... بیکراں پھیلے آسمان کی وسعتوں پر اڑان بھر کے انہیں خوشی ہوتی ہے۔ آزمالو...... کبھی انہیں سونے کے پنجرے میں بند کر دو، یہ ایک دم اداس ہو جائیں گے۔''

''ہاں! میں اکثر ان آزاد اور مست الست پنچھیوں کو اڑتے ہوئے حسرت سے دیکھا کرتی ہوں۔'' سونجنا نے بھی اپنے اندر کا اظہار کر ڈالا اور رابرٹ اسی طرح اس کے اندر کو ابھار کر اسے جاننے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بولا۔

''تمہاری یہ راج محل کی زندگی لگی بندھی ہے۔ دولت کے ڈھیر میں محض ایک پنجرہ ہے۔ صبح و شام ایک ہی طرح کے...... نہ کوئی رونق نہ کوئی کشش۔ کہیں جاؤ تو تم لوگوں کے ساتھ پچاس لوگ ہوتے ہیں۔ انہی کے دائرے میں قید رہتے ہوئے تم کہیں باہر ہوتے ہوئے بھی ایک قیدی ہی تو ہوتی ہو۔ مزہ تو اکیلے یا اپنے کسی ایک دل پسند ساتھی کے ساتھ آزاد ماحول میں گھومنے پھرنے کا ہے۔ ایسا ساتھی جو تمہیں بہت چاہتا ہو، تم سے بے حد پیار کرتا ہو۔ جیسے میں اور تم......'' چالاکی سے یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے سونجنا کے چہرے کی سرخ پڑتی رنگت کو غور اور بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ایک بھوکا مگر شاطر لومڑ دکھائی دے رہا تھا جو اپنے کسی شکار کو پھانسنے کی کوشش میں لگا ہو۔ اس نے دیکھا کہ سونجنا اس کی بات پر شرمائی تو ضرور تھی مگر ایک آہ سی بھر کر اس نے رابرٹ کو ایک حسرت زدہ سی مسکراہٹ سے بھی نواز دیا تھا۔ رابرٹ مزید جسارت کرنے اور چکر چلانے کے موڈ میں تھا مگر کسی کی آمد پر اسے اپنا یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔

رابرٹ ...... تصور میں سونجنا کو ایک سونے کی ایسی چڑیا سمجھنے لگا تھا جسے وہ حقیقتاً ایک ہی بار ذبح کر کے...... سارے انڈے ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ اسے بہکا کر وہ یہاں سے سونے کی گٹھڑی کے ساتھ ہی ... بھگا لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں رہتے ہوئے رابرٹ نے ایسے ایسے نادر و بیش قیمت نمونے دیکھے تھے، جن کی انگلستان میں بڑی کھپت اور مانگ تھی۔ خود رابرٹ انگلستان میں ایک تیسرے درجے کی زندگی گزار رہا تھا مگر سونجنا سے وہ یہی کہتا تھا کہ اس کا باپ بہت امیر کبیر اور جاگیردار شخص تھا۔ لندن کے مضافات میں ایک بڑی کاؤنٹی کا مالک، جس کے مرنے کے بعد اب وہی مالک تھا۔ وغیرہ۔

☆☆☆

راج محل سے بے دخلی کی سبکی کو سب سے زیادہ رابرٹ اور اس کی بہن گارشیا نے محسوس کیا تھا۔ یہ لوگ سب مہمان گاہ میں موجود تھے اور رینا کے ایما پر ڈرائیور امجد خان نندو بابا اور شانتا بھی مہمان گاہ کے گوشے میں موجود چہرے لٹکائے موجود تھے۔

رینا نے کسی فضا کو گرم دیکھتے ہوئے کسی بھی قسم کی لڑائی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یا گرما گرم بحث و مباحثے سے منع کر رکھا تھا، بلکہ رابرٹ اور گارشیا سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اب تو ان کا بھی ان کے ساتھ (رینا اور شوکی کے ساتھ) رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں بچا ہے لہٰذا... وہ لیف بروجر سے رابطہ کرلیں تاکہ وہ ان کی ریاست سے دلی روانگی کا بندوبست کردے۔ آج کا سارا دن ان کے پاس تھا لیکن...... چونکہ رابرٹ اور گارشیا کے "معاملات" ایسی نہج پر تھے کہ وہ...... رینا اور شوکی کا "ساتھ" چھوڑنے سے قاصر تھے۔ رابرٹ، سوبجنا پر ڈورے ڈالے ہوئے تھا، نیز وہ شوکی اور رینا کا راستہ کھوٹا کرنے کا دل میں تہیہ کیے ہوئے تھا، کم وبیش یہی کینہ اور بغض گارشیا کے دل میں بھی تھا۔ اسے راج محل سے تو کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر وہ شوکی کو حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے بھی اپنے دل میں پکا ارادہ باندھ رکھا تھا کہ اگر شوکی اس کا نہ ہوسکا تو وہ اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دے گی۔ مگر بہ ظاہر مکاری سے کام لیتے ہوئے انہوں نے رینا سے یہی کہا تھا کہ...... وہ رینا کو محض نوکروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ کر جاسکتے۔ الاّیہ کہ رینا ان کی بھی "ذمے داری" ہے۔ کل کلاں رینا کو کچھ ہوگیا تو وہ انکل شا کو کیا منہ دکھائیں گے اور انگلستان کس منہ سے لوٹیں گے وغیرہ۔ رینا ان کے دوغلے پن کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ کرسکی البتہ شوکت حسین ان شرپسند بہن بھائی کی مکاری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، جبکہ امجد خان اور تندو بابا کا معاملہ شوکی جیسا ہی تھا، یعنی وہ رینا کے ساتھ مخلص ہی تھے۔

چنانچہ سردست رابرٹ اور گارشیا نے بھی کسی بحث یا لڑائی میں پڑنے کے بجائے یہی سوال اٹھایا۔

"آخر اب ہم جائیں کہاں......؟"

"اگر تم لوگوں نے میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرہی لیا ہے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہوگا۔" رینا نے گہری متانت سے کہا۔

"یہاں سے بھلا ہم کہاں جاسکتے ہیں؟ راج محل کے باہر اور ریاست کے اندر ہی کسی دور افتادہ گوشے میں خیمہ زن ہوجائیں گے، جیسا کہ پہلے انکل ہنری بھی چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ آزادی سے اپنا کام کرنے کا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے بیس کیمپ قائم کرنا چاہتے تھے۔"

"لیکن برادر! تم بھول رہے ہو کہ ہماری ریاست میں حدود مقرر کردی گئی ہیں جس کے تحت ہم راج محل سے ایک مقررہ فاصلے پر رہتے ہوئے کیمپ لگاسکتے ہیں۔" گارشیا نے بھائی سے کہا۔ "اس حساب سے تو ہم آبادی سے بہت دور ہوجائیں گے۔ یعنی جنگل میں ڈیرا ڈالنا پڑے گا۔ اف......! مجھے تو یہاں کے جنگلوں سے بڑا خوف آنے لگا ہے۔" وہ آخر میں تھرتھرا کے بولی۔

"ہم راکاشی کی وادی میں ڈیرا ڈالیں گے۔" رینا نے جیسے بہ یک قلم ان کی سماعتوں میں دھماکا کرڈالا۔ ماسوائے شوکی کے سب کے چہروں سے خوف کے آثار جھلکنے لگے۔

☆☆☆

لیف بروجر نے اپنے دونوں گھڑسوار سپاہیوں کو علی ریحان کے تعاقب میں روانہ کرنے کے بعد فوراً اریبہ اور شاہ زمان کو طلب کرنے کا حکم جاری کردیا۔

اریبہ اور شاہ زمان اپنے دل و دماغ میں ہزار قسم کے وسوسے لیے اس کے روبرو حاضر ہوگئے۔ اریبہ نے یہاں اپنا نام مینا کوری، شاہ زمان کا بھوپت جسے اپنا شوہر کہا جبکہ تیسرا علی ریحان کا نام سوشیل بتاتے ہوئے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا تھا۔

لیفٹیننٹ بروجر...... سینا پتی موج سنگھ کی تادیب کے بعد ذرا محتاط بھی تھا اسی لیے وہ ان سے سخت لہجے میں تو بات کرسکتا تھا اور دھمکا بھی سکتا تھا لیکن جسمانی طور پر وہ انہیں ہاتھ بھی لگانے کا مجاز نہ تھا۔ تاہم اپنے چہرے پر خونخواری لاتے ہوئے اس نے پہلے پُرطیش نظروں کے ساتھ دونوں کو گھورا اریبہ اسے چکما دے کر بھاگ گئی تھی، وہ بھی اس کے دل میں تھا لیکن ابھی وہ اس بارے میں کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا، یوں بھی اریبہ کے ساتھ شاہ زمان بھی تھا۔

"تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟" لیف بروجر نے دانستہ اریبہ کو نظرانداز کرتے ہوئے شاہ زمان کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ اریبہ نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ بروجر نے نہایت درشتی سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اس سے کہا۔

"جس سے میں سوال کروں، صرف وہی اپنا منہ کھولے۔"

"ہاں تو بھوپت! کیا کہتے ہو؟"

"جناب! وہ اپنے گھر گیا ہے۔" شاہ زمان نے نارمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"گھر...... کون سا گھر......؟ کیا تم لوگوں کا گھر بھی ہوتا ہے؟" بروجر نے ترش لہجے میں طنز کیا اور آگے بولا۔ "جہاں تک میری معلومات ہیں تم پائندے ڈومنوں کا گھر تو نہیں ہوتا۔"

"ہم پائندے یا خانہ بدوش نہیں ہیں جی! گویے ہیں...... گا بجا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے ہم بھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بنجاروں کی طرح ہی زندگی گزارتے ہیں لیکن ......"

"بس!" بروجر نے اچانک اسے چپ کرا دیا۔ "جو پوچھوں اسی کا جواب دو۔ سوشیل کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟"

"اپنے گھر۔" شاہ زمان نے وہی جواب دہرا دیا۔

"گھر کہاں ہے؟"

اسی دوران شاہ زمان نے محسوس کیا کہ اریبہ بہت بے چین سی نظر آرہی تھی۔ یوں، جیسے وہ اس سوال کا جواب دینا چاہ رہی ہو۔ ضرور اس کے ذہن میں کچھ تھا۔ شاہ زمان نے جلدی سے سوچا۔

درحقیقت بروجر کے ہاں اس طرح اچانک طلبی ان کی توقع کے خلاف تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ بروجر علی ریحان کے یوں اچانک راج محل سے چلے جانے سے واقف ہو چکا ہے۔ ورنہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے۔ تاہم اس بات کا امکان ان کے ذہن میں تھا کہ علی کی یوں اچانک روانگی پر اور کوئی نہیں تو بروجر ضرور ٹھٹک سکتا ہے۔

بہرطور ...... اسی سبب شاہ زمان نے ایک دم بہانہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑی اریبہ کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد بروجر سے کہا۔

"وہ جی...... سچی بات یہ ہے کہ میں تو اس وقت سویا ہوا تھا جب اس کا بھائی اچانک کہیں چلا گیا تھا۔ اسی لیے آپ کے سوال کا صحیح طرح جواب میری پتنی مینا کوری ہی دے سکتی ہے۔"

"ہوں......" بروجر نے پُرخیال سی ہمکاری خارج کی اور اریبہ کی طرف سوالیہ مگر درشتی سے دیکھا تو وہ فوراً بولی۔

"حضور...... ! ادھر پالن پور میں عنقریب ایک میلا لگنے والا تھا۔ سوشیل وہی معلوم کرنے گیا ہے...... کہ کب اور کس دن میلا لگے گا، تاکہ ہم بھی یہاں سے اپنی تیاری باندھ لیں۔" اریبہ نے دانستہ ریاست تریپال کا نام لینے سے اجتناب برتا تھا۔

"تم نے سوشیل کو بغیر مہاراجا کی اجازت کے کیوں راج محل سے باہر بھیجا؟" بروجر نے اریبہ سے اگلا سوال کیا۔

"سرکار...... ! ہم اتنے کہاں اہم ہیں کہ کسی سے پوچھتے پھریں۔ وہ تو آپ جیسے بڑے لوگ ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم تو کم ذات کے چھوٹے لوگ ہیں حضور...... ! یوں بھی مہاراجا صاحب نے ہم پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں لگا رکھی ہے۔"

"بہت چالاک بن رہی ہو تم......" کہتے ہوئے بروجر نے اسے بڑی سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورا۔ وہ ان کے جواب سے قطعاً مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان دونوں میاں بیوی کو الٹا لٹکا کر اور ان کے جسموں کو برہنہ کر کے ان پر کوڑے برسا کر سچ اگلوا لے۔

اریبہ تو نہیں البتہ شاہ زمان کی چست نظریں ضرور بروجر کے چہرے پر اس کے اندر کے اٹھنے والے جوار بھاٹا کو تاڑ رہی تھیں اور یہ بھی کہ وہ ان کے منہ سے اگلوانے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی نیت رکھے ہوئے ہے، مگر کسی وجہ سے وہ یہ سب ان کے ساتھ نہیں کر پا رہا۔ وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ انہیں عارضی طور پر سہی، راج محل کے شاہی گویوں کی حیثیت حاصل تھی لیکن یہ حقیقت اریبہ اور شاہ زمان دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ لیف بروجر کی اس معاملے میں سیناپتی سے بھی گرما گرم بحث ہو چکی تھی، یا پھر شاید انہیں ایسا ہی کچھ اندازہ تھا۔

بروجر نے اسی وقت ان دونوں کو ساتھ لیا اور موج سنگھ کے پاس پہنچا۔ پھر سارا حال اس کے سامنے رکھ دیا۔ سیناپتی موج سنگھ کو بھی اپنے عہدے اور اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ بے شک اس کی دو ایک روز پہلے لیف بروجر سے تو تکرار ہو چکی تھی، مگر بہرحال یہ دونوں مشترکہ مفادات اور مصلحت کوشی کے پیش نگاہ ایک دوسرے کی باتوں کو سننے اور اس پر غور کرنے پر مجبور بھی تھے۔

موج سنگھ کے سامنے جب لیف بروجر نے یہ سوال رکھا تو اس کے فوجی ذہن نے بھی اسے کھدیڑا کہ بات غلط نہیں تھی۔ الّا یہ کہ اپنی جگہ جواب طلب بھی ضرور تھی۔ لہٰذا اس نے پہلے تو ان دونوں کی طرف باری باری بہت غور سے دیکھا اور پھر جیسے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو! ہم تم پر جاسوس ہونے کا شبہ تو نہیں کرتے مگر ہمیں یہ دھڑکا تو ہر کسی سے ضرور لگا رہتا ہے کہ وہ جاسوسوں کے کسی جھانسے یا لالچ میں آ کر ایسا کوئی خطرناک کام نہ کر ڈالیں جو تم لوگوں کی بھیانک موت کا سبب بنے۔ کیونکہ ان لوگوں کی رسائی بہ آسانی راجاؤں اور نوابوں کے محلات تک رہتی ہے۔ کوئی بھی تمہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو بتا دو ہمیں...... میرا وعدہ ہے میں معاملہ ادھر ہی ختم کر دوں گا اور معافی بھی دلوا دوں گا۔"

لیف بروجر، موج سنگھ کے اس سوال پر اندر ہی اندر بری تلملا طرح رہا تھا جبکہ وہ ان دونوں کے ساتھ کسی قسم کی بھی نرمی برتنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ریاست کا یہ سیناپتی ان سے سخت باز پرس کرے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ارے حضور! کیسی باتیں کرتے ہو، ہم غریب گویے ایسا خطرناک کام کیوں کرنے لگے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہم سب سے پہلے آپ کو خبردار کریں گے۔ ہم تو ناچ گانے والے لوگ ہیں ہمیں بھلا ایسا خطرناک اور مشکل کام کہاں آتا ہے۔''
اریبہ نے چالاکی سے کہا۔
''تو پھر تم نے اپنے ساتھی سوشیل کو کہاں بھیجا ہے؟''
موج سنگھ نے پوچھا۔
''بتایا نا...... حضور! وہ پالن پور گیا ہے۔ وہاں گنیش دیوتا کا عنقریب میلا لگنے والا ہے۔ اس کے بارے میں پتا کرنے گیا ہے کہ کون سے دن کو لگے گا۔'' اریبہ نے بتایا تو اسی وقت لیف بروجر نے موج سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ اریبہ اور شاہ زمان کا دل اندر سے بری طرح دھڑ کے جا رہا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر موج سنگھ، لیف بروجر کے بہکائے میں آ گیا تو ان کے ساتھ برا ہو جائے گا۔
موج سنگھ نے اپنے کان میں پڑی بروجر کی سرگوشی پر اثبات میں سر کو جنبش دی اور ان سے بولا۔
''کب تک لوٹے گا سوشیل؟''
''دو...... دو تین روز میں......'' اریبہ کے منہ سے نکلا۔
اس کی آواز تھوڑی لڑکھڑانے لگی تھی۔
''ٹھیک ہے، ہم ابھی اپنے کچھ آدمی اس کے پیچھے روانہ کرتے ہیں۔ اگر وہ وہاں نہ ملا تو ہم تمہارے اس جواب کو جھوٹ پر محمول کرتے ہوئے اپنے شبہے کا اظہار بھی مہاراجا صاحب سے کر دیں گے پھر وہی تم لوگوں کے بارے میں آخری فیصلہ کریں گے لیکن اب یہ بات یاد رکھنا...... تم دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اجازت کے راج محل سے باہر نہیں جائے گا۔ سمجھ گئے؟''
''سمجھ گئے حضور...... سمجھ گئے۔'' دونوں نے جلدی سے اپنے سروں کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے سادگی سے کہا۔
اس کے بعد موج سنگھ نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے تو لیف بروجر نے سیناپتی سے کہا۔
''میں اپنے دو سپاہی پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ لیکن ان دونوں پر بھی یہاں کڑی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔''
''ہاں! یہ تم نے اچھا کیا۔ ہم بھی اپنے آدمیوں سے کہہ دیں گے۔'' موج سنگھ نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔
دراصل موج سنگھ کو فرنگی سپاہیوں کی راج محل میں تعیناتی شروع ہی سے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ یوں بھی بروجر اس کا ہم منصب نہیں تھا۔ تاہم برٹش گورنمنٹ کے دور میں مملکتی اور ریاستی مصلحتوں کے سامنے ریاستی حکمران ایک حد تک مجبور بھی تھے۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ سردی کی کاٹ کسی وقت بھی شروع ہونے والی برف باری کا پتا دیتی تھی۔ قلعے کی جنوب مشرقی سمت کی فصیل کی ڈھلوانی راہ گزر پر ڈاک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ (ڈاک گاڑی اس زمانے کی گھوڑا گاڑی کو کہتے تھے۔ جو بالکل بند ہوتی تھی اور عموماً سخت سردی اور بارش اور برف باری کے موسم میں چلا کرتی تھی) اس کے اندر مہارانی نجو بائی اور بچھورام بیٹھے تھے۔ بوڑھے کوچبان نے ان کے سوار ہوتے ہی ڈاک گاڑی میں جتے ہوئے دو گھوڑوں کو ہلکے سے چابک مار کے ٹخارا اور پھر وہ چل پڑی۔
گھنے تاریک جنگلوں میں گھری اس راہ گزر پر ڈاک گاڑی مناسب رفتار سے دوڑتی ہوئی کالی کے مندر تک جا پہنچی۔ مندر کے گرد و جوار میں آسیبی سناٹا طاری تھا۔ ایک ٹھٹھرتا ہوا ملگجا اندھیرا مندر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔
مہارانی اپنا لباس سنبھالتی ہوئی بچھورام کے سہارے سے نیچے اتری اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔
اندر ہال کمرے میں ایک شخص جیسے اسی کا...... منتظر کھڑا تھا۔ اس نے نجو بائی کو نہایت احترام کے ساتھ پرنام کیا اور اسے لیے ایک اور کمرے میں آ گیا۔ بچھورام بھی ساتھ تھا۔
اس کمرے میں مہاپجاری کے ساتھ اس کا خاص چیلا پرس رام بھی موجود تھا۔ اس نے بھی کھڑے ہو کر مہارانی کو پرنام کیا اور پھر دونوں آمنے سامنے ایک کونے میں بچھی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ ان نشستوں کا بندوبست خاص طور پر کیا گیا تھا جبکہ پرس رام اور بچھورام ایک طرف فرشی نشست پر پالتی مار کے بیٹھ گئے تھے۔
''حالات قابو میں آ چکے ہیں بدری ناتھ! تم نے آگے کیا سوچا ہے اب......؟''
مہارانی نے چھوٹتے ہی مہاپجاری سے پوچھا۔ بدری ناتھ نجو بائی کی بات کا مطلب سمجھتا تھا، بولا۔
''مہارانی جی! میں نے بہت محنت سے اور خود کو خطرے میں ڈال کر ولی عہد کی کھٹیا کھڑی کرنے کے لیے ایک پورا چکر بنایا تھا۔ مگر افسوس وہ آپ کی وجہ سے ضائع چلا گیا۔''
''میری وجہ سے...... ہوا یا تمہاری ترنت کاری (جلد بازی) کی وجہ سے ہوا......؟'' مہارانی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

”آپ کو مجھے نئے اور ودیشی لوگوں کے بارے میں مطلع کرنا چاہیے تھا کہ وہ راج محل میں مقیم ہیں۔“ بدری ناتھ بولا۔ مہارانی نجوبائی کو مہاپجاری کا یہ جواز لنگڑا لولا محسوس ہوا۔ بولی۔

”مطلع کرنا میرے لیے کوئی ضروری بات نہ تھی بدری ناتھ!“ نجوبائی نے ہلکی مگر رعب دار آواز میں کہا۔ ”مگر تم نے اتنا اہم ہتھیار ایک عام سے جھکی پروفیسر پر کیوں ضائع کر ڈالا؟ اور پھر بھلا اسے ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ ہماری راہ پر لگے ہوئے تھے۔“ بدری ناتھ نے جواب دیا۔ اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”تو پھر کسی اور عام طریقے سے بہ آسانی اسے ٹھکانے لگا دیتے۔ کیا ضروری تھا سانپوں سے ڈسوانا؟“

اب پجاری بدری ناتھ مہارانی کو کیا بتاتا کہ اس کے لیے ودیشیوں کا کالی کے مندر میں مداخلت کرنا کتنا خطرناک تھا۔ کیونکہ وہ یہاں پوجاپاٹ کی آڑ میں ایک عرصے سے جو گھناؤنا اور پراسرار کھیل، کھیل رہا تھا، اس کے بارے میں صرف وہی جانتا تھا یا پھر اس کے سیوک کار..... مگر وہ مہارانی سے بحث بھی کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ ان دونوں کا مفاد ایک دوسرے سے منسلک تھا۔ وہ خاموش رہا۔

”ٹھیک ہے، اب جو ہوا سو ہوا.....“ بالآخر نجوبائی نے بھی اسے خاموش پا کر بات ختم کرنا چاہی۔ آگے بولی۔

”اب کوئی اور طریقہ سوچو..... مگر جلدی۔ سیاسی حالات بدلنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کچھ ہو جائے۔“

”مہارانی جی! اب آپ کو ہی کچھ سوچنا اور کرنا پڑے گا۔ ترکیب میں بتائے دیتا ہوں، جو بظاہر سادہ سی ہے، مگر ہے بڑی چترائی ہوئی۔“ پجاری بدری ناتھ نے بڑی مکاری سے مہارانی سے کہا۔ وہ اب مزید رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

”کون سی ترکیب ہے اب، بتاؤ مجھے؟“

”میں آپ کو ایک خطرناک سانپ کے زہر کو سکھا کر اس کی پڑیا بنائے دیتا ہوں، وہ کسی دودھ وغیرہ میں ڈال کر ولی عہد پرتاب کو پلا دیں، قصہ ختم.....“

”ہوں..... بڑی چترا کاری بتا رہے ہو ہمیں.....“ مہارانی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ راج محل کے اندر کسی بھی فرد کے لیے زہر کا استعمال خود ہی سازش کا پول کھول دیا کرتا ہے؟ میں ولی عہد کی موت کو حادثے کی شکل میں ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ شک کی ذرا سی بھی گنجائش باقی نہ رہے۔“

”مہارانی صاحبہ! اب یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔“

”ایک کام کرو، بدری! ابھی ہتھیار کارگر رہنے دو..... پورن ماشی کے تہوار میں ولی عہد کو سانپوں سے ڈسوا دیتے ہیں۔“ نجوبائی نے سفاکی سے کہا مگر اس کے لہجے سے قدرے جھنجلاہٹ مترشح تھی، اس پر بدری ناتھ کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ اسی حیرت و پریشانی سے بولا۔

”ی ی..... یہ کیا کہہ رہی ہیں مہارانی جی آپ.....؟ دوبارہ اسی ہتھیار کو آزمانا ہمارے لیے خطرناک ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے تو ہم نے اس فرنگن سے جان چھڑائی ہے، سب کو ہم پر شبہ ہو جائے گا۔ یہ زہریلے سانپ ہمارے پالتو ہیں۔ ہم دھر لیے جائیں گے۔ مندر اور ہماری ساکھ متاثر ہوگی۔“

مہارانی نجوبائی بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بس! میرا کام ہونا چاہیے۔ وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور پھر تم کیوں چنتا کرتے ہو بدری؟ ایک بار ریاست کی باگ عنان ہمارے بیٹے کے ہاتھوں میں آ جانے دو، تم بھی محفوظ رہو گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مہارانی صاحبہ! لیکن سمجھنے کی کوشش کریں۔ اب حالات وہ نہیں رہے، بھانڈا پھوٹنے کا اندیشہ یہاں بھی ہے، بلکہ یہاں زیادہ خطرہ ہے۔ آپ کو میں بالکل صحیح مشورہ دے رہا ہوں۔ پانی والے زہر میں خطرہ ہوتا ہے، مگر خشک زہر میں نہیں۔“

مہاپجاری کی بات سن کر نجوبائی کچھ ثانیے کے لیے پُرسوچ انداز میں چپ رہی اور سوچنے لگی کہ بدری ناتھ کی بات ماننا ہی پڑے گی۔ دونوں کے مفادات مشترکہ تھے۔ اس کی سانپ والی ترکیب کی طرح خشک زہر والی ترکیب کارگر ہو سکتی تھی۔ نیز یہ کہ اب بدری ناتھ کسی صورت میں بھی سانپ والا ہتھیار دوبارہ نہیں آزماتا۔

”ٹھیک ہے، کب تک مجھے زہر دے دو گے؟“ بالآخر مہارانی نے پوچھا۔

”کل تک دے دوں گا۔“ بدری ناتھ نے جواب دیا۔

☆☆☆

”اب ہمارا بھی یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں رہا شاہ زمان۔“ مہمان گاہ کے اپنے گوشے میں آ کر اریبہ نے فکرمندی سے کہا۔ شاہ زمان بھی کچھ ایسے ہی حالات میں خطرے کی بو سونگھ رہا تھا۔ اریبہ کی بات کی تائید میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن اس طرح ہمارا راج محل چھوڑنا ان کے یقین کو پختہ بنا دے گا۔"

"جہاں تک صرف اس فرنگی افسر بروجر کے شکوک کی بات تھی تو مجھے اس کی پروانہ تھی لیکن علی بھائی کے یوں اچانک راج محل سے روانگی نے لگتا ہے سیناپتی موج سنگھ کو بھی شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اریبہ! لیکن باوجود اس کے ہم یہاں سے چپ چپاتے فرار نہیں ہو سکتے۔ اس طرح... ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ جنگی پلان میں تبدیلی کر لیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہماری ساری محنت اور قربانیاں اکارت چلی جائیں گی۔" شاہ زمان نے گہری تفکیر سے کہا۔ اریبہ کو بھی یہ بات سمجھ آ رہی تھی اسی لیے وہ بھی چند لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی۔ دونوں مدھم سی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ شاہ زمان نے مزید کہا۔

"جب تک علی تر پیال پہنچ کر نواب شہباز خان سے مل کر اسے مائیکل شا اور چندر گپتا کے خطرناک عزائم سے آگاہ نہیں کر دیتا، ہمارا یہاں سے کوچ کرنا اس مشن کو ناکام بنانے کے مترادف ہو گا۔ بلکہ مشن کے زیادہ سے زیادہ سود مند نتائج حاصل کرنے کے لیے ہمارا ابھی ادھر ہی قیام کرنا بہت ہی اہم ہے۔"

اریبہ فطرتاً بہت زیرک دماغ تھی۔ بعض خاص قسم کے حالات میں اس کا ذہن تیزی سے کام کرتا تھا۔ وہ کوئی منصوبہ بنا رہی تھی۔ تب ہی جیسے اس کا چہرہ ایک دم پرسکون نظر آنے لگا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی اور پھر اسی لہجے میں وہ شاہ زمان سے بولی۔

"میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے، اس میں خطرہ تو ہے مگر کامیابی کی بھی اتنی ہی امید ہے۔"

"کیسا منصوبہ؟" شاہ زمان نے اس کے چہرے کے سندر تا نقوش پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ اریبہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگی۔ جسے سننے کے بعد شاہ زمان کا اپنا چہرہ ست کے رہ گیا۔ بولا۔

"نہیں اریبہ! میں تمہیں اس خطرناک منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی پروا نہیں، لیکن تمہاری زندگی میرے لیے اہم ہے۔"

"کیا مشن اہم نہیں......؟" اریبہ نے خفیف سی ایک ادائے مسکان سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ شاہ زمان کو اس کا یہ دلنشین انداز اس قدر بھایا کہ اس نے بے اختیار اریبہ کو خود سے بھینچ لیا۔ اریبہ کے حلق سے سسکاری نکل گئی، اس کے انداز میں خود سپردگی تھی۔

"اریبہ! تم بہت بہادر ہو، آخر کب تک تم خود کو ہماری خاطر خطرات میں ڈالتی رہو گی؟ ہم کوئی اور ترکیب بھی تو سوچ سکتے ہیں۔"

"تمہاری خاطر......؟" اریبہ آہستگی سے جدا ہو کر بولی۔ "ہرگز نہیں، میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہاری خاطر نہیں بلکہ اس نیک مقصد کی خاطر کر رہی ہوں۔ لیکن ذرا سوچو زمان! ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا ابھی یہاں قیام ضروری ہے۔ تم دعا کرو میری کامیابی کی...... اور میرا ساتھ دو۔ بس! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

شاہ زمان سوچتا رہ گیا۔ وقت گزرا چلا جا رہا تھا۔ اریبہ نے اس کی طول پکڑتی خاموشی کو اثبات میں جانا اور پھر اس سے اجازت لے لی۔

☆☆☆

لیف بروجر...... اپنے کمرے میں پشت پر دونوں ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں سے ہلکے شور کی آواز ٹکرائی۔ اس نے ایک سپاہی کو آواز دے کر اندر بلایا اور اس شور کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ باہر وہ دونوں گویے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے۔ لیف بروجر چونک سا گیا اور یہ "نظارہ" دیکھنے کے لیے خود ہی...... کمرے سے باہر آ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مینا کوری اپنے شوہر بھوپت کا گریبان پکڑے اس کے لتّے لے رہی تھی۔

"تو اس کتیا کو یہاں کیوں بلانا چاہتا ہے میں خوب جانتی ہوں۔ میرے بھیا سوشیل کیا گئے یہاں سے تم نے پھر وہی رنگ روپ دکھانے شروع کر دیے۔" اریبہ، شاہ زمان کا گریبان پکڑے مسلسل یہ کہے جا رہی تھی اور لیف بروجر قدرے حیرت سے یہ "نظارہ" دیکھنے میں محو تھا۔ اس کے چہرے کی ترشی اس منظر کو دیکھ کر اچانک ایک "خاص" قسم کی دلچسپی میں بدل گئی تھی۔

"میرا وشواس کرو مینا! تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ کامنا کو میں اسی لیے......"

"مت لو بار بار اس حرافہ کا نام میرے سامنے...... آلینے دو میرے سوشیل بھیا کو...... پھر میں تمہیں مزہ چکھاتی ہوں۔" اریبہ غصے سے شاہ زمان سے بولی۔ شاہ زمان کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے ایک تھپڑ اریبہ کے چہرے پر جڑ دیا۔ پھر تو جیسے قیامت آ گئی۔ اریبہ نے چلاتے ہوئے اس کا منہ نوچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھائے۔ شاہ زمان اس کی انگلیوں کے لمبے ناخنوں سے بچنے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کے لیے پرے ہٹ گیا۔

"الو کی پٹھی! وہی عورت کی عورت ہی رہی۔ پتنی نہ بن سکی۔ بلاوجہ کا شک کیے جارہی ہے۔" پھر شاید اسے خود ہی پچھتاوا بھی ہوا اور وہ ایک بار پھر اریبہ کو منانے سمجھانے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

اسی وقت بروجر نے...... ایک سپاہی کو اشارہ کرکے اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ سپاہی فوراً حرکت میں آیا اور ان دونوں کی طرف بڑھا اور انہیں خاموش ہونے کی تلقین کرتا رہا۔ بروجر نے دیکھا کہ مینا اپنی سوتی ساڑی کے پلو میں منہ دیے ایک طرف کو روتی ہوئی چلی گئی اور بھوپت اسے منانے کی کوشش میں اس کے پیچھے ہولیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے کمرے میں آگئے اور اندر آتے ہی شاہ زمان بے اختیار ہوکر...... اریبہ کے اسی نرم گال کو چومنے لگ گیا جہاں اس نے تھپڑ مارا تھا وہاں ہلکی سی سرخی آگئی تھی۔ کیونکہ اریبہ کا رنگ اسی قدر گورا اور جلد شفاف اور نازک تھی کہ ایک ذرا سا ہاتھ لگتا تو داغ پڑ جاتا۔ یہ تو پھر شاہ زمان کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ تھا۔ وہ بچا کر مارتا تو ڈرامے میں وہ حقیقت کا رنگ نہ بھر پاتا اسی لیے اریبہ نے شاہ زمان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کوئی رعایت نہ کرے۔

"اریبہ! تھپڑ زور سے لگا تمہیں......" شاہ زمان نے ....الگ ہوکے بڑے دکھی لہجے میں اس سے کہا۔

"بالکل بھی نہیں، اپنے محبوب کی مار بھی پھولوں کی چھڑی لگتی ہے اور کون سا تم نے مجھے سچ مچ مارا تھا۔" اریبہ محبت سے اٹھلا کر بولی۔ شاہ زمان ایک بار پھر اسے خود سے بھینچنے کا ارادہ کررہا تھا کہ اریبہ نے روک دیا۔

"ارے...... رے رے...... بس! ورنہ ڈرامے کا سارا راز کھل جائے گا۔ ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

وہی ہوا...... لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد اریبہ کی توقع کے عین مطابق ایک فرنگی سپاہی اندر داخل ہوا اور اریبہ سے تحکمانہ انداز میں بولا کہ اسے "صاحب" نے فوراً بلایا ہے۔

سپاہی کی متوقع آمد سے وہ دونوں پہلے ہی ہوشیار تھے۔ اسی لیے منصوبے کے عین مطابق دونوں نے پہلے والا "منظر" ترتیب دے دیا تھا۔ یعنی شاہ زمان، اریبہ کو منانے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

"میں ضرور جاؤں گی صاحب کے پاس...... اور اس سے کہوں گی کہ میرے سوا کسی اور ڈومنی کو راج محل میں نہ گھسنے دے۔" اریبہ نے دانستہ اس فرنگی سپاہی کے سامنے غصے سے شاہ زمان سے کہا جس پر سپاہی کے ہونٹوں پر ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ شاہ زمان اسے روکتا رہ گیا مگر اریبہ غصے سے تنتناتی ہوئی فرنگی سپاہی کے ساتھ چلی گئی۔

☆☆☆

تیز بارش کے پانی کی برودت...... علی ریحان کے چہرے پر پڑتی رہی تھی۔۔ اسی لیے وہ جلد ہی بے ہوشی سے نیم بے ہوشی کی حالت میں آگیا اور فوراً ہی جب اسے خرد کا بھی یارا ہونے لگا تو اس نے کچھ آوازیں سنیں۔ کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی اور پھر ایک انسانی آواز......

"جیکب......!"

"کیا ہوا؟"

"اس طرف کوئی بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ ارے...... یہ تو وہی ہے...... ہمارا شکار...... سوشیل۔"

اپنے فرضی نام پر علی نے بے حرکت رہتے ہوئے ایک آنکھ کی جھری بنا کر دیکھا۔ سوئے اتفاق وہ اسی رخ پر پڑا تھا جدھر سے روب اور جیکب گھوڑوں پر چلے آرہے تھے۔ وہ قریب پہنچ چکے تھے پھر اس نے ان کو قریب آتے دیکھا۔

کیا ہوا ہے روب! دیکھو ذرا...... مر تو نہیں گیا ہے کہیں؟"

"یہ زندہ ہے، بیمار لگ رہا ہے۔ لگتا ہے سرد موسم اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کرکے بے ہوشی پر مجبور کردیا ہے۔"

"میرا خیال ہے اسے ادھر ہی گولی مار کر واپس چل پڑتے ہیں، موسم بہت خراب ہورہا ہے۔ کہاں اس مصیبت کو ساتھ لیے پھریں گے۔"

"تجویز تو تمہاری بری نہیں لیکن...... لیف بروجر......"

علی ریحان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ لیٹے لیٹے ہی اپنے حواس مجتمع کرنے لگا۔ جان گیا تھا کہ ایک سفاک موت اس کے سر پر کھڑی ہے۔

"اس کی پروا مت کرو...... بتادیں گے کہ ہمیں دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش میں چلتی ہوئی ریل کار پر سوار ہورہا تھا تو ہم نے گولی ماردی۔"

"چلو پھر جلدی کرو۔"

"کون گولی مارے گا؟"

یہ سفاکانہ گفتگو علی ریحان کے دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح ضربیں لگاتی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سر پر کھڑی موت سے خود ہی نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ یہ اپنا بار ہلکا کرنا چاہ رہے تھے مگر وہ نہتا تھا۔ پستول وغیرہ اس نے اسی لیے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں ایک گوپے کے پاس سے ہتھیار ملنا کسی کو بھی اس کی طرف سے شک وشبے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں مبتلا کرسکتا تھا۔

"یہ کام میں ہی کرتا ہوں، تم ذرا گھوڑوں کی رسی کومضبوطی سے پکڑے رکھنا۔ دھماکے کی آواز پر یہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔"

"میں انہیں ذرا دور ہی لے جاتا ہوں، تم ذرا جلدی اپنا کام نمٹالو.....؛"

اس نے آنکھ کی جھری بنا کر دوبارہ دیکھا اور اس کا جسم لرزا تھا۔ انہی دونوں فرنگی سپاہیوں میں سے ایک اپنی بندوق اس پر تانے ہوئے تھا۔ علی تب تک نہ صرف پوری طرح اپنے حواسوں میں آچکا تھا بلکہ وہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔

ٹھیک اسی وقت جنگل میں بندوق کے گرجنے کی آواز ابھری اور بارودی سکے اسی گھاس میں پیوست ہوگئے جہاں چند ثانیے پہلے ہی علی ریحان بہ ظاہر بے سدھ پڑا تھا۔ مگر اب وہ دائیں جانب کی جھاڑیوں میں جا پڑا تھا۔

گولی فائر ہونے سے پہلے ہی علی ریحان نے لیٹے لیٹے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لوٹ لگائی تھی اور پاس کی جھاڑیوں میں جا پڑا تھا۔ وہاں گرتے ہی علی نے اپنے دونوں ہاتھ متلاشی انداز میں زمین کو ٹٹولتے ہوئے حرکت دی تو اس کے ہاتھ میں ایک پہاڑی پتھر آگیا۔ وہی اس نے جیکب کی طرف بڑے سے زور سے اچھال دیا۔

جیکب کے لیے ایک بے ہوش اور بے سدھ پڑے آدمی سے اچانک ایسی حرکت اور پھرتی کی بالکل توقع نہ تھی۔ اسی سبب وہ ایک لمحے کے لیے تو ہکا بکا سا رہ گیا، ہوش تب آیا جب علی کا پھینکا ہوا پتھر اس کی پیشانی پر بڑے سے زور سے آکر لگا اور...... دوسرے ہی لمحے اس کا دماغ چکرا گیا۔ علی نے اٹھنے میں ذرا بھی تساہل سے کام نہیں لیا تھا، جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے ایک نازک وقت تھا۔ ذرا سی بھی سستی اس کے لیے موت کا پیغام لاسکتی تھی۔

ادھر دونوں گھوڑوں کی رسیاں پکڑے انہیں ایک طرف لے جاتے ہوئے روب نے گولی چلنے کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے ساتھی سپاہی جیکب نے اپنا "کام" نمٹایا ہوگا۔

علی ریحان... جو فوج آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک کمانڈر کی حیثیت رکھتا تھا، اپنے اندر ایک خاص جنگجوانہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ جنرل شمیر خان کے گروپ میں یہ "بارودی ماہر" بھی سمجھا جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ہتھیار دیکھ کر ہی یہ بات تاڑ گیا تھا کہ وہ اس کے کام کے ہرگز نہیں تھے، یعنی وہ انہیں استعمال کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ اس کے کارتوس کی تیاری میں سور کی چربی استعمال کی گئی تھی اور توڑے دار بندوق جس قدر تباہ کن ہتھیار تھا، اسی قدر اس میں ایک بڑی خامی یہ بھی تھی کہ اسے صرف اسی وقت بھرا جاتا تھا جب اسے استعمال کیا جائے۔ بہ صورت دیگر اگر اسے پہلے سے ہی بھرا رکھا جاتا تو فولادی خول کے اندر سور کی چربی پگھلنے سے کارتوس کا بارود بھی بیرل میں بہہ جاتا تھا اور چلاتے وقت بیرل کے پھٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

کچھ یہی وجہ تھی کہ علی نے ان سے خالصتاً زور بازو سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر اس کے لیے پھرتی درکار تھی۔

پتھر لگتے ہی فرنگی سپاہی کا دماغ چکرا گیا تھا۔ یہی موقع علی کے لیے کافی تھا۔ اس نے بہ سرعت اور بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی اور دو چار لمبے ڈگ بھرتے ہی وہ اس پر جا پڑا۔ وہ اسے رگیدتا ہوا نیچے آرہا اور اس کی بندوق جھپٹ کر پرے اچھال دی۔ یہی نہیں اس کی پنڈلی کی میان سے سنگین بھی نکال لی۔ اسے چھوڑ کر وہ تیزی سے روب کی طرف پلٹا، جو خطرے کی بو پاتے ہی گھوڑوں کی رسی چھوڑ کر اپنی بندوق میں کارتوس ڈالنے کی تیاری کررہا تھا۔

علی نے ایک نعرہ بلند کیا اور سنگین سونتے اس کی طرف انداز جنوں خیزی سے دوڑا۔ اس کی للکار پر روب پر ایسا خوف اور لرزہ طاری ہوا کہ اس کا وہ ہاتھ کانپ گیا جس میں کارتوس پکڑا ہوا تھا اور وہ اس فرنگی نے منہ سے کھولنے کے لیے قریب کر رکھا تھا۔ وہ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ روب بندوق پھینک کر اپنی بائیں ٹانگ کی پنڈلی پر جھکا کہ سنگین نکال لے، مگر تب تک علی ریحان ملک الموت بنا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

دودھاری تیز سنگین کے ایک ہی وار نے روب کا پیٹ چیر ڈالا اور انتڑیاں باہر ابل کر گر پڑیں۔ یوں جیسے کوئی زپ والا بیگ کھول دیا گیا ہو اور سارا سامان باہر گر پڑے۔ علی ...... جنونی انداز میں دوبارہ جیکب کی طرف پلٹا جو اپنی بندوق تلاشنے کے چکر میں تھا۔ اپنے ساتھی کا بھیانک انجام اور پھر علی کا جنگجوانہ انداز دیکھ کر اس میں مقابلے کی ہمت نہ ہوسکی اور وہ ایک طرف کو راہ فرار اختیار کرنے کو دوڑا مگر علی اسے اب کہاں چھوڑنے والا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کا زندہ راج محل پہنچنا نہ صرف مشن کے لیے خطرے کا سبب بن سکتا تھا بلکہ اریبہ اور شاہ زمان کی زندگیاں بھی خطرے سے دوچار ہوجاتیں۔

بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا مگر اس کے سبب زمین اور گھاس میں پھسلن سی پیدا ہوگئی تھی۔ جیکب دوڑتے دوڑتے کئی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جگہوں پر گر جاتا اور پھر اٹھ کر دوڑنے لگتا۔ یوں تب تک علی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ خون آلود سنگین پر بارش کا پانی بھی اس کے گاڑھے پن کو ختم نہ کر سکا تھا۔ وہی سنگین اس نے جیکب کے سینے میں پیوست کر دی۔

یکلخت جیسے طوفان تھم گیا۔ بارش رک گئی۔ جنگل دھل کر نکھرا نکھرا نظر آنے لگا۔ ایک عجیب سی اسرار بھری خاموشی طاری ہوگئی۔ شام تاریکی میں بدل چکی تھی۔ دور کہیں محاق کے جھکے جھکے چاند کی مدھم روشنی میں گیلا جنگل طلسماتی سا محسوس ہو رہا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔

دونوں فرنگی سپاہیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد علی بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس تھکاوٹ اور ٹوٹے ہوئے جسم کے اندر اچانک اتنی ہمت کیسے آگئی تھی کہ وہ نہتا ہونے کے باوجود ان دونوں مسلح سپاہیوں کو جہنم واصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ یقیناً اس جذبے کی قوت کا اثر تھا جس کے لیے اس نے سر سے کفن باندھ رکھا تھا اور وہ جذبہ تھا فرنگی سامراجیوں سے آزادی کا......!

کچھ دیر بیٹھ کر اس نے ستانے کا سوچا مگر اچانک ہی اس کی نظر مدھم سی روشنی میں گھوڑوں پر پڑی۔ یکلخت ایک خیال برق کی طرح اس کے ذہن میں چمکا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک گھوڑے کو اس نے درخت سے باندھ دیا، جبکہ دوسرے کی رسی اس نے تھام لی تھی۔ اس نے اس کی زین دیکھی، وہاں اس نے چمڑے کا ایک توبڑا دیکھا۔ اس کے اندر بھنے ہوئے چنے، گڑ کی بھیلی اور آدھا گنا پڑا ہوا تھا۔ وہ اس نے بڑی رغبت سے کھایا اور پھر گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ دونوں فرنگی سپاہی ضرور اس کے تعاقب میں بھیجے گئے ہوں گے اور بلاشبہ ایسی حرکت وہ فرنگی افسر لیفٹیننٹ بروجر کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقیناً اس پر شبہ گزرا ہوگا کہ ان تینوں گویوں میں سے ایک اچانک کیوں اور کہاں غائب ہوگیا؟ بے شک اریبہ یا شاہ زمان نے اس کے بارے میں کوئی بہانہ تو ضرور تراشا ہوگا لیکن وہ فرنگی افسران سے مطمئن ہونے والا کب تھا؟ لہٰذا اسی نے ہی دو سپاہیوں کو اس کے تعاقب میں دوڑا دیا۔ ممکن تھا اور بھی جگہوں پر اس نے اپنے سپاہی اس کی تلاش میں دوڑائے ہوں۔ لیکن علی کو اپنے دونوں ساتھیوں اریبہ اور شاہ زمان کی فکر ہونے لگی۔ تاہم اسے تسلی بھی تھی کہ صرف بروجر کے شک کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہیں تو مہاراجا چندر گپتا اور سینا پتی موج سنگھ کی حمایت حاصل تھی اور وہ پہلے بھی بروجر کے اس شبہے کو لغو قرار دے چکے تھے۔ لیکن پھر یہ سوچتے ہوئے فوراً ہی ایک خیال برق کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں آیا کہ...... اگر اسی طرح اور سپاہی بھی اس طرف کو نکل آئے اور انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں یہاں پڑیں دیکھ لیں تو ان کا پول کھل جائے گا۔

اس نے پہلے تو ان لاشوں سے متعلق یہی سوچا تھا کہ یہاں پڑی رہیں گی اور جنگلی جانور چٹ کر جائیں گے مگر اب لاشوں کو کم از کم چھپانے کا ارادہ ضرور باندھ لیا، اس نے پہلے جیکب کی لاش کو گھسیٹا اور ایک گہری کھائی میں پھینک دیا جس کے اندر جھاڑیاں نکلی ہوئی تھیں، روب کی لاش کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا۔ اس کے بعد جلدی جلدی تمام نشانیاں زائل کر ڈالیں۔

یہ کام تقریباً نصف گھنٹے میں نمٹانے کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔

گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری میں اسے سردی بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ بارش کے بعد تو اس میں اضافہ ہوگیا تھا۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے اس کے چہرے کو سن کیے دے رہے تھے۔ ان میں برف کی سی ٹھنڈک اور ایک سرد سی کاٹ تھی۔ علی سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگا۔

جلد ہی جنگل اختتام پذیر ہوا اور ٹیلے نما بنوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہاں سے پختہ اور پتھریلا راستہ شروع ہوگیا۔ جیسا اریبہ نے بتایا تھا علی اسی طرح ان راستوں کی نشانیاں ذہن میں رکھے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پٹڑی کے قریب پہنچ گیا۔

اسے قریب میں وہ پہاڑی ندی بھی دکھائی دے گئی تھی جہاں سے چٹانی کاریز نکال کر ٹین کے کھالے کو نلکا بنایا گیا تھا جو عین پٹڑی کے اوپر جھول رہا تھا۔ اس کے نیچے ریل کار کا انجن اور بوگیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ اس طرح ان کی ٹنکیاں بھری جاتی تھیں۔ لیکن وہاں اسے کوئی ریل کار کھڑی دکھائی نہ دی تھی۔ اسے مایوسی ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود پر ہی ہنس پڑا۔ حالات نے اس کا ذہن ہی ماؤف کر دیا تھا۔ سواری تو اس کے نیچے موجود تھی۔ لہٰذا اس نے اللہ کا نام لے کر گھوڑا...... پٹڑی کے ساتھ ساتھ ڈال دیا۔ مگر جلد ہی اسے رکنا پڑا۔

گھوڑا چوری کا تھا اور فرنگی سپاہی کا تھا۔ اگرچہ اس نے اس پر سے شاہی مہر اور برٹش گورنمنٹ کی مخصوص مونوگرام والی زین اور دیگر ایسی چیزیں اتار پھینکی تھیں لیکن اس طرح گھوڑے پر سواری سے وہ کسی کی نظروں میں بھی آسکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ مایوس سا ہونے لگا۔ سردی سے اب اس کا پورا بدن اکڑنے لگا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ادھر گھوڑے کی سواری سے جو امید بندھی تھی وہ محو ہوگئی۔ وہ کسی بھی صورت میں کسی کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تک وہ ریاست ناگرہ کی حدود کے اندر ہی تھا۔ حدود کے اختتام پر ضرور اس پٹڑی پر بھی ناکا بنایا گیا ہوگا لیکن ترپال بھی جلد سے جلد پہنچنا ضروری تھا۔ بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اسی طرح اللہ کے بھروسے پر تاریکی میں اس پٹڑی کی راہنمائی میں گھوڑے پر چلتا رہے گا اور گردوپیش سے بھی پوری طرح چوکس رہنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہوگا وہ گھوڑے سے اتر کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا۔

چنانچہ اس نے گھوڑے کو دھیمی رفتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔ دو پلیا پار کرنے کے بعد پٹڑی رات کی تاریکی میں دائیں جانب سانپ کی طرح بل کھاتی جا رہی تھی اور جب وہ ایک مقام پر بالکل سیدھی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔ وہ سرخ بتی کی روشنی تھی۔

پہلے تو وہ اسے سگنل سمجھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے وسل کی آواز سنائی دی۔ اس آواز کو سن کر اس کا دل بے پایاں مسرت تلے زور سے دھڑک اٹھا۔ ریل کار اس کے آگے آگے جا رہی تھی اور سرخ روشنی لالٹین نما وہ بتی تھی جو ریل کے آخری ڈبے پر باندھی جاتی ہے۔ اسے حیرت تھی کہ ریل کار تو کب کی اس سے چھوٹ چکی تھی۔ کہیں یہ مال بردار گاڑی تو نہیں تھی؟ جس کی رفتار یوں بھی دھیمی ہوتی تھی۔

بہرکیف...... کچھ بھی تھا اس نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی اور جلد ہی آخری بوگی کے قریب پہنچا تو اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ مال گاڑی ہی تھی جس کے آخر میں بوسیدہ سا گارڈ کا ڈبا منسلک تھا۔

اسے اندر گارڈ کی موجودگی کا ڈر بھی تھا تاہم وہ اللہ کا نام لے کر بڑھتا رہا حتیٰ کہ ڈبے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ہوشیاری سے خود کو گھوڑے کی پشت سے الگ کیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر ڈبے کے عقبی کھلے گوشے میں نصب فولادی ریلنگ کو تھام لیا اور گھوڑے کی پشت سے اچک کر ڈبے میں سوار ہوگیا۔ گھوڑا تھوڑی دیر تک آخری ڈبے کے پیچھے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا اس کے بعد جب علی نے مخصوص انداز میں اسے زور سے ایک اشارہ کرتے ہوئے ٹٹکارا مارا تو وہ راستہ بدل کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔

علی ریحان پلٹا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں زور سے رگڑ کر سردی کے احساس کو کم کرنا چاہا۔

اندر ایک ہی مختصر سا کیبن تھا۔ دو چوکور چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے درمیان میں دروازہ تھا جو بند تھا۔ کھڑکیوں میں سے ایک بند تھی، جبکہ دوسری کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا کو پُر کرنے اور سرد ہواؤں کے گزر کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کرنے کے لیے اس پر کوئی گتا سا اٹکا دیا گیا تھا۔ وہی گتا ہٹا کر علی نے اندر جھانکا تھا۔

اندر مدھم سی یرقان زدہ روشنی تھی۔ درمیان میں لوہے کی زنگ آلود گول اسٹول نما میز نصب تھی۔ اس پر رجسٹر رکھا تھا۔ پاس ہی کرسی تھی۔ دائیں بائیں لوہے کی دیواروں سے دو بنک بیڈ نصب تھے۔ ایک پر کوئی موٹا سا بوسیدہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ لالٹین اسی اسٹول پر رکھی تھی جس کی لو مدھم تھی۔ اندر اسے کوئلوں کی ایک انگیٹھی بھی سلگتی نظر آئی تھی۔

علی کا سردی سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی مگر حسب توقع دروازے کو اندر سے بند ہی پایا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر وہیں کھڑا رہ گیا۔ گارڈ کی اس چھوٹی سی بوگی میں دونوں طرف چھت تھی۔ اس کا فرش لوہے کی پٹیوں کے بیچ میں چوبی پھٹے نصب کر کے بنایا گیا تھا۔ علی اسی جگہ پر کھڑا تھا۔

ریل کا دخانی انجن رات کی تاریکی میں وسل دیتا ہوا اپنے پیچھے مال بوگیوں کو باندھے مناسب رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ دائیں جانب تاریک جنگل تھا اور بائیں طرف گہری سنگلاخ کھائیاں اور چٹانیں تھیں۔ ان کے درمیان ریل بل کھاتی پٹڑی پر گامزن تھی۔

علی نے بالآخر اس کھڑکی کو تختۂ مشق بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے خلا میں گتے کا ٹکڑا پھنسایا گیا ہوا تھا۔ اس نے گتا بہ آسانی اکھیڑ ڈالا اور کھڑکی سے سکڑ سمٹ کر بہ مشکل کیبن کے اندر آگیا۔

کیبن کے اندر آتے ہی بے اختیار اسے سکون کا احساس ہوا۔ کیبن کا محدود ماحول سلگتی انگیٹھی کی وجہ سے کچھ گرم تھا۔ علی نے اس کرم نوازی پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور جلدی سے گتا دوبارہ سے وہیں اٹکا دیا، تاکہ سرد اور برفاب ہواؤں کا گزر کم سے کم رہے۔ اس کے بعد وہ انگیٹھی کے قریب آکر بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔

اچانک گاڑی کسی چٹانی سرنگ کے اندر داخل ہوگئی۔ اس سے کیبن کا ماحول کچھ دیر کے لیے ہی سہی اور بھی گرم ہو گیا۔

سرد ٹھٹھرتی رات...... اور کاٹ دار برفیلی ہواؤں کو چیرتی، محاق کے چاند کی مدھم طلسماتی روشنی میں بارش سے بھیگے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بھیگے جنگلوں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان میں سانپ کی طرح بل کھاتی مال گاڑی مناسب رفتار سے دوڑی چلی جارہی تھی۔اس کی رفتار پہلے سے تیز ہوگئی تھی۔

علی ریحان کی ہڈیوں کے اندر تک اتری ہوئی ٹھنڈک کم ہوئی تو اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔اس نے ایک نظر بنک بیڈ پر دراز کمبل اوڑھے شخص کی طرف دیکھا۔وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص بے سدھ سو رہا ہے۔اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔سونا اس نے نہیں تھا،سرحد پار کرتے ہی اور تریپال میں داخل ہونے کے بعد وہ فوراً مال گاڑی سے خاموشی کے ساتھ اتر جائے گا۔

لہٰذا اس نے یہی کیا اور خاموشی سے اسی طرح انگیٹھی کے پاس بیٹھا رہا۔رات کا جانے کون سا پہر سرک رہا تھا۔مال گاڑی اپنی مخصوص ......کھٹا کھٹ......کھٹا کھٹ......کی آواز سے منزل کی جانب گامزن تھی۔وقت گزرتا جارہا تھا۔

اس نے ناگرہ سے تریپال تک کے اپنے سفر کے دورانیے پر غور کیا۔یعنی ناگرہ سے مال گاڑی میں روانگی کو اسے بیس سے پچیس منٹ ہوچکے تھے۔اس نے ریل کار کی رفتار پر بھی دھیان دیا۔جس کی رفتار اس کے محتاط اندازے کے مطابق درمیانی رفتار سے کم ہی تھی۔درمیان میں اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے رفتار بڑھی تھی مگر پھر کم ہوگئی تھی۔بس اتنی ہی تھی کہ ایک انسان اپنی پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے اس پر چڑھ اور اتر سکتا تھا۔

اس نے اپنی معلومات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سوچا۔وہ ناگرہ کی حدود کے بعید ترین گوشے میں محوِ سفر تھا۔مزید بیس سے پچیس منٹ کے بعد وہ اس کی حد سے پار ہوسکتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت شراٹے دار بارش پھر شروع ہوگئی۔بارش کا زور ایک دم ہی پھوٹ پڑا تھا۔تب ہی اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار بھی بتدریج ہلکی ہونے لگی تھی۔جو ہوتے ہوتے اتنی باقی رہ گئی کہ کوئی بھی مسافر (اگرچہ یہ مال گاڑی تھی) نیچے اتر کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ... بہ آسانی سوار ہوسکتا تھا۔

علی متفکر سا ہوگیا۔ابھی وہ پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی رک گئی۔اب صرف ماحول میں تیز شراٹے دار بارش کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔اس نے تھوڑی سا کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے گھور ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات کے برستے ہوئے اندھیاروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔وہ دوبارہ انگیٹھی کے پاس آکر بیٹھ گیا جس کے کوئلوں کی سلگن بھی اب ماند پڑنے لگی تھی۔

اچانک اس کا دل کچھ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرنے لگا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایک دم کیوں بے چین ہونے لگا تھا؟ پریشانی اپنی جگہ لیکن......اس کے دل کی بے چینی کسی اور ہی بات کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہورہی تھی۔یہ بے چینی اس کی چھٹی حس سے بیدار ہورہی تھی جس کا تعلق اس کیبن سے تھا۔تب ہی دفعتاً وہ چونکا۔

اس نے ایک نگاہ یونہی بنک بیڈ پر کمبل اوڑھے گہری نیند میں مستغرق آدمی کی طرف دیکھا اور اپنے اندر کی اسرار بھری بے چینی کو سوا ہوتے محسوس کیا۔وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔اس کے وجدان میں فوراً ہی ادراک ہوا کہ اس کی نامعلوم بے چینی کا تعلق کمبل میں سوئے پڑے اسی آدمی سے تھا۔تب ہی جانے کیوں اس کے جی میں آئی کہ وہ ایک ذرا اس آدمی کا کمبل سرکا کر دیکھے تو......بس یونہی ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔

وہ کھڑا ہوگیا۔باہر تاریک جنگلوں اور پہاڑیوں میں دھواں دھار ہونے والی بارش کا شور جاری تھا۔گاڑی رکی ہوئی تھی۔ایک بار اس کے انجن نے عجیب سا تاثر چھوڑتی وسل دی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا زنگ آلود اور سالخوردہ سے بنک بیڈ کے قریب آیا اور چند ثانیے کھڑے ہوکر اسی طرح کمبل اوڑھے سوئے ہوئے شخص کو گھورتا رہا۔وہ پشت کے بل لیٹا ہوا لگتا تھا۔علی نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اسے اپنے ہاتھ میں ارتعاش نمایاں طور پر محسوس ہوا......پھر جب اس نے سر کی طرف سے اس کا کمبل چھوکر آہستگی سے ہٹایا تو اسے ایک بھیانک چہرہ اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا محسوس ہوا۔

ٹھیک اسی وقت بجلی کا زوردار کڑاکا ہوا تھا اور علی ریحان جیسا مضبوط دل گردے کا آدمی بھی اس بھیانک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے بری طرح دہل کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

☆☆☆

کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کا اصل منصوبہ اور مقصد کیا تھا،یہ مہارانی نجوبائی کو پتا نہیں تھا۔یہی نہیں مہارانی،بدری ناتھ کے......گھناؤنے راز سے بھی واقف نہ تھی کہ اس نے ولی عہد کے لیے تیار کیا ہوا ہتھیار پروفیسر ہنری پر کیوں آزما ڈالا تھا؟ جبکہ اسے بتایا یہی گیا تھا کہ ایسا نادانستگی یا غلطی سے ہوگیا مگر اس کے درپردہ حقیقت کچھ اور تھی۔

دراصل بدری ناتھ کے لیے ولی عہد پرتاب نہیں بلکہ پروفیسر ہنری ''خطرناک'' ثابت ہونے لگا تھا۔لہٰذا یہ کہا جاسکتا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا کہ بدری ناتھ نے غلطی سے نہیں بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے ہی پروفیسر ہنری کا قتل کروایا تھا کیونکہ ہنری اس کے ایک بھیانک منصوبے سے پردہ چاک کرنے والا تھا جو بدری ناتھ کو کسی صورت میں بھی گوارا نہ تھا کہ وہ راز آشکار ہوتا۔ بے شک اس کا مفاد بھی مہارانی نجوبائی کے مفادات سے نتھی تھا مگر اپنا مفاد بدری ناتھ کو زیادہ عزیز تھا۔

اپنی اس شاندار فتح کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ وہ اس فتح کو اپنے خفیہ منصوبے کے لیے اچھا شگون سمجھ رہا تھا۔ ریاست میں اس کی عزت اور شہرت بڑھ گئی تھی۔ یہی بدری ناتھ چاہتا بھی تھا۔ وہ ریاست میں ایک ایسا مذہبی راہنما بن کر ابھرنا چاہتا تھا کہ ساری ..... رعایا کے لیے وہ سب سے زیادہ قابلِ احترام اور عزت دار دھارمک کی حیثیت اختیار کرلے۔ یہ اس کے شیطانی منصوبے کا ایک ابتدائی اور ..... اہم حصہ بھی تھا۔ وہ مذہب کی آڑ میں اپنے خفیہ شیطانی منصوبے کا فروغ چاہتا تھا۔

اب پروفیسر ہنری کو موت سے ہمکنار کرنے کے بعد بدری ناتھ کی شیطانی نظر ریتا اور اس کے ساتھیوں پر مرکوز ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے چیلے پرس رام کو ہدایت کررکھی تھی کہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھے۔ آج وہ یہی پتا چلانے کے لیے راج محل کی طرف گیا تھا اور اب مندر لوٹ کر وہ اپنے گرو گھنٹال کو ایک نئی خبر سے مطلع کررہا تھا۔

”گرو! وہ فرنگن ہے نا..... کیا نام تھا سسری کا..... ہاں ریتا..... وہ تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ راج محل چھوڑ رہی ہے۔“

”یہ اچھی خبر ہے۔“ پجاری بدری ناتھ نے خوش ہوکے کہا۔ ”پرتو یہ بتا پرس رام کہ انہیں صرف راج محل سے بے دخل کیا گیا ہے یا..... ریاست سے.....؟“

”یہی تو بری خبر ہے گرو! انہیں ریاست سے نہیں کیول راج محل سے بے دخل کیا گیا ہے۔“ پرس رام نے جواب دیا تو بدری ناتھ کی سانپ جیسی آنکھوں میں یکا یک تشویش کے سائے نمودار ہوگئے، بولا۔

”ممکن ہے وہ لوگ اب بددل ہوکر خود ہی ریاست سے بھی نکل جائیں۔“

”اگر ایسا ہوتا تو مہاراجا خود ان کی شہر واپسی کا بندوبست کروادیتا۔ جس کا اس نے ان سے کہا بھی تھا، پرتو اس فرنگن نے انکار کردیا۔ اب پتا نہیں اس سسری کا اور کیا ارادہ ہے؟“

”تم یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ اب ان کا نیا ٹھکانا اور آئندہ ان کے عزائم کیا ہیں.....؟“

”میں نے دو ساتھیوں کو ان کے تعاقب میں لگادیا ہے۔ وہ آج رات تک بتا دیں گے۔“ پرس رام نے جواب دیا۔

”اور سنو پرس رام.....!“

”کہو گروجی!“

”زہر کی پڑیا پہنچادی تھی؟“

”ہاں گرو! پہنچادی تھی۔“ پرس رام نے جواب دیا۔

”پر گروجی! ایک بات میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیا بات.....؟“

”اگر اب کے بھی مہارانی نجوبائی سے یہ کام نہ بن پڑا تو وہ پھر ہمارے گلے پڑجائیں گی۔ ڈرتا ہوں اس کی وجہ سے کہیں ہمارا کام نہ بگڑ جائے۔“

”اس کی چنتا مت کرو پرس رام!“ مہاپجاری نے سانپ کی سی پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ یہ محلات کی مہارانیاں کوئی نہ کوئی گل کھلاتی رہتی ہیں۔ چین ان کے من میں کہاں..... ہوتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ عنقریب ستی کی رسم کو میں پروان چڑھانے والا ہوں۔ پھر دیکھنا سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔“

”اوش..... اوش ..... (ضرور) گروجی.....! کیوں نہیں۔“ پرس رام خوشامدانہ لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

☆☆☆

ان سب کو اپنے آئندہ کے وہ عزائم پیارے تھے جو انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھے تھے۔ اسی لیے مخالفت اور ناپسندیدگی کی اس مکدر فضا کے باوجود وہ سب ریتا کا حکم ماننے پر مجبور تھے کیونکہ رابرٹ اور گارشیا ان سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم پھر بھی وہ اس آسیبی بستی میں ڈیرا ڈالنے کا سن کر کانپ گئے تھے۔

رابرٹ نے ریتا سے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔ ”ریاست میں اپنا یہیں کیمپ قائم کرنے کے لیے جگہ کی کیا کمی ہے، کیا ضروری ہے کہ ہم اسی آسیبی بستی کا رخ کریں؟“

بھائی کی دیکھا دیکھی اس کی تائید میں گارشیا نے بھی ریتا سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”ریتا! لگتا ہے صدمے نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ وہاں ہم نے کن عجیب و غریب لوگوں کو دیکھا تھا؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہاں کسی وچ ڈاکٹر کی حکمرانی ہے اور وہ بدروحوں کی بستی ہے۔“

”وہاں نہ کوئی وچ ڈاکٹر رہتا ہے نہ ہی وہ بدروحوں کی بستی ہے۔“ ریتا نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

اس کے منصوبے میں صرف یہی دونوں بھائی بہن

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

معترض تھے۔ باقی سب رینا کے ہر حکم کے آگے سرخم کیے ہوئے تھے۔ رہ گیا شوکی تو اس نے پہلے ہی رینا کے ہر عزم کا ساتھ دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ تاہم اسے ہی نہیں بلکہ امجد خان وغیرہ کو بھی اس بات کی حیرت تھی کہ رینا کے ساتھ شدید مخالفت کے باوجود......رابرٹ اور گارشیا کیوں ان کے ساتھ نتھی تھے؟ وہ واپس شہر کا رخ بھی کر سکتے تھے؟ رینا کا ساتھ چھوڑنے میں آخر ان کو کیا مسئلہ درپیش تھا؟ وہ ان دونوں بہن بھائیوں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے بے چین تھے مگر نہیں پوچھ سکتے تھے کیونکہ ملازموں کا کام صرف حکم ماننا ہوتا ہے سوال کرنا نہیں......

بہرکیف......رابرٹ اور گارشیا کی کوئی بھی..... پیش رینا کے آگے نہ چل سکی۔ یہ لوگ راج محل سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگے۔ مہمان گاہ کے اس گوشے میں باتوں کی بھنبھناہٹ بھی جاری تھی جسے ذرا دیر بعد اچانک بریک لگ گئی۔

ولی عہد پرتاب اندر داخل ہو رہا تھا۔ ڈرائیور امجد خان، نندو بابا اور شانتا احترام سے سر جھکائے دوسرے گوشے کی طرف سرک گئے۔ شوکت متذبذب رہا، کیونکہ اسے رینا کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہ تھی۔ تاہم ولی عہد کے سامنے وہ اس کیفیت کا شکار رہا تھا۔ رینا نے نگاہ اٹھا کر خود ہی پاس کھڑے شوکی کو نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی اندر چلا گیا۔

اب صرف وہاں رابرٹ اور گارشیا سمیت رینا اور ولی عہد رہ گئے تھے۔

پرتاب کی نظریں رینا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور......رینا نے ایک نگاہ راجکمار پر ڈالنے کے بعد جھکالی تھیں تاہم اسے ادب سے سلام ضرور پیش کیا تھا، جبکہ رابرٹ اور گارشیا نے بھی اسے سلام کیا تھا۔ اب ان دونوں کی نظریں پرتاب اور رینا کو تاکنے میں لگی ہوئی تھیں۔

ولی عہد پرتاب نے رابرٹ اور گارشیا کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے رینا کو ہولے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رینا! ہمیں اس طرح آپ کے راج محل سے جانے پر دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ہمیں تاعمر اس بات کا افسوس رہے گا کہ ہم آپ سے کیا گیا اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ کوشش ہماری یہی تھی کہ آپ کو پورا پورا انصاف دلایا جائے......مگر ہم ایسا نہیں کر سکے۔ ہم آپ سے یہاں اس بات کی معافی طلب کرنے آئے ہیں۔ لیکن ایک بات کہہ دیتے ہیں کہ اس میں ہمارا ابھی کوئی قصور نہ تھا اگر آپ کے اپنے ساتھی جھوٹی گواہی نہ دیتے۔"

رینا......جس نے پرتاب کی اس طرح آمد کو محسوس نہیں کیا تھا، ولی عہد کی اس "معافی" والی بات نے بے اختیار اس کا "اندر" دھڑکا کر رکھ دیا۔ اس کی بات غلط بھی......تو نہیں تھی۔ رینا نے سوچا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ولی عہد کے چہرے کی طرف دیکھا۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ رینا کو ولی عہد سے انصاف دلانے کی پوری امید تھی۔ اگر رابرٹ ذاتی عناد کی آگ میں جل کر......جھوٹی گواہی نہ دیتا تو آج حالات ان کے حق میں ہو سکتے تھے لیکن ولی عہد کے یوں اظہار معذرت و معافی نے رینا کو از حد متاثر کر ڈالا، کیونکہ یہ کسی عام انسان کے اس سے معافی مانگنے کی بات نہ تھی۔ ریاست کا ولی عہد اس کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ یہ اس کا بڑا پن تھا۔ رینا کو اسی بات نے متاثر کیا تھا، وہ بولی۔

"راجکمار صاحب! آپ نے یقیناً ہمارے لیے جو کرنا چاہا تھا اس میں آپ کی نیک نیتی کا ہی دخل ہو گا لیکن جس انداز سے ہم مقدمہ ہار بیٹھے اس کا مجھے بے حد قلق ہے۔ آپ کو تو کوئی دوش نہیں لیکن......" یہ کہتے ہوئے رینا نے دانستہ قریب کھڑے اپنے کزن رابرٹ کی طرف ترش نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پرتاب نے بھی اسی کی طرف دیکھتے ہوئے رینا سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں کے اندرونی معاملات کیا ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ لوگ جہاں بھی جائیں، جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رینا صاحبہ! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا، چلتے ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔"

ولی عہد یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا۔ گارشیا ترچھی اور معنی خیز نگاہوں سے رینا کے پک دک سے چہرے کو تکنے لگی تھی جو جاتے ہوئے راج کمار کی طرف یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ گارشیا کو شوکی کے علاوہ اب ایک نئی کھچڑی پکنے کی بو آنے لگی تھی۔ گارشیا کی مثال گندی مکھی کی سی تھی۔ وہ اس گند میں سے ایک گندا خیال اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے لیے کسی طرح "سودمند" ہو سکتا تھا۔

رینا چند ثانیے تو خاصی گہری اور خیال انگیز سوچ میں مستغرق رہی۔ اس کے دل کو ایک بار پھر ولی عہد پرتاب کی باتوں سے ڈھارس ہوئی تھی۔ آج اس نے پرتاب کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک خاص جذبے کی تپش کو بھی محسوس کیا تھا۔ اسی بات نے رینا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ روانگی کی تیاری کے دوران بھی کافی دیر تک کھوئی کھوئی سی رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ہنوز راج کمار پرتاب کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

الفاظ گونج رہے تھے۔ "جدھر بھی اور جب بھی ہماری ضرورت پڑے مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ رینا صاحبہ! خاص کر آپ کے لیے میرے یہ الفاظ ہیں۔ انہیں یاد رکھیے گا۔ چلتے ہیں۔ بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔"

شوکی نے بھی اس درمیان میں یہ محسوس کیا تھا کہ ولی عہد کے جانے کے بعد رینا کچھ زیادہ ہی کھوئی کھوئی سی ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سے بھی کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

یہ لوگ ایک مختصر قافلے کی صورت میں راج محل سے باہر نکل آئے تھے۔ ولی عہد پرتاب نے ان کے لیے سواری کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ سواری دو گھوڑوں کی ڈاک گاڑی تھی۔

ڈاک گاڑی نے تقریباً نصف گھنٹے بعد انہیں راکاشی بستی کی طرف جانے والے راستے پر اتار دیا اور واپس لوٹ گئی۔ ایسا رینا کے کہنے پر ہی ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈاک گاڑی اس بستی میں داخل ہو۔ یوں بھی وہ بستی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ لوگ اپنے اپنے سفری بیگ پشت پر لادے پیدل چل پڑے۔ اپنے اس سفر میں انہوں نے آنجہانی پروفیسر ہنری برنارڈ کو بہت یاد کیا تھا۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ شام کی ملگجاہٹ دور پہاڑی چوٹیوں پر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے گرد گھنے جنگل کا حصار تھا۔ وہاں جانے کیوں بھیدوں بھری خاموشی کا گمان ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی یہ لوگ راکاشی بستی کی وادی کے دامن میں فروکش ہو چکے تھے۔ اس بستی میں آتے ہی انہیں یہاں ایکا ایکی ہی عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

مہارانی نجوبائی کو خشک زہر کی پڑیا پہنچادی گئی تھی اور وہ اس نے بچھورام کے حوالے کرتے ہوئے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

"بچھورام......! یہ کام آج ہی ہوجانا چاہیے۔ تم کام ہوجانے کے بعد اپنی جھولی کو بھرا ہوا پاؤ گے۔"

"آپ چنتا نہ کریں مہارانی صاحبہ! آپ کا غلام یہ کام آج ہی نمٹادے گا اور اوش (ضرور) نمٹائے گا۔" چندی چندی آنکھوں والے بچھورام نے کہا۔ انعام کے لالچ سے اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

اس نے اسی رات وہ زہر ولی عہد کے دودھ کے اس گلاس میں ملادیا جسے ایک ملازمہ نرملا اس کے کمرے میں پہنچاتی تھی۔ دودھ کا گلاس پہنچانا اسی کے ذمے تھا۔ ہر کسی کے گلاس مختلف سائز اور سطح کے تھے۔ ولی عہد کا گلاس مخروطی اور کھلے پیندے والا تھا۔ بچھورام نے نرملا کی غیر موجودگی تاک کر، رات کو عین وقت پر بڑی ہوشیاری سے زہر کی پڑیا کو ولی عہد پرتاب کے دودھ والے گلاس میں ملادیا تھا۔

راجدھانی کے مکینوں میں صرف تین افراد ایسے تھے جو رات کو دودھ کا ایک گلاس پینے کے عادی تھے۔ مہاراجا چندر گپتا، راجکماری سونجنا اور ولی عہد پرتاب۔ بلکہ پرتاب کو تو دودھ پیے بنا نیند ہی نہیں آتی تھی۔ البتہ سونجنا اور مہاراجا کو جب نیند زیادہ ستاتی تو دودھ رکھا رہ جاتا تھا اور وہ بغیر دودھ پیے سو جاتے تھے۔ البتہ ولی عہد پرتاب کا معاملہ الگ تھا۔ وہ رات کو دودھ پیتا ہی اسی لیے تھا کہ اسے نیند آجائے۔ دودھ پیے بنا اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔

جبکہ راجکماری نجوبائی اور اس کے بیٹے، یعنی چھوٹے راج کمار ایش کا معاملہ مختلف تھا۔

رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی۔ ولی عہد اپنے کمرے میں مسہری پر نیم دراز سوچوں میں مستغرق تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ پروجیہہ چہرہ رنجور سا نظر آتا تھا۔ وجہ یہی تھی اس کی کہ اسے رینا کے جانے کا دکھ تھا۔ وہ اندر ہی اندر اس معصوم صورت اور نازک اندام سی نیلی آنکھوں اور کومل چہرے والی پری مثل رینا کو چاہنے لگا تھا۔ اسے اس بات کا بے حد رنج بھی تھا کہ وہ اس کے باپ کے قاتلوں کو بے نقاب نہیں کرسکا تھا اور نہ ہی اسے انصاف دلاسکا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا لیکن بہرحال وہ رینا سے کیا گیا اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا تھا۔ اس کا دل رینا کے لیے آج بہت بے چین ہو رہا تھا۔ ایک تڑپ تھی شدت کی کہ وہ...... یہاں سے رخصت ہوتی رینا کو جا کر روک لے...... اسے جانے نہ دے یہاں سے...... اس کے آگے رو پڑے، اس کی منتیں کرے مگر وہ یہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا مرتبہ، رینا اور اس کے درمیان نامعلوم تعلق کے سامنے مانع ہوتا تھا۔ اسے پہلی بار لمحہ بھر کو ہی، حیرت بھی ہوئی تھی کہ اسے یہ کیا ہوگیا تھا؟ وہ ایک فرنگن دوشیزہ کی محبت میں کیونکر گرفتار ہوگیا تھا؟

رینا ہی کے بارے میں سوچتے سوچتے کافی رات بیتنے لگی۔ وہ سونا چاہتا تھا اب...... تب ہی اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے قریب ہاتھ بڑھا کر دودھ سے بھرا گلاس اٹھالیا۔

اب بھی اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی رینا کی طرف سے ہٹا نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں اس نے دودھ کا گلاس اپنے منہ سے لگالیا اور چند لمحوں میں خالی کردیا۔

اگلے دن کا سورج...... راج محل میں ایک کہرام بپا کرتا طلوع ہوا تھا۔

(جاری ہے)

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جسٹس

ناہید سلطانہ اختر

دور چاہے قدیمی ہو یا جدید... ظالم مظلوموں پر ظلم کی انتہا کرتے رہے ہیں... جرم کی نہ کوئی سمت ہوتی ہے نہ قسم۔ یہ واقعہ بھی اگرچہ تیس سال پرانا ہے مگر آج بھی دورِ حاضر کے حالات پر نوحہ کناں ہے۔ خبیث روحیں ہر دور میں بدی پھیلاتے ہوئے اپنے انجام کو یکسر فراموش کردیتی ہیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معصوم بچوں کا بچپن چھین لینے والے سنگدل اور ظالم انسانوں کا ماجرا

دادی اسے اپنے گھر کی رونق اور پاپا چیٹر بکس کہا کرتے تھے۔ بھیا کی وہ دوست تھی اور ماما کی گڑیا...... گڑیا جو پٹر پٹر بولتی تھی۔ جس کی خوب صورت آنکھوں میں جگنو چمکتے تھے۔ جو ہنستی تو پھول بکھر جاتے۔ جو روتی تو موتی برسنے لگتے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں وہ پہلے ہی دن اپنی ٹیچر کی من پسند بن گئی تھی۔ اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہی چیٹر بکس کھل جاتا۔ وہ دروازے سے بعد میں داخل ہوتی، اس کی زبان پہلے ہی چلنے لگتی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"دادی! آج تھری اسٹارز دیے ہیں ٹیچر نے۔"

"دادی! آج نا میری فرینڈ نے مجھے گراؤنڈ میں دھکا دے دیا۔"

"ماما! لنچ بہت مزیدار تھا...... کل بھی آپ یہی دینا۔"

"دادی! ہمارے اسکول میں فن فیئر ہوگا...... آپ چلو گی نا؟"

"ماما! میرے شوز کی لیس کھول دیں۔"

"اُف اللہ دادی! آج تو میں بہت تھک گئی۔"

دادی مسکرا دیتیں۔ "کیوں تھک گئی میری رانی؟"

"کام بہت تھا نا۔"

"کیسا کام؟"

"اُف اللہ! آپ کو یہ بھی نہیں پتا...... بھئی اسکول میں پڑھنا ہوتا ہے، بہت سا لکھنا ہوتا ہے...... پتا ہے کیا آج ٹیچر نے پوئم بھی یاد کرائی۔" بنا کسی کی فرمائش پر وہ لہک لہک کر پوئم سنانے لگتی۔

پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر واقع چھوٹے سے فلیٹ میں اس کی آواز خوشبو بن کر بکھری رہتی۔ کبھی ماما سے فرنچ فرائز کا تقاضا، کبھی پاپا سے آئس کریم کھلانے کی فرمائش...... کبھی دادی سے کہانی سننے کا اصرار تو کبھی بھیا سے ہلکی پھلکی نوک جھوک۔

"بلی!" بھیا اسے چھیڑتا۔

"ماما! بھیا کو دیکھیں، مجھے بلی کہہ رہے ہیں۔"

"میاؤں!" بھیا آواز نکالتا اور انگلیاں موڑ کر پنجے دکھاتا۔

"دادی!" وہ ٹھنکتی۔

"بھئی کیوں ستا رہے ہو بہن کو۔" دادی اپنے کمرے سے ہانک لگاتیں۔

"دادی! بلی کو بلی نہیں تو کیا چوہا کہوں۔"

"اوں!" وہ مٹھیوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگتی۔

"پاپا آئیں گے تو شکایت کروں گی ان سے۔"

بھیا اس کی نقل اتارتا۔ زبان چڑاتا، وہ منہ بسورنے لگتی۔ بھیا ہنس دیتا۔ اسے گدگداتا۔ "ارے یار مذاق کر رہا تھا...... تم تو میری پیاری سی جانو سی بہن ہو...... ایک ہی تو بہن ہے میری۔"

"آپ بھی تو ایک ہی بھیا ہو۔" وہ مسکرا دیتی آسانی سے من جاتی۔

"ہاں تو پھر جھگڑا کیسا...... میں تمہارا ایک ہی بھیا تم میری ایک ہی بہنا...... دوستی کرو نا پھر......" بھیا اپنے سیدھے ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں جوڑ کر اس کی طرف بڑھاتا۔

وہ بھی جواباً ایسا ہی کرتے ہوئے دادی جان کے سکھائے الفاظ دہراتی۔ "لڑائی لڑائی ختم۔ دوست بنے ہم۔"

پاپا کے ساتھ گھر سے باہر کہیں جاتے ہوئے اس کی زبان تالو سے نہ لگتی۔ سوال پہ سوال اور پھر خود ہی جواب۔ پاپا اس کا سر پیار سے چھو کر کہتے۔ "تمہارے اتنے چھوٹے سے سر میں اتنی بہت سی باتیں کہاں سے آتی ہیں؟"

"دادی بولتی ہیں باتیں دماغ سے آتی ہیں۔"

"اچھا!" پاپا مصنوعی حیرت سے کہتے۔

"ہاں جی۔"

"تمہارے پاس دماغ ہے؟"

بھیا ساتھ ہوتا تو لقمہ دیتا۔ "پاگلوں کے پاس دماغ کہاں ہوتا ہے۔"

"پاپا! بھیا کو دیکھیں، مجھے پاگل کہہ رہے ہیں۔"

"بھیا کی پٹائی کروں گا میں۔"

"آہا! بھیا کی پٹائی لگے گی۔" وہ تالیاں پیٹنے لگتی۔

ماما کہتیں۔ "گڑیا گھر میں نہ ہو تو گھر سنسان ہو جاتا ہے۔"

دادی کہتیں۔ "گھر میں رونق گڑیا رانی کے دم سے ہے۔"

صبح اسے اسکول بھیجنے کے لیے تیار کرتے ہوئے ماما اس کے ریشمی بالوں کو سہج سہج سلجھاتیں، سنوارتیں، کلپ اور ہیئر بینڈ لگاتیں پھر دھیرے دھیرے اسے موئسچرائزنگ لوشن لگاتیں۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی گردن پر پاؤڈر لگاتیں۔ ماما اسے پری کی طرح تیار کرتیں۔ اسکول وین ساڑھے سات بجے آتی۔ پاپا اسے ساتھ لے کر پانچ سات منٹ پہلے ہی نیچے جا کھڑے ہوتے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے دادی منہ ہی منہ میں آیاتِ حفاظت پڑھ کر اس پر دم کرتیں۔ بھیا کا اسکول دور تھا۔ وہ ساڑھے چھ بجے ہی گھر سے نکل چکا ہوتا۔ پاپا کہتے تھے، نویں جماعت کے طالب علم کو خود ہی اسکول آنے جانے کا عادی ہونا چاہیے۔ بھیا کے جاتے وقت دادی اس پر بھی ضرور دم کرتیں۔ دادی بوڑھی تھیں۔ افرادِ خانہ میں سے کوئی گھر سے باہر جا رہا ہوتا تو دادی آیاتِ حفاظت پڑھ کر اس پر دم کرنے کے بعد نہایت مطمئن سی ہو جاتیں۔

☆☆☆

برسوں پہلے میں ان دنوں شہر کے ایک تعلیمی ادارے میں معاون پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ادارے میں داخلے کے سخت قواعد و ضوابط کے باعث

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ابتدائی جماعت میں بچوں کا داخلہ میرٹ کی بنیاد پر کیا جاتا۔ بعد ازاں یہی طلبہ اگلی جماعتوں میں ترقی پاتے جاتے۔ چنانچہ اگلی جماعتوں میں نئے طلبہ کے داخلے نہ ہونے کے برابر ہوتے۔ کوئی غیر معمولی لائق طالب علم، کوئی ٹرانسفر کیس یا پھر کوئی بڑی سفارش! تعلیمی سال کا آغاز ہوتے ہی داخلے کے خواہشمندوں کے لیے نوٹس بورڈ پر جلی حروف میں یہ نوٹس لگا دیا جاتا کہ پہلی جماعت میں داخلے مکمل ہو چکے ہیں، دیگر جماعتوں میں نئے داخلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود تعلیمی سال کے ابتدائی چند ہفتوں میں داخلے کے خواہشمند طلبہ اور ان کے والدین کا جمگھٹا لگا رہتا۔ امیدوار کی غیر معمولی اہلیت یا کسی بڑی سفارش کی بنیاد پر گنے چنے داخلے ہو بھی جاتے۔

دادی کے بقول گھر کی رونق، پاپا کے چیٹر بکس، ماما کی گڑیا اور بھیا کی دوست .... بھیا کا داخلہ پاپا کے اثر رسوخ کی بنا پر نویں جماعت میں ہوا۔ داخلہ ٹیسٹ میری نگرانی میں ہوا۔ لڑکا لائق بھی تھا۔ والد کا اثر رسوخ سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔

گہری سانولی رنگت، دراز قامت اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والا وہ نوعمر طالب علم آج بھی میری یاد کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے۔ صبح جب مارننگ اسمبلی کے لیے طلبہ اپنی اپنی جماعت کی علیحدہ علیحدہ صفیں بنا کر کھڑے ہوتے تو وہ ان طالب علموں میں ہوتا جو اپنی دراز قامتی کے باعث نمایاں ہوتے۔

میقاتِ دوم امتحانات کے نتائج سے والدین کو آگاہ کرنے تک میری اس کے والدین سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ماں اور باپ جب آتے، اکٹھے۔ ماں کھلتی رنگت کی حامل ایک خوش شکل اور جواں عمر خاتون، باپ درمیانی عمر کا متحمل، خوش لباس اور خوش کلام مرد۔ دونوں بیٹے کی تعلیمی ترقی کے بارے میں خاصے فکرمند اور پُرجوش لگتے۔ وہ ان والدین میں سے تھے جو بچوں کو ایک مرتبہ اسکول میں داخل کروا کے انہیں بھول نہیں جاتے بلکہ ان کی مادرِ علمی سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ بچوں کی تعلیمی ترقی کا احوال معلوم کرنے کے لیے گرمجوشی دکھاتے ہیں۔ امتحانات کے نتائج جاننے کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ نتیجتاً ایسے بچوں پر اساتذہ اور انتظامیہ کی توجہ بھی بڑھ جاتی ہے، سو والدین کی غیر معمولی دلچسپی اور احساسِ ذمے داری کے باعث وہ بھی جلد ہی ہم سب کی نگاہوں میں آ گیا۔

میقات سوم شروع ہونے کے چند ہی دن بعد اس کی اسکول سے مسلسل غیر حاضری شروع ہو گئی۔ میقاتِ سوم کا اختتام سالانہ امتحانات پر ہوتا تھا، سو یہ دورانیہ نہایت اہم تھا۔ اساتذہ کو اس کی مسلسل غیر حاضری پر تشویش ہونے لگی۔

یہ تشویش مجھ تک پہنچی۔ میں نے والدین سے رابطہ کیا۔ والدین نے بہت مضمحل سی آواز میں فقط اتنا کہا۔ ''میں آپ کو اسکول آ کر بتاؤں گا میڈم۔'' میرے دل نے کہا شاید وہ بیمار تھا یا شاید کوئی اور مسئلہ...... باپ کی آواز بلاوجہ مضمحل نہیں ہو سکتی تھی۔

تین چار دن یا شاید ایک ہفتہ گزرا، ماں اور باپ دونوں اسکول آ گئے۔ وہ ساتھ نہیں تھا۔ والدین دونوں نہایت اداس اور دل شکستہ دکھائی دیتے تھے۔ ماں کی آنکھوں کے پپوٹے متورم تھے جیسے عموماً بہت زیادہ روتے رہنے سے ہو جایا کرتے ہیں۔ باپ نے ایک درخواست میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے درخواست پر تیزی سے نظر دوڑائی۔

''سالانہ امتحانات نزدیک ہیں۔ آپ اس وقت اس کا اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کیوں لینا چاہتے ہیں؟ کہاں داخل کرائیں گے اسے؟ اس وقت تو کوئی اسکول بھی اسے داخلہ نہیں دے گا۔'' میں نے درخواست پڑھنے کے بعد کہا۔

''کچھ پتا نہیں میڈم۔'' باپ نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکی۔

باپ نے ایک نظر اپنی رفیقۂ حیات کو دیکھا۔ وہ رونے لگی۔

''کیا ہوا؟'' میں تشویش میں پڑ گئی۔

''میڈم! ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ جس کا ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' باپ نے نہایت دل گرفتگی سے کہا۔

''کیسا حادثہ!'' میں نے پوچھا۔

باپ نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے نزدیک بیٹھی اہلیہ کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''صبر کرو۔''

''نہیں ہوتا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ میرے کمرے کے باہر بیٹھا نائب قاصد کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں بلکتی ہوئی خاتون کو پانی پلانے کے لیے خود اٹھی۔

خاتون کے آنسو تھمے تو شوہر نے اپنی آنکھوں کو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں سے دباتے ہوئے گھائل لہجے میں کہا۔ ''میڈم! ہماری بچی کا مرڈر ہوگیا۔''

''مرڈر!'' میں چونکی۔ ''کیسے؟'' میں نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اگلا سوال کیا۔ ''کتنی بڑی تھی؟''

''چھوٹی تھی...... کلاس ون میں تھی۔''

''کلاس ون میں!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کس بے رحم نے مرڈر کردیا اس کا؟''

''شاید آپ نے اخبار میں خبر پڑھی ہو۔'' باپ نے کہا۔

ان دنوں ایسی خبریں اخبارات ہی سے ملتی تھیں۔ نہ الیکٹرونک میڈیا اتنا سرگرم تھا، نہ بریکنگ نیوز کا غلغلہ۔

''اخبار تو میں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں، آپ کس خبر کی بات کررہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بچی کی ڈیڈ باڈی...... جو ایک بوری میں بند...... بلڈنگ کے قریب سے گزرنے والی بجلی کی تاروں میں اٹکی ہوئی ملی تھی۔'' باپ نے نہایت کرب سے بتایا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں اپنے روبرو بیٹھے شخص کو آنکھیں پھاڑے ہکا بکا دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا...... وہ...... وہ بچی......؟'' میں اپنا سوال مکمل کرنے سے قاصر رہی۔

''جی ہاں...... وہی ہماری بیٹی تھی۔'' باپ کی آواز میں آنسو گھلے تھے، میں دم بخود رہ گئی۔

چند دن قبل اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر میں بھلا کیونکر بھول سکتی تھی۔ بچی کے قتل کی وہ بہیمانہ خبر اور اس کی لاش کا المناک طریقے سے ملنا تو کئی دن تک میرے گھر میں افرادِ خانہ اور اسکول میں رفقائے کار کا موضوعِ گفتگو بنا رہا تھا۔

اخبارات میں شائع خبر کے مطابق شہر کے ایک گنجان آباد معروف رہائشی علاقے میں ایک کم سن بچی نہایت پراسرار حالات میں گمشدہ ہوگئی تھی اور اس کی تلاش میں اس کے اہلِ خانہ اور پولیس اہلکاروں کی ناکامی کے بعد اس کی لاش اسی عمارت کے قریب سے گزرنے والی بجلی کی تاروں میں الجھی ایک بوری سے برآمد ہوئی تھی جس عمارت کی تیسری منزل پر واقع ایک فلیٹ میں بچی اور اس کے اہلِ خانہ مقیم تھے۔ بعد کی خبروں کے مطابق پولیس بچی کے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہوگئی تھی جس نے بچی سے زیادتی کے بعد اسے قتل کردیا تھا۔

''کون تھا وہ؟ کیسے ہوا یہ سب؟'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پوچھ بیٹھی۔

مرد نے خاتون کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہتا ہو۔

''تم بتاؤ۔'' خاتون نے اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھا پھر جیسے خود کو آمادۂ تکلم کرنے لگی۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے بوجھل آواز میں بولنا شروع کیا۔

''ہماری بلڈنگ کے آس پاس چند دکانیں ہیں۔ بلڈنگ کے سامنے سڑک کے کنارے درخت کے نیچے ایک موچی بیٹھتا ہے۔ اس روز......'' خاتون نے توقف کیا اور اس دن کو یاد کرکے اس کے چہرے پر کرب والم کی ناقابلِ بیان کیفیت ہویدا ہوئی۔ ''سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ قریبی دکان سے اپنے لیے چیز خریدنے کے لیے نیچے اتری...... وہ اکثر خود ہی چلی جایا کرتی تھی اپنے لیے چیز لینے...... میں...... میں بالکونی میں کھڑی ہوکر اسے دیکھتی رہتی...... اس روز بھی میں بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے دکان سے چیز لی اور گھر واپس آنے کو مڑی...... اتنے میں میرا بیٹا بھی بالکونی میں آگیا۔ اس نے اپنے جوتے مرمت اور پالش کے لیے موچی کو دے رکھے تھے۔ اس نے بہن کو اوپر سے پکارا اور کہا میں پیسے نیچے پھینک رہا ہوں، تم موچی سے میرے جوتے بھی لے آؤ۔ میرے اور اپنے بھائی کے دیکھتے ہوئے اس نے نیچے پھینکے گئے پیسے اٹھا کر موچی کو دیے۔ موچی نے ایک شاپر میں جوتے ڈال کر اسے تھمائے۔ اس نے اوپر ہم دونوں کو دیکھا۔ شاپر زور سے لہرایا اور ہمیں دیکھتے ہوئے مسکرائی پھر بلڈنگ کے اوپر جانے والے زینے کی طرف مڑ گئی...... وہ اس کی آخری مسکراہٹ تھی بس۔''

''پھر؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں اور بیٹا کچھ دیر اس کا انتظار کرتے رہے پھر میں نے بیٹے سے کہا کیا بات ہے، وہ ابھی تک آئی نہیں...... آجائے گی امی...... کسی دوست کے ساتھ باتیں بنانے کھڑی ہوگئی ہوگی...... بیٹے نے کہا...... کچھ دیر اور گزر گئی پھر دادی بولیں...... جاکر دیکھو تو وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں...... میرا بیٹا نیچے گیا۔ اسے واپس آنے میں بھی کچھ دیر لگی...... واپس آیا تو اس نے کہا امی وہ تو نیچے ہے ہی نہیں...... میں نے کہا شاید پڑوس میں کسی گھر چلی گئی ہو...... دادی بولیں...... اسے بلا کر لاؤ...... بیٹا پھر نیچے گیا اور کافی دیر بعد پلٹا...... اس نے کہا میں نے بلڈنگ کے ایک ایک گھر میں پوچھ لیا، وہ کسی کے ہاں نہیں گئی...... مجھے ہول سوار ہوئی۔ دادی گھبرا کر اٹھیں۔ ہم تینوں گھر سے باہر نکلے۔ اپنی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بلڈنگ میں، بلڈنگ کی چھت پر، آس پاس، سارا کمپلیکس چھان مارا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ اتنے میں یہ آفس سے آگئے...... ہم چاروں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے رہے پر وہ نہیں ملی۔"

"پھر؟" مجھے خاتون کے خاموش ہونے پر پھر پوچھنا پڑا۔

"رات ہونے لگی تو یہ پولیس اسٹیشن گئے اور انہوں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوادی۔ پولیس دو دن ڈھونڈتی رہی۔ کچھ پتا نہیں چلا۔"

"جبکہ آپ نے اسے اپنی بلڈنگ کے زینے کی طرف خود جاتے دیکھا تھا؟" میں نے لقمہ دیا۔

"ان آنکھوں سے۔" خاتون نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا پھر یکایک ان کی آواز بھرا گئی۔ "بس وہ آخری بار تھا کہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ مجھے اور اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔" خاتون ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ مجھے اپنا دل پارہ پارہ ہوتا محسوس ہوا۔

خاتون کے آنسو تھمے تو میں نے مرد سے کہا۔ "اچھا تو نہیں لگتا کہ میں زخم کریدوں لیکن ...... میرا بچوں سے تعلق رہتا ہے...... پتا چلے کہ آپ کی بچی کیونکر اس سانحے کا شکار ہوئی تو شاید ہم ان بچوں کو اپنی حفاظت کرنا سکھا سکیں جن سے ہمارا واسطہ رہتا ہے۔"

"معاف کیجیے گا میڈم۔" مرد نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ "اس بے رحم بھیڑیا معاشرے میں صرف اللہ ہی بچوں کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔"

میں اس شخص کے درد کی انتہا کو سمجھ سکتی تھی۔

"مائنڈ نہ کیجیے تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں آگے کیا ہوا؟" مجھے ڈر تھا کہ وہ شخص مجھ پر پھٹ ہی نہ پڑے مگر میری توقع کے برعکس اس نے تحمل سے بتایا۔

"دو دن بعد کسی نے اس بلڈنگ کے جس میں ہم رہتے ہیں، قریب سے گزرتی بجلی کی تاروں میں ایک بھاری بوری اٹکی ہوئی دیکھی اور اس خدشے کے تحت کہ کہیں تاروں کے ٹکرانے سے بجلی فیل نہ ہوجائے، متعلقہ محکمے کو شکایت کی۔ بوری اتاری گئی تو اس میں ہماری بچی کی ڈیڈ باڈی تھی۔"

"میرے خدا!" میرے جسم میں تھرتھری تھی۔

"ملزم کیسے پکڑا گیا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ڈیڈ باڈی ملنے کے بعد پولیس کو یقین ہوگیا کہ واردات ہماری بلڈنگ کے قرب وجوار میں کی گئی تھی۔ تفتیشی اہلکاروں نے اپنی توجہ آس پاس کے گھروں پر مرکوز کردی۔ خاص طور پر ہماری بلڈنگ میں واقع فلیٹس پر کیونکہ بچی کو آخری مرتبہ بلڈنگ کے زینے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ بلڈنگ کے ایک ایک گھر کو سرچ کیا گیا۔ ان گھروں میں رہنے والے افراد سے پوچھ گچھ کی گئی، پتا چلا بلڈنگ میں واقع ایک فلیٹ کے سب مکین سوائے اس خاندان کے ایک نوجوان لڑکے کے، کسی تقریب میں شرکت کے لیے گھر سے دور گئے ہوئے تھے۔ اس لڑکے کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پولیس نے اس بارے میں پوچھا تو اس نے آئیں بائیں شائیں کی کوشش کی مگر غسل خانے کی ایک دیوار پر خون آلود انگلی کا نشان دیکھا گیا۔ پولیس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہے تو بڑے سے بڑا مجرم بھی نہیں بچ پاتا۔ وہ بھی اپنا جرم قبول گیا۔ اس نے بچی کو گھر کے غسل خانے میں پانی سے بھری بالٹی میں الٹا ڈبو کر مارا تھا اور اس کشمکش میں اس کا ہاتھ بھی زخمی ہوگیا تھا زخمی ہاتھ کے خون کا ہلکا سا نشان غسل خانے کی دیوار پر رہ گیا تھا۔ بعد میں اس نے اپنا جرم چھپانے کے لیے بچی کی ڈیڈ باڈی ایک خالی بوری میں ڈال کر رات کے وقت اپنے فلیٹ کی بالکونی سے باہر پھینک دی تھی جو بجلی کے تاروں میں اٹک گئی۔"

میں دم بخود تھی کہ ایک نوجوان لڑکا اور ایسی سفاکانہ واردات! اخباری اطلاعات کے مطابق اس نے بچی کو قتل کرنے سے قبل اس کے ساتھ زیادتی بھی کی تھی۔

"بیٹے کا اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کیوں لینا چاہ رہے ہیں آپ؟" میں نے باپ سے پوچھا۔

"میڈم! دو ہی بچے تھے ہمارے۔ ایک بیٹی ایک بیٹا...... بہن کی موت نے بیٹے کو بہت اپ سیٹ کردیا ہے۔ وہ بہن سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کی موت سے اور وہ بھی اس طرح سے ...... وہ شدید دکھ اور کرب میں ہے۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے...... وہ دوستوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا...... لوگوں کا سامنا کرنے سے کترانے لگا ہے۔ وہ اسکول بھی نہیں جانا چاہتا...... ہم اسے کسی نفسیاتی دباؤ میں نہیں رکھنا چاہتے...... وقت بڑا مرہم ہے...... زندگی رہی تو وہ پڑھ بھی لے گا۔ فی الحال اسے ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔"

"اوکے۔" مجھے اپنے سامنے بیٹھے مرد و زن سے غیر معمولی ہمدردی محسوس ہوئی۔

"آج مل جائے گا سرٹیفکیٹ؟" باپ نے پوچھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"عموماً ہم دو دن بعد دیتے ہیں لیکن اگر آپ آدھ پون گھنٹا انتظار کرسکیں تو میں آج ہی بنوا دیتی ہوں۔"

"جی...... ہم انتظار کیے لیتے ہیں۔"

فوری طور پر سرٹیفکیٹ کے اجرا کے لیے مجھے پرنسپل کے دفتر میں جا کر ساری صورتِ حال ان کے گوش گزار کرنا پڑی۔ سرٹیفکیٹ پر دستخط تو بہرحال انہی کو کرنا تھے۔

چونکہ ادارے میں ایک ماہ پیشگی فیس لینے کا طریقہ رائج تھا لہٰذا واجبات کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ سرٹیفکیٹ کی فیس میں نے خود ادا کی اور آفس کلرک کو جلد از جلد سرٹیفکیٹ کی خانہ پری اور پرنسپل کے دستخط کروا کے میرے دفتر میں پہنچانے کی ہدایت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آئی تو میاں بیوی دونوں خاموش بیٹھے تھے

"بس تھوڑی دیر انتظار کرلیجیے۔" میں نے ان سے کہا۔

"اب تو انتظار ہی ہے میڈم کہ اس معصوم سے دوبارہ کب ملنا ہوگا۔" باپ نے کرب سے کہا۔

میں اب تذبذب میں تھی کہ اس درماندہ جوڑے سے کیا کہوں...... کیا کروں۔ چند ماہ پہلے جب وہ بیٹے کو ادارے میں داخل کروانے آئے تھے تو ان کا روپ کچھ اور تھا اور آج کچھ اور! صدمہ اور وہ بھی ایسا جاں گسل، انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔

"میڈم!" باپ نے کرب ناک خاموشی کو توڑ کر میری مشکل آسان کر دی۔ "بعض حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مرنا مشکل کیوں ہے...... میری ضعیف والدہ جو اپنی پوتی کو گھر کی رونق کہا کرتی تھیں، اس حادثے کے بعد مسلسل بیمار ہیں، گم صم رہتی ہیں...... یہ میری بیگم جو بیٹی کو پیار سے گڑیا کہا کرتی تھیں، سوتے میں بھی اسے پکارنے لگتی ہیں۔ یہ کہتی ہیں وہ روزان کے خواب میں آتی ہے اور آنکھ کھلنے پر جب انہیں احساس ہوتا ہے کہ گڑیا اب اس دنیا میں نہیں رہی تو یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ دیواروں سے اپنا سر ٹکراتی ہیں۔ یہ اس کے کپڑوں، جوتوں، کھلونوں، کتابوں اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر روتی رہتی ہیں...... میں تو اسے چیٹر بکس کہا کرتا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ اتنی باتیں کر لیتی تھی...... شاید اس لیے کہ اسے زیادہ دن ہمارے ساتھ نہیں رہنا تھا...... بھائی کہتا ہے...... میری بہنا، میری دوست چلی گئی...... وہ ہنسی کھو گئی میڈم جو ہم سب کو زندگی کے خوب صورت ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ ہمارا گھر سناٹوں میں ڈوب گیا ہے...... قبرستان کی طرح۔" دکھی باپ بولتا چلا گیا۔

"پتا ہے کیا میڈم...... اسکول سے گھر واپس آ کر دروازے سے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک آواز لگاتی تھی...... دادی جان! میں آ گئی...... وہ آواز نہیں سنائی دیتی اب۔"

ماں نے کہا۔ "میں اس آواز کو پورے گھر میں ڈھونڈتی پھرتی ہوں...... پر نہیں ملتی۔" ماں پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

"اس حادثے نے ہماری زندگی بدل کر رکھ دی ہے میڈم۔" باپ کی آواز میں رقت تھی۔

کلرک سرٹیفکیٹ لے آیا۔

"تھینک یو ویری مچ میڈم۔" باپ نے کہا۔

"خدا آپ کی آئندہ زندگی میں آسانیاں عطا فرمائے۔" میں نے دونوں کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔

"آمین۔"

دونوں اٹھے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے نہایت مضمحل سے انداز میں میرے دفتر سے نکل گئے۔ مجھے ان کی زندگی بدل جانے کا شدت سے رنج ہوا۔

آج سوچتی ہوں زندگی تو اس گھرانے کی بھی بدل ہی گئی ہوگی جس کے ایک فرد کے شیطانی فعل نے ایک بستے بستے کنبے سے اس کی خوشیاں چھین لی تھیں کیا اس کے اس قبیح فعل کے بعد اس کے اپنے گھر والے معاشرے کا سامنا کر پائے ہوں گے؟ زندگی پہلے کی طرح جی پائے ہوں گے...... اور کیا وہ خود...... جرم اور سزا کے بعد اگر رہا ہوا بھی ہو تو کیا کبھی آئینے کے سامنے ٹھہر سکا ہوگا...... آئینہ تو اسے گڑیا کی سہمی، لرزتی روتی اور بلبلاتی شبیہیں دکھاتا ہوگا، ڈراتا ہوگا!

گڑیا کی زندگی سے بھرپور ہنسی کو فضاؤں میں گم ہوئے کم و بیش چھبیس ستائیس برس گزر چکے مگر شیطانی کھیل آج بھی جاری ہے۔ پھول جسموں کو مسلے جانے کا قبیح سلسلہ تھما نہیں۔ شیطان کے چیلے آج بھی ہمارے گھروں کے آس پاس، ہمارے گلی کوچوں میں، ہمارے گھروں کے اندر تک ہمارے بچوں کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

اس دنیا میں ایسی صبح کب ہوگی جب مشرق سے طلوع ہونے والا سورج ہمارے بچوں کو بلکہ ساری دنیا کے بچوں کو امن و تحفظ کی نوید دے گا؟

حیوان نما انسانوں کی بہیمیت کا شکار ہونے والے ہر بچے کو انصاف آخر کب ملے گا؟ کیا صاحبِ اختیار کو یومِ آخر کا یقین اور خوف نہیں......؟

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مہلت

ثمر عباس

قدرت کے کارخانے میں سزا ہمیشہ خطاوار کے لیے رکھی گئی ہے... مگر کبھی کبھی سزا کا انداز بڑا مختلف ہوتا ہے... قدرت کسی ایسے رشتے میں دکھ رکھ دیتی ہے جو دل کے بہت نزدیک ہوتا ہے اور جسے دی جانے والی اذیتیں دل پر بہت ستم ڈھاتی ہیں۔ وہ بھی اپنے اس رشتے کو دنیا بھر سے چھپا کر رکھنے کا خواہش مند تھا مگر حالات اسے چھپنے دے رہے تھے اور نہ ہی کسی ایک جگہ پر ٹکنے دے رہے تھے... اور پھر زندگی سے اس نے محض آدھے گھنٹے کی مہلت مانگ لی جس کے بعد اس کا سفر ختم ہوگیا۔

محفوظ ہاتھوں میں اپنا اہم رشتہ دے کر ایک مجرم باپ کے اطمینان کا قصہ

جولائی کی گرم دوپہر میں اخباری نمائندے مائیک گراہم کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ گراہم بلاک ہوٹل میں رہتا تھا جو سینٹرل اسٹیشن ہاؤس کے بالکل قریب ہی تھا۔ ویسے بھی گراہم کا یادہ وقت ہیڈکوارٹر میں واقع چھوٹے سے دفتر میں ہی زرتا اور وہ صرف سونے کے لیے ہوٹل جاتا تھا۔ چوبیس سال سے اس کا یہی معمول تھا۔

جیسے ہی راہداری میں اس کے قدموں کی آہٹ ہوئی،

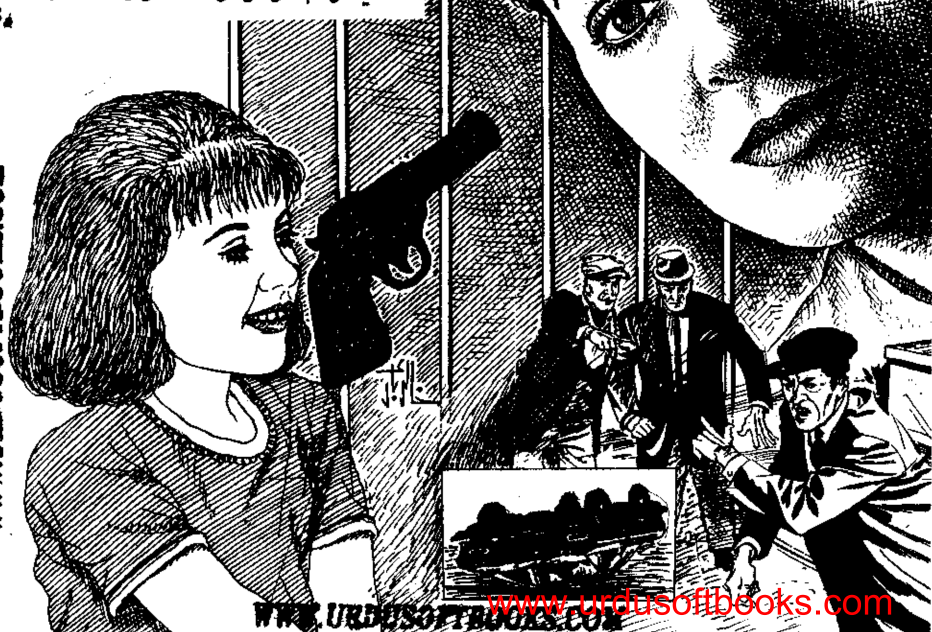

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تمام رپورٹرز پریس روم سے باہر نکل آئے اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہ گھوم کر اپنی میز پر پہنچا، ٹیلی فون کو دیکھ کر منہ بنایا۔ جیسے توقع ہو کہ وہ اسے کوئی اطلاع پہنچائیں گے اور پھر اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔

ٹربیون کے نمائندہ شون نے بولنے میں پہل کی۔ وہ گراہم کو کافی عرصے سے جانتا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ڈینی ٹرمبل نے اسپیشل پولیس کے آدمی کو قتل کر دیا ہے؟''

گراہم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''قدرتی بات ہے۔''

''تمہیں اس کا کوئی سراغ ملا؟'' یہ احمقانہ سوال ایک نوجوان رپورٹر نے کیا تھا جسے گراہم نے نظر انداز کر دیا۔ وہ اپنی معلومات اور کارروائی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

''اب تم لوگ جا سکتے ہو۔'' اس نے اخباری نمائندوں سے کہا۔ ''مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

تمام نمائندے باہر راہداری میں آ گئے۔ ہیرالڈ کا رپورٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص میں ذرا سا بھی رکھ رکھاؤ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ سرد مہر آدمی نہیں دیکھا۔''

شون لاؤنج میں جاتے ہوئے بولا۔ ''پولیس والے ایسے ہی سخت گیر ہوتے ہیں اور مائیک گراہم بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ علامت ہے۔ بے حس، اکھڑ اور جھگڑالو۔ ہمیں یہاں رک کر کسی خبر کا انتظار کرنا چاہیے۔''

گراہم کے کمرے میں تین فون تھے۔ ایک دفتر کے اندر بات کرنے کے لیے، دوسرا مین بورڈ سے منسلک اور تیسرا پرائیویٹ نمبر تھا۔ پولیس کمشنر نے اس پر اعتراض کیا تھا لہٰذا گراہم اس کے بل کی ادائیگی اپنی جیب سے کرتا تھا۔ یہ ٹیلی فون اس کا واحد معاون اور اطلاعات پہنچانے کا بہترین ذریعہ تھا کیونکہ اس کے مخبر سرکاری فون پر بھروسا نہیں کرتے تھے۔ رپورٹرز کے جانے کے بعد گراہم نے پرائیویٹ فون اپنی طرف کھینچا اور کسی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ''گراہم!'' دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سننے کے بعد وہ بولا۔ ''تمہاری اطلاع درست ہو سکتی ہے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور عقبی دروازے سے نکل کر اس گلی میں چلا گیا جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ نوجوان رپورٹر نے اسے جاتے دیکھا تو بولا۔ ''ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔''

شون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''نہیں۔ اگر اس نے ڈینی کو تلاش کر لیا تو ہمیں قبرستان میں بیٹھ کر خبر بنانا پڑے گی کیونکہ ان میں سے ایک یقینی طور پر وہاں جائے گا اور مجھے گراہم کی زیادہ امید ہے۔''

ڈینی ایک ایسا خطرناک مجرم تھا جو کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا اور کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ یہ پولیس کا ہی تخلیق کردہ ایک کردار ہے اور ہر غیر حل شدہ جرم اس کے نام ڈال دیا جاتا ہے اور شون جیسے لوگوں کی پیش گوئی تھی کہ وہ بہت جلد جرم کی دنیا کا لیجنڈ بننے والا ہے۔ اگر وہ واقعی اس راہ پر گامزن تھا تو پھر وہ کوئی فرضی کردار نہیں بلکہ زندہ حقیقت تھا۔ وہ مائیکل گراہم سمیت تمام پولیس والوں سے نفرت کرتا تھا۔

صرف چند ماہ قبل وہ ذہین اور ہوشیار مجرموں کے گروہ کا سرغنہ رہ چکا تھا، وہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ کبھی بدمعاشوں کے ساتھ نہیں رہا اور نہ ہی کسی کچی آبادی کی پیداوار تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا اور ایک باعزت رہائشی علاقے میں رہتا تھا۔ اب اس کا کوئی گروہ نہیں تھا جس کا سہرا گراہم کے سر جاتا تھا۔

گراہم قانونی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے مجرموں کے خلاف براہِ راست کارروائی پر یقین رکھتا تھا، جب اسے معلوم ہوا کہ ڈینی اور اس کے تین ساتھی مارٹی کے سیلون کے عقبی کمرے میں ملاقات کرنے والے ہیں تو وہ اکیلا ہی وہاں چلا گیا۔ اس گروہ نے بینک کے پیغام رساں اور دو پولیس والوں کو قتل کیا تھا۔ گراہم نے زوردار لات مار کر دروازہ توڑ دیا اور گن سمیت اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ڈینی وہاں موجود نہیں تھا۔ گراہم نے دروازے میں کھڑے کھڑے اس کے تینوں ساتھیوں پر فائر کھولا اور انہیں ہلاک کر دیا۔

اس کے بعد صرف ڈینی ہی زندہ بچا۔ اس کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ شہر چھوڑنے والا ہے لیکن جانے سے پہلے گراہم کو قبرستان پہنچا کر جائے گا اور اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر ایک اسپیشل پولیس کے سپاہی کو قتل کر دیا تھا۔

گراہم نے اپنے مخبر کے بتائے ہوئے پتے سے ایک بلاک کے فاصلے پر کار کھڑی کی اور بقیہ فاصلہ پیدل طے کیا۔ اس نے اس چھوٹی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ پر نظر ڈالی اور سر ہلا کر رہ گیا۔ ڈینی جیسے شخص کے چھپنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ اس عمارت کے دیگر رہائشی غالباً دفتروں میں کام کرنے والے کلرک اور کارکن تھے۔

عمارت کے صدر دروازے پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ مخبر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے ڈینی کے فلیٹ کا نمبر 307 بتایا تھا۔ گراہم نے اس کے علاوہ دیگر نمبر دبائے۔ یہاں تک کہ کسی رہائشی نے آٹومیٹک ڈور لاک کھول دیا۔ وہ عمارت میں داخل ہوا اور لفٹ کو نظر انداز کر کے سیڑھیوں کے ذریعے تیسری منزل پر۔۔۔ پہنچ گیا۔

تین سو سات کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اپنی گن نکالی اور دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور خود چوکنا ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا لیکن اپنے سامنے ایک لڑکی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

گراہم حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کمرے پر نظر ڈالی کہ شاید اسے وہاں کوئی بدمعاش نظر آ جائے لیکن وہاں اس لڑکی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

''کیا تم آئس کریم لائے ہو؟'' اس لڑکی نے پوچھا۔

گراہم نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے اور بولا۔ ''لڑکی۔ تمہارے پاپا کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جلدی گھر آ جائیں گے۔''

گراہم کو اپارٹمنٹ میں کھانا پکنے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہاری ماں یہاں ہیں؟''

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''پھر یہ کھانا کون پکا رہا ہے؟''

''میں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''پینی۔ آج میں آٹھ سال کی ہو گئی ہوں۔''

گراہم نے گن ہولسٹر میں رکھی اور جیب سے ڈینی کی ایک پرانی تصویر نکال کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی اس آدمی کو دیکھا ہے؟''

''بالکل یہ میرے پاپا ہیں۔''

''تم بتا سکتی ہو کہ یہ گھر کب آئیں گے؟''

''کسی بھی وقت۔'' پینی نے کہا۔ ''وہ میرے لیے تحفہ لینے گئے ہیں۔''

گراہم نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے انتظار کر لینا چاہیے۔''

''تم کچن میں آ جاؤ۔'' پینی نے پیشکش کی۔ ''میں پاپا کے لیے کھانا بنا رہی ہوں۔''

وہ اس کے چھوٹے سے کچن میں چلا گیا اور ایک اسٹول پر اس طرح بیٹھا کہ اس کی نظریں اپارٹمنٹ کے دروازے پر رہیں۔

پینی برتن دھوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''گراہم۔۔۔مائیک گراہم۔''

''کیا تمہاری کوئی چھوٹی بیٹی ہے؟''

گراہم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔''

''پاپا کہتے ہیں کہ ہر ایک کو شادی کرنا چاہیے۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے شہر جانے والے ہیں جہاں وہ کسی خوب صورت عورت سے شادی کر لیں گے جو میری ماں بن سکے۔''

''اچھا خیال ہے۔'' گراہم نے کہا۔

''پاپا کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' پینی بولی۔ ''وہ بہت خوش شکل ہیں۔''

کچن میں بہت گرمی ہو رہی تھی۔ گراہم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔''

پینی بولی۔ ''کھانا کھا کر جانا۔ پاپا بس آتے ہی ہوں گے۔''

''شاید میں دوبارہ آؤں۔'' گراہم نے کہا اور دروازہ کھول کر راہداری میں چلا گیا۔ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچا ہی تھا کہ اسے ڈینی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چابی اور دوسرے میں آئس کریم کا پیکٹ تھا۔ گراہم اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا۔ ڈینی نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی اس نے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا، گراہم نے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور آئس کریم اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گئی۔ گراہم نے اسے کالر سے پکڑا اور سڑک پر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، گراہم نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

اب وہ اس کا قیدی تھا۔ اسے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ ڈینی نے ایک پولیس والے کو قتل کیا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ زندہ گرفتاری نہیں دے گا۔ اس طرح گراہم نے بھی عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن اب اس پر قابو پانے کے بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ اسے ہیڈ کوارٹر لے جائے۔

اسے ایک گھنٹے تک پینی کا خیال نہیں آیا۔ وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں سرکاری وکیل اور اخباری نمائندوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ سرکاری وکیل کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے کئی تصویریں بنوائیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اور اخباری نمائندوں کے سامنے اس یقین کا اظہار کیا کہ ڈینی کو سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

شون نے گراہم کی یادداشت کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک افواہ یہ سننے میں آئی ہے کہ ڈینی کی ایک بیٹی بھی ہے۔ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟''

گراہم نے غراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''

شون طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ذرا سوچو کہ جب اس کی تین کالم میں تصویر شائع ہوگی تو تمہارے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔''

گراہم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس فضول باتیں سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے آئس کریم کے دو پیکٹ خریدے اور ڈینی کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ دروازہ پینی نے ہی کھولا تھا۔ اس نے آئس کریم کے پیکٹ اسے پکڑا دیے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''پاپا ابھی تک نہیں آئے۔ تم اندر آجاؤ اور میرے ساتھ ڈنر کرو۔''

گراہم ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں کھانا کھا چکا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن میں ابھی تک بھوکی ہوں۔''

کھانا خاصا بدمزہ تھا جس کا اعتراف پینی نے بھی کیا لیکن گراہم اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔ ''بہت مزے کا ہے۔'' پھر اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''پینی! تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟''

''صرف پاپا۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟''

''پریشان مت ہو پینی۔ ممکن ہے وہ کسی سے ملنے چلے گئے ہوں یا چند دنوں کے لیے کسی کام میں مصروف ہو گئے ہوں، جب میں آخری بار اس سے ملا تو اس نے کچھ ایسی ہی بات کی تھی۔''

''تم ان سے کب ملے تھے؟''

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔'' وہ اپنی پلیٹ پر نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی پینی کی تصویر اخبار میں شائع ہو گئی تو اس کے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جائے گی۔

''دیکھو پینی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا نہیں خیال کہ تمہارے پاپا آج رات گھر واپس آئیں گے۔ فرض کرو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

اس نے مزید سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور پینی کو لے کر کار میں بیٹھ گیا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے لے کر کہاں جائے۔ وہ دو گھنٹے تک بلا مقصد گاڑی چلاتا رہا یہاں تک کہ پینی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ وہ اسے اپنے ہوٹل نہیں لے جا سکتا تھا اور اگر ہیڈ کوارٹر لے جاتا تو وہ اسے یقینی طور پر دارالاطفال بھیج دیتے اور گراہم ایسا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک اسے جان پال کا خیال آیا جو شہر کے وسط میں ایک ریسٹوران چلاتا تھا اور بال بچوں والا تھا۔ شاید وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر پینی کو اپنے پاس رکھ لے۔ گراہم اس کے ریسٹوران پہنچا۔ جان پال پولیس والوں سے دوستی کرنے کا شوقین تھا اور ویسے بھی گراہم نے اس سے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی لہٰذا وہ ایک رات کے لیے پینی کو اپنے فلیٹ لے جانے پر رضامند ہو گیا اور گراہم..... ہیڈ کوارٹر واپس آگیا۔

ویسے تو گراہم ہر وقت ہی کام کرتا رہتا تھا لیکن شیڈول کے مطابق اس کی ڈیوٹی نصف شب سے صبح آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے کہ جان پال کا فون آگیا۔

''گراہم! تم نے آج کے اخبارات دیکھے؟''

''نہیں۔''

''بہتر ہوگا کہ تم انہیں دیکھ لو۔'' جان نے مشورہ دیا۔ ''اور براہ کرم اس بچی کو یہاں سے لے جاؤ۔ میں کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

''تم آرام سے بیٹھو اور اپنی زبان بند رکھو۔'' گراہم نے اسے تنبیہہ کی اور فون بند کر دیا۔

اخبار کی خبر پڑھ کر گراہم کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے مطابق ڈینی نے اپنے ایک دوست کو پینی کی دیکھ بھال کے لیے گھر بھیجا تھا لیکن وہ اسے وہاں نہیں ملی۔ وکیل صفائی نے اپنے ایک بیان میں الزام لگایا کہ پولیس نے ڈینی پر دباؤ ڈالنے کے لیے بچی کو اغوا کیا ہے لیکن ڈسٹرکٹ اٹارنی نے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ اس طرح قیدی کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ خبر کے مطابق پولیس بچی کو سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی۔

گراہم نے اخبار ایک طرف رکھا اور چیف سے بات کرنے کے لیے فون اٹھایا لیکن اسے اپنے ضمیر کی آواز سنائی دی........ ''سوچ کیا رہے ہو؟ چیف کو بتا دو کہ بچی تمہارے پاس ہے۔ وہ اسے بچہ جیل بھیج دیں گے جہاں اس کی پرورش لاوارثوں کی طرح ہوگی۔ اس کا بچپن اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نوجوانی جیل کی محدود دنیا کی نذر ہوجائے گی اور اسے معاشرے میں کوئی مقام نہیں مل سکے گا۔"

گراہم کو یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی اور اس نے ٹیلی فون رکھ دیا۔

سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں واقع کھیتوں میں رنگ برنگے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ ان کھیتوں میں مکئی اور گندم کی کاشت ہوتی تھی۔ پینی کے لیے یہ مناظر بالکل نئے تھے۔ وہ سارے راستے گراہم سے سوالات پوچھتی رہی اور وہ اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیتا رہا پھر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"دیکھو پینی۔ میں دیہات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ وہاں کبھی نہیں رہا۔"

"پھر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔"میں نے سوچا کہ آج کا دن شہر سے باہر گزارا جائے۔"

یہ جگہ شہر سے قریب تھی اور وہ جب چاہے یہاں آسکتا تھا۔ اس نے ایک سروس اسٹیشن سے فارم کا پتا پوچھا اور وہاں سے دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا پرانا پتھروں کا بنا ہوا مکان تھا جس کے ساتھ کھلیان، پانی کا تالاب، ایک گائے، کچھ مرغیاں اور ایک لمبے بالوں والا کتا بھی نظر آیا۔ کار سے اتر کر گراہم نے پورچ کی طرف قدم بڑھائے جہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی ایپرن سے اپنے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

اس سے بات کرنے کے بعد گراہم نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن وہ عورت جس کا نام ویلس تھا، اصرار کرنے لگی کہ وہ کھانا کھا کر جائے۔ گراہم نے گزشتہ بیس سالوں میں گھر کا بنا ہوا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے کچھ زیادہ ہی کھا لیا اور اسے غنودگی محسوس ہونے لگی، ابھی تک سورج کی تپش موجود تھی۔ مسز ویلس نے تجویز پیش کی کہ وہ شام میں واپس جائے لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اسے آٹھ بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔

روانہ ہونے سے قبل پینی نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ دوسرے روز ضرور واپس آئے گا لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کم از کم ایک ہفتہ پینی کو وہاں رکھے گا۔ اس وقت تک اخبارات میں اس کی گمشدگی سے متعلق خبریں دم توڑ دیں گی اور وہ خاموشی سے پینی کو حکام کے حوالے کر دے گا اور اس کی کوشش ہوگی کہ پینی کو بچہ جیل نہ بھیجا جائے۔ اس نے اس بارے میں کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

اسی دوران ایک دن گراہم ایک بدمعاش کا تعاقب

شاعری

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا بے وجہ نہ تھا۔ اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے پھر قوم کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ غرضیکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارعِ عام پر پڑ لیے جس پر راہ گیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہ گزر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیمیائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقائق سے زیاد دل فریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔ جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا کر پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننا بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضروری ہیں۔

انتخاب: محمد ذیشان، منڈی بہاؤالدین

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کرتے ہوئے ایک اسٹور میں پہنچ گیا۔ وہ بدمعاش چوری کی کئی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اس اسٹور میں خواتین کے ملبوسات اور دیگر اشیا فروخت ہوتی تھیں۔ اس بدمعاش کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ وہ وہاں ایک لڑکی سے ملنے آیا تھا۔ اس لڑکی نے دل کھول کر خریداری کی اور اس بدمعاش نے ان چیزوں کی قیمت ادا کی جیسے ہی دونوں اسٹور سے باہر آئے، گراہم نے انہیں پکڑلیا۔

دوسرے دن وہ پھر اسی اسٹور میں گیا اور سیلز گرل سے کہا کہ وہ بچی کے لیے ایک خوب صورت لباس خریدنا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے کلرک سے کہہ دیا کہ جب لباس تیار ہوجائے تو وہ اس کے دفتر پہنچا دیا جائے۔

جب اسٹور کا باوردی ڈیلیوری مین دوسرے دن دو ڈبے لے کر پولیس ہیڈکوارٹر پہنچا اور اس نے سارجنٹ مائیکل گراہم کے دفتر کے بارے میں جاننا چاہا تو استقبالیہ کلرک معنی خیز انداز میں مسکرادی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پریس روم میں پہنچ گئی کہ سخت گیر سارجنٹ گراہم نے کسی عورت کے لیے خوب صورت لباس خریدے ہیں۔ زیادہ تر رپورٹرز کو اس افواہ پر یقین نہیں آیا تاہم شون کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

''جو بظاہر سخت نظر آتے ہیں، وہی پھسلتے بھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کون اس کے پاس جائے گا۔''

ٹائمز کے نمائندے نے کہا۔ ''میں تو نہیں جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ وہ جب یہاں آئے گا تو ہم اس سے پوچھ لیں گے۔'' شون بولا۔

گراہم اس روز پریس روم میں نہیں آیا۔ پچیس سالوں میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے دفتر سے چھٹی لی تھی۔ وہ اسی ارادے سے فارم ہاؤس گیا تھا کہ پینی کو واپس لاکر متعلقہ حکام کے حوالے کردے گا لیکن وہاں پہنچ کر وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

پینی نے مختصر سا پلے سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کو چھپانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے جسم کی رنگت بھی تبدیل ہوکر سفید سے گولڈن براؤن ہوگئی تھی۔ وہ ایک کرسی پر کھڑی اپنے کپڑے استری کررہی تھی۔ جیسے ہی گراہم کمرے میں داخل ہوا، وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ گراہم گھبرا گیا اور اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

''دیکھو لڑکی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''ان بنڈلوں میں کیا ہے؟'' پینی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں۔''

وہ فرش پر بیٹھ کر کھولنے لگی۔ وہ ایک ایک چیز کو اپنے جسم پر رکھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی محویت کو دیکھتے ہوئے گراہم کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہوجائے۔ اس سے پہلے کہ پینی کی فیشن پریڈ ختم ہوتی، مسز ویلس کمرے میں داخل ہوئی۔

''پینی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔'' وہ جھکتے ہوئے بولی۔ ''گرمیاں ختم ہونے سے پہلے اس کی رنگت بالکل براؤن ہوجائے گی۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا۔''

''ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔'' گراہم نے کہا۔

پینی نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو وہ فارم پر سیکھ رہی تھی۔ اس نے گائے کا بھی تعارف کروایا۔ اس کا نام ایلونس تھا۔ پینی نے اپنے کپڑوں پر استری کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر گراہم کے مسلے ہوئے سوٹ پر گئی تو اس نے اس پر بھی استری کرنے کی پیشکش کردی، جس میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ بعد میں جب اس نے مسز ویلس کے سامنے یہی پیشکش دہرائی تو وہ شرمندہ ہوگیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اس کی زبان کو روکے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ کمرے میں جاکر اپنی پتلون اتار کر دروازے سے باہر پھینک دے اور پتلون استری ہوجانے کا انتظار کرے۔

پینی نے اپنا کام عمدگی سے کیا گو کہ پتلون پر دہری کریز بن گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بہتر نظر آرہی تھی۔ گراہم پینی کو لیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا آیا البتہ اس کے کپڑے استری شدہ تھے۔ یہ دیکھ کر ڈیسک کلرک اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکی۔ اس نے شون سے کہا۔

''گراہم اور ایک عورت کے بارے میں جو خیال تھا، اس میں ضرور کوئی سچائی ہے۔ مجھے تو اسی وقت شک ہوگیا تھا جب زنانہ کپڑے یہاں آئے تھے لیکن اب اس کے استری شدہ کپڑے دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے جب سے یہ سوٹ خریدا ہے، اس پر استری نہیں ہوئی۔''

اس کے بعد گراہم چار مرتبہ پینی کو لینے گیا لیکن ہر مرتبہ اس کا ارادہ کمزور پڑ گیا ... بالآخر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ وہ خود بھی پینی کو بحالی کے مرکز میں نہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ پینی کو گود لے لے۔ یہ سوچتے ہی اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے لیکن اگر اسے پینی کو اپنے پاس رکھنا تھا تو یہی کرنا ہوگا۔

اس نے اپنے طور پر محتاط طریقے سے معلومات

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حاصل کیں تو پتا چلا کہ ڈینی کی زندگی میں اس کی اجازت کے بغیر وہ پینی کو گود نہیں لے سکتا۔ اس بارے میں گراہم نے بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے ڈینی سے بات کرلینی چاہیے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے رومانس کی کہانی جیل کے اندر بھی پہنچ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈینی سے ملنے کے لیے اپنا ذہن بناتا، ڈینی نے اسے بلا بھیجا۔

وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے دو اور دو جمع کیے اور سچ معلوم کرلیا۔ جب گراہم ملنے کے لیے اس کے سیل پہنچا تو ڈینی نے لگی لپٹی بغیر کہا۔ ”تم میری بیٹی کو لے گئے ہو۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ کھل کر بات کرسکتے تھے۔

”میں تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہا۔“ گراہم نے... بہ آواز بلند کہا۔ ”ہاں، وہ میرے پاس ہے۔“

ڈینی اس کے بالکل قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس دنیا میں مجھے صرف اپنی بیٹی کی پروا ہے۔“

”بہت خوب۔“ گراہم نے کہا۔ ”لیکن میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں اور اسے گود لینا چاہتا ہوں۔“

ڈینی واپس اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے بہت زیادہ پی لی ہو۔ گراہم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں پھانسی ہوجائے گی، اخبارات کو تمہاری بیٹی کی کہانی چاہیے۔ میں اسے بہت دور لے جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ ڈینی نے پوچھا۔

گراہم نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ”کاش میں جان سکتا۔“

ڈینی کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ ”گراہم! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ تم ایک بے حس اور جذبات سے عاری انسان ہو۔ بے شک میری بیٹی مرجائے لیکن میں اسے تمہارے حوالے نہیں کرسکتا۔ تم ابھی اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”تم کسی کو نہیں مارو گے۔“ گراہم نے خشک لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ ڈینی کی دھمکیوں سے پریشان نہیں تھا۔ وہ جیل میں بند تھا اور جس دن اسے پھانسی پر لٹکایا جائے گا تو وہ اس مسئلے سے آزاد ہوجائے گا۔ اسے صرف یہ فکر تھی کہ کہیں ڈینی اخباری نمائندوں اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کو نہ بتادے کہ اس کی بیٹی گراہم کے پاس ہے، اس طرح اس کے خلاف اسکینڈل بن جائے گا۔

گراہم بڑی باقاعدگی سے اخبارات دیکھ رہا تھا لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود بھی اسے اپنے اور پینی کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی تو اس نے فون کرکے مسز ویلس کو بتایا کہ وہ اگلے روز پینی سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کے لیے پکنک لنچ تیار رکھے گی اور پورے دن کے لیے فارم ان کے حوالے کردے گی کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے دوسری کاؤنٹی جانا چاہتی ہے۔

گراہم کو ابھی تک اس شرمندگی سے نجات نہیں ملی تھی جو پینی کے سوٹ پر لیس کرنے کی وجہ سے اسے ہوئی تھی۔ لہٰذا اس مرتبہ اس نے جانے سے پہلے اپنا سوٹ اچھی طرح استری کرلیا تھا۔ اس کا ارادہ ڈیوٹی ختم ہونے کے فوراً بعد علی الصباح روانہ ہونے کا تھا لہٰذا اس نے استری شدہ سوٹ پہن لیا۔ ڈیسک کلرک نے اسے غور سے دیکھا اور چند منٹوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ گراہم اپنی محبوبہ سے ملنے جارہا ہے۔

مائیک گراہم کی کار میں ریڈیو نہیں تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ دفتر سے وائرلیس کے ذریعے اسے بتایا جائے کہ وہ کیس کو کس طرح ہینڈل کرے گا چنانچہ خزاں کی اس خوشگوار صبح بھی وہ کار ریڈیو کے بغیر ہی پینی سے ملنے جارہا تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر پینی کے تحفے رکھے ہوئے تھے۔

ریڈیو نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ اطلاع نہ دی جاسکی کہ ڈینی جیل توڑ کر فرار ہوگیا ہے۔ مائیک اس صورتِ حال سے لاعلم تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا بے فکری سے کار چلا رہا تھا اور اسے یہ علم ہی نہ ہوسکا کہ مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔

پینی فارم کے گیٹ پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے لنچ پیک کرلیا تھا اور اس کا انتظار کررہی تھی۔ گراہم نے سوچا کہ پہاڑی پر چڑھتے وقت اس کا کندھا نمایاں ہوجائے گا۔ اس لیے اس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد...... اپنا ہولسٹر اور گن کار کے خانے میں رکھ کر مقفل کردی۔ وہ پینی کے ساتھ فارم کے عقب میں واقع جنگل میں چلا گیا.... شکاری کتا ان کی راہنمائی کررہا تھا۔

گراہم پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا۔ لہٰذا ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ٹھنڈی گھاس پر چت لیٹ گیا اور پینی کی باتیں سننے لگا... بالآخر اس نے اسے ٹوکا اور بولا۔ ”پینی!

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کیا تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟"

"میرے پاپا کہاں ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟ میں ان کی بیٹی ہوں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

گراہم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" پھر کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ "کیا تمہارے پاپا تم سے بہت پیار کرتے تھے پینی؟"

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ کبھی کبھی وہ مجھے رات کو جگا کر پیار کرتے تھے۔"

"فرض کرو کہ وہ واپس نہیں آئے پھر تم میری بیٹی بننا پسند کرو گی؟"

پینی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ ضرور واپس آئیں گے۔"

اس کے بعد گراہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ سہ پہر کے بعد واپس آئے۔ اس وقت سورج ڈھل رہا تھا۔ گراہم خوش تھا کہ وہ اپنا کوٹ اور ہولسٹر اتار کر آرام سے بیٹھے گا لیکن اس کی خوشی خاک میں مل گئی جب اس نے کچن میں ڈینی کو بیٹھے دیکھا۔ وہ انہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک چھوٹا آٹومیٹک پستول اس کے ہاتھ میں تھا جس کی نال کا رخ اس نے گراہم کی جانب کر لیا۔

گراہم کی نظر اس پر اس وقت گئی جب اس کے پاس کچھ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا وہ خاموش کھڑا اس کی اگلی کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔

پینی خوشی سے چلائی اور دوڑتی ہوئی ڈینی کے پاس جا پہنچی۔ "اوہ پاپا میں جانتی تھی کہ تم ضرور واپس آؤ گے۔"

ڈینی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک طرف کر لیا تاکہ پستول کی نال کا رخ گراہم کی طرف رہے پھر گراہم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

گراہم کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں ڈینی پر تھیں۔ پینی اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ہاتھ میں گن کیوں ہے؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" ڈینی نے کہا۔ "سڑک پر سیب کے درخت کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔ تم اس میں جا کر بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔"

"لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔" اس نے تیز آواز میں کہا۔

گراہم کو ڈینی کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اچھے نہیں لگے۔ "بہتر ہے کہ تم وہی کرو جو تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں۔" وہ غراتے ہوئے بولا۔ "شاید یہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن میں پاپا کو وہ سب چیزیں دکھانا چاہتی ہوں جو تم میرے لیے لائے ہو۔"

وہ چلّاتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا بازو چھڑایا اور ڈینی کے روکنے کے باوجود کمرے سے چلی گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گھورا اور پینی کے قدموں کی آواز سنتے رہے جو سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"میں نے عہد کیا تھا کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ڈینی نے کہا۔ "مجھے تین دن پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نے پینی کو کہاں رکھا ہے لیکن مجھے جیل سے فرار ہونے کا موقع آج ملا۔"

گراہم غراتے ہوئے بولا۔ "مجھے چاہیے تھا کہ تمہیں گرفتار کرنے کے بجائے اسی وقت شوٹ کر دیتا۔"

"تمہارے پاس موقع تھا پھر اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟"

گراہم.... ناک چڑھاتے ہوئے بولا۔ "تم اس بچی کے ساتھ کیا کرو گے؟"

"اسے تمہاری دسترس سے دور لے جاؤں گا۔"

گراہم کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ "میں جانتا تھا کہ تم ایک قاتل ہو پھر پینی نے مجھے بتایا کہ تم اسے کتنا چاہتے ہو اور ہمیشہ اسے وقت دینے کا وعدہ کرتے رہے تب میں نے سوچا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کڑواہٹ کے پیچھے شائستگی چھپی ہوئی ہو۔ بہرحال تم اس کے باپ ہو اور جب تم نے اخبارات کو یہ نہیں بتایا کہ پینی میرے پاس ہے تو میں نے سوچا کہ تم نے اس کی محبت میں ایسا نہیں کیا لیکن میں غلطی پر تھا۔ تم محض ایک قاتل ہو۔"

ڈینی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "تم نے اسے میرے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔"

پینی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی گفتگو روک کر اسے دیکھنے لگے۔

"دیکھو پاپا! یہ کتنا خوب صورت لباس ہے۔ یہ مائیک نے میرے لیے خریدا ہے پاپا۔ کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟" پھر وہ گراہم کی طرف گھومتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا۔ اگر پاپا یہاں رک جائیں؟"

ڈینی نے غصے سے کہا۔ "یہاں سے نکلو اور کار میں جا کر بیٹھو۔ ہمیں جلدی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ جلدی کرو۔"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں بولی۔ ''لیکن پاپا! ہم ہمیشہ ہی جلدی میں جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ہمارا اپنا گھر ہوگا اور میں کتا پال سکوں گی۔ میں اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی اور اگر ہم یہاں سے دور چلے گئے تو میں مائیک سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔''

گراہم نے اپنی آنکھیں ڈینی کے چہرے پر جما رکھی تھیں۔ اس نے پینی سے کہا۔

''تمہارے ڈیڈی کا کام ہی ایسا ہے کہ وہ کسی ایک جگہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔''

''لیکن میں یہاں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے موورن اور ویلوس سے محبت ہوگئی ہے اور مائیک کا کہنا ہے کہ میں سڑک پار کرکے اسکول جاسکتی ہوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل سکتی ہوں۔''

اس کی باتیں جاری تھیں کہ گراہم کی نظر ڈینی کی گن پر گئی جو اس نے بے دھیانی میں نیچے کرلی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ڈینی کے چہرے سے وحشت اور نفرت غائب ہوچکی تھی۔ اس کی جگہ مایوسی اور اضطراب نے لے لی تھی۔

گراہم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''پینی! تم اوپر جاکر نیلا لباس پہنو اور بالوں میں بھی کنگھی کرو۔''

اس کے جانے کے بعد ڈینی نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔''

گراہم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گراہم اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تمہیں قتل کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ میں یہ ارادہ کرکے آیا تھا۔ مجھے تمہاری ہر بات سے نفرت ہے۔''

''شاید میں نے بھی اسی وجہ سے تمہیں نہیں مارا۔''

ڈینی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ بچی میرے لیے سب کچھ ہے۔ ہم یہاں سے جارہے ہیں۔''

گراہم سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم کہیں نہیں جاسکتے۔ تم نے کئی قتل کیے ہیں اور ہم تمہیں تلاش کرکے ہی رہیں گے۔ تم اس بچی کو لے کر کہیں بھی چلے جاؤ لیکن جب ہم تمہیں پکڑلیں گے تو پینی کو ایک مجرم کی بیٹی ہونے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

ڈینی اپنے ہونٹ تر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تم اس کی پرورش مجھ سے اچھی کرسکو۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو اور مجھے جانے دو۔''

''میں پولیس آفیسر ہوں ڈینی اور تم سے کوئی سودا نہیں کرسکتا۔ جیسے ہی تم باہر نکلو گے، میں تمہارا پیچھا کروں گا۔''

''تم مجھے صرف آدھا گھنٹا دے دو۔ پینی کی خاطر۔''

''آدھے گھنٹے میں تم کسی محفوظ جگہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔''

ڈینی کا چہرہ زرد ہوچکا تھا۔ ''میں بہت تیز گاڑی چلاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں بہت دور نکل جاؤں گا۔''

گراہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ صرف آدھا گھنٹا۔ اس کے بعد میں تمہارے پیچھے آرہا ہوں۔''

ڈینی نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور اس نے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔ گراہم نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور سگریٹ سلگا لیا۔ پینی جب نیچے آئی تو باپ کو نہ دیکھ کر رونے لگی۔ گراہم نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''پینی! تمہارے ڈیڈی کو ایک لمبے سفر پر جانا تھا۔ وہ تمہیں بہت پیار کرتے ہیں لیکن ان کا جانا بھی ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ کسی دن تمہاری ان سے پھر ملاقات ہوجائے۔''

''اب میں ان سے کب مل سکوں گی مائیک؟''

''تمہیں اس دن کا انتظار کرنا ہوگا۔''

وہ تھوڑی دیر اس کے کندھے سے لگ کر روتی رہی پھر اسے نیند آگئی۔ گراہم نے گھڑی دیکھی۔ آدھا گھنٹا ختم ہونے والا تھا۔ اسی وقت مسز ویلس اندر داخل ہوئی اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ''معاف کرنا۔ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک کار بہت تیزی سے جارہی تھی کہ چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا۔ وہ موقع پر ہی مرگیا۔''

''وہ واقعی بہت خطرناک موڑ ہے۔'' گراہم نے آہستہ سے کہا اور پینی کو گود میں اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گیا۔

مسز ویلس کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پینی کو محفوظ اور مطمئن دیکھ کر بہت سکون ہوا ہے۔''

گراہم ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں اب وہ واقعی محفوظ اور مطمئن ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے گراہم کو آدھے گھنٹے کی مہلت دے کر کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آوازِ حق

مرزا امجد بیگ

جب صبر اور قناعت کی جگہ ہوس اور زر پرستی لے لے تو انسان کو زندگی نشیب و فراز کے دائرے میں سفر کرتے ہوئے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کر دیتی ہے جہاں سوچ کی کئی سمتیں اسے الجھا دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر عدالت کا یہ کمرا بھی پیش کر رہا تھا جہاں بیگ صاحب ایک ایسی ہی جان بوجھ کر کی جانے والی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہ تھا اور خیالات کی بلند پرواز اسے بہت اونچی اڑان بھی دے رہی تھی کہ اچانک ایک ہی قلابازی نے اس کی آنکھیں کھول دیں... قسمت اچھی تھی کہ سنبھالنے والے ہاتھ موجود تھے وگرنہ ہر ایک کو ایسی مسیحائی میسر نہیں آتی۔

بیرون ملک جا کر روزگار کے خواہش مند لوگوں

کے لیے ایک عبرت اثر واقعہ

کاروبار کوئی بھی ہو، اس کے معاملات کو چلانے کے لیے صاف گوئی کے ساتھ بہرحال کسی حد تک غلط بیانی کا عنصر بھی شامل کرنا پڑتا ہے، چاہے اسے مصلحت کا نام دے کر خود کو مطمئن کر لیا جائے یا کاندھے اچکا کر خاموشی اختیار کر لی جائے، اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔

اگر سچ میں جھوٹ کا تناسب ''آٹے میں نمک'' کے اصول کا آئینہ دار ہو تب معاملہ گڑبڑ نہیں ہوتا اور کاروبار اپنی مخصوص رفتار سے خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن اگر کوئی بھی کاروباری شخص اس اصول کو توڑ کر نمک میں آٹا ڈالنے کی روش پر چل نکلے تو ایسی آمیزش سے معاملات کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ نتیجے کے طور پر ذائقہ تیزی سے کڑواہٹ کی جانب بڑھتے ہوئے فریقین کے بیچ تلخیوں کی خلیج کو حائل کر دیتا ہے۔ ریکروٹنگ کا بزنس بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے!

ممکن ہے، سو میں سے دو چار ریکروٹنگ ایجنٹ ایمان دار، سچے اور کھرے بھی ہوں۔ وہ اپنی زبان کا پاس کرتے ہوں اور اپنے کلائنٹ کو کوئی چکما دیے بغیر معینہ مدت میں وہ اسے بیرون ملک بھجوا دیتے ہوں مگر ایسی خوشخبریاں بہت کم سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں۔ زیادہ تر ریکروٹنگ ایجنٹس کے بارے میں ہمارے معاشرے کے خاص و عام کی رائے یہی ہے کہ یہ لوگ جھوٹے اور دھوکے باز درجۂ اول ہوتے ہیں۔ اپنی پیچ دار باتوں سے یہ کلائنٹ کے دماغ کو اس طرح شکنجے میں لے لیتے ہیں کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ موسم سرما کے ابتدائی دن تھے۔ کراچی کے باسی موسمِ سرما کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہاں پر جاڑا صرف

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

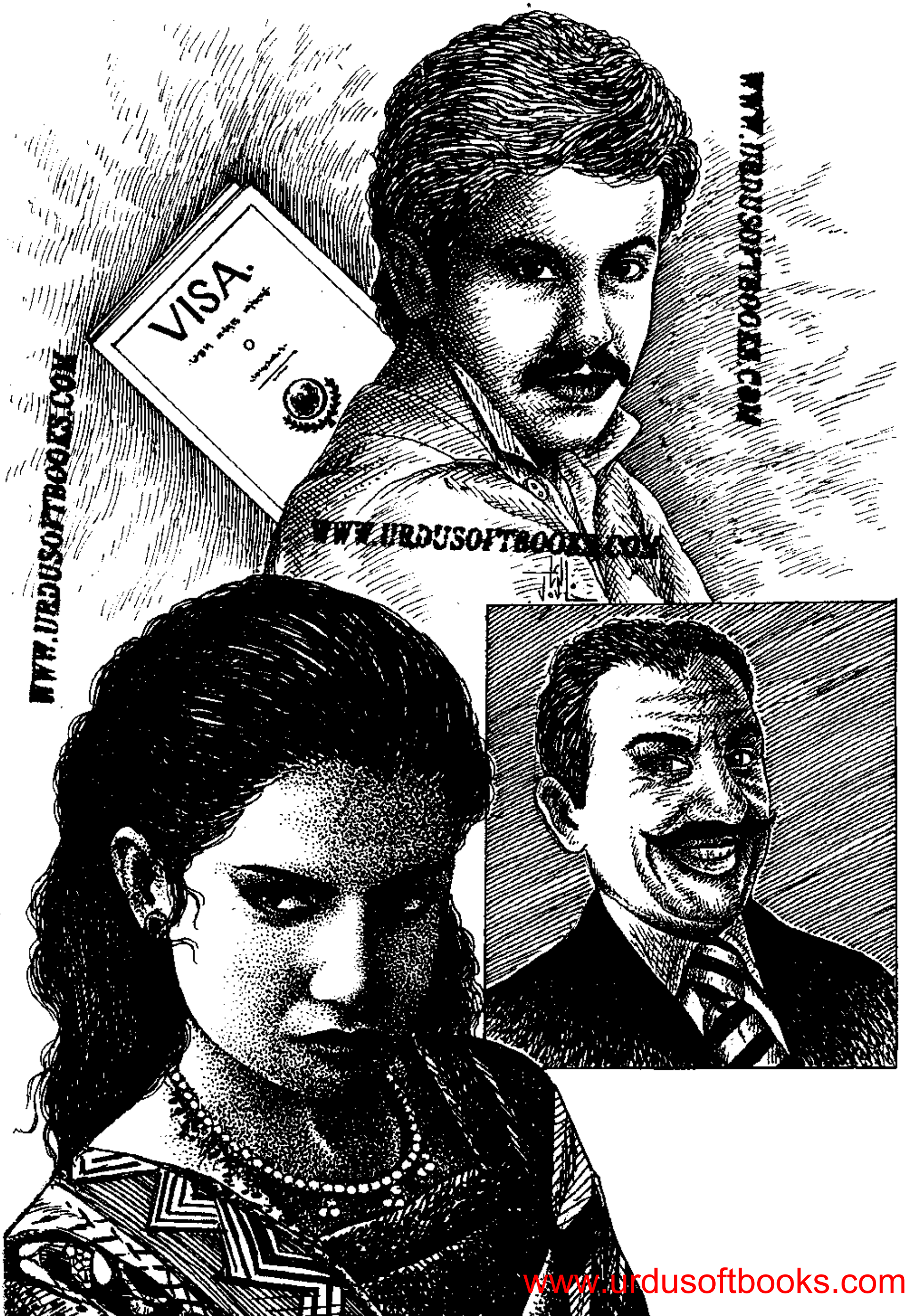

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جھلک دکھانے کے لیے آتا ہے۔ ''چار دن کی چاندنی، پھر اندھیری رات'' کے مصداق ''چار دن کی سردی، پھر وہی گرمی'' والا معاملہ ہے کراچی کے موسم سرما کا۔

بارہ نومبر کی ایک سہ پہر میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں رات میں ہلکی خنکی فضا میں اتر آتی تھی تاہم دن میں ابھی ائرکنڈیشنر کا استعمال جاری تھا۔ میں حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک خاتون اور ایک مرد مجھ سے ملنے آ گئے۔ عورت کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور متناسب بدن کی مالک ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کے ساتھی مرد کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ وہ ایک دبلا پتلا اکہرے جسم کا مالک شخص تھا اور اس نے ہلکی پھلکی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ دونوں میری میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں پر براجمان ہو چکے تو میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''وکیل صاحب! ان کا نام صائمہ ہے۔'' ڈاڑھی والے مرد نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک مصیبت میں پھنس گئی ہیں۔ انہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے اس شخص سے پوچھا۔ ''آپ کی تعریف.....؟''

''میرا نام سلطان شاہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ان کا محلے دار ہوں۔ انسانی ہمدردی کے ناتے ان کے ساتھ آ گیا ہوں۔ آپ ان کی بپتا سن لیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''میں یہاں پر اپنے مؤکلات کی دکھ بھری کہانیاں سننے کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔'' میں نے براہِ راست صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ بتائیں، مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ نوید کا ہے وکیل صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔''

''پریشانی کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس سے بھی پہلے یہ بتائیں کہ نوید کون ہے.....؟''

''نوید میرا شوہر ہے وکیل صاحب۔'' صائمہ نے بتایا۔ ''اس کا پورا نام نوید باری ہے اور ہماری پریشانی یہ ہے کہ ایک ایجنٹ نے دو سال سے ہمیں عجیب و غریب چکر میں ڈال رکھا ہے۔''

''کوئی اسٹیٹ ایجنٹ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کوئی پراپرٹی ڈیلر......!''

''نہیں وکیل صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں ویزا ایجنٹ کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ اچھا...... ریکروٹنگ ایجنٹ۔'' میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''جی جی...... وہی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیا چکر دے رکھا ہے اس ایجنٹ نے آپ لوگوں کو؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بات دراصل یہ ہے جناب کہ......'' صائمہ کے بجائے سلطان شاہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''دو سال پہلے ایک ایجنٹ کے ذریعے نوید نے آسٹریلیا جانے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں نوید نے اس ایجنٹ کو کچھ رقم ایڈوانس میں بھی دے دی تھی لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس ایجنٹ نے ابھی تک نوید کو آسٹریلیا نہیں بھجوایا۔ وہ ہر روز کوئی نئی کہانی سنا کر نوید کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صائمہ صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ آپ قانونی چارہ جوئی کر کے انہیں ایجنٹ سے وہ رقم واپس دلا دیں جو انہوں نے ایڈوانس میں اسے دے رکھی ہے۔''

''باقی باتیں بعد میں۔'' میں نے قلم کو پیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نوید باری کہاں ہے؟''

''وہ اس وقت اپنی دکان پر ہے۔'' صائمہ نے بتایا۔ ''اسے پتا نہیں کہ میں کسی وکیل کے پاس گئی ہوں۔''

''کیا آپ نے دانستہ یہ بات اپنے شوہر سے چھپائی ہے؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے صائمہ کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی۔''

''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''اگر میں یہ بات نوید کے علم میں لے آتی تو وہ مجھے آنے نہیں دیتا۔'' صائمہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایجنٹ پر بہت بھروسا کرتا ہے اور اس کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کے حق میں نہیں ہے۔ اسے ابھی تک یہی یقین ہے کہ وہ ایجنٹ اسے کہیں نہ کہیں ضرور بھجوا دے گا۔''

''میں اسی لیے ان کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں کہ نوید ایسی کسی بھی کوشش کے خلاف ہے۔'' سلطان شاہ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ ''صائمہ بھابی نے مجھ سے درخواست کی اور میں انسانی ہمدردی کے ناتے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یہاں چلا آیا۔"

"شاہ جی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے ستائشی نظر سے سلطان شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس معاملے میں ایک تکنیکی خرابی ہے......!"

"کیسی خرابی وکیل صاحب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے سلطان شاہ سے پوچھا۔ "نوید نے آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کے ساتھ کتنے میں معاملہ طے کیا تھا؟"

"تین لاکھ کی بات ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ایک لاکھ ایڈوانس اور باقی کے دو لاکھ ویزا لگ جانے پر۔"

یہ واقعہ آج سے بتیس تینتیس سال پہلے کا ہے۔ آج کل اس نوعیت کے کام کے ریٹ بہت ہائی ہیں۔ میں نے سلطان شاہ سے دریافت کیا۔

"کیا یہ ایڈوانس والی ایک لاکھ کی رقم آپ نے ایجنٹ کو دی تھی؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ نے......؟" میں نے معنی خیز انداز میں صائمہ کی طرف دیکھا۔

وہ میرے سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولی۔ "نہیں وکیل صاحب! رقم تو خود نوید نے ایجنٹ کو دی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر یعنی نوید باری رقم کی واپسی کے لیے ایجنٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟" میں نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

"جی......ایسی ہی بات ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ دونوں کی یہاں آمد بے سود ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا جناب؟" سلطان شاہ نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"یہ معاملہ دراصل نوید باری اور اس... ریکروٹنگ ایجنٹ کے بیچ ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا آپ دونوں غیر متعلقہ افراد ہیں۔ اس کہانی میں نوید کا کردار ایک مدعی ایسا ہے۔ جب تک وہ رقم کی واپسی کے لیے رضامند نہیں ہوگا، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ پولیس اور نہ کورٹ کچہری......!"

"میں نوید کو راضی کرلوں گی۔" صائمہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ بس میری کہانی سن لیں اور مجھے بالکل ...... صاف صاف بتادیں کہ کیا آپ قانونی چارہ جوئی کر کے اس ویزا ایجنٹ سے ہماری رقم واپس دلوا سکتے ہیں!"

"میں آپ کی کہانی ضرور سنوں گا اور پوری توجہ سے سنوں گا۔" میں نے صائمہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور اس بات کا فیصلہ کہانی کے اختتام پر کیا جائے گا کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی قانونی مدد کر سکتا ہوں یا نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر میں یہ کیس لوں گا تو آپ کو میری فیس کے علاوہ تمام دیگر عدالتی اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے!"

"مجھے منظور ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

میں نے اسے اپنی فیس کی رقم کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔"

"یہ بھی منظور ہے وکیل صاحب۔" وہ پراعتماد انداز میں بولی۔

اس کے بعد صائمہ نے مجھے اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کردیا۔ کہانی تو خاصی طویل ہے لیکن میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ ایک امر کی وضاحت کردوں کہ اس داستان میں سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپالی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا تاکہ کہانی میں تجسس کا عنصر برقرار رہے۔

☆☆☆

نوید باری کی رہائش کراچی کے ایک علاقے "اعظم بستی" میں تھی۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ خاصا پسماندہ ہوا کرتا تھا، اسی لیے اس محلے کے نام کے ساتھ "بستی" کا لفظ لگا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی اعظم بستی کوئی ماڈرن علاقہ نہیں بن گیا تاہم تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جیسا کہ آپ کو پتا چل چکا کہ صائمہ، نوید کی بیوی تھی۔ ان کی ایک چار سال کی بیٹی بھی تھی جس کا نام فرزانہ تھا۔ ان کی شادی کو چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ نوید کی محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ کام ٹھیک ٹھاک تھا لیکن انسان کی فطرت میں ناشکرے پن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ قدرت انسان کو چاہے کتنا بھی نواز دے وہ پھر بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ اگر وہ کسی حد تک شکر ادا کرتا بھی ہے تو ساتھ ہی مزید کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔

یہی معاملہ نوید کے ساتھ بھی تھا۔ وہ اتنا کما لیتا تھا کہ اس کی مختصر سی فیملی کا بڑا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ یہ ایک

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایسا دماغی کیڑا ہے کہ جس نے بہت سے خاندانوں کو سپردِ عذاب کیا ہوا ہے!

نوید کے جاننے والوں میں شاکر نامی ایک شخص تھا۔ شاکر کسی بینک میں کام کرتا تھا۔ مذکورہ بینک کی برانچ لانڈھی کے علاقے میں تھی تاہم اس کی رہائش اختر کالونی میں تھی۔ نوید کی اکثر شاکر سے ملاقات ہو جاتی تھی کیونکہ اختر کالونی اور اعظم بستی ایک دوسرے کے پڑوسی محلے ہیں اور کچھ پتا نہیں چلتا، کب ایک ختم ہوا اور کب دوسرا شروع ہو گیا۔

شاکر کو بیرونِ ملک کی خاصی معلومات تھیں۔ ان کی جب بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شاکر نے نوید کو بتا رکھا تھا کہ اس کا ایک جاننے والا لوگوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا کام کرتا ہے۔ ایک روز نوید نے شاکر سے کہا۔

''یار! مجھے اس بندے سے تو ملواؤ...... وہ جو ویزا لگوا کر دیتا ہے۔''

''کیا تم بھی ملک سے باہر جانا چاہتے ہو؟'' شاکر نے پوچھا۔

''ہاں یار......'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے ناشکرے پن سے بولا۔ ''یہاں کیا رکھا ہے۔ میں بھی ملک سے باہر جا کر دولت کمانا چاہتا ہوں۔''

''نوید! میں تمہیں اس بندے سے ملوا تو دوں گا۔'' شاکر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کے بارے میں چند باتیں میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا ہوں۔''

''کون سی باتیں؟'' نوید ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''نمبر ایک' وہ بندہ بہت اطمینان سے کام کرتا ہے۔'' شاکر نے بتایا۔ ''اس لیے تم جلدی کی کوشش نہیں کرنا۔ اگر کام میں دیر ہو رہی ہو گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کام پکا ہو رہا ہے۔ اگر تمہارے اندر صبر کا مادہ ہے تو اس کام میں ہاتھ ڈالو ورنہ کوئی فائدہ نہیں ہے خوامخواہ اپنا خون جلانے کا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے کا۔''

''میں انتظار کر لوں گا۔'' نوید نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''وہ بندہ جتنے دن بھی کہے گا، میں برداشت کر لوں گا۔ میرے اندر بڑا صبر ہے۔ بس، کام پکا ہونا چاہیے۔''

''ایک دم لوہا لاٹ کام ہو گا۔'' شاکر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔''

''تو ٹھیک ہے......'' نوید نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ''پھر کب ملوا رہے ہو مجھے اس بندے سے؟''

''تم جب کہو گے، ملوا دوں گا یار، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' شاکر بے پروائی سے بولا۔ ''ابھی تو میں تمہیں اس بندے کے بارے میں بتا رہا تھا......''

''ہاں ہاں...... بتاؤ۔'' نوید تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ہو گیا کہ وہ بندہ بہت دیکھ بھال کر پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے۔'' شاکر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے علاوہ وہ کچھ رقم ایڈوانس میں بھی لیتا ہے......''

''کتنی رقم؟'' شاکر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید نے سوال داغ دیا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔'' شاکر سادگی سے بولا۔ ''اس بارے میں تمہیں شیر بھائی ہی بتائیں گے۔''

''شیر بھائی......'' نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون صاحب ہیں؟''

''ارے یار! میں اسی بندے کی بات کر رہا ہوں۔'' شاکر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام شیر ہے...... شیر افضل!''

''ٹھیک ہے۔ تم مجھے شیر افضل سے ملوا دو۔'' نوید نے کہا۔ ''باقی باتیں میں خود ہی اس سے پوچھ لوں گا۔''

''ایک بات ذہن میں رکھنا نوید۔'' شاکر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں شیر افضل سے ضرور ملوا دوں گا لیکن اس کے ساتھ سارے معاملات تم خود ہی طے کرو گے، خاص طور پر رقم کا لین دین۔ میں کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہوں گا۔''

''ٹھیک ہے!'' نوید نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''بس، مجھے اتنا بتا دو کہ وہ بندہ تو صحیح ہے نا؟''

''ایک دم صحیح ہے۔'' شاکر نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ''میں اس کے کام سے مطمئن ہوں۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں شیر افضل نے ملک سے باہر بھجوایا ہے اور وہ وہاں سے کما کما کر رقمیں اپنے بیوی بچوں کو بھیج رہے ہیں۔''

شاکر کی وضاحت نے نوید کو مطمئن کر دیا۔

چند روز کے بعد وہ تینوں کالا پل کے نزدیک چائے کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے یعنی نوید، شاکر اور شیر افضل۔ شیر افضل کی شخصیت نے نوید کو بڑا ٹھیک ٹھاک متاثر کیا تھا۔ شاکر انہیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے بعد کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب نوید اور شیر افضل ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شیر افضل کا پہناوا اور رکھ رکھاؤ شاندار تھا۔ اس زمانے میں سیل فون کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔ کسی انسان کی حیثیت کو چیک کرنے کے لیے اس کی گھڑی اور لباس کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا۔ شیر افضل کی کلائی پر سنہری کیس اور سنہری چین والی ایک قیمتی گھڑی موجود تھی اور اس نے جدید تراش کا ایک بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا جس پر اس نے اعلیٰ درجے کی پرفیوم بھی اسپرے کی ہوئی تھی۔

گفتگو کے آغاز میں شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نوید صاحب! پہلے میں آپ سے چند سوالات کروں گا۔ اس کے بعد آپ کا جو دل چاہے، پوچھ لیجیے گا۔ آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟''

''جی بالکل۔ میں نے پچھلے سال ہی بنوایا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی آپ کے پاسپورٹ کو چار سال تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔'' شیر افضل سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''آپ نے اس پاسپورٹ پر بیرون ملک کوئی سفر کیا ہے؟''

''جی نہیں!'' نوید نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ٹریول ہسٹری بالکل نہیں ہے۔'' شیر افضل نے کہا۔ ''پاسپورٹ کورا ہے......!''

''اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟'' نوید باری نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''اگر وزٹ ویزا چاہیے ہو تو فرق پڑتا ہے۔'' شیر افضل نے بتایا۔ ''ایمپلائی منٹ ویزا پر نہیں لہٰذا آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میں تو ویزا کی اقسام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔'' نوید سادگی سے بولا۔ ''بس میری یہ خواہش ہے کہ میں پاکستان سے باہر جا کر محنت کروں اور اپنے بیوی بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ روزی کما سکوں۔''

''محنت مزدوری کرنا اور روزی کمانے...... کا تعلق ایمپلائی منٹ سے ہے۔'' شیر افضل نے کہا۔ ''لہٰذا آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا چاہیے ہوگا یعنی ورک پرمٹ والا ویزا۔''

''دونوں ویزا میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے؟'' نوید نے استفسار کیا۔

''وزٹ ویزا پر آپ سیر و تفریح کے لیے کسی بھی ملک جاتے ہیں اور ویزا کی مدت ختم ہونے سے پہلے آپ کو واپس آنا ہوتا ہے یعنی آپ اس ملک میں طویل قیام نہیں کرسکتے اور یہ مدت عموماً پندرہ دن یا ایک ماہ یا تین ماہ یا چھ ماہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس مختصر قیام کے دوران میں آپ وہاں ملازمت بھی نہیں کرسکتے۔'' شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا پر آپ وہاں کی کسی کمپنی سے جاب کنٹریکٹ کر کے جاتے ہیں لہٰذا آپ وہاں قانوناً قیام بھی کرسکتے ہیں اور نوکری بھی اور یہ کنٹریکٹ عموماً ایک سال یا دو سال یا تین سال کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''وزٹ ویزا کے لیے آپ کے پاسپورٹ کی ویلیڈیٹی کم از کم تین ماہ اور ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم دو سال ہونا لازمی ہے۔''

''میں تو روزگار کے سلسلے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' نوید باری نے کہا۔ ''لہٰذا آپ مجھے ایمپلائی منٹ ویزا پر ہی بھیجیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''ایک بات ذہن میں رہے کہ ایمپلائی منٹ ویزا کا پروسس خاصا طویل ہے۔ اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ وزٹ ویزا تو زیادہ سے زیادہ دو ماہ میں لگ جاتا ہے جبکہ ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے کم از کم آٹھ نو ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

''میں انتظار کرلوں گا۔'' نوید نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''مگر کام پکا ہونا چاہیے۔''

''میں پکے کام ہی کرتا ہوں نوید صاحب اسی لیے ٹائم لگتا ہے۔'' شیر افضل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ اگر لوگوں کے پیسے کھا کر بھاگنا ہو تو کوئی بھی آسرا دیا جاسکتا ہے۔ اب آپ یہ بتا دیں کہ کس ملک میں جانا چاہتے ہیں؟''

''آپ کہاں کہاں بھجوا سکتے ہیں؟'' نوید نے پوچھا۔

''میرے پاس تو ہر ملک کا کام ہے۔ آپ جہاں کہیں گے، میں پہنچا دوں گا۔'' شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنی پسند بتائیں۔''

''یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔'' نوید نے کہا۔ ''بس کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کام آسانی سے مل جائے اور تنخواہ اچھی ہو۔''

''آپ اس وقت کیا کام کر رہے ہیں۔'' شیر افضل نے پوچھا۔ ''اور ایک ماہ میں کتنا کما لیتے ہیں؟''

''محمود آباد کے مین بازار میں میری کپڑے کی دکان ہے۔'' نوید نے بتایا۔ ''اور میں تقریباً پانچ سے سات ہزار روپے ماہانہ کما لیتا ہوں۔''

''ہوں......'' شیر افضل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لہجے میں کہا پھر سوال کیا۔ ''محنت والا کام کرلیں گے؟''

''بالکل کرلوں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں محنت سے نہیں گھبراتا۔''

''پھر آپ کے لیے آسٹریلیا سب سے زیادہ مناسب رہے گا۔'' شیر افضل سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''آسٹریلیا میں ڈیری فارم کا بہت زیادہ کام ہے جہاں ہر وقت لیبر کی ضرورت رہتی ہے۔''

''ڈیری فارم...... یعنی بھینسوں کا دودھ نکالنا......؟''

نوید نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں پاکستان کے نہیں، آسٹریلیا کے ڈیری فارمز کی بات کررہا ہوں۔'' شیر افضل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں کے ڈیری فارمز میں گائے بھینس کا دودھ نکالنے کے علاوہ گھی، مکھن، پنیر اور ملائی وغیرہ کے پروسس کے پلانٹس بھی لگے ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں گائے بھینس کا دودھ بھی یہاں کی طرح ہاتھ سے نہیں نکالا جاتا بلکہ اس کام کے لیے باقاعدہ مشینوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں زیادہ محنت اور مشقت کا کام مشینیں کرتی ہیں اور انسان ان مشینوں کو آپریٹ کرتے ہیں اور آپ کو ڈیری فارم کے جس بھی شعبے میں لگایا جائے گا پہلے اس کام کی آپ کو ٹریننگ دی جائے گی۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ آپ مجھے آسٹریلیا ہی بھجوادیں۔''

نوید باری اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''آپ مجھے اپنے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی دے دیں۔'' شیر افضل نے کہا۔ ''میں آپ کا پروسس شروع کروادیتا ہوں۔''

نوید باری پاسپورٹ اور شناختی کارڈ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور ان کی فوٹو کاپی بھی کروا رکھی تھی۔ شیر افضل کی مطلوبہ چیزیں اس کے حوالے کرتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

''آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آسٹریلیا میں مجھے ماہانہ کتنی تنخواہ مل جائے گی؟''

''آپ کے تصور سے بھی بہت زیادہ۔'' شیر افضل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

نوید باری کا دل مچل کر رہ گیا۔ وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''پھر بھی...... کچھ بتائیں تو سہی......؟''

''میرے محتاط اندازے کے مطابق آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں آپ کو بہ آسانی پندرہ ڈالر فی گھنٹا کی نوکری مل جائے گی۔'' شیر افضل اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہفتے میں پینتالیس گھنٹے آپ کو کام کرنا ہوگا یعنی فی ہفتہ چھ سو پچھتر ڈالرز کمالیں گے اور اگر آپ ماہانہ آمدنی کا حساب لگانا چاہیں تو چار ہفتوں کی کمائی دو ہزار سات سو ڈالرز بنے گی۔''

''آپ مجھے پاکستانی کرنسی میں بتائیں......!'' نوید دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔

''میں نے ابھی آپ کو جو حساب بتایا ہے اس میں انیس بیس کا فرق آسکتا ہے۔'' شیر افضل گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور یہ مزدوری آسٹریلین ڈالر کے مطابق ہے۔ اس وقت آسٹریلین ڈالر پاکستان کے ساڑھے دس روپے کے برابر چل رہا ہے۔ اگر آپ پاکستانی کرنسی میں اپنی ماہانہ آمدنی کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو دو ہزار سات سو آسٹریلین ڈالرز کو ساڑھے دس سے ضرب دیں۔ اس طرح یہ رقم اٹھائیس ہزار تین سو پچاس روپے بنتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق آپ ستائیس ہزار سے تیس ہزار پاکستانی روپے تک بہ آسانی کمالیں گے۔''

یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت آسٹریلین ڈالر پاکستان کے ساڑھے دس روپے کے برابر اور امریکی ڈالر پاکستان کے سولہ روپے کے برابر ہوا کرتا تھا۔ آج آسٹریلین ڈالر کم و بیش نوے روپے کا اور امریکی ڈالر ایک سو دس روپے تک جا پہنچا ہے۔ بہ ظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ڈالر کی قیمت میں بتدریج اضافہ ہوا ہے لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی روپے کی قیمت و قدر میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہوئی ہے۔

نوید نے ماہانہ تیس ہزار روپے تک کی آمدنی کا سنا تو اس کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے پھیل گئیں۔ یہ اس کی پاکستان میں آمدنی سے پانچ گنا زیادہ رقم تھی۔ وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ ''آپ میرا پروسس شروع کروادیں۔ میں آسٹریلیا جانے کے لیے آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''

''میں شرطیں ورطیں نہیں منوایا کرتا نوید صاحب۔'' شیر افضل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بس میرے کچھ اصول ہیں، وہ میں آپ کو بتادیتا ہوں۔ اگر وہ اصول آپ کے لیے قابلِ قبول ہوں تو میں کل ہی آپ کا پروسس شروع کروادیتا ہوں۔''

''جی...... ضرور......'' نوید ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''بتائیں، آپ کے اصول کیا کیا ہیں۔''

''دیکھیں جناب! ویزا وزٹ ہو یا اوورسیز ایمپلائی منٹ ویزا، میں دونوں صورتوں میں اس کام کے تین لاکھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ورسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 300/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الارا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس 91

معظم علی 475/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی ننڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحر اکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)

ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کی پہلی لغت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 | 022-2780128
021-32765086 | 051-5539609 | 042-37220879

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

روپے لیتا ہوں۔'' شیر افضل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''بس دونوں میں موڈ آف پے منٹ کا فرق ہے۔ وزٹ ویزا میں، میں ایک لاکھ روپے ایڈوانس لیتا ہوں اور باقی کے دو لاکھ ویزا لگنے پر......''

''اور میرے والے کیس میں ......'' شیر افضل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید بول اٹھا۔ ''اس سلسلے میں آپ کا کیا اصول ہے؟''

''ایمپلائی منٹ ویزا کے لیے بھی ایک لاکھ روپے ایڈوانس لیتا ہوں۔ باقی کا پروسس بالکل مختلف ہے۔'' شیر افضل اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''سب سے پہلے میں آسٹریلیا کے ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں آپ کا کیس جمع کراؤں گا جس کی رجسٹریشن فیس دو ہزار آسٹریلین ڈالر ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے ساتھ میرا خط کتابت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آسٹریلیا کا ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ آپ کے لیے کسی ڈیری فارم میں جاب نکال کر مجھے آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد اس ڈیری فارم کی طرف سے آپ کے لیے جاب آفر لیٹر آ جائے گا۔ اس جاب آفر لیٹر کے ساتھ آسٹریلیا کے ورک پرمٹ ویزا کے حصول کے لیے وہاں کی امیگریشن میں درخواست دی جائے گی۔ اس تمام تر پروسس میں چار سے چھ ماہ لگ جائیں گے۔ جب آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ آپ کے کیس سے مطمئن ہو جائے گا تو وہاں سے آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آ جائے گا۔ اس دوران میں ہر مرحلے پر پیسے خرچ ہوں گے......'' لمحاتی توقف کر کے شیر افضل نے ایک گہری سانس خارج کی پھر نوید کی عقل سے ماورا پروسس کی تفصیلات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میڈیکل چیک اپ سب سے اہم اور نازک مرحلہ ہے۔ کسی اچھی شہرت والے اسپتال میں آپ کے مختلف ٹیسٹ کیے جائیں گے جن کی مدد سے یہ جانچنا مقصود ہوگا کہ آپ میڈیکلی فٹ ہیں اور آپ کے اندر خدانخواستہ کوئی بڑی بیماری تو نہیں پل رہی......''

''اور اگر میرے کسی ٹیسٹ میں کوئی بیماری نکل آئی تو......؟'' نوید نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا لہٰذا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' شیر افضل نے بے پروائی سے کہا۔ ''اول تو آپ کے اندر کوئی ایسی بیماری ہے ہی نہیں جس سے دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ ہو۔ وہ صرف یہ تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں طویل عرصہ گزارنے کے لیے آنے والا شخص کسی ایسی وبائی یا متعدی بیماری میں مبتلا نہ ہو جس سے دوسرے لوگوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور بہ فرض محال، خدانخواستہ اگر آپ کے اندر ایسی کسی بیماری کی نشاندہی ہو بھی گئی تو......'' جملے کو نامکمل چھوڑ کر وہ تھوڑا سا آگے کو جھک آیا پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

''میرا نام شیر افضل ہے۔ میں کچے کام نہیں کرتا۔ آپ مجھے میری مطلوبہ رقم دے رہے ہیں نا۔ آپ کے مفادات کا تحفظ کرنا میری ذمے داری ہے۔ اگر آپ کے ٹیسٹ کی کسی رپورٹ میں کوئی گڑبڑ آ بھی گئی تو میں نوٹ خرچ کر کے سب سنبھال لوں گا۔ یہاں کے اسپتال سے آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو جو رپورٹ ارسال کی جائے گی اس کے مطابق آپ سولہ آنے میڈیکلی فٹ ہوں گے لہٰذا آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

نوید نے ایک طویل اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔

شیر افضل نے چالاکی سے کہا۔ ''جس روز آپ کے میڈیکل چیک اپ کا لیٹر آئے گا اس دن آپ مجھے ایک لاکھ اور دیں گے اور آخری ایک لاکھ آپ اس وقت دیں گے جب آپ کو ایمپلائی منٹ ویزا جاری کر دیا جائے گا۔''

''میڈیکل کے بعد ویزا ملنے میں کتنا وقت لگے گا؟'' نوید نے پوچھا۔

''ایک سے دو ماہ تک۔'' شیر افضل نے جواب دیا۔ ''میڈیکل چیک اپ کی رپورٹ آسٹریلین امیگریشن ڈیپارٹمنٹ میں جائے گی۔ اس رپورٹ سے مطمئن ہونے کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ ''اوکے'' کا لیٹر جاری کر دے گا۔ اس لیٹر کے ساتھ آپ کا پاسپورٹ یہاں کراچی میں متعلقہ جگہ پر جمع کرا دیا جائے گا۔ یہاں سے آپ کا پاسپورٹ اسلام آباد جائے گا اور ضروری کارروائی کے بعد آپ کو ویزا جاری کر دیا جائے گا۔ بس، اس کے بعد آپ کو جہاز پکڑ کر آسٹریلیا روانہ ہونا ہوگا۔''

شیر افضل نے نوید باری کو اس سلسلے میں مزید کچھ باتیں سمجھائیں۔ اِکا دُکا مقام پر اس نے دروغ گوئی سے بھی کام لیا تھا۔ نوید چونکہ اس نوعیت کے معاملات سے قطعی لاعلم تھا لہٰذا وہ شیر افضل کی بیان کردہ اسٹوری پر ایمان لے آیا اور اگلے روز اس نے اپنی زندگی کی جمع پونجی میں سے ایک لاکھ روپے نکال کر شیر افضل کے حوالے کر دیے۔ اب اس کی سیونگ میں چند ہزار ہی باقی بچے تھے۔ آپ خود اندازہ لگا لیں، آج سے لگ بھگ بتیس، تینتیس سال پہلے جو شخص چھ سات ہزار روپے ماہانہ کماتا ہو اس نے سوا، ڈیڑھ لاکھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

روپے کتنی مشکل سے کتنے عرصے میں جمع کیے ہوں گے!

شیر افضل نے ایک لاکھ روپے وصول کرتے وقت اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''نوید صاحب! آپ کے پاس کم و بیش چھ ماہ ہیں۔ آپ ابھی سے دوسرے لاکھ کے بندوبست میں لگ جائیں۔ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور یہ چھ ماہ پر لگا کر اڑ جائیں گے۔''

''جی ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' نوید نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں ادھر ادھر سے پکڑ کر انتظام کر لوں گا اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو میں دکان میں موجود مال کو فروخت کر دوں گا۔ اس وقت کم از کم ڈیڑھ لاکھ کا کپڑا میری دکان میں موجود ہے۔ آپ پروسس شروع کر دیں۔ میں دوسرے اور تیسرے لاکھ کی ادائیگی کے سلسلے میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔''

''یہ سودا آپ کے لیے مہنگا ثابت نہیں ہوگا نوید صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ سے جو کل تین لاکھ لے رہا ہوں اس میں آپ کی پکی نوکری کے علاوہ جہاز کا ٹکٹ بھی شامل ہے۔ آپ نے بس ایک بیگ تیار کرنا ہے۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔ ان تین لاکھ کے علاوہ آپ کی جیب سے ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوگا بلکہ جس روز میں آپ کو جہاز کا ٹکٹ دوں گا اسی دن ٹکٹ کے ساتھ پانچ سو آسٹریلین ڈالرز بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا تاکہ جب تک آپ کو تنخواہ ملتی، آپ اپنا خرچ چلا سکیں۔ ایک بات آپ کو بتا دوں کہ وہاں آپ کو ہفتہ وار تنخواہ ملے گی لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تین لاکھ تو آپ ایک سال کے اندر پورے کر لیں گے۔ اگر آپ آٹھ سو ڈالرز بھی ماہانہ وہاں خرچ کریں تو پھر بھی لگ بھگ اکتیس ہزار پاکستانی روپے یہاں اپنی فیملی کو بھیج سکتے ہیں۔ ایک بات اور......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے آپ کی ماہانہ آمدنی کا جو ذکر کیا ہے وہ نارمل ڈیوٹی ٹائم کا ہے۔ اگر آپ روزانہ چند گھنٹے اوور ٹائم کریں گے تو ماہانہ پچاس ہزار روپے تک بھی کما سکتے ہیں۔''

شیر افضل نے نوید باری کو جس بانس پر چڑھا دیا تھا وہاں سے سب اچھا اچھا ہی دکھائی دیتا تھا۔ جب انسان کا دماغ اس بلندی پر ہو تو پھر اسے اپنے ملک کی سرزمین بہت حقیر نظر آنے لگتی ہے۔ نوید بھی اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آسٹریلیا ہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں ہر دس پندرہ دن کے بعد شیر افضل اس سے ملاقات کرتا اور ہر ملاقات پر اسے کوئی نہ کوئی کاغذ تھما دیتا۔ یہ وہ لیٹرز ہوتے تھے جو بہ قول شیر افضل کے، اس کے اور مختلف آسٹریلین دفاتر کے بیچ مراسلہ نگاری کے نتیجے میں موصول ہوتے تھے۔ ان ڈاکیومنٹس کی رو سے نوید کا کیس بڑے طریقے سلیقے سے آگے بڑھ رہا تھا لہٰذا نوید مطمئن تھا۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور میڈیکل چیک اپ کا مرحلہ آن پہنچا۔ نوید نے دوسرا لاکھ بھی شیر افضل کے حوالے کر دیا، تاہم اس رقم کے بارے میں اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ صائمہ کی معلومات کے مطابق، شیر افضل ان کے ایک لاکھ روپے کھائے بیٹھا تھا اور اس نے مجھے بھی یہی بتایا تھا لیکن جب میری نوید سے براہِ راست تفصیلی بات ہوئی تو دیگر اہم باتوں کے علاوہ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ شیر افضل کے پاس دو لاکھ روپے پھنسائے بیٹھا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ صائمہ حسبِ وعدہ اپنے شوہر نوید باری کو میرے آفس تک لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

نوید باری کے ساتھ میری ملاقات اس کے لیے کافی سود مند رہی تھی۔ میں نے اسے ویزا ایجنٹ حضرات کی چال بازیوں اور مکاریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ شیر افضل پچھلے دو سال سے مسلسل اسے الو بنا رہا تھا۔ جب میں نے نوید کا اعتماد حاصل کر لیا تو پھر اس نے کھل کر مجھے بہت سی اہم باتیں بتائیں جن کی بنا پر میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

نوید باری کی فراہم کردہ معلومات کے اندر بعض ایسے نکات موجود تھے کہ جن کے اوپر کھڑے ہو کر پیشہ ورانہ مہارت کو استعمال کرتے ہوئے میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ شیر افضل کو اپنے گھیرے میں لے کر بے بس کر سکتا تھا۔ میں نے اوپر آپ کو نوید باری اور شیر افضل کے بارے میں جتنا کچھ بتایا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جو آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں مختلف مواقع پر آپ کے سامنے آئے گا۔

میں نے اگلے روز سلطان شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ سلطان شاہ، نوید باری کا محلے دار تھا اور چند روز پہلے وہ پہلی مرتبہ نوید کی بیوی صائمہ کے ہمراہ میرے پاس آیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ سلطان شاہ خدائی فوجدار قسم کا شخص تھا جو خلوصِ نیت

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے نوید باری کا بھلا چاہتا تھا۔
رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے بتایا۔ ''شاہ جی! میں نے نوید باری کا کیس پکڑلیا ہے۔ میں تو عدالت کے اندر جو فائٹ کروں گا سو کروں گا ہی لیکن عدالت کے باہر مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیا آپ اس سلسلے میں ذہنی طور پر تیار ہیں؟''
''اگر میں نوید باری کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ حکم کریں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''
''صرف آپ کا مخلصانہ تعاون۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کے ذمے کوئی کام لگاؤں، آپ مجھے بتائیں کہ بھاگ دوڑ کے لیے تھوڑا وقت نکال سکتے ہیں؟''
''نکال لوں گا جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''بتائیں، کہاں سے کہاں تک ریس لگانا ہے؟''
''ارے نہیں یار......'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو کسی گھڑ دوڑ میں شرکت نہیں کرانا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ میری ہدایات پر عمل کرنے کے لیے دن میں کچھ وقت نکال سکتے ہیں؟''
''جی ضرور!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''
میں نے پوچھا۔ ''آپ کی روزانہ کی مصروفیات کیا ہیں؟''
''میں پاکستان چوک میں واقع ایک چھوٹے سے پرنٹنگ پریس میں کام کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں پریس کے باہر کے کام دیکھتا ہوں اس لیے دن کا بیشتر حصہ شہر کی سڑکوں پر گزرتا ہے۔''
''تب تو اور بھی اچھا ہے کہ میرے بتائے ہوئے کام سے آپ کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔ آپ بہ آسانی اپنے فرائض کو نبھاتے ہوئے نوید باری کے بھی کام آسکتے ہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''آپ جانتے ہیں کہ وہ ریکروٹنگ ایجنٹ شیر افضل کوئی سیدھا سادہ نیک دل انسان نہیں ہے کہ ہم بڑے آرام سے اس کی جیب میں سے دو لاکھ روپے نکلوانے میں کامیاب ہوجائیں۔''
''دو لاکھ کیوں وکیل صاحب!'' سلطان شاہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''نوید باری نے تو اس ویزا ایجنٹ کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ کیا ان دو سالوں کا ٹیکس لگا کر اس سے ڈبل رقم وصول کرنا ہے؟''
''نہ کوئی ٹیکس اور نہ کسی قسم کا کوئی جرمانہ یا ہرجانہ!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ اصل زر ہے اور ہمیں شیر افضل سے یہی رقم نکلوانا ہے۔''
''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نوید باری نے آسٹریلیا جانے کے لیے اس ایجنٹ کو دو لاکھ روپے دے رکھے تھے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
''ایسی ہی بات ہے شاہ جی۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''ایک لاکھ ایڈوانس، کام شروع کرنے سے پہلے اور ایک لاکھ لگ بھگ چھ ماہ بعد۔ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی نوید باری کا کام ہوا ہے اور نہ ہی اس کی دو لاکھ روپے کی رقم واپس ملی ہے۔''
''اوہ خدایا......!'' وہ افسوس بھرے انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''یہ ویزا ایجنٹ تو بہت عیار اور دھوکے باز شخص ہے۔''
''اکثر ریکروٹنگ ایجنٹس اسی قماش کے ہوتے ہیں۔'' میں نے زہرخند انداز میں کہا۔ ''بہرحال، اب شیر افضل کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کرکے اس سے نوید باری کے دو لاکھ نکلوانے ہیں اور اسی سلسلے میں مجھے آپ کے عملی تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے بتائیں، شیر افضل کے بارے میں آپ ذاتی طور پر کیا جانتے ہیں؟''
''کچھ بھی نہیں۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آج تک اس بندے سے نہیں ملا۔ بس اس کا ذکر ہی سنا ہے۔''
''لیکن اب آپ کو شیر افضل کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی کوشش کرنا ہے اور وہ بھی جلد از جلد۔'' میں نے سلطان شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''مگر کیسے؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔
''طریقہ میں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے آپ نے شیر افضل کی رہائش اور اس کے بیوی بچوں کا سراغ لگانا ہے۔ نوید باری اس حوالے سے کچھ نہیں جانتا۔ آج تک شیر افضل سے اس کی ملاقاتیں مختلف چائے خانوں میں ہوتی رہی ہیں۔ ایک دو بار وہ محمود آباد میں نوید کی دکان پر بھی ملنے آیا ہے، خاص طور پر شیر افضل نے دو لاکھ کی رقم نوید باری کی دکان پر آکر ہی لی ہے۔ وہ نوید کی دکان، اس کے گھر کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے لیکن نوید کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ اب آپ کو نوید کے ہاتھ مضبوط کرنا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یعنی بہ الفاظِ دیگر، اس معاملے کو بہ خوبی نمٹانے کے لیے آپ نے میرے ساتھ تعاون کرنا ہے اور اسی کام کے لیے میں نے آپ کو اپنے پاس بلایا ہے۔''

''آپ مجھے راستہ بتائیں وکیل صاحب۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔ ''میں آپ کی ہدایات پر عمل کر کے اس ٹاسک کو پورا کر دکھاؤں گا اللہ کے فضل سے۔''

''اختر کالونی میں نوید باری کا ایک دوست رہتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جو لانڈھی کے کسی بینک میں جاب کرتا ہے۔ اسی شخص نے نوید کو شیر افضل سے ملوایا تھا۔''

''آپ کہیں شاکر کی بات تو نہیں کر رہے......؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

''بالکل وہی۔'' میں نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اگر آپ شاکر پر تھوڑی محنت کریں تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! یہ میں کرلوں گا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اس کام کے لیے آپ مجھے دو دن دے دیں۔ پھر میں تفصیلی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

''دو نہیں، آپ چار دن لے لیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس دوران میں، میں اس معاملے کے دیگر قانونی پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہوں۔ میں نے آپ کو ایک لائن دے دی ہے۔ باقی کام آپ کا ہے۔''

''انشاء اللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا وکیل صاحب۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے مختلف ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔

آئندہ دو روز میں سلطان شاہ نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں جن کے مطابق، شیر افضل کورنگی کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی بڑی تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بیٹے کی عمر دس سال تھی اور ان کے نام علی الترتیب نازیہ اور فرحان تھے۔ شیر افضل کی بیوی شکیلہ ایک گھریلو عورت تھی اور اسے اپنے شوہر کی غیر نصابی سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی۔ عام لوگوں کی نظر میں اور بیوی کے علم کے مطابق وہ پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ اس کی باقاعدہ کوئی اسٹیٹ ایجنسی بھی نہیں تھی بلکہ وہ مختلف ایجنسیوں کے لیے کمیشن پر کام کرتا تھا۔ بہت ہی کم لوگوں کو یہ بات پتا تھی کہ شیر افضل نے پراپرٹی ایجنٹ والا نقاب لگا رکھا تھا اور اس نقاب کی اوٹ میں وہ لوگوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا کام کرتا تھا، البتہ اگر کوئی پراپرٹی کے حوالے سے کام آ جاتا تھا تو وہ اسے بھی ہینڈل کر لیتا تھا لیکن اس کا اصل دھندا یہی تھا یعنی وہ لوگوں کو ویزا دلانے کا کام کرتا تھا۔ جو افراد ملک سے باہر جانے کے حوالے سے شیر افضل سے ملتے تھے ان میں سے کوئی بھی اس کی رہائش اور فیملی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے کلائنٹس سے گھر سے دور مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ملاقاتیں کرتا تھا۔ جیسا کہ نوید باری کی کہانی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سلطان شاہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ وہ پاکستان چوک میں واقع جس پرنٹنگ پریس کے لیے کام کرتا تھا ان کی ایک پارٹی ادھر کورنگی میں بھی تھی۔ سلطان شاہ نے اپنے تعلقات کو استعمال کر کے شیر افضل کے بارے میں اچھی خاصی معلومات اکٹھا کر لی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ ریکروٹنگ ایجنٹ والے کام میں شاکر بھی شیر افضل کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ بندہ چونکہ لانڈھی کے کسی بینک میں جاب کرتا تھا لہٰذا وزٹ ویزا کے حصول کے لیے جو بینک اسٹیٹ منٹ یا دیگر کسی ایسی ہی دستاویز کی ضرورت ہوتی، وہ شیر افضل شاکر کی مدد سے بنوالیا کرتا تھا۔ گویا دونوں کی ملی بھگت سے یہ کام چل رہا تھا۔ وہ دونوں اس بزنس میں کس حد تک کامیاب تھے اور انہوں نے آج تک کتنے افراد کو پاکستان سے باہر بھجوایا تھا...... یہ فی الحال میرا ٹاپک نہیں تھا۔ میرا تمام تر فوکس اس بات پر تھا کہ شیر افضل، میرے کلائنٹ نوید باری کے دو لاکھ روپے ہضم کیے بیٹھا تھا۔ اس نے جس کام کے لیے میرے موکل سے یہ رقم لی تھی وہ آٹھ دس ماہ میں ہو جانا چاہیے تھا لیکن دو سال گزر جانے کے باوجود بھی نوید باری کا کام نہیں ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ سلطان شاہ میرے اندازے سے زیادہ ہوشیار نکلا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ شیر افضل کا گھر دیکھ لیا تھا بلکہ ایڈریس پوچھنے کے بہانے وہ شیر افضل کی بیوی شکیلہ سے دو چار باتیں بھی کر آیا تھا۔

آئندہ دو روز میں، میں نے اس کیس کو تیار کر لیا اور ابتدائی مرحلے پر میں نے شیر افضل کے گھر کے ایڈریس پر رجسٹرڈ ڈاک سے ایک نوٹس بھجوا دیا۔ مذکورہ نوٹس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

میرے موکل نوید باری نے مجھے بتایا ہے کہ دو سال پہلے تم نے اس سے دو لاکھ روپے لیے تھے اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ آٹھ سے دس ماہ میں تم اسے ایمپلائی منٹ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ویزا پر آسٹریلیا بھجوادوگے۔ آٹھ دس ماہ تو رہے ایک طرف، اب اس معاملے کو لگ بھگ دو سال ہو گئے ہیں، اس کے باوجود بھی میرا مؤکل اپنے ذہن میں آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم کے خواب سجائے ابھی تک محمود آباد کے مین بازار میں کپڑے کی دکان چلا رہا ہے۔ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام ... رہے ہو۔ نوید باری یعنی میرے مؤکل نے اب یہ معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اسے آسٹریلیا یا کسی بھی ملک نہیں جانا۔ میں، نوید باری کے وکیل کی حیثیت سے اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ عرصہ سات یوم کے اندر میرے دفتر آ کر اس معاملے کو نمٹا دو اور معاملے کو نمٹانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں میرے مؤکل کے دو لاکھ روپے واپس کرنا ہیں۔ اگر تم نے اس نوٹس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور اسے ایک کاغذ کا فضول سا ٹکڑا سمجھ کر نظرانداز کر دیا تو پھر یہ معاملہ کورٹ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا، اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ یہ پہلا اور آخری نوٹس ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یا تو میرے دفتر آ کر شرافت سے میرے مؤکل کے دو لاکھ روپے واپس کر دو یا پھر قانونی چارہ جوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

اس نوٹس کی ترسیل کے چند روز بعد ایک شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا اور ایک لفافہ میرے سامنے پھینکتے ہوئے قدرے برہمی سے بولا۔ ''یہ آپ کا کارنامہ ہے؟''

مذکورہ لفافے پر نظر پڑتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ یہ وہی رجسٹرڈ ڈاک والا لفافہ تھا جو میں نے ویزا ایجنٹ شیر افضل کو بھیجا تھا، گویا شیر افضل اس وقت میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ انداز میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اضافہ کیا۔

''لگتا تو یہ میرے دفتر ہی کا ہے...... کیوں؟ کیا ہوا؟''

میرے سوالات نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ آپ ہی ہیں نا؟''

''جی بالکل، میں ہی ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا اور پوچھا۔ ''آپ کون؟''

''میرا نام شیر افضل ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ ''آپ نے کسی نوید باری کے حوالے سے مجھے یہ نوٹس بھیجا ہے جس میں دو لاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔''

''تو اس میں ایسے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے میرے مؤکل سے جس کام کے لیے دو لاکھ روپے لیے تھے وہ کام آپ نے کیا نہیں لہٰذا اصولی طور پر وہ رقم آپ نے میرے مؤکل کو واپس کرنا ہے اور یہ آپ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر استفسار کیا۔

''میرے مؤکل کے لیے آپ ''کسی نوید باری'' کے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ کیا میرا مؤکل آپ کے لیے اجنبی ہے؟''

''وہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی کل ہی اس سے ملا ہوں لیکن وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ پتا نہیں، اسے کیا ہو گیا ہے۔''

''اسے ہوش آ گیا ہے۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اب آپ کو اس سے کوئی بھی بات نہیں کرنا۔ میں نوید باری کا وکیل ہوں۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے، مجھ سے کہیں...... یہاں بھی اور...... عدالت میں بھی!''

''آپ مجھے عدالت کی دھمکی نہ دیں۔'' وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جو اس قسم کی باتوں سے ڈر جاؤں گا۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس نوٹس کا کوئی تحریری جواب دے دیں۔ بہ صورتِ دیگر عدالت میں ملاقات ہوگی۔''

''وکیل صاحب! میں یہاں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ میں نے نوید باری کے ساتھ کوئی دھوکا یا فراڈ نہیں کیا۔'' وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کے مؤکل سے جس کام کے پیسے لیے ہیں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ میرے پاس سارے ثبوت موجود ہیں۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

شیر افضل کی شخصیت متاثر کن تھی۔ وہ بہ ظاہر بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میرے بھیجے ہوئے نوٹس نے اسے خاصا مضطرب کر دیا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں، میں کس کا وکیل ہوں؟''

''ظاہر ہے، نوید باری کا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کریکٹ!'' میں نے کہا۔ ''میں واقعی نوید باری کا وکیل ہوں اسی لیے میں اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے چارہ جوئی کر رہا ہوں لہٰذا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ دو لاکھ تو آپ کو ہر صورت میں واپس کرنا ہوں گے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس سارے پروسس میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔" وہ ہوشیاری سے بولا۔

"میرے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت موجود ہے۔"

"آپ یہ تمام تر ثبوت سنبھال کر رکھیں۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہو سکتا ہے، عدالت میں آپ کے کسی کام آ جائیں۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔ "میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ نے میرے مؤکل سے جس مقصد کے لیے دو لاکھ روپے لیے تھے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکا۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ آسٹریلیا والے کام میں بعض رکاوٹیں کھڑی ہو گئی تھیں۔" وہ بتانے لگا۔ "اس لیے وہ چیپٹر کلوز ہو گیا لیکن اب میں اسے یورپ بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاءاللہ بہت جلد اس کا کام ہو جائے گا۔"

"میرے مؤکل کو یورپ، آسٹریلیا، افریقا، امریکا کہیں نہیں جانا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اسے ایشیا ہی میں رہنا ہے یعنی اپنے ملک پاکستان میں...... کراچی میں...... اس لیے آپ اس کے دو لاکھ روپے واپس کر دیں۔"

"جناب! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، میں نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں اچھا خاصا خرچہ کر چکا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اب اگر واقعی اسے کہیں نہیں جانا تو میں اسے بیس تیس ہزار واپس کر سکتا ہوں۔"

اس کی مکارانہ بلکہ ظالمانہ پیشکش کو سن کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی غرض سے کہا۔

"اس سلسلے میں، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی آفر کو نوید باری کے سامنے رکھوں گا۔ اگر وہ مان گیا تو پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے!"

"وہ آپ کا مؤکل ہے۔ آپ کی بات ضرور مان لے گا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"کبھی وہ آپ کا کلائنٹ ہوا کرتا تھا۔" میں نے ایک گہری چوٹ کی۔ "اور بلا سوچے سمجھے وہ آپ کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ آپ کو دو لاکھ روپے دینا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے!"

"چھوڑیں وکیل صاحب! گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔ "آپ بیس پچیس ہزار میں ہمارا راضی نامہ کروائیں۔ میں آپ کو بھی خوش کر دوں گا۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ......" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ یہ سیٹل منٹ کروا دیتے ہیں تو میں آپ کی خدمت شدمت بھی کر دوں گا۔ اگر نوید باری آپ کی فیس ادا کر سکتا ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں ہوں کہ آپ کو نظر انداز کر دوں۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اپنے انداز سے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ "میں کل نوید باری سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

"آپ نے صرف یہ بات نہیں کرنا بلکہ یہ کام کرنا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "مجھے امید ہے، وہ آپ کی تجویز کو رد نہیں کرے گا۔ آپ طریقے سلیقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا...... ان شاءاللہ!"

ہم لوگوں میں کچھ چیزیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ وہ ہماری عادت بن کر رہ گئی ہیں۔ آپ ایک لحاظ سے اسے فطرت ثانیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان شاءاللہ، ماشاءاللہ، بسم اللہ، الحمدللہ...... بہت اچھے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے تقدس میں اور وقار کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں مثبت اور تعمیری مقامات پر استعمال کیا جائے لیکن عموماً دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ ہم اچھے برے مقصد کی تفریق کے بغیر بے دھڑک ان مقدس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ شیر افضل میرے مؤکل کے دو لاکھ ہڑپ کیے بیٹھا تھا اور بیس پچیس ہزار میں اس معاملے کو سیٹل کرانے کے لیے اللہ کی رضا کا بھی ذکر کر رہا تھا......

"اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نوید باری کو آپ کی دی ہوئی آفر پر راضی کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔" میں نے شیر افضل کے اطمینان کی غرض سے کہہ دیا۔ "لیکن ایک ضروری کام آپ کو بھی کرنا ہے اور...... اسی وقت کرنا ہے!"

"کون سا ضروری کام وکیل صاحب؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی میز پر پڑے ہوئے لفافے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس نوٹس کا جواب چاہیے۔"

"اب اس کی کیا ضرورت ہے!" وہ چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ تو ہمارا تصفیہ کرانے جا رہے ہیں۔"

"بے شک! میری خواہش اور کوشش تو یہی ہے کہ آپ دونوں کے درمیان راضی نامہ ہو جائے لیکن فائلوں کا پیٹ بھرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "یہ میرے دفتری ریکارڈ کے لیے ہے کہ میں نے آپ کو ایک نوٹس بھیجا اور آپ نے اس کا جواب دے دیا۔"

"ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں...تو میں آپ کی بات

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مان لیتا ہوں۔" وہ رضامندی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے آپ پر بھروسا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا، جواب میں کیا لکھوں......!"

"اگر مجھ پر بھروسا کر رہے ہیں تو پھر سچ بولیں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "سچائی میں بڑی طاقت اور برکت ہوتی ہے۔"

"ہوں......!" وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"کوئی پرابلم ہے؟" میں نے اپنایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نن...... نہیں!" وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اس نوٹس کا جواب کیسے لکھوں گا۔ یہ نوٹس تو انگلش میں ہے۔ میں تھوڑی بہت انگلش پڑھ اور سمجھ تو لیتا ہوں لیکن اس زبان میں باقاعدہ تحریر نہیں کر سکتا۔"

"اوہ...... تو یہ مسئلہ ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "یہ تو معمولی سی بات ہے جناب۔ آپ کی آسانی کے لیے یہ کام میں کر دیتا ہوں۔ آپ بس دستخط کر دینا۔"

"بہت شکریہ وکیل صاحب۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔"

"یہ ٹھیک ہے شیر افضل صاحب کہ میں نوید باری کا وکیل ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اگر آپ لوگوں کے معاملے کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے جا رہا ہے تو میں اس کارِ خیر میں اتنا سا حصہ تو ڈال ہی سکتا ہوں۔"

"بس تو پھر بسم اللہ کریں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"اس کارِ خیر کا اجر آپ کو اللہ دے گا اور آپ کا محنتانہ میں دوں گا۔"

میں نے شیر افضل کی جانب سے اپنے نوٹس کے جواب کا ڈرافٹ تیار کر کے اس کے دستخط کروا لیے۔ دستخط کرانے سے پہلے میں نے اس کے اطمینان کی خاطر مذکورہ ڈرافٹ کا مضمون پڑھ کر اسے سنا دیا تھا جو سادہ الفاظ میں کچھ اس طرح تھا۔

وکیل صاحب! آپ کی جانب سے نوٹس موصول ہوا۔ یہ سچ ہے کہ دو سال پہلے میں نے آپ کے مؤکل نوید باری سے دو لاکھ روپے وصول کیے تھے جس کے بدلے میں عرصہ نو ماہ کے اندر میں نے نوید باری کو ورک ویزا پر آسٹریلیا بھجوانا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مقررہ مدت میں، میں اپنا وعدہ پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس ناکامی... کا سبب جو بھی رہا ہو بہرحال، اب پچھلے کچھ عرصے سے میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کے لیے کوشاں تھا لیکن اچانک اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی کوئی بدمزگی یا لڑائی جھگڑا نہیں چاہتا۔ آسٹریلیا والے پروسس پر میرے اچھے خاصے پیسے خرچ ہو گئے تھے۔ آپ اپنے مؤکل کو آفس میں بلا لیں۔ میں بھی آ جاتا ہوں۔ میں اپنا نقصان کاٹ کر باقی رقم نوید باری کے حوالے کر دوں گا۔ یہ تو اچھا ہے، ایک وکیل کی موجودگی میں قانونی طریقے سے ہمارے لین دین کا معاملہ نمٹ جائے گا۔

اس مضمون میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جس پر شیر افضل چیں بہ جبیں ہوتا۔ اس نے بے چون و چرا میرے تیار کیے ہوئے ڈرافٹ پر دستخط کر دیے۔ میں نے ہنرمندی یہ کی تھی کہ اس ڈرافٹ میں ان دو لاکھ روپوں کا تو واضح طور پر ذکر کر دیا تھا جو اس نے میرے مؤکل نوید باری سے وصول کیے تھے لیکن اس کے اخراجات والے اماؤنٹ کا کہیں تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ میری چال میں آ گیا اور تسلی بھرے انداز میں اس نے دستخط کر دیے تھے بلکہ بہ وقتِ رخصت وہ میرا صد درجہ شکریہ بھی ادا کر گیا تھا۔

میری کوشش تو یہی تھی کہ نوید باری کا کم سے کم نقصان ہو اور عدالتی بکھیڑوں میں پڑے بغیر ہی اس کا مسئلہ حل ہو جائے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لہٰذا مجبوراً انصاف کے حصول کے لیے ہمیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ شیر افضل کی میرے آفس میں آمد کے دو روز بعد میں نے ان دونوں فریقین کو تصفیے کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا لیکن شیر افضل نے معقول بات نہیں کی تھی۔ وہ خرچے کے نام پر دو لاکھ روپے میں سے اتنی رقم کاٹنا چاہتا تھا کہ باقی نوید باری کے حصے میں آنے والی رقم کو "خیرات" کا نام دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا لہٰذا ان کے بیچ معاملہ بن نہیں پایا تھا۔

شیر افضل نے جب تک نوید باری کو آسٹریلیا والے پروسس کے چکر میں الجھا رکھا تھا تو تھوڑے تھوڑے دنوں میں وہ اسے اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرتا رہتا تھا اور بعض کاغذات کی فوٹو کاپی بھی وہ اسے تھماتا رہتا تھا۔ اس کے... بہ قول یہ وہ کاغذات تھے جو آسٹریلیا کے مختلف محکموں سے اس کی خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ نوید باری نے وہ تمام کاغذات میرے حوالے کر دیے تھے۔ ان میں بعض بہت ہی اہم چیزیں بھی تھیں۔

ابتدائی دو پیشیاں مختلف عدالتی کارروائیوں میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گزر گئیں۔ جنوری کے وسط میں اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ اس کیس میں شیر افضل کی حیثیت ایک ملزم ایسی تھی جبکہ میں وکیل استغاثہ کا کردار ادا کر رہا تھا اور مجھے اپنے مؤکل نوید باری کو عدالت سے انصاف دلوانا تھا۔ شیر افضل نے اپنے ڈیفنس کے لیے ایک وکیل بھی کرلیا تھا۔

شیر افضل کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہوچکا تھا۔ میں جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔

''آپ کے نام کے دو حصے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''شیر اور افضل ...... اگر میں آپ کو کسی ایک نام سے پکارنا چاہوں تو ان میں سے کون سا حصہ استعمال کروں؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''آپ کو جو بھی اچھا لگے وہ استعمال کرلیں۔''

''اچھے تو دونوں ہی ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ''شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے اور افضل کا مطلب ہے فضیلت والا، اعلیٰ وارفع۔ اس نسبت سے آپ کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مالک ایک نفیس انسان ہونا چاہیے لیکن مجھے نہایت ہی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا کردار اس کے برعکس ہے۔ خیر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''شیر افضل صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہوگی؟''

''لگ بھگ سینتیس سال۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''آپ کو سن پینسٹھ کی جنگ تو یاد ہوگی؟''

''اچھی طرح یاد ہے جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس وقت میں کم وبیش سترہ سال کا تھا۔''

میں نے اس کی رگڑائی منجھائی کا پروسس شروع کرتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں کہا۔ ''ویری گڈ...... اس کا مطلب ہے، آپ انٹر میں ہوں گے؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کالج میں تعلیم حاصل نہیں کرسکا۔''

''میٹرک تو یقیناً آپ نے کر رکھا ہوگا؟''

''نہیں!'' اس نے ایک بار پھر سر کو منفی جنبش دی۔ ''میں مڈل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔''

''اس کے باوجود بھی آپ نے جس کام میں ہاتھ پاؤں اور سر ڈال رکھا ہے وہاں تو سارے کا سارا کام ہی انگلش کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بہت ہی باکمال انسان ہیں کیونکہ یہ کام آپ خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔''

وہ میرے طنز کو سمجھ نہیں پایا اور عام سے لہجے میں بولا۔ ''بس جی، اللہ چلا رہا ہے۔''

''آپ کا آفس کس جگہ پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی آفس نہیں ہے۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''پھر کام کیسے چل رہا ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ اپنے کلائنٹس کو کیسے ڈیل کرتے ہیں؟''

''میں اپنے کلائنٹس سے مختلف ہوٹلوں میں ملاقات کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''ساری بات چیت وہیں پر ہوتی ہے۔''

''ملک سے باہر جانے والے افراد کی آپ تک رسائی کس طرح ہوتی ہے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا اس سلسلے میں بیچ کا کوئی آدمی آپ کی مارکیٹنگ کرتا ہے؟''

''نہیں!'' وہ قطعی انداز میں بولا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر؟''

''دراصل، میں نے بہت سے لوگوں کو بیرون ملک بھجوایا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری ایک ساکھ بنی ہوئی ہے۔ ایک سے دو اور دو سے تین، اسی طرح میرے کام کی شہرت آگے بڑھتی ہے اور مجھے کلائنٹس ملتے رہتے ہیں۔''

''آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے جن لوگوں کو بیرونِ ملک بھجوایا ہے وہی لوگ آپ کی پبلسٹی کرتے ہیں۔'' میں نے اسے اچھی طرح باندھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کسی نہ کسی کو آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ لوگ ملک سے باہر جانے کے خواہش مند افراد کو بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے بھی دولت کمانا ہے تو وہ آپ سے رابطہ کریں۔ آپ اس شعبے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔''

''جی، بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا کام ہی دراصل میرا تعارف ہے۔''

''ماشاءاللہ! اس سلسلے میں آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔'' میں نے اسے کھمبے پر چڑھاتے ہوئے کہا پھر عدالت میں موجود اپنے مؤکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''جی، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ شکایتی نظر سے نوید باری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی کی مہربانی سے تو آج میں ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ کسی نے سچ کہا ہے...... بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔ جس پر احسان کرو، وہی ڈنک مارتا ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''غالباً آپ میرے مؤکل پر اپنے کسی احسان کا ذکر کر رہے ہیں......!'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے وکیل صاحب۔'' وہ شکوہ بھرے انداز میں بولا۔ ''مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آپ جیسا تجربہ کار وکیل بھی اس احسان فراموش شخص کی باتوں میں آ گیا اور مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا......!''

''میرے مؤکل پر آپ کے احسانات اور میری ناسمجھی پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ نے میرے مؤکل کے کسی دوست یا رشتے دار کو بیرونِ ملک بھجوایا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''پھر میرے مؤکل کو آپ کے پاس کس نے بھیجا تھا؟''

وہ متذبذب انداز میں وکیلِ صفائی کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیلِ صفائی فوراً اپنے مؤکل کی مدد کو لپکا۔ وہ قدرے تیز آواز میں بولا۔

''آبجیکشن یور آنر۔ یہ کوئی اصول نہیں کہ کوئی کسی کے توسط ہی سے میرے مؤکل تک پہنچے۔ بعض لوگ اپنی ضرورت کے تحت ڈائریکٹ رابطہ بھی کر سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نوید باری بیرون ملک جا کر روزی کمانا چاہتا تھا اور وہ اسی سلسلے میں میرے مؤکل سے ملا تھا۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیلِ صفائی کے اعتراض کے جواب میں کہا۔ ''میں نے جس اصول کے تحت ملزم سے سوال کیا تھا وہ خود ملزم ہی کا واضح کردہ ہے اور تھوڑی دیر پہلے ملزم نے معزز عدالت کے سامنے اپنا یہ اصول بیان کیا تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا مؤکل ڈائریکٹ ملزم یعنی آپ کے مؤکل سے نہیں ملا تھا......''

''پھر......!'' وکیلِ صفائی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''ان کی ملاقات کس کے توسط سے ہوئی تھی؟''

''شاکر کے توسط سے۔'' میں نے وکیلِ مخالف کے سوال کا جواب دیا پھر اکیوزڈ باکس کے اندر کھڑے شیر افضل سے استفسار کیا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا جناب؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ انکار نہ کر سکا۔

''کیا یہ درست ہے کہ شاکر نامی یہ شخص اختر کالونی کا رہائشی ہے۔'' میں نے تصدیق طلب نظر سے شیر افضل کی طرف دیکھا۔ ''اور یہ بندہ لانڈھی میں واقع کسی بینک میں کام کرتا ہے؟''

''آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''شاکر کے نوید باری سے اچھے مراسم ہیں اور شاکر ہی نے نوید کو پہلی بار مجھ سے ملوایا تھا۔''

''اگر شاکر نے میرے مؤکل کو آپ سے ملوایا تھا تو شاکر کے اس عمل کو دوستانہ نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ تو سراسر دشمنی ہے اور آپ کہہ رہے ہو، ان دونوں کے بیچ اچھے مراسم ہیں......؟''

''اب آپ جو بھی سمجھ لیں......'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''میں آپ کو روک تو نہیں سکتا۔''

''میں جو سمجھ رہا ہوں اس کا تمہیں بھی بہ خوبی علم ہے۔'' میں نے شیر افضل کے لیے اپنے لہجے میں موجود احترام کو خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتائیں، آپ نے آج تک شاکر کے جاننے والے کتنے افراد کو بیرون ملک بھیجا ہے جو وہ آپ کی مارکیٹنگ کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بھی جواب دینے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں تمہاری بات کی تصدیق کے لیے ان افراد کے لواحقین کو عدالت میں بلا کر ان کی گواہی بھی دلواؤں گا......!''

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مجھے پریشانی نظر آئی۔ اس نے ایک لحہ سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''میں نے شاکر کے کسی عزیز یا دوست کو ملک سے باہر نہیں بھجوایا۔''

یہ سچ اس نے مجھ سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بولا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کی جان کہاں چھوڑنے والا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاکر تمہارا بزنس پارٹنر ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بدکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اکیلے ہی یہ کام کرتا ہوں۔''

''پھر شاکر کس خوشی میں تمہارے لیے مرغے گھیرتا ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اس خدمت کے لیے تم شاکر کو کوئی کمیشن وغیرہ دیتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ''شاکر کبھی کبھار دوستی میں کسی کلائنٹ کو ریفر کر دیتا ہے۔''

''گویا شاکر سے تمہاری دوستی ہے؟''

''کہہ سکتے ہیں!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''کہہ سکتے ہیں وغیرہ عدالت میں نہیں چلتا۔ دوٹوک الفاظ میں جواب دو۔ شاکر تمہارا دوست ہے یا نہیں؟''

''جی......شاکر میرا دوست ہے۔'' اس نے تسلیم کر لیا۔

میں نے میز پر رکھی اپنی فائلوں کی جانب اشارہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے پچھلے دو سال میں میرے مؤکل کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں آسٹریلیا کے مختلف ڈیپارٹ منٹس سے جو بھی خط کتابت کی ہے اس کی اوریجنل فائل تمہارے پاس ہے جبکہ تم نے ان پیپرز کی جو فوٹو کاپیاں میرے مؤکل کی تسلی کے لیے اسے فراہم کی تھیں وہ سب میری فائلوں میں موجود ہیں۔ کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟''

''شک کی کوئی گنجائش نہیں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ فوٹو کاپیاں میں نے ہی اپنے کلائنٹ کو دی تھیں۔''

''یہ تمام تر خط کتابت انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمہاری تعلیم مڈل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ پھر تم انگریزی میں کس طرح مراسلہ نگاری کر لیتے ہو؟''

''اس کام کے لیے میں اپنے پڑھے لکھے دوستوں کی مدد لیتا ہوں۔'' وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے بولا۔

''جیسے کہ شاکر جیسے پڑھے لکھے دوست؟'' میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں...... کبھی کبھار شاکر بھی اس حوالے سے میری مدد کر دیتا ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''کبھی کبھار پر فوکس کرتے ہوئے بتاؤ......'' میں نے شاطر ریکروٹنگ ایجنٹ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری فائلوں کے اندر نوید باری کے کیس کے حوالے سے جتنے بھی کاغذات رکھے ہیں کیا ان کی تیاری میں بھی شاکر نے تمہاری مدد کی تھی؟''

''جی مدد کی تھی۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاطر بہت ہی قابل بندہ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اتنا قابل کہ آسٹریلیا کے بعض ڈیپارٹمنٹ اس سے مدد کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں...... ہیں نا؟''

میرے اس سوال پر شیر افضل بہت زیادہ نروس ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ میرا ایک مقصد اسے ہراساں کرنا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرا دوسرا مقصد اسے جعل ساز ثابت کرنا تھا اور یہ مقصد آئندہ چند منٹ میں پورا ہونے والا تھا۔ میرا تیسرا اور آخری مقصد اسے جھوٹا اور فراڈی ثابت کرنا تھا اور یہ مقصد آئندہ کسی پیشی پر لازمی پورا ہو جانا تھا۔ میں نے اس مکار شخص کو قابو کرنے کے لیے ایسا زبردست ''جرح جال'' تیار کر رکھا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بچ نہیں سکتا تھا۔

میرے تیکھے سوال نے شیر افضل کو حد درجہ ہراساں کر دیا تھا۔ اس نے امداد طلب نظر سے اپنے وکیل کی جانب دیکھا۔ وکیلِ صفائی حقِ فیس ادا کرتے ہوئے کراری آواز میں گویا ہوا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' اس نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل استغاثہ غیر ضروری باتوں میں الجھا کر میرے مؤکل کو کنفیوژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میری باتیں نہ تو غیر ضروری ہیں اور نہ ہی غیر منطقی۔ یہ انتہائی ضروری، منطقی اور اس کیس سے متعلقہ ہیں۔ اگر ڈیفنس کونسلر مجھے میری جرح مکمل کرنے دیں تو میں معزز عدالت کے سامنے یہ ثابت کر دوں گا کہ میں نے جو کہا وہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

اقوالِ زریں

☆ کوئی بھی رشتہ بدن پر پہنا ہوا لباس نہیں ہوتا کہ جسے اتار کر پھینک دیا جائے اور دوسرا بدل لیا جائے۔

☆ زندگی چاہتے ہو تو موت پر یقین رکھو۔

☆ ناکامی کامیابی کا زینہ ہے کیونکہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔

☆ اینٹیں بکھری ہوئی ہوں تو وہ ملبے کا ڈھیر ہیں مگر جب باہم جڑ کر عمارت بن جائیں تو طاقت کا قلعہ ہیں جس میں قومیں پناہ لے سکتی ہیں۔

☆ بلند مقام ہمیشہ اپنا ظرف بلند کرنے سے ملتا ہے۔ نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے۔

معلومات

☆ سب سے زیادہ اخبارات امریکا میں شائع ہوتے ہیں۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا ہاکی اسٹیڈیم نیشنل اسٹیڈیم لاہور (پاکستان) ہے۔

☆ بدترین قحط 1959ء تا 1961ء کے دوران چین میں پڑا جس سے دو کروڑ پچانوے ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''پلیز پروسیڈ!''

''میرے سوال کا جواب دو!'' میں دوبارہ شیر افضل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''کون سا سوال؟''

''تمہارے دوست شاکر کی قابلیت کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا اس حوالے سے تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں مانتا ہوں کہ شاکر ایک قابل انسان ہے۔''

''اتنا قابل کہ آسٹریلیا کے مختلف اہم سرکاری اداروں میں اس کی بہت مانگ ہے؟'' میں نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ اپنی پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ آپ بار بار آسٹریلیا کے اداروں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟''

''وہ اس لیے کہ تم نے میرے کلائنٹ نوید باری کے آسٹریلین ورک ویزا کے لیے وہاں مختلف اداروں سے خط کتابت کی تھی جس کا ثبوت میری فائلوں کے اندر موجود ہے۔'' میں نے شیر افضل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور تم نے تھوڑی دیر پہلے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اس کام میں گاہے بہ گاہے شاکر نے تمہاری مدد کی تھی!''

''یہ ٹھیک ہے، شاکر نامی کسی شخص نے میرے مؤکل کی علمی معاونت کی ہوگی۔'' وکیل صفائی نے شیر افضل کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ شاکر کا آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے جو تعلق جوڑنا چاہ رہے ہیں اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں میرے فاضل دوست......'' میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''کہ آپ کا مؤکل ایک دھوکے باز شخص ہے۔ وہ میرے مؤکل کے دو لاکھ روپے کھائے بیٹھا ہے اور اس فراڈ بزنس میں شاکر آپ کے مؤکل کا پارٹنر ہے۔''

''تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاکر اور شیر افضل مختلف آسٹریلین ڈیپارٹمنٹس کے ساتھ مل کر یہ مذموم کام کر رہے ہیں!'' وکیل صفائی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ویری فنی......!''

''یہ ویری فنی ہے یا ہنی ہے، میں اسے ڈنکے کی چوٹ پر ثابت کر سکتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے!''

میری بات پتا نہیں، وکیل صفائی کی سمجھ میں آئی کہ نہیں، وہ بڑے جوش سے پوچھ بیٹھا۔ ''آپ یہ کس طرح ثابت کریں گے کہ میرا مؤکل اور اس کا دوست شاکر کسی آسٹریلین ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں؟''

''حضور! میری کیا مجال کہ میں کچھ ثابت کروں......'' میں نے وکیل صفائی کے چٹکی لی۔

''لیکن ابھی تو آپ نے ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''حضرت! آپ نے یہ تو سن رکھا ہوگا...... دعویٰ جھوٹا، قبضہ سچا!'' میں نے سوالیہ نظر سے وکیلِ مخالف کی جانب دیکھا۔

''جی سن رکھا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تو اب آپ یہ فرما رہے ہیں کہ آپ نے جھوٹا دعویٰ کیا تھا؟''

''نہیں!'' میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت عدالت میں میرا دعویٰ اور آپ کے مؤکل کا قبضہ یعنی دونوں چیزیں موجود ہیں۔ میں اپنے دعوے کو آپ کے مؤکل کے قبضے کی مدد سے اس طرح ثابت کر دکھاؤں گا کہ میرا دعویٰ سچا اور آپ کے مؤکل کا قبضہ جھوٹا ہو جائے گا......!''

وکیل استغاثہ نے بے بسی سے سر جھٹکا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! میرے فاضل دوست اپنی لچھے دار باتوں سے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے جو معما پیش کیا ہے اس کا حل کیا ہے؟''

''یور آنر!'' میں نے روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ذمے داری کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ''ملزم شیر افضل معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آسٹریلیا کے مختلف اداروں سے خط کتابت کے سلسلے میں اس نے اپنے دوست شاکر سے مدد لی تھی کیونکہ ملزم خود نہ تو انگریزی کی ڈرافٹنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی یہ کسی ایمبیسی یا اسی طرح کے کسی ادارے کی طرف سے بھیجے جانے والے کسی ڈاکیومنٹ کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''جناب عالی! آسٹریلیا کی آفیشل لینگویج انگلش ہی ہے تاہم آسٹریلین انگلش، امریکن انگلش اور برطانوی انگلش سے قدرے مختلف ہے اور ہمارے ہاں پاکستان میں جو انگلش ڈرافٹنگ کی جاتی ہے اسے آپ امریکن اور برطانوی انگلش کا ملغوبا کہہ سکتے ہیں اور ہماری مقامی انگلش، آسٹریلین انگلش کے مقابلے میں لب و لہجے، گرامر اور الفاظ کے چناؤ، ان کی نشست و برخاست کے اعتبار سے کافی مختلف ہے۔ مطلب، اگر ایک ہی مضمون کو مقامی اور آسٹریلین انگلش میں ڈرافٹ کیا جائے تو اس میں انیس بیس نہیں بلکہ پندرہ بیس کا فرق واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ......''

میں نے ایک بار پھر مختصر سا توقف کر کے فاتحانہ انداز میں وکیل صفائی کی جانب دیکھا پھر دوبارہ کرسیِ انصاف پر براجمان شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں معزز عدالت کے علم میں ٹھوس ثبوت کے ساتھ یہ حقیقت لانا چاہتا ہوں کہ ملزم شیر افضل ایک فراڈ اور جعل ساز شخص ہے اور دھوکا... دہی کے اس کاروبار میں شاکر بھی پوری طرح اس کے ساتھ شامل ہے۔'' پھر میں نے اپنی فائلوں میں سے وہ تمام کاغذات جو مختلف مواقع پر ویزا ایجنٹ شیر افضل نے میرے مؤکل کو بے وقوف بنانے کے لیے فراہم کیے تھے...... وہ نکال کر جج کے سامنے رکھ دیے اور نہایت ہی پراعتماد انداز میں کہا۔

''یہ رہا میری بات کا ٹھوس ثبوت۔ ان کاغذات میں پاکستان سے آسٹریلیا جانے والے اور آسٹریلیا سے پاکستان آنے والے تمام لیٹرز شامل ہیں۔ یہ مراسلہ نگاری آسٹریلیا کے مختلف ذمے دار اداروں اور ملزم کے بیچ ہوئی تھی بہ الفاظِ دیگر آسٹریلیا اور شاکر کے درمیان کیونکہ ملزم تو اس معیار کی انگلش لکھنا، پڑھنا اور سمجھنا جانتا ہی نہیں۔ یہ کارنامہ سراسر شاکر کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ ان ڈاکیومنٹس کو دیکھ کر عدالت فوراً سے پیشتر اس نتیجے پر پہنچ جائے گی کہ پاکستان سے آسٹریلیا جانے والی کوئی ویزا اپلی کیشن ہو یا آسٹریلیا سے پاکستان آنے والا کوئی سرکاری آفیشل لیٹر...... سب کچھ ایک ہی فرمے میں تیار کیا گیا ہے، یہ سب ایک ہی منشی، ایک ہی کاتب کی تحریر ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر آسٹریلین لیٹر مقامی انگلش میں یعنی ایک دم پاکستانی انداز میں تحریر کیا گیا ہے اسی بنا پر تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ ملزم کے دوست شاکر کی قابلیت کا شہرہ چار دانگ پھیلا ہوا ہے، آسٹریلیا کے مختلف سرکاری ادارے انہی حضرت سے اپنی تمام اہم ڈرافٹنگ کرواتے ہیں۔''

میرے بات کرنے کے دوران میں جج نے ان تمام کاغذات کا جائزہ لیا تھا جو میں نے اپنی فائل میں سے نکال کر اس کی میز پر رکھے تھے۔ جج نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ ان تمام لیٹرز کا ڈکشن ایک جیسا ہے۔ لگتا ہے، ان سب کو ایک ہی سانچے میں تیار کیا گیا ہے۔''

''اور وہ سانچا ہے...... شاکر!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جو اپنے کمال فن سے کراچی میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے مختلف سرکاری اداروں کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ یہ ''عبقری'' ملزم شیر افضل کا دوست اور بزنس پارٹنر ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر شاکر کو عدالت میں حاضر کرنے کا بندوبست کرایا جائے۔ میں اس ''نادر روزگار'' شخص کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے وکیل صفائی کو ہدایت کی کہ اگلی پیشی پر وہ ملزم کے دوست شاکر کو عدالت میں پیش کرے۔ اس کے ساتھ ہی جج نے متعلقہ عدالتی عملے کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ کسی ماہر لسانیات کی مدد سے ان کاغذات کی جانچ پڑتال کرائیں تاکہ اس بات کا حتمی ثبوت ہاتھ لگ جائے کہ ملزم نے اپنے دوست شاکر کے توسط سے جعلی دستاویزات تیار کروا کر میرے مؤکل نوید باری کو بے وقوف بنایا تھا اور اس کی سادگی و معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو لاکھ روپے ہتھیا لیے تھے۔ جج میرے اٹھائے ہوئے نکتے کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو نوید باری نے مجھ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔''

''یہ تو ابتدا ہے نوید صاحب۔'' میں نے اس کے ساتھ برآمدے سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!''

''شیر افضل تو آپ کے سامنے بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔'' وہ پرمسرت آواز میں بولا۔ ''اس سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وکیل صفائی بار بار اسے سہارا دے رہا تھا۔''

''انسان وکیل اسی لیے تو کرتا ہے کہ وہ اسے سنبھالا دے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا میں نے آپ کو سہارا نہیں دے رکھا؟''

''بے شک دے رکھا ہے۔'' وہ بڑے توانا لہجے میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بولا۔ ''مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ مجھے میرا حق دلوا کر ہی رہیں گے۔''

''حق حاصل کرنے کے لیے آواز بلند کرنا پڑتی ہے نوید صاحب!'' میں نے پارکنگ لاٹ کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو ''آوازِ حق'' کہلاتی ہے۔ آپ نے میرے توسط سے اس عدالت کے پلیٹ فارم پر یہ آواز بلند کردی ہے۔ آگے اللہ سب ٹھیک کردے گا اور جہاں تک شیر افضل کے بھیگی بلی بننے کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو آپ تماشا دیکھتے جائیں۔ بہت جلد وہ آپ کو ایک مریل چوہے کے روپ میں نظر آئے گا۔ شیر افضل جیسے فراڈ لوگ صرف انہی افراد کو دبا سکتے ہیں جو ان کے گیم سے واقف نہیں ہوتے۔ آپ جیسے معصوم اور سادہ لوح بیرون ملک جاکر زیادہ سے زیادہ کمانے کے لالچ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی ایسے لوگوں کے حوالے کردیتے ہیں۔''

''مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس اور ندامت ہے وکیل صاحب۔'' وہ پشیمانی بھرے انداز میں بولا۔ ''آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔''

''صرف افسوس، ندامت اور شرمندگی سے کچھ نہیں ہوتا نوید صاحب۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انسان کو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایک ہی تجربے نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔''

''آپ نے شاکر کو بہت زیادہ اچھالا ہے۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''ابھی تو میں نے محض شاکر کا تعارف پیش کیا ہے نوید صاحب!'' میں نے پارکنگ لاٹ کے نزدیک رکتے ہوئے کہا۔ ''آپ دیکھیے گا، اگلی پیشی پر میں عملاً اسے وٹنس باکس میں کس طرح اچھالتا ہوں۔ شاکر کو بھی اور شیر افضل کے وکیل کو بھی۔ میرے پاس شاکر اور شیر افضل کو زیر کرنے کا اتنا زیادہ سامان موجود ہے کہ مخالف پارٹی کے کسی بھی فرد کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی لیکن......'' میں نے اس کے چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟''

''میں شاکر کی وجہ سے تھوڑا الجھا ہوا ہوں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ کی الجھن کی نوعیت کیا ہے؟''

''میری پریشانی کا سبب یہ ہے وکیل صاحب کہ شاکر سے آج تک میرے اچھے مراسم رہے ہیں۔'' وہ خاصے فکرمند انداز میں بولا۔ ''وہ کیا سوچے گا کہ میں اس کے خلاف کھڑا ہوگیا ہوں۔''

''تو پھر ایک کام کرتے ہیں......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور خاموش نظر سے نوید باری کو تکنے لگا۔

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کون سا کام وکیل صاحب؟''

''ہم اس کیس کو واپس لے لیتے ہیں۔'' میں نے اس کا ردعمل جانچنے کے لیے کہا۔ ''آپ اپنے دو لاکھ کو بھول جائیں۔ اس طرح آپ کے اور شاکر کے تعلقات کا بھرم قائم ودائم رہے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!''

''میں اپنے پیسوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تو میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہے؟'' وہ بدکے ہوئے انداز میں بولا۔

''تعلقات کی سلامتی کے لیے ایسی قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں!'' میں نے سنجیدہ چھیڑ چھاڑ کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے مراسم شاکر سے ہیں، شیر افضل سے نہیں وکیل صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور میں نے دو لاکھ روپے شیر افضل کو دیے ہیں۔ میں اپنے پیسے نہیں چھوڑ سکتا۔ شیر افضل نے مجھے دھوکا دیا ہے۔''

''یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ شاکر اور شیر افضل کو الگ الگ سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور لوگوں کو بیرون ملک بھجوانے والے فراڈ بزنس میں یہ ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں۔ شاکر اور شیر افضل کا ٹرائل ہوگا تو آپ کی ڈوبی ہوئی رقم بازیاب ہوسکے گی۔ آپ شاکر سے اپنے مراسم کو بچانے کے لیے سلطان شاہ کا شکریہ ادا کریں جس کے تعاون سے میں اس کیس کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور......'' میں چند سیکنڈ کے لیے تھما پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے مزید کہا۔

''......اور آپ کو اپنی وائف کا بھی بے حد شکرگزار ہونا چاہیے جس نے شیر افضل کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے کی شروعات کی۔ اگر اس روز صائمہ، سلطان شاہ کے ساتھ میرے دفتر نہ آتی اور مجھے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد مجھ سے قانونی چارہ جوئی کی درخواست نہ کرتی تو آپ ابھی تک شیر افضل کے چکر ہی میں پھنسے ہوتے اور عین ممکن تھا، آپ اپنی دکان کا سارا مال فروخت کر کے تیسرا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لاکھ بھی شیر افضل کے ہاتھ پر رکھ چکے ہوتے......!''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب!'' وہ ہتھیار پھینک کر ہینڈز اپ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔ آپ جو بھی کرنا چاہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''اسی میں آپ کی بھلائی اور آپ کی ڈوبی ہوئی دو لاکھ کی رقم کی بازیابی کا امکان ہے۔'' میں نے کہا۔ ''روشن امکان......''

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں اگلی پیشی پر توقع تو یہی کر رہا تھا کہ شاکر حاضر نہیں ہوگا کیونکہ میں نے گزشتہ پیشی پر اپنے سوالات سے شیر افضل کو اس بری طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا کہ اگر شاکر گواہی کے لیے عدالت کے کمرے میں قدم رکھتا تو پھر اس کی بچت کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن میرے اندازے کے برعکس وہ عدالت پہنچ گیا تھا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا تاہم میری ٹٹولتی ہوئی نگاہ نے اس کے چہرے پر کسی ایسے تاثر کو اجاگر نہیں کیا جس سے پتا چلتا کہ وہ پریشان یا حواس باختہ ہے۔

شاکر کی عمر لگ بھگ تیس سال ہو گی۔ وہ پستہ قامت اور دبلے پتلے جسم کا مالک ایک سنگل پسلی کا شخص تھا۔ شاکر نے خاصی صحت مند مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں بلکہ ان مونچھوں کے لیے ''پال رکھی تھیں'' کے الفاظ زیادہ موزوں اور مناسب تھے۔ ایک بات بلا مبالغہ کہوں گا کہ یہ کنگ سائز مونچھیں شاکر کے چہرے پر بھلی لگتی تھیں۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر شاکر کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اخلاقی اور قانونی طور پر میرے سوال کا بالکل درست جواب دینے کے پابند ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں وکیل صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اور مجھے اپنی اخلاقی و قانونی حیثیت کا بھی بہ خوبی اندازہ ہے۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے میں اس کا بالکل کھرا اور سچا جواب دوں گا لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''کیسی درخواست؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں بینک سے فرسٹ ہاف کی چھٹی لے کر آیا ہوں اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے سیدھا اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ ''سٹی کورٹ اور لانڈھی کے بیچ جتنی مسافت ہے اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے لہٰذا آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی پوچھ کر مجھے فارغ کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، عدالت آپ پر یہ مہربانی ضرور کرے گی۔'' میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر میں براہ راست سوالات پر آ گیا اور پوچھا۔ ''شاکر صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ کی رہائش اختر کالونی میں ہے اور اس کیس میں متاثرہ شخص یعنی میرے مؤکل نوید باری سے آپ کے دیرینہ مراسم ہیں اور آپ ہی نے نوید کو ملزم شیر افضل سے ملوایا تھا؟''

''آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

''آپ ملزم کو کب سے جانتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''کم وبیش تین سال سے۔''

''تین سال......!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر صفائی کے گواہ سے پوچھا۔ ''یعنی جب آپ نے ملزم کو نوید باری سے ملوایا اس سے ایک سال پہلے آپ کی ملزم سے شناسائی ہوئی تھی؟''

''جی بالکل!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اس شناسائی کا سبب کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسا کہ آپ کو پتا ہے، میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شیر افضل ہمارے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے آیا تھا۔''

''کیا آپ کا بینک فراڈ ویزا ایجنٹس کا ایسے ہی بغیر کسی ویری فکیشن کے اکاؤنٹ کھول دیتا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب......''

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

''شیر افضل نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اسٹیٹ کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے یعنی وہ ایک پراپرٹی ایجنٹ ہے اور اس سلسلے میں اس نے بینک کو ضروری ثبوت بھی مہیا کیے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ شیر افضل ویزا وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بینک کو چونکہ اس سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے سائڈ بزنس پر کوئی توجہ نہیں دی۔"

"اور جیسے ہی آپ کو پتا چلا کہ ملزم ویزا دلوانے کا منافع بخش سائڈ بزنس کرتا ہے تو آپ فوراً اس کے پارٹنر بن گئے تاکہ خوب دولت کما سکیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہی بات ہے نا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں کبھی بھی شیر افضل کا پارٹنر نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔"

شاکر کے جواب نے مجھ سمیت حاضرین عدالت کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ جج بھی آنکھیں سکوڑ کر صفائی کے گواہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب سے بری حالت وکیل صفائی اور ملزم شیر افضل کی تھی۔ ان کا تو یہ معاملہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شاکر ڈیفنس کا وٹنس تھا لیکن اس کے جواب کی پن نے ڈیفنس ہی کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔ اس کا بیان ہمارے حق میں جاتا تھا یا نہیں البتہ ملزم کے خلاف ضرور جاتا تھا۔

"لیکن پچھلی پیشی پر ملزم عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ آپ اس "ویزا بزنس" میں اس کے پارٹنر ہیں۔ وہ تمام تر جعلی کاغذات آپ ہی کی مدد سے تیار کرواتا ہے۔" میں نے شاکر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ بیچ میں کچھ نہیں بولا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اگر شیر افضل نے ایسا کچھ کہا ہے تو سراسر جھوٹ بولا ہے۔ میں اس کے کسی قول و فعل کا ذمے دار نہیں ہوں۔ مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہاں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہی نوید باری کو شیر افضل سے ملوایا تھا۔ نوید کو ملک سے باہر جانے کا جنون چڑھا ہوا تھا اور میرے علم میں یہ بات تھی کہ شیر افضل اس قسم کے کام کرتا ہے۔ اگر شیر افضل نے نوید باری کے دو لاکھ روپے ہتھیا لیے ہیں اور اس کا کام نہیں کیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے نوید پر واضح کر دیا تھا کہ میں تمہیں ایک ایجنٹ سے ملوا تو رہا ہوں لیکن پیسے کا لین دین تم اپنی ذمے داری پر کرنا۔ نوید اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ آپ اس سے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں!"

"کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ عدالت کو ان معاملات کی خبر ہے۔" میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن ابھی جو آپ نے بھری عدالت میں ملزم سے اعلانِ لاتعلقی کیا ہے اگر بعد میں آپ کا یہ بیان غلط ثابت ہوا تو آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"میں نے معزز عدالت کے سامنے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "اس لیے مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے کہ مجھ پر کوئی آفت یا مصیبت نہیں آئے گی...... ان شاء اللہ!"

میں نے شاکر کو فارغ کر دیا۔ جب شاکر عدالت کے کمرے سے نکل گیا تو میں اکیوزڈ باکس کے نزدیک آ گیا، پھر شیر افضل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہارا بزنس پارٹنر تو تمہیں ہری جھنڈی دکھا گیا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟"

"آپ نے اس سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں اس پر گواہ کا بدکنا لازمی تھا۔" شیر افضل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے میری ذات کے حوالے سے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔" بات کے اختتام پر وہ ناگواری سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں نے کیا غلط بیانی کی ہے؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں۔" وکیل صفائی نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"جنابِ عالی! میرے مؤکل نے یہ ضرور تسلیم کیا ہے کہ شاکر نامی اس شخص سے اس کی دوستی ہے لیکن اس نے کسی بھی مرحلے پر یہ نہیں کہا کہ شاکر اس کا بزنس پارٹنر ہے یا یہ کہ وہ میرے مؤکل کے لیے مرغے گھیرتا ہے یا میرا مؤکل شاکر کو کسی قسم کا کمیشن دیتا ہے۔ میرے مؤکل نے یہ اقرار کیا ہے کہ انگلش میں عدم مہارت کے باعث وہ شاکر سے مدد لے لیا کرتا تھا تاہم اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ شاکر کے تعاون سے جعلی دستاویزات تیار کرتا تھا۔ یہ تمام تر باتیں جو میرے فاضل دوست نے صفائی کے گواہ شاکر کو بتائی ہیں یا وکیل موصوف نے گواہ سے جس قسم کے سوالات کیے ہیں، وہ سب وکیل استغاثہ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے اور ان فضول باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ دیٹس آل یور آنر۔"

وکیل صفائی اپنے مؤکل کے موقف کی وضاحت کر چکا تو جج نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! یور ٹرن۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"یور آنر! ہم شاکر کی گواہی کو چند لحات کے لیے ایک طرف رکھ کر بات کرتے ہیں۔" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "پچھلی پیشی پر معزز عدالت نے ملزم کی میرے مؤکل کو فراہم کی گئی مختلف دستاویزات کی فوٹو کاپیوں کو کسی ماہر لسانیات کے پاس "چیک اپ" کے لیے بھیجا تھا اور اس ٹیسٹ کی رپورٹ میرے موقف کی تصدیق کرتی ہے یعنی ملزم نے جن کاغذات کو آسٹریلیا کے مختلف ڈیپارٹمنٹس سے آئے ہوئے ظاہر کیا، اس اہم اور چونکا دینے والی رپورٹ کے مطابق، وہ تمام کے تمام ڈاکیومنٹس یہاں پاکستان میں اسی شخص نے تیار کیے ہیں جو پاکستان میں بیٹھ کر آسٹریلیا کے اہم ڈیپارٹمنٹس سے خط کتابت کا ڈراما اسٹیج کر رہا تھا۔ اس نوعیت کی انگلش ڈرافٹنگ ملزم کے بس کا کام نہیں۔ ملزم نے اس مقصد کے لیے شاکر کی مدد لی یا کسی ایکس، وائی، زیڈ کی...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پتے کی بات یہ ہے کہ ملزم نے جعل سازی کی ہے۔ جو کہ ایک سنگین نوعیت کا جرم ہے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی کہ ملزم نے فلاں ابن فلاں کے توسط سے جعلی دستاویزات تیار کر کے میرے سادہ دل اور معصوم مؤکل سے بیرونِ ملک بھیجنے کا جھانسا دے کر دو لاکھ روپے بٹور لیے ہیں۔ اس تنازع کو عدالت تک لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میرے مؤکل کو انصاف فراہم کیا جائے۔ اسی انصاف کے حصول کے لیے میں نے اپنے دفتر میں بھی کوشش کی تھی لیکن ملزم نے وہاں شرافت کا مظاہرہ نہیں کیا لہٰذا بہ حالتِ مجبوری میرے مؤکل کو عدالت کے دروازے پر دستک دینا پڑی۔ اگر عدالت مجھے چند منٹ کی مہلت دے تو میں اس کیس کے ملزم سے چند ایسے ٹیکنیکل سوالات کرنا چاہتا ہوں جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ میرے یہ سوالات ملزم کی دھوکا دہی کے تابوت میں آخری کیل بھی ثابت ہوں گے۔"

"پرمیشن گرانٹیڈ!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں اکیوزڈ باکس کی جانب بڑھ گیا اور ملزم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا تم اقرار کرتے ہو کہ تم نے جعلی دستاویزات کی جھلکیاں دکھلا کر میرے مؤکل سے دو لاکھ روپے ہتھیا لیے ہیں؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیلِ صفائی نے آغاز پر ہی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ 2018ء کے

شمارے کی دلربا جھلک

قفس شکن

سازش اور سود خوری کے دائرے سے نکل کے عالمی پس منظر میں بپا ہونے والے فتنوں کی ہوش رُبا داستان ...... زویا اعجاز کے قلم سے

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتی طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت...... عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

زمین و جائداد کے اسیر جو سزا کے مستحق قرار پائے...... سرورق کے خونی رنگ میں ڈوبی کہانی

رشتے ناتے انتہائی نازک ہوتے ہیں......

ٹوٹتے ہیں تو صرف کرچیاں رہ جاتی ہیں جو صرف زخمی کرتی ہیں...... سرورق کی نزاکت میں لپٹی کہانی

چینی نکتہ چینی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اعتراض جڑ دیا۔ ”میرے فاضل دوست ”جعلی دستاویزات“ اور ”ہتھیا لیے“ کے الفاظ استعمال کر کے میرے مؤکل کی انسلٹ کر رہے ہیں جبکہ میرے مؤکل نے واشگاف الفاظ میں عدالت کو یہ باور کرارکھا ہے کہ اس نے یہ دولا کھ روپے نوید باری کو آسٹریلیا بھجوانے کی مد میں لیے تھے لیکن نوید کی بدقسمتی کہ کام ہو نہیں سکا۔“

”میں نے آپ کی بات تحمل سے سن لی میرے فاضل دوست۔“ میں نے وکیل صفائی کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے مؤکل سے وہ ٹیکنیکل سوالات کرلوں جس کی اجازت معزز عدالت آپ کے سامنے مجھے دے چکی ہے؟“

میرا انداز ایسا سلگا دینے والا تھا کہ وکیل صفائی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ بڑی بددلی سے اس نے کہا۔ ”جی ضرور......“

میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ بہ قول آپ کے میں نے آپ کے مؤکل کی جو انسلٹ کی ہے، اپنی بات کے اختتام پر میں آپ کے مؤکل کی عزت افزائی کر کے یہ قرض مع سود اتار دوں گا۔“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

”تم نے میرے مؤکل سے جس کام کے لیے دولا کھ روپے بٹورے تھے وہ باوجود تمہاری لاکھ کوشش کے بھی ہو نہیں سکا۔“ میں نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم شیر افضل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اخلاقیات اس امر کا تقاضا نہیں کرتیں کہ اپنی ناکامی... کا اعتراف کرتے ہوئے بے حد معذرت کے ساتھ تم یہ دولا کھ روپے میرے مؤکل کو واپس کر دو؟“

”اسی مقصد کے لیے آپ نے اپنے آفس میں ایک میٹنگ رکھی تھی۔“ وہ اپنی عرق آلود پیشانی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے مؤکل کو کچھ رقم دینا چاہتا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس بندے نے میری بات نہیں مانی لہٰذا ہمارے بیچ تصفیہ نہیں ہوسکا تھا۔“

”ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں اور مجھے وہ سبب بھی معلوم ہے جس کی بنا پر تم دونوں کے درمیان سیٹل منٹ نہیں ہوسکا تھا۔“ میں نے تیز نظر سے شیر افضل کو گھورا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے مؤکل کو بیس ہزار روپے پر ٹرخا کر اس کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے ہضم کرنا چاہتے تھے جبکہ میرے مؤکل کا موقف اور میری تجویز یہ تھی کہ تم بیس ہزار روپے رکھ کر باقی کے ایک لاکھ اسی ہزار روپے میرے مؤکل کو واپس کر دو مگر تم اس کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔“

”میں گھاٹے کے اس سودے کے لیے کیوں کر راضی ہو جاتا؟“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

”تمہارا اس میں کیا نقصان ہو رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو کچھ اندازہ نہیں کہ اس کیس پر میرا کتنا خرچہ ہو چکا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ورک ویزا کا پروسس کوئی بچوں کا کھیل نہیں!“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ واقعی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ یہ تم جیسے گھاگ اور شاطر کا کھیل ہی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک آسٹریلین ایمپلائی منٹ ویزا کے پروسس کی بات ہے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پچھلے دو سال میں اس کام پر تم نے کتنا خرچ کیا ہوگا۔ میں تو بیس ہزار دلوا کر تمہیں مالا مال کرنا چاہتا تھا مگر میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔“

وہ بڑے جوش سے بولا۔ ”اگر آپ اس کام سے اتنی ہی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں تو بتائیں، میں نے کتنے پیسے خرچ کیے ہوں گے؟“

اس کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔ میں نے اسے ”ویل کم“ کہتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ”زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ سکہ پاکستان رائج الوقت!“

وہ اس طرح اچھلا جیسے کسی نے اسے گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا کر جھٹکا دیا ہو۔ اس کے ساتھ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”آسٹریلیا کے ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ میں صرف رجسٹریشن فیس ہی دو ہزار آسٹریلین ڈالرز ہے جو پاکستان کی کرنسی کے مطابق لگ بھگ اکیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک معمولی سا خرچہ ہے۔ اس کے علاوہ دس جگہ پر کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔“

”تم ایک زیرو کم کرلو تو میں آگے بات کرتا ہوں!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”آسٹریلین ورک ویزا کے لیے وہاں کے ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ کی رجسٹریشن فیس دو ہزار نہیں بلکہ دو سو ڈالرز ہے لہٰذا پاکستانی کرنسی میں یہ رقم اکیس ہزار روپے نہیں، دو ہزار ایک سو روپے بنتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تو ایک زیرو کم کرنے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا؟“

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وہ میرے بیان کردہ نکتے پر توجہ دیے بغیر بولا۔
''اور یہ جو آپ نے میرے تمام تر اخراجات کا اماؤنٹ محض ایک ہزار روپے بتایا ہے، کیا یہ کوئی مذاق ہے؟''
''کیا ہمارے بیچ میں بھی مذاق کا کوئی تعلق یا رشتہ رہا ہے؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے پوچھ لیا۔
''نہیں!'' بے ساختہ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''بس...... تو سمجھ لیں کہ میں نے آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اور اس ایک ہزار کی رقم میں ایسا کوئی بھی خرچہ شامل نہیں جس کا بلاواسطہ یا بالواسطہ میرے مؤکل کے آسٹریلیا جانے سے کوئی تعلق ہو۔''
وکیل صفائی کافی دیر سے ضبط کے دامن کو دبوچے کھڑا تھا۔ میرے تازہ ترین انکشاف پر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا، استعجابیہ مگر خاصی تیز آواز میں اس نے براہِ راست مجھ سے استفسار کیا۔
''پھر یہ ایک ہزار روپے کس چیز کا شاخسانہ ہے؟''
''آپ نے بہت ہی موزوں لفظ استعمال کیا ہے میرے فاضل دوست...... شاخسانہ۔'' میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہ تو کوئی افسانہ ہے اور نہ ہی آشیانہ بلکہ یہ سراسر شاخسانہ ہے ان اخراجات کا جو پچھلے دو سال میں آپ کے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے میرے مؤکل اور اس کیس کے مظلوم پر کیے ہیں اور ان اخراجات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات کی تکمیل کر دی۔
''کسی انگلش جاننے والے شخص سے ڈرافٹنگ کرانے کا معاوضہ، کسی ٹائپسٹ اینڈ ٹیلیکس آپریٹر کا محنتانہ اور مختلف چائے خانوں میں میرے مؤکل کی خاطر تواضع پر اٹھنے والی رقم...... آپ کے مؤکل نے پچھلے دو سال سے اس کے سوا اور کیا ہی کیا ہے میرے فاضل دوست؟''
''تو...... آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو برس میں میرے مؤکل نے آپ کے مؤکل کو آسٹریلیا بھجوانے کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا؟''
''بالکل ٹھیک کہا...... آئی مین اٹ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''کیا آپ اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کر سکتے ہیں؟'' وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔
''ہنڈریڈ اینڈ ون پرسنٹ!'' میں نے پورے تیقن سے کہا۔
''کریں ثابت......'' وہ شہ دلانے والے انداز میں بولا۔ ''ذرا پتا تو چلے کہ آپ نے پچھلے دو تین ماہ میں کون سا کنکریٹ نالج جمع کر لیا ہے......!''
قبل اس کے کہ میں اپنی جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھاتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔
جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈجارنڈ!''
آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اپنے مؤکل نوید باری کو دفتر بلایا اور اس کے ذمے ایک اہم کام لگانے کے بعد پوچھا۔
''کیا آپ یہ کام کر لیں گے؟''
''آپ بے فکر ہو جائیں وکیل صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''
''آپ نے اگلی پیشی کی تاریخ نوٹ کر لی ہے نا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''جی بالکل نوٹ کر لی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور ذہن نشین بھی کر لی ہے۔''
''میں نے جو کام آپ کے سپرد کیا ہے اسے آئندہ پیشی سے ایک دو روز پہلے کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔''
''ہو جائے گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔
میں نے چند ہدایات دینے کے بعد نوید باری کو رخصت کر دیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور اکیوزڈ باکس میں ویزا ایجنٹ شیر افضل کھڑا تھا۔ دوسرے اہم افراد بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ پچھلی پیشی پر میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے روئے سخن جج کی جانب کرتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! گزشتہ پیشی پر وقت کی کمی کے باعث میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں جرح کے سلسلے کو وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے رابطہ منقطع ہوا تھا۔ میرے فاضل دوست نے بارِ ثبوت میرے کندھوں پر لاد رکھا ہے۔ میں آج کی کارروائی میں یہ بوجھ ملزم کی مدد سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکوں گا اس طرح میرے فاضل دوست کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا اور میرے مؤکل کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لیے انصاف کا حصول بھی آخری اور یقینی مرحلے میں داخل ہوجائے گا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے وکیلِ صفائی کی جانب دیکھا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میرے فاضل دوست! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

وکیل صفائی نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں ملزم شیر افضل کی جانب متوجہ ہوگیا اور اس سے پوچھا۔''کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم نے میرے مؤکل سے دولاکھ روپے لے رکھے ہیں؟''

''نہیں، میں انکار نہیں کرسکتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''اور یہ بات میں نے آپ کے نوٹس کے جواب میں بھی لکھی تھی، مطلب یہ کہ میں نے نوید باری سے دولاکھ روپے لینے کا اقرار کیا تھا۔''

''مذکورہ جوابی نوٹس میں تو تم نے اپنی ناکامی...کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ......مقررہ مدت میں، میں اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا......تو اس صورت میں تمہیں میرے مؤکل کے دولاکھ روپے واپس نہیں کردینا چاہئیں؟''

''آپ جس نوٹس کے جواب کی بات کررہے ہیں، وہ میں نے نہیں، آپ نے ڈرافٹ کیا تھا۔'' وہ قدرے خفگی بھرے انداز میں بولا۔

''وہ اس لیے کہ تم انگلش لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میں نے اس جوابی نوٹس کا مضمون پڑھ کر تمہیں سنایا اور سمجھایا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد ہی تم نے اس پر دستخط کیے تھے۔ مذکورہ لیٹر اس وقت بھی میری ایک فائل میں موجود ہے۔ اگر تم میری بات کو جھٹلاؤ گے تو میں بطور ثبوت اسے عدالت میں پیش کردوں گا۔''

''مم...... میں آپ کی بات کو جھٹلا نہیں رہا۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔''میں تو آپ کو یہ بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ آسٹریلیا والے مشن میں ناکامی کے بعد میں نوید باری کو یورپ کے کسی ملک بھجوانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ اللہ کا بندہ اس معاملے کو عدالت میں لے آیا ہے۔''

''وہ اس لیے کہ اس اللہ کے بندے کی آنکھوں پر تم نے اپنی چالاکی کی جو پٹی باندھ کر اس سے دولاکھ روپے بٹور لیے تھے، وہ پٹی یکایک کھل گئی اور میرے مؤکل کو سب کچھ واضح نظر آنے لگا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔''کیا آسٹریلیا کے محاذ پر تمہیں ہمیشہ منہ کی کھانا پڑتی ہے یا ''مشن آسٹریلیا'' میں کبھی فتح بھی نصیب ہوئی ہے؟''

''یہ پہلا کیس ہے جس میں گڑبڑ ہوگئی۔'' وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔''ورنہ نوید باری سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

شیر افضل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے میرے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جارہا تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یعنی تم یہ بتانے کی کوشش کررہے ہو کہ نوید باری سے پہلے تم کافی لوگوں کو آسٹریلیا کے ویزا دلوا چکے ہو؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''میرا یہی مطلب تھا۔''

''میرے مؤکل سے پہلے تم نے کتنے افراد کو آسٹریلیا بھجوایا ہے؟'' میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

''بہت سے لوگوں کو......'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔''اسی نوعیت کے جعلی ڈاکیومنٹس پر تم نے لوگوں کو آسٹریلیا بھیجا ہے جو میرے مؤکل کے کیس میں فائلوں کا پیٹ بھر رہے ہیں؟''

''آپ کی نظر میں یہ ڈاکیومنٹس جعلی ہوں گے۔'' وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔''لیکن میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔''

''تمہارے اطمینان سے بات نہیں بنے گی، یہاں پر معزز عدالت کو مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے اور عدالت کے اطمینان کے لیے ٹھوس ثبوت چاہیے ہوتے ہیں۔'' میں نے کڑے تیوروں سے شیر افضل کو گھورا۔''اگر تم نے لاتعداد افراد کو آسٹریلیا بھیجا ہے تو معزز عدالت کو صرف پانچ خوش نصیب افراد کے نام بتاؤ جو تمہارے توسط سے آسٹریلیا جاچکے ہیں۔ فرضی نام گنواتے ہوئے ایک بات ذہن میں رکھنا کہ میں چور کو اس کے گھر تک پہنچا کر آتا ہوں۔ تم جن افراد کے نام دو گے، میں ان کے لواحقین کو گواہی کے لیے عدالت میں بھی بلوا سکتا ہوں!''

شیر افضل، شیر تھا اور نہ افضل۔ اس کی شخصیت اور لچھے دار باتوں کا سارا جادو خارجی حیثیت کا حامل تھا۔ اندر سے چونکہ وہ بالکل خالی تھا چنانچہ وہ میری دھمکی کے دباؤ میں آگیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس وقت مجھے کسی کا نام یاد نہیں آرہا......''

''تم جس دھندے سے لگے ہوئے ہو وہ سراسر غیر قانونی ہے۔'' میں نے لتاڑ پھٹکار کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔'' اسے ٹیکنیکل زبان میں ہیومن ٹریفکنگ HUMAN TRAFFICKING یعنی انسانوں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کی اسمگلنگ کہا جاتا ہے جس کی بڑی کڑی سزا ہے!''

''میں تمام کام ڈاکیومنٹس پر کرتا ہوں۔'' وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا کام غیر قانونی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، اب ہم تمہارے ڈاکیومنٹس کی صحت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔'' میں نے حددرجہ کڑوے لہجے میں کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا کے قوانین اور وہاں کے طور طریقوں کی بھی بات ہوگی۔ تم تیار ہونا؟''

آخری جملہ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود تاثرات سے جھلکتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت اکیوزڈ باکس میں سے نکل کر کمرائے عدالت کے دروازے کی سمت دوڑ لگا دے گا۔ گویا لوہا گرم ہو چکا تھا۔ اب مجھے دو چار کاری چوٹیں لگانا تھیں۔

''جی...... میں تیار ہوں۔'' وہ تھوک نگل کر نحیف سی آواز میں بولا۔

''کیا تم جانتے ہو، پاکستان میں بھی اوورسیز ایمپلائی منٹ ڈیپارٹمنٹ موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جو بیرون ملک جا کر کام کرنے کے خواہش مند پاکستانی افراد کے لیے ان کی تعلیمی اور فنی قابلیت کے مطابق پوری دنیا میں جاب سرچ کرتا ہے اور انہیں ورک ویزا کی سہولیات مہیا کرتا ہے؟''

''جی...... میں جانتا ہوں۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''کبھی تمہارا اس ڈیپارٹمنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''تم نے ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کیونکہ تم تو براہِ راست آسٹریلین ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ منسلک ہو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے پوچھا۔

''آئی ایل او کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''یہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ الجھن آمیز حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''آئی ایل او کا مطلب ہے...... انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی اس ادارے کا نام سنا ہے؟''

''ن...... نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''میں نے بتا دیا ہے اور وہ بھی بغیر فیس وصول کیے......'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب اسے یاد رکھنا۔ تمہارے بہت کام آئے گا کیونکہ اس کیس سے نمٹنے کے بعد تم نے کوئی شریفانہ کام کر کے رزقِ حلال تو کمانا نہیں ہے۔ آ جا کر تمہارے پاس یہی ایک کام ہے...... مرغے گھیرنا اور مال بنانا...... اگر دوبارہ کہیں پھنس گئے تو میری فراہم کردہ معلومات تمہارے کام آئیں گی......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آئی ایل او دنیا بھر کے ممالک کے ورک ویزا ڈیپارٹمنٹس کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط ہر ملک کے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کو ماننا پڑتے ہیں۔ آئی ایل او نے ایک ''لیبرا یگری منٹ'' نامی ڈاکیومنٹ تیار کر رکھا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کی طرح آسٹریلین ویزا بیورو کے پاس بھی موجود ہے۔ جب بھی آسٹریلین ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ ملازمت کے خواہش مند کسی شخص کے ساتھ خط کتابت شروع کرتا ہے تو پہلے ہی مرحلے پر فارم کے ساتھ اس لیبرا یگری منٹ کی ایک کاپی بھی متعلقہ شخص کو بھیجی جاتی ہے۔ تم نے میرے مؤکل کے کیس کے سلسلے میں جو کاغذات کا پلندا جمع کیا ہے اس میں مجھے مذکورہ ''لیبر ایگری منٹ'' کی کاپی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس غیر حاضری کی وضاحت کرو گے؟''

''ان لوگوں نے جو کچھ بھیجا وہ میرے پاس موجود ہے۔'' وہ بےبسی سے بولا۔ ''اگر وہ لیبرا یگری منٹ کی کاپی بھیجنا بھول گئے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے!''

''تمہارا کوئی قصور نہیں!'' میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ''یہ آسٹریلین ورک ویزا بیورو کی بھول ہے۔ انہوں نے آئی ایل او کے تیار کردہ ''لیبرا یگری منٹ'' کی کاپی تمہیں نہیں بھیجی۔ اس غلطی پر تو ممکن ہے آئی ایل او آسٹریلین ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کو معاف کر دے لیکن آسٹریلین گورنمنٹ مذکورہ ڈیپارٹمنٹ کی ایک سنگین غلطی کو کبھی درگزر نہیں کر سکتی۔ ورک ویزا ڈیپارٹمنٹ کا یہ قصور گردن زدنی ہے۔''

''کون سا قصور؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''یہی جو...... وہ...... آپ کے ساتھ...... پاکستانی اسٹائل کی...... انگلش میں خط کتابت کر رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر اس کی طبیعت صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''عدالت کے حکم پر تمہارے فراہم کردہ کاغذات کا جولسانی ٹیسٹ ہوا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہے اس کا نتیجہ سراسر تمہارے خلاف جاتا ہے۔"

"پپ پانی......" وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں شدید پیاس محسوس کررہا ہوں۔"

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ شیر افضل اندر سے بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی کیفیت سے دوچار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنی جرح کو اختتامی مرحلے میں داخل کرتے ہوئے پچکارنے والے انداز میں ملزم سے کہا۔

"تمہارے خشک حلق کو تر کرنے کا بندوبست کیا جائے گا لیکن پانی سے نہیں بلکہ دودھ سے اور وہ بھی آسٹریلین ریڈ کاؤ (سرخ گائے) کے دودھ سے۔"

وہ خوفزدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ "تم نے میرے مؤکل کو آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم میں ملازمت دلوانے کی بات کی تھی نا؟"

"جج...... جی......" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

"تمہارے فراہم کردہ کاغذات میں آسٹریلیا کے کسی ڈیری فارم کا نام دیکھنے کو نہیں ملتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "آسٹریلیا میں کم و بیش چھ ہزار چار سو ڈیری فارم ہیں جن میں لگ بھگ تینتالیس ہزار ملازمین کام کررہے ہیں۔ کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ میرے مؤکل کو تم کس ڈیری فارم میں جاب دلوا رہے تھے؟"

"اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا......" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"جیل جاکر تو تمہاری یادداشت واپس آہی جائے گی لیکن میں یہاں بھی تمہیں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "آسٹریلیا کے چھ بڑے حصوں میں ڈیری فارم قائم ہیں۔ تم میرے مؤکل کو جس ڈیری فارم میں ملازمت دلوا رہے تھے اس علاقے کا نام ہی بتادو؟"

شیر افضل کے پاس میرے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "تمہیں اس لیے کچھ بھی یاد نہیں آرہا کیونکہ تمہارا سارا کھیل جھوٹ اور دھوکا دہی پر مبنی ہے۔ درحقیقت تم آسٹریلیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے آسٹریلیا کے ان چھ علاقوں کا ذکر کیا ہے...... وکٹوریا، ساؤتھ آسٹریلیا، نیو ساؤتھ ویلز، کوئینز لینڈ، تسمانیا اور ویسٹرن آسٹریلیا۔ اب تم سے آخری سوال......" میں نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر فاتحانہ انداز میں وکیل صفائی کی طرف دیکھا پھر ملزم شیر افضل سے استفسار کیا۔

"آسٹریلیا کے دارالحکومت کا نام کیا ہے؟"

"سڈنی!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے کہا۔ "اگر تم ایمانداری سے کام کررہے ہوتے تو میرے اس سوال کا بالکل درست جواب دیتے۔"

وہ اپنے جواب کی ٹیڑھی دیوار کو پلستر کرتے ہوئے بولا۔ "پرتھ......!"

"تم ایک دھوکے باز... ہی نہیں بلکہ ایک نالائق ایجنٹ بھی ہو۔" میں نے کہا۔

"میلبورن۔" وہ سرخروئی کی کوشش میں مصروف رہا۔

"بالکل غلط!" میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے گھورا۔

وہ زچ ہوتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"پھر آپ ہی بتادیں!"

میں نے بتایا۔ "کینبرا۔"

"اوہ......" وہ مکاری سے بولا۔ "میں یہ بتانے ہی والا تھا۔"

"یہ بتانے کا موقع تو جاتا رہا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اب تم وہ بتادو......!"

"وہ کیا؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"کہ...... تم میرے مؤکل کے دو لاکھ کب واپس کررہے ہو؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس پروسس......" وہ اپنی بات پوری نہ کرسکا۔

"عدالت کو بہ خوبی اندازہ ہوچکا ہے کہ تم دھوکا دہی کے اس مذموم کاروبار کو کس طرح جھوٹ اور جعل سازی کی مدد سے چلارہے ہو۔" جج نے ناگوار نظر سے ملزم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "عدالتی کارروائی میں متعدد مقامات پر تمہاری غلط بیانیوں کا راز فاش ہوچکا ہے۔ اگر باقی کی زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو یہ ڈراما بازی بند کرو اور بیگ صاحب کے سوال کا سیدھا جواب دو۔"

جج کے ریمارکس نے کھلے عام یہ بتادیا تھا کہ عدالت نے میرے مؤکل کے حق میں فیصلہ صادر کردیا ہے۔ جج کی بات نے شیر افضل کی رہی سہی ہمت کی لٹیا بھی ڈبودی۔ وہ یکایک صدیوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ وہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں بولا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"سر! میری مالی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ میں یک مشت دولاکھ روپے ادا کرسکوں۔"

شیر افضل کے جواب نے یہ تو ثابت کر دیا کہ اس نے دولاکھ روپے واپس کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، گویا وہ اپنے جرم کا اقرار کرچکا تھا۔ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم نے جس طرح دو قسطوں میں نوید باری سے دو لاکھ روپے وصول کیے تھے اسی طرح دو قسطوں میں عرصہ سات یوم کے اندر یہ رقم اس کے حق دار کو واپس کردو۔"

"سر! مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں اس وقت بہت مجبور اور لاچار ہوں۔" شیر افضل رونی صورت بنا کر بولا۔ "میں پچھلے کچھ عرصے سے مالی بحران کا شکار ہوں۔ اگر عدالت اس رقم کی واپسی کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ کی قسط باندھ دے تو میں بے حد شکر گزار رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں!" میں نے شیر افضل کی جانب دیکھتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ "دولاکھ کی یہ رقم تم یک مشت ہی ادا کروگے اور وہ بھی ایک دو روز میں۔ اداکاری کر کے تم عدالت کی ہمدردی حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ تو شکر کرو کہ تم سے اصل زر ہی واپس لیا جارہا ہے ورنہ اگر اس کے اندر تمام تر اس کیس کے عدالتی اخراجات کو بھی شامل کرلیا جائے اور لگے ہاتھوں اس رقم پر دو سال کا مارک اپ بھی ایڈ کردیا جائے تو تخمینہ تین لاکھ تک جا پہنچے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے بہ آسانی میرے مؤکل کو دولاکھ روپے ادا کرسکنے کی پوزیشن میں ہو۔"

"بیگ صاحب!" جج نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کس طرح اتنے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں؟"

"جناب عالی! میرے پاس اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"کیا آپ وہ ٹھوس ثبوت عدالت کے علم میں لائیں گے؟" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"جی ضرور......" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا وہ ٹھوس ثبوت۔"

"اوہ......!" جج نے مذکورہ کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بینک اسٹیٹ منٹ ہے جس کا کلوزنگ بیلنس چار لاکھ تیرہ ہزار چھ سو چون روپے ہے۔"

میں نے نوید باری سے کہہ کر شاکر کے تعاون سے ملزم شیر افضل کی بینک اسٹیٹ منٹ نکلوالی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح کمپیوٹرائزڈ بینک اسٹیٹ منٹ نہیں ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت اسٹیٹ منٹ میں بہت سا کام ہینڈ میڈ بھی ہوا کرتا تھا۔

"میں نے اپنے ذرائع سے یہ بینک اسٹیٹ منٹ نکلوائی ہے۔" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ بینک سے اس اسٹیٹ منٹ کی ویری فیکیشن کرواسکتی ہے۔ اس دستاویز میں ظاہر ہونے والا بیلنس ایک روز پہلے کا ہے یعنی ملزم کی فنانشل پوزیشن ایسی ہے کہ آئندہ دو تین گھنٹے کے اندر اگر یہ چاہے تو میرے مؤکل کو یکمشت پے منٹ کرسکتا ہے۔"

جج نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "پے منٹ کی ادائی کے لیے دو دن کی مہلت کافی ہے؟"

جج اگر حکم دیتا کہ ابھی اور اسی وقت نوید باری کو فل پے منٹ کرو تو بھی شیر افضل کے پاس انکار کی گنجائش نہیں بچی تھی۔ جج کے سوال کے جواب میں ملزم نے مریل سی آواز میں کہا۔

"جی......ٹھیک ہے......"

☆☆☆

نوید باری کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کی ڈوبی ہوئی دولاکھ کی رقم قانونی چارہ جوئی کے معجزاتی اثرات سے بازیاب ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی جرح کی رسیوں کی مدد سے شیر افضل کو کمرائے عدالت میں اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا، اس کے پاس کوئی بھی راہِ فرار اور کوئی بھی جائے پناہ نہیں بچی تھی۔ اگر وہ احمق میری بات مان لیتا تو یقیناً فائدے میں رہتا۔ میں اسے عدالت کے باہر اپنے آفس میں بیس ہزار روپے دلوار ہا تھا۔ وہ اگر ایک لاکھ اسی ہزار روپے میرے مؤکل کو واپس کرنے کے لیے راضی ہوجاتا تو یہ معاملہ اسی روز میرے آفس ہی میں نمٹ جاتا لیکن شیر افضل کو توقع نہیں تھی کہ میں اسے عدالت میں اس بری طرح بے بس ولاچار کر کے رکھ دوں گا۔

انسان کی توقعات بعض اوقات اس کا کباڑا کر کے رکھ دیتی ہیں اور اگر انسان برائی کی راہ پر گامزن ہو تو پھر قدرت کے فیصلے اس کا ستیاناس نہیں بلکہ سوا ستیاناس مار دیتے ہیں۔ شیر افضل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

بہ ظاہر یہ کیس بہ خیر وخوبی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا۔ نوید باری کو اس کی رقم واپس مل گئی تھی اور اس نے کبھی بھی ملک سے باہر جا کر روزی کمانے سے توبہ کر لی تھی۔ میں بھی مطمئن ہو کر اپنے روزمرہ کے پیشہ ورانہ کاموں میں مصروف ہو گیا تھا لیکن لگ بھگ آٹھ ماہ کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کیس کو فائنل ٹچ لگا دیا۔

ایک شام میں حسب معمول اپنے آفس میں موجود تھا کہ شاکر مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہی شاکر جس کے نوید باری کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور جو لانڈھی کے کسی بینک میں کام کرتا تھا اور اسی شاکر کی گواہی نے شیر افضل اور وکیل صفائی کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وکیل صاحب! میں آپ کے پاس اپنے ایک ذاتی کام سے آیا ہوں۔''

''جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کافی دنوں سے میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔'' وہ قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ''آپ اسے میرے ضمیر کی خلش بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں۔''

''اس روز عدالت میں، میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموش نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ میں کافی عرصے تک شیر افضل کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ دیانتداری سے کام کر رہا ہے لہٰذا مختلف نوعیت کی ڈرافٹنگ میں، میں اس کی مدد کر دیا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے کچھ رقم بھی دے دیا کرتا تھا لیکن نوید باری کے کیس نے شیر افضل کے جھوٹ کی قلعی کھول کر اس کی دھوکا دہی کو میری نگاہ میں آشکار کر دیا۔ جب شیر افضل کا گھناؤنا کردار میرے سامنے کھلا تو اسی لمحے میرے اندر ایک آواز ابھری......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس آواز میں بڑی توانائی، بڑی تحریک تھی۔ کوئی میرے اندر بول رہا تھا اور مجھے تلقین کر رہا تھا کہ مجھے فوراً سے پیشتر دلی، دماغی، جسمانی اور روحانی طور پر شیر افضل سے دور، بہت دور ہو جانا چاہیے اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔

اس روز عدالت میں میری وہ گواہی اس تبدیلی کی شروعات تھی۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نہ کبھی شیر افضل سے ملا اور نہ ہی اس سے کوئی واسطہ رکھا۔ وہ اپنے کسی کام سے بینک میں آتا بھی تھا تو میں اس کے لیے اجنبی بن جاتا تھا۔ پھر کوشش کر کے میں نے اپنا تبادلہ دوسری برانچ میں کروا لیا۔ میں شیر افضل سے دور تو ہو گیا تھا لیکن میرے اندر سکون کا فقدان تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اطمینانِ قلب کے لیے کیا کروں۔ پھر کل بیٹھے بٹھائے میرے ذہن میں آیا مجھے اپنا یہ راز کسی سے شیئر کرنا چاہیے۔ مجھے آپ سے زیادہ معقول شخص اور کوئی دکھائی نہیں دیا تو آپ کے پاس آ گیا۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا۔'' اس کی بات مکمل ہوئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اندر کا غبار دھونے سے من ہلکا ہو جاتا ہے۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''بہت پُرسکون اور مطمئن۔'' اس نے جواب دیا۔

''گڈ......'' میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''مبارک ہو، آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔''

''مسئلہ تو حل ہو گیا......'' وہ قدرے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا......''

''کون سا سوال؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ آواز کیا چیز تھی؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میری دنیا بدل ڈالی؟''

''آپ اس آواز کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''ضرور...... اسی لیے تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔'' وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔

''وہ آوازِ حق تھی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''جب حق کسی انسان کو بدلنا چاہتا ہے تو وہ اس کے اندر اسی طور گونجتا ہے، پھر وہ بندہ حق شناس ہو جاتا ہے۔''

''اب میرا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''حق آپ کا بھلا کرے......!''

میں نے شاکر کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جتنی خاموشی سے وہ آیا تھا ویسے ہی چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خلش

نعمان اسحاق

غلط فیصلے ہمیشہ غلط نتائج کو جنم دیتے ہیں... اور یہ غلطی بغیر کسی تفریق کے کسی سے بھی ہوسکتی ہے جیسے کہ اس کی ماں... جو اس کی سہیلی بھی تھی، جانے کیوں اپنے دل پر لگے ہوئے زخم کی ٹیس کو جان نہ سکی اور نہ ہی اپنی بیٹی کے دل میں چھپی خلش کو سمجھ سکی کیونکہ... وہ غلطی پر تھی اور یہی بات وقت نے بھی سچ ثابت کردی۔

زندگی کے بجائے درد کو جینے والی ایک حسینہ کی دلدوز کتھا

گھر کی خوبصورتی دیدنی تھی۔ ایک نظر جو پڑتی تو مڑ کر دوسری بار دیکھنے کا دل کرتا۔ سیاہ آہنی گیٹ، سفید روغن سے نہائی دیواریں اور دیواروں سے جھانکتی پُرشکوہ عمارت جس کے لان میں عائشہ بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ مٹھیاں بھینچے منہ پھلائے وہ دنیا بھر سے ناراض لگتی۔

''امی! آپ ایسے غیر ذمے دار ملازم رکھتی کیوں ہیں۔'' وہ بیزار سے لہجے میں ماں سے کہہ رہی تھی۔

''صفدر ہرگز غیر ذمے دار نہیں۔ یہ تو اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ اسے اسپتال لے جانا تھا اس لیے چھٹی کر لی اور تم کتنے اور چکر کاٹو گی...... بیٹھ جاؤ۔ تھک جاؤ گی چندا۔'' رقیہ ساتھ کرسی پر بیٹھی تھیں اور اب محبت سے بیٹی کو بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔

''ہونہہ...... مجھے نہیں پتا۔ میرا آج کا پروگرام تو خراب ہوگیا نا۔ ادھر کالج میں میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ ہنوز منہ پھلائے کھڑی تھی۔

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

دراصل آج اس کے کالج میں میوزیکل شو تھا۔ ملک کا سب سے بڑا گلوکار گانے کے لیے آرہا تھا اور اسے کالج چھوڑنے کی ذمے داری ڈرائیور صفدر کی تھی۔ ارادہ تو توقیر صاحب کا تھا کہ وہ بیٹی کو کالج ڈراپ کردیں گے مگر فیکٹری میں کلائنٹ کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے انہیں جلدی نکلنا پڑا اور یوں عائشہ جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی۔ کالج جانے کا کوئی وسیلہ بنتا نظر نہ آتا تھا۔

''میں خود گاڑی ڈرائیو کر کے چلی جاتی ہوں۔''

اسے یکدم خیال آیا۔

''نہیں......'' رقیہ نے قطعی طور پر منع کیا۔

''کیا طے ہوا تھا کہ کالج سے فراغت سے پہلے تم ڈرائیو نہیں کرو گی اور تمہیں ڈرائیو کرنا آتا بھی کہاں ہے۔ پھر کہیں گاڑی ٹکرا دو گی۔''

''اوہ امی! اب ایسی بری ڈرائیور بھی نہیں ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اب کیا ضرورت کے تحت بھی ڈرائیو نہ کروں۔ میرا کالج جانا بے حد ضروری ہے۔ آپ جانتی ہیں میرا پسندیدہ سنگر آرہا ہے۔'' وہ ماں کو قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

مگر رقیہ کا سر نفی میں ہلتا رہا۔

تبھی ملازم کی پیروی میں ایک لڑکا لان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

بانکا، سجیلا۔ چہرے پر جوانی کے دھنک رنگ لیے، بال سلیقے سے جمائے۔

''السلام علیکم خالہ!'' رقیہ کے سامنے اس نے سر جھکایا۔

''وعلیکم السلام!'' رقیہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''کیسے ہو بیٹا؟'' انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو یاسر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

یاسر کو دیکھ کر لمحے بھر کو عائشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''سنو تم ڈرائیو کرلیتے ہو نا۔ مجھے پلیز کالج چھوڑ دو۔ ڈرائیور چھٹی پر ہے اور میرا کالج جانا بہت ضروری ہے۔'' وہ بھی یاسر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''عائشہ......!'' رقیہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ''اسے آرام سے سانس تو لینے دو۔ چائے تو پی لے۔''

''اوہ امی! وہ چائے پی کر آیا ہے۔ یاسر تم چائے تو نہیں پیو گے نا؟'' وہ اب یاسر سے مخاطب تھی۔

یاسر مسکرا دیا۔

''تو پھر چلیں۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''بائیک پر؟'' یاسر پوچھنے لگا۔ وہ خود بائیک پر آیا تھا۔

''اوہ نہیں۔ بائیک پر تو میری ساری لک خراب ہوجائے گی۔ تم پلیز کچھ تکلیف اٹھا لو۔ مجھے گاڑی میں ڈراپ کردو۔ واپسی پر اپنی بائیک لے لینا۔ تو پھر چلیں؟''

اس نے چابی یاسر کی طرف بڑھا دی۔ یاسر نے مسکرا کر چابی تھام لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''خالہ یہ امی نے پیسے بھجوائے ہیں۔'' اس نے شرٹ کی سامنے والی جیب سے پیسے نکال کر رقیہ کی طرف بڑھائے۔

''اوہ یہ خدیجہ بھی حد کرتی ہے۔ یہ معمولی سی تو رقم تھی۔ اب اس کی واپسی کی کیا تک تھی۔ اب تم سے نہ لوں گی تو ناراض ہو گی۔ بہنوں میں اتنے چھوٹے موٹے حساب کیا اچھے لگتے ہیں۔'' خفگی سے کہتے ہوئے انہوں نے رقم تھام لی۔

''چلو عائشہ کو چھوڑ آؤ۔ واپسی پر گپ شپ لگاتے ہیں۔'' رقیہ نے کہا تو یاسر اور عائشہ روانہ ہوگئے۔

''تم آج معمول سے زیادہ ہینڈسم لگ رہے ہو۔'' جب گاڑی مین گیٹ پار کررہی تھی تب عائشہ نے کہا تھا۔ لمحے بھر کو یاسر کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔ زمانہ تیز نہ تھا مگر عائشہ ماڈرن لڑکی تھی۔

''تعریف کے لیے شکریہ۔ تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے۔''

گاڑی مین روڈ پر آگئی تھی۔

''پڑھائی......'' عائشہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

''اب تمہیں کیا بتاؤں۔ پڑھائی کے نام پر کیا وبال پال لیا، کبھی کبھی سوچتی ہوں۔''

''میں ایسے نہیں سوچتا۔ تم خوش قسمت ہو کر شہر کے سب سے اچھے میڈیکل کالج سے ڈگری لے رہی ہو۔ ڈاکٹر صاحبہ۔''

''ڈاکٹر صاحبہ......'' عائشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اپنے لیے استعمال ہونے والے یہ لفظ ہمیشہ اسے مسکرانے پر مجبور کر دیتے۔ حالانکہ ابھی تو وہ میڈیکل اسٹوڈنٹ تھی۔ ڈاکٹر بننے کی منزل ابھی دور تھی۔

''آج تیار ہو کر جانے کی کوئی خاص وجہ۔ کیا کوئی تقریب ہے؟''

''ہاں۔ میوزیکل شو ہے۔ کیوں نا تم بھی میوزیکل شو میں شرکت کرو۔ اپنے ساتھ ایک مہمان لے جانے کی اجازت ہے۔''

''میں، نہیں، نہیں......''

''اوہو، نہ مت کرو۔''

اور آدھے گھنٹے بعد وہ میوزیکل شو میں ہجوم کا حصہ تھے اور عائشہ کی سہیلی عائشہ کے کان میں گھسے کہہ رہی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''تمہارا کزن تو کافی ہینڈسم ہے۔''

''آخر کزن کس کا ہے۔''

''صرف کزن ہی ہے یا پھر کوئی اور رشتہ بھی ہے؟''

''اور رشتہ مطلب؟ کیا کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے؟'' عائشہ لمحے بھر کو چونکی۔

''ہاں بھئی۔ دوست، منگیتر یا پھر......'' سہیلی نے لمحے بھر کو شوخ وقفہ لیا۔

''یا پھر پریمی!''

عائشہ کا دل لمحے بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے پلٹ کر یاسر کی طرف دیکھا جو سامنے اسٹیج پر گاتے گلوکار کو انہماک سے سن رہا تھا۔ یاسر کس قدر ہینڈسم ہے۔ جیسے دیو مالائی داستان کا یونانی دیوتا۔ اس کا پہلے دھیان کیوں نہ گیا۔

''کیا تم نے شو انجوائے کیا؟'' واپسی پر عائشہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، بہت خوبصورت شو تھا۔''

اس کے بعد وہ اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ سوچتی رہ گئی اور پھر ان کے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ قائم ہو گیا۔

دو مہینے بعد کی بات ہے۔

جب وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور اس ملاقات سے دونوں کے گھر والے ناواقف تھے۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گی؟'' یاسر عائشہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

عائشہ سٹ سی گئی۔ شرم کی لالی اس کے چہرے پر کچھ ایسے پھیلی کہ یاسر حیران رہ گیا۔

کیا وہ خود اعتماد لڑکی بھی شرما سکتی ہے؟

خاموشی کا وقفہ بڑھنے لگا۔

اور اس خاموشی کو عائشہ کی ہاں نے توڑا۔

''ہاں......'' یہ محض ہاں نہ تھی، ایک جلترنگ تھا جو بج اٹھا۔

ایک روشنی تھی جو ہر شے کو پُرنور کر گئی۔

☆☆☆

پارک کے احاطے میں ہر طرف ہریالی تھی۔ پتوں کا سبز رنگ آنکھوں کو بھلا محسوس ہوتا اور وہ دونوں پتھریلی روش پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے جاتے۔

روش پر چلتے چلتے وہ مینار تک چلے آئے۔ اب وہ مینار کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

''مجھے چھوڑ تو نہ دو گی؟'' یاسر نے یکدم پوچھا۔

عائشہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

''اگر تم نے آئندہ یہ سوال پوچھا تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔'' اس کی نگاہیں مینار پر جم گئیں۔ مینار جو آسمان کی وسعتوں کو چھوتا تھا۔ جو قیام پاکستان کی نشانی تھا۔

''اسی پارک میں کبھی مسلمان اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک عزم کیا تھا۔ خود سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بقا کے لیے ایک الگ ملک حاصل کریں گے......''

عائشہ کی آنکھیں مینار کی اونچائی پر تھیں۔

''آج ہم بھی اسی جگہ وعدہ کرتے ہیں کہ کبھی ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں گے۔ میرے ساتھ الفاظ دہراؤ۔'' ہاتھوں میں ہاتھ دیے، محبت کو زندگی کا عنوان دیے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' عائشہ کہتی۔

''میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔'' یاسر دہراتا۔

''میں تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔''

''میں بھی تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گا۔''

''ہر دکھ سکھ اکٹھے بانٹوں گی۔''

''ہر دکھ سکھ اکٹھے بانٹوں گا۔''

''کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گی۔''

''کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے عائشہ کے ہاتھ پر اپنی گرفت اور مضبوط کی۔

وہ دونوں مینار کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو تکے جاتے۔ فضا میں دھنک بکھر رہی تھی۔ دھنک رنگ ان کا احاطہ کیے جاتے۔

☆☆☆

ہر انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی کام میں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ کام جسے کرنا اچھا لگتا ہے تو یاسر کو بھی ایسے ہی ایک کام میں بے حد دلچسپی تھی اور وہ تھا کھانا بنانا۔

وہ اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ بی اے کر لیا تھا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ نہ تھا بلکہ وہ اب اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ ایک اچھا سا ہوٹل بنانا چاہتا تھا جہاں وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بنائے۔ لوگ اس کا بنا کھانا کھائیں اور دنیا بھر کے ذائقے بھول جائیں۔

وہ واقعی اتنا اچھا کک تھا۔ بریانی یا جو بھی ڈش بناتا تو گھر والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

''تجھے کیونکر یہ زنانہ شوق لگ گیا؟'' والد صاحب اکثر کہتے۔

وہ مسکرا دیتا۔ ''ابو! یہ تو ایک فن ہے اور فن میں صنف

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کی کوئی قید نہیں۔ میں اپنا ہوٹل کھولوں گا۔ میرے ہوٹل کے چرچے طول وعرض میں ہوں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' والد صاحب دل ہی دل میں کہتے اور پوچھتے۔ ''مگر بیٹا! ہوٹل کھولنے کے لیے بہت سارے پیسے چاہئیں۔ تیرے باپ کی کریانے کی دکان سے اتنا پیسا کہاں نکلے گا۔''

''ابو! اللہ مسبب الاسباب ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتا۔ اللہ اس کی قسمت کھولے گا...... اس کا نصیب چمکے گا، اسے پختہ یقین تھا۔

بسم اللہ کر کے والد صاحب نے کمیٹی سے آئے پیسے بیٹے کے ہاتھ پر رکھے اور اس نے ایک ڈھابا کھول لیا مگر اس کا ارادہ آہستہ آہستہ اس کام کو بڑھانے کا تھا۔ منزل دور سہی مگر ان شاء اللہ ایک دن آئے گا کہ اس کا ہوٹل شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے ہوگا اور شہر بھر میں مشہور ہوگا۔

ابھی تو لگے بندھے گاہک تھے۔ سلسلہ چل رہا تھا مگر آمدنی کم تھی لیکن اسے خود پر یقین تھا اور اچھے مستقبل کی بے انتہا امیدیں۔

اور دوسری طرف...... دوسری طرف عائشہ ایم بی بی ایس کر رہی تھی۔ میرٹ نہ بنا۔ والد صاحب کے پاس اتنے پیسے تھے کہ انہوں نے بیٹی کی خواہش کو مقدم جانا اور آج وہ سال سوم کی طالبہ تھی۔ دو بڑے بھائی تھے۔ بڑا کاروبار کے سلسلے میں یورپ سیٹل تھا۔ دوسرا انجینئر تھا۔ صوبائی دارالحکومت کے بجائے اسے مرکزی دارالحکومت میں اچھی جاب ملی، چنانچہ وہ بھی گھر سے دور رہتا۔

یاسر اور عائشہ جو خالہ زاد تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہ کہاں جانتے تھے کہ تمام خواب تعبیر کو نہیں پہنچتے۔

کل عائشہ کی سالگرہ تھی اور وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں تھی جو اپنی سالگرہ بھول جاتے ہیں' اپنی سالگرہ کا دن اسے ہمیشہ یاد رہتا۔ وہ رات گیارہ بجے سوئی تو اسے یاد تھا کہ جب وہ اٹھے گی تو بائیس سال کی ہوگی۔

ابھی آنکھوں میں کچی نیند تھی کہ اس کا دروازہ بجایا گیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس وقت اس کے دروازے پر کون دستک دے سکتا ہے؟ وہ اٹھی اور دروازہ کھولا۔

سر پر ٹوپی سجائے، ہاتھ میں غبارے لیے یاسر کھڑا تھا۔

''سالگرہ مبارک ہو۔'' یاسر اسے پورے بارہ بجے وش کرنے آیا تھا۔

''تھینک یو سو مچ یاسر! آئی ریئلی......'' لو یو کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ پیچھے رقیہ دونوں ہاتھ سینے پر جمائے کھڑی تھیں۔

''اچھا جلدی لاؤنج میں آؤ اور کیک کاٹو۔ تمہیں بروقت وش کرنے کے چکر میں خالہ کی نیند میں خلل ڈالا۔

رقیہ کا چہرہ بے تاثر تھا اور یوں ان دونوں نے جو اپنے تعلقات واحساسات اب تک گھر والوں سے مخفی رکھے تھے، اب مخفی نہ رہے۔

عائشہ نیچے آئی اور کیک کاٹا۔ یاسر ہی تالیاں بجاتا رہا۔ رقیہ ساری کارروائی دیکھتی رہیں۔ عائشہ نے کیک کاٹ کر کھلانے کے لیے ماں کے منہ کی طرف بڑھایا۔

''مجھے بھی کھلاؤ۔'' یاسر کہہ رہا تھا۔ یوں تو وہ پہلے بھی ایک ہی پلیٹ میں کھاتے رہے تھے مگر یوں ماں کے سامنے اسے بے تحاشا شرم آئی۔

''امی کیا سوچتی ہوں گی۔''

اور یاسر بھی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ سوچیں اس لیے اس نے رات کے اس پہر آنے کی پروا نہ کی۔

عائشہ نے کیک یاسر کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور کیک کھالیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا باتیں کرتا رہا۔

''خالہ! معذرت کہ آپ کو تنگ کیا مگر میں عیشو کو کچھ انوکھے انداز میں وش کرنا چاہتا تھا۔''

''عیشو......'' تو نک نیم بھی رکھا جا چکا ہے۔ وہ کہاں سوتی رہی تھیں۔

یاسر الوداعی کلمات کہتا چلا گیا۔ رقیہ صوفے پر خاموش بیٹھی رہیں۔

''یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟'' آخرکار انہوں نے پوچھ لیا۔

عائشہ کا دل زوروں سے دھڑکا۔ شاید یاسر کا طریقہ غلط تھا۔ انہیں پہلے والدین کو بتا دینا چاہیے تھا پھر یوں وش کرتا تو اور بات تھی۔

''چند ماہ سے......'' اس کی آواز مدھم تھی۔

''ٹھیک......'' رقیہ دھیمے سے سر ہلانے لگیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم سو جاؤ، صبح بات کرتے ہیں۔'' اس تمام وقت میں رقیہ کے ہونٹ پہلی بار مسکرائے مگر عائشہ کو یہ مسکراہٹ پراسرار لگی۔

رقیہ اس کا گال تھپتھپاتی ہوئی چلی گئیں اور وہ اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''امی کا بھانجا ہے۔ انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ اچھا خوب صورت لڑکا ہے۔ تھوڑا غریب ہے مگر کوشش تو کر رہا ہے۔ وہ وقت بھی آجائے گا جب شہر کی مرکزی شاہراہ کے کنارے اس کا ہوٹل ہوگا...... ''وہ خود سے باتیں کرتی سو گئی۔

اس بات سے بے خبر کہ کل ماں سے ہونے والی باتیں کیسے اس کی کایا پلٹ دیں گی۔

☆☆☆

''تم جانتی ہو نا تمہاری ماں یونیورسٹی سے گریجویٹ ہے۔'' ناشتے کی میز پر دونوں ماں بیٹی آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ توقیر آفس چلے گئے تھے۔ یوں تو اس نے بھی کالج جانا تھا مگر رقیہ نے روک لیا۔

''امی! میری سہیلیوں نے پارٹی ارینج کی ہوگی۔''

''میری باتیں زیادہ ضروری ہیں۔ اگر پھر بھی ضروری سمجھو تو لیٹ کالج چلی جانا۔''

''جی......''اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''ہمارے زمانے میں تعلیم عام نہ تھی اور میں خاندان کی واحد لڑکی تھی جو پڑھنے کے لیے یونیورسٹی گئی تھی۔'' رقیہ بتا رہی تھیں۔ ''شروع میں تو سب نے میرے پڑھنے کو برا جانا مگر تعلیم اپنی افادیت منوا لیتی ہے۔ میں نے بھی سب کو گرویدہ کر لیا۔'' وہ لمحے بھر کو رکیں۔

''یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم پہلے سے جانتی ہو مگر اب تمہیں ایک اور بات بتاتی ہوں جو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یونیورسٹی میں، میں نے بھی محبت کی تھی۔'' عائشہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

''شاہد میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور پسند محبت میں بدل گئی اور ہم نے تمام زندگی ایک ساتھ نبھانے کے عہد کیے اور پھر......'' وہ لمحے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

''پھر ڈگری مکمل ہوئی، رابطے ختم ہوئے اور تمہارے ابو کا میرے لیے رشتہ آیا۔ تمہاری دادی نے مجھے کسی تقریب میں دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ وہ ایک انڈسٹریلسٹ کی بیوی تھیں اور توقیر ایک انڈسٹریلسٹ کا بیٹا۔ بہت امیر کبیر فیملی تھی۔ ان کا رشتہ ہماری لوئر مڈل کلاس فیملی میں آنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ سب خوش تھے۔ مجھے جو پہلے ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا اب تو جیسے خوش قسمت ترین سمجھا جانے لگا۔ ہاں میں خوش قسمت ترین تھی......'' وہ رک گئیں اور گہری نظروں سے بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ عائشہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

''شاہد بہت غریب تھا۔ رہنے کے لیے گھر بھی نہ تھا۔ چھ بہن بھائی تھے۔ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ میں نے خوب سوچ بچار سے کام لیا اور تمہارے ابو کے لیے ہاں کہہ دی۔ شروع میں اپنا آپ چھوٹا لگا۔ بے وفا ہونا چھوٹی بات نہیں تھی مگر کرائے کے گھر میں زندگی گزارنا آسان نہیں ہوتا اور آج سوچتی ہوں تو خود کو مطمئن پاتی ہوں۔ اگر میں توقیر کے لیے ہاں نہ کہتی اور شاہد کا ہاتھ تھامتی تو شاید میرے کانوں کے جھمکوں میں ہیرے نہ دمک رہے ہوتے۔ اور شاید تم بھی ڈاکٹر نہ بن رہی ہوتیں۔'' رقیہ کا ایک ہاتھ اپنے کان کے جھمکے پر تھا۔ وہ اسے اپنی کہانی سنا رہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی مگر عائشہ کو اپنا وجود آندھی کی زد میں محسوس ہو رہا تھا۔

''یاسر اچھا لڑکا ہے۔ میرا بھانجا ہے۔ اس نسبت سے مجھے عزیز بھی ہے مگر اتنا عزیز نہیں کہ میں اپنی بیٹی اس سے بیاہ دوں۔ وہ گلی کے نکڑ پر ڈھابے میں بریانی بیچنے والا میری بیٹی کو اور میرے نواسوں کو کیا مستقبل دے گا۔'' رقیہ کے الفاظ تلخ تھے اور گرم بھی۔

عائشہ خاموش بیٹھی رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموش گزر گئے اور جب کہا تو اتنا ہی کہا۔

''کیا زندگی میں پیسا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟''

''نہیں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔'' رقیہ مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دے رہی تھیں۔ ''مگر چند امحبت بھی سب کچھ نہیں ہوتی۔ محبت کے بغیر گزارہ آسان ہے، پیسوں کے بغیر گزارہ مشکل۔ اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈنی چاہئیں۔ محبت کا کیا ہے۔ صرف ایک دفعہ نہیں ہوتی۔ اگر صرف ایک دفعہ ہوتی تو میں اور تمہارے ابو اتنی خوب صورت زندگی کیسے گزارتے۔''

عائشہ چپ چاپ ماں کو دیکھنے لگی۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

''جس موڑ پر تم کھڑی ہو، وہاں سے واپس لوٹ آؤ۔ تمہارے مقدر میں پھولوں کے راستے ہیں۔ کانٹوں کا سفر اپنے کے لیے منتخب مت کرو۔'' اب وہ بیٹی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں۔

''اب کالج جانا ہو تو صفدر سے کہہ دو، وہ چھوڑ آئے گا۔ تمہاری دوستوں نے پارٹی ارینج کی ہوگی۔'' رقیہ اس کا گال تھپتھپاتی ہوئی اٹھ گئیں اور وہ وہیں ناشتے کی میز پر بیٹھی رہ گئی۔

کالج جانا، برتھ ڈے پارٹی...... کچھ بھی یاد نہ رہا۔ یاد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہا تو بس یہ کہ پھولوں بھرے راستے مقدر میں ہوں تو اپنے لیے کانٹوں کا سفر منتخب نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

سلمان اس کا کلاس فیلو تھا۔ شہر کی مرکزی شاہراہ پر اس کے والد کا بہت بڑا اور بہت مشہور اسپتال تھا۔ لوگ دور دراز کے شہروں سے وہاں علاج کے لیے آتے۔

ایک دن سلمان نے اس سے کہا۔ ''میرے والدین آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''آپ کے والدین سے میرے لیے آپ کو مانگنے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''آپ کو اعتراض تو نہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں، مجھے اعتراض ہے۔'' اسے کہنا چاہیے تھا اور شاید وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔

اور سلمان کے ابو کا اسی شاہراہ پر تو اسپتال ہے جہاں یاسر اپنا ہوٹل کھولنا چاہتا تھا۔

سلمان کا رشتہ آیا۔ چھ مہینوں کے اندر رشتہ طے بھی ہوگیا۔

فائنل ائیر کے امتحانات کے بعد ابھی رزلٹ نہیں آیا تھا۔ ابھی اپنے ناموں کے ساتھ ڈاکٹر لگانے میں وقت تھا کہ وہ دونوں شادی کے حسین بندھن میں بندھ گئے۔

شادی پر اس نے سرخ فراک پہنی۔ سلمان کے سیاہ کوٹ سے جھانکتی ٹائی کا رنگ بھی سرخ تھا اور کاج میں اٹکے پھول کا بھی۔

سرخ نو بیاہتا جوڑے نے ایجاب و قبول کے مراحل طے کیے اور عائشہ دعاؤں کے سائے میں پھولوں سے سجی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر ایک عظیم الشان گھر سے دوسرے اس سے بھی زیادہ عظیم الشان گھر میں چلی آئی۔

اور یاسر گلی کے نکڑ پر کھڑا اپنے ڈھابے پر بریانی بیچتا رہا۔ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتا رہا۔

سچ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ محبت کرنے سے پہلے بھی دیکھ لے کہ اس کی جیب اس محبت کی متحمل ہے کہ نہیں۔

میں وعدہ کرتی ہوں۔
تم سے زندگی کی آخری سانس تک محبت کروں گی۔
ہر دکھ سکھ اکٹھے بانٹوں گی۔
کبھی تمہارا ہاتھ نہ چھوڑوں گی۔

☆☆☆

اور پھر نئی زندگی شروع ہوئی، وہ اور سلمان۔ اس کی خوبصورتی کے بارے میں اگر کوئی دو رائے نہ تھی تو یہی معاملہ سلمان کا تھا۔

وہ دیو مالائی داستان کا یونانی دیوتا محسوس ہوتا۔ بالکل یاسر جیسا اور وہ سکتے میں آجاتی کہ وہ ہر وقت سلمان کا یاسر کے ساتھ موازنہ کیوں کرتی رہتی ہے۔

اس دن کا آغاز معمول کی طرح ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو واش روم سے شاور کی آواز آرہی تھی۔

وہ نہا کر آیا اور قد آدم آئینے کے سامنے بال برش کرنے لگا۔

''یہ یاسر کون ہے؟'' قبل اس کے کہ وہ واش روم جاتی، سلمان نے پوچھ لیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

یاسر......

''یاسر چھوٹا سا لڑکا ہے۔ ہمارے گھر کا سودا سلف لاتا ہے۔''

''کیا صبح اٹھانے کی ذمے داری اسی کی ہے۔ پہلے بھی ایک رات میں نے نوٹ کیا اور کل رات بھی تم بار بار اس کا نام لے رہی تھیں۔''

''جی، جی۔ صبح مجھے اٹھاتا ہے۔'' وہ من من بھر کے قدم اٹھاتی واش روم میں چلی آئی۔

واش روم کا نل کھولا۔ سامنے آئینے میں عکس دیکھا۔ وہاں وہ نہ تھی، یاسر تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

''یوں مت کرو عائشہ...... میں تم سے پیار کرتا ہوں۔''

''میں شرمندہ ہوں۔'' وہ یاسر سے کہہ رہی تھی۔

''پارک میں مینار کے پاس تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کبھی میرا ہاتھ نہ چھوڑو گی۔ وفا کے تمام سلسلے میرے نام کرو گی۔'' وہ اسے یاد دلانا چاہ رہا تھا۔

''میں وعدے کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔''

وعدہ خلافی اور معذرت۔ یاسر بے یقینی سے اسے تکتا رہا۔ کیا صرف اتنی سی بات تھی کہ وعدہ خلافی اور معذرت کے الفاظ تلافی کردیں۔

''کیوں، آخر کیوں؟'' وہ مرد تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''مستقبل...... میں اچھا مستقبل چاہتی ہوں۔''

''میں تمہیں اچھا مستقبل دوں گا۔ آسائشوں بھری زندگی دوں گا۔''

''نہیں...... لفظوں کے محل رہائش کے قابل نہیں ہوتے۔'' آئینے میں عکس دھندلا گیا۔ اب اس کا اپنا عکس تھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اس نے نل پورا کھول دیا۔ پانی پوری رفتار سے بہنے لگا۔ وہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی اور بے تحاشا رونے لگی۔

''بس کردو اب۔ میرے خواب وخیال پر جب تم قابض ہو۔ اب بس کردو۔ میرے خواب وخیال میری ملکیت ٹھہراؤ۔ مزید ان میں مت آؤ۔'' روتے ہوئے وہ خود سے نہیں یاسر سے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

آج کی محفل خاص تھی اور اس خاص میں وہ دونوں مہمانِ خصوصی تھے۔ رات بھیگی بھیگی تھی۔ سیاہ رات میں سیاہ لباس میں ملبوس وہ حسن کی ملکہ تھی اور اس کا شوہر، جیون بھر کا ساتھی حسن کا دیوتا۔

کندھے سے کندھا ملائے وہ اسٹیج کے بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر مشہور گلوکارہ اپنی آواز کا فن جگا رہی تھی۔

عائشہ نے نظریں دوڑا کر چاروں طرف دیکھا۔

یہ محفلِ خاص اس کے لیے سجائی گئی تھی اور کیا رنگ تھے اس محفل کے۔ پھولوں کی آرائش سے لے کر نشست گاہوں تک۔ طعام کے اہتمام سے موسیقی کے سروں تک...... سب کچھ بے مثال تھا۔

اور اس کا سراپا، سیاہ لباس، بالوں میں اٹکے خوش رنگ پھول اور ہاتھ کے بریسلیٹ میں دمکتا ہیرا۔ سب کچھ مکمل۔

گلوکارہ نے گانا ختم کیا۔ تالیاں بجیں۔ سلمان کے دوستوں نے شور مچا دیا کہ اب وہ گائے۔ سلمان فنِ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ صرف سننا ہی نہیں گانا بھی اس کا مشغلہ تھا۔ اس لیے تو اکثر گاتا رہتا۔

دوستوں نے فرمائش کی تو وہ مسکراتا ہوا اسٹیج پر آگیا۔

''میں یہ گانا اپنی محبوب اپنی شریکِ حیات کے نام کرتا ہوں۔ جو میری زندگی میں بہار لے کر آئی۔ جس نے میری زندگی مکمل کی۔'' تالیاں گونج اٹھیں اور سب عائشہ کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

مگر عائشہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹھا اور حلق میں اٹک گیا اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گنگناتا ہوا سلمان خاموش ہوگیا۔ محفل لمحے بھر کو رک گئی۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

محفل کی سب سے معزز عورت یوں اچانک اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا ہوا تھا آخر؟

سلمان تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ سلمان اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''سویٹ ہارٹ! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''میرے سر میں درد ہے۔'' وہ روئے جاتی اور سلمان اسے اچنبھے سے دیکھے جاتا۔

☆☆☆

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ نیچے زمین کا موسم خوشگوار تھا اور شاید وہ اراضی زمین کا ٹکڑا نہیں تھی۔ خوش رنگ اور خوش گلو۔ عائشہ نے گھوم کر ہر طرف کا جائزہ لیا۔ یہ ایک باغ تھا۔ پھولوں بھرے پودے۔ پھلوں سے لدے درخت۔ ہوا کے جھونکے اور معطر فضا۔ کیا یہ جنت تھی؟

جنت نہیں تو جنت جیسی ضرور تھی۔

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی درخت سے کچھ توڑ کر کھائے اور یہی خواہش لیے وہ اپنے لیے پھل منتخب کرنے لگی۔

پہلے درخت پر سرخ اسٹرابیریز سجی تھیں۔ وہ اتنی سرخ تھیں کہ سرخ رنگ پسندیدہ ٹھہرے۔ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے سانس اندر اتاری۔ قبل اس کے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹرابیری توڑتی، دل میں خیال آیا کہ کچھ اور کھایا جائے۔ چنانچہ وہ اسٹرابیری کھانے کی خواہش پر قابو پاتے

حسین چہرہ

سیکریٹری نے اپنے باس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ''جناب! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے آئی ہیں۔''

''کیا وہ خوبصورت ہے؟'' باس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔ ''انتہائی خوبصورت اور دلکش۔''

''اچھا! اسے اندر بھیج دو۔'' باس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کرکے چلی گئی تو باس نے اپنے سیکریٹری کو طلب کیا۔ ''تم احمق ہو۔'' باس نے غصے سے کہا۔ ''اس بدصورت عورت میں تمہیں حسن کیسے نظر آیا؟''

''میں معذرت خواہ ہوں سر!'' سیکریٹری نے لجاجت سے کہا۔ ''اس نے نام نہیں بتایا تھا، میں سمجھا شاید وہ آپ کی بیوی ہے۔''

''وہ میری بیوی ہی تھی۔ اب جاؤ دفع ہو جاؤ۔'' باس دہاڑا۔

مرسلہ: حسین ریاض...... سرگودھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوئے آگے بڑھی۔
اگلے درخت پر آڑو سجے تھے مگر کچھ سوچ کر اور آگے بڑھ گئی۔
اگلے درخت پر سرخ انار تھے اور اس سے اگلے درخت پر پیلے آم۔ دونوں پھل اپنی خوبیوں میں بے مثال تھے مگر اس نے وہ بھی توڑ کر نہ کھائے۔
اگلا درخت عام درختوں جیسا ہی تھا مگر اس پر لگے پھل عجیب تھے۔ اس نے پہلے ایسا درخت نہیں دیکھا تھا۔ اس درخت پر کرنسی نوٹ لگے تھے۔ سرخ، نیلے اور ہرے۔ وہ حیران ہوئی۔ کیا درختوں پر بھی پیسے لگتے ہیں؟
اور وہ لڑکی جو اسٹرابیری، آڑو، انار اور آم کھانے کے لیے نہ رکی، پیسے دیکھ کر اس کا دل ہمکنے لگا اور اس نے درخت سے پیسے توڑ لیے۔ اتنے سارے پیسے کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ زمین پر گرتے اور وہ انہیں اٹھاتی۔ جب وہ زمین پر گرے ہوئے نوٹ اٹھاتی تو پہلے سے ہاتھ میں موجود نوٹ گر جاتے۔ کتنی ہی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔
بات یہیں تک محدود ہوتی تو بھی خیر تھا مگر یہ کیا......
اب وہ کرنسی نوٹ کھا رہی تھی۔
سبز نوٹ منہ میں ڈالا، اسے چبایا اور نگل گئی۔ نیلا نوٹ منہ میں ڈالا اور اب وہ اسے چبا رہی تھی۔
کیا ان نوٹوں کا ذائقہ اسٹرابیری، آڑو، انار اور آم سے بہتر تھا؟
اور پھر جب اچانک عائشہ کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو نیم اندھیرے کمرے میں لیٹے پایا۔
زیرو پاور کا بلب کمرے کے ماحول کو خوابناک بنا رہا تھا۔ اس کا شوہر اس کے پہلو میں اس کی طرف رخ کیے لیٹا تھا اور وہ سیدھی لیٹی اندھیرے میں چھت کو تکنے لگی۔
یہ کیسا خواب تھا؟ اور اس نے پھل کھانے کے بجائے کرنسی نوٹ کھانے کو کیوں ترجیح دی؟ دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے مفقود ہوا جاتا اور آن کی آن میں آنکھوں میں جھلمل آنسو چمکنے لگے۔
کیا ہو چکا تھا، کیا ہو رہا تھا، اور کیا ہونے والا تھا۔
وہ سلمان کے قریب ہوئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
سلمان اس کا شوہر تھا۔ اس کا انتخاب۔ وہ بہت اچھا اور خیال رکھنے والا تھا۔ پھر کیوں وہ بے چین و بے کل تھی اور یہ کیسے خواب و خیال اس کو ڈستے رہتے تھے۔
ایک عہد وفا ہی تو اس نے نہ نبھایا تھا۔ کیا وہ زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے ہوئے تھوڑی سی غرض نہ دکھا سکتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کی مگر یاسر کا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔
وہ اٹھ بیٹھی اور رونے لگی۔ سلمان کی آنکھ کھل گئی۔
اس نے بیوی کو بیٹھے ہوئے اور روتے ہوئے پایا۔ ''کیا ہوا عائشہ؟'' وہ پریشان ہونے لگا۔
''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
اور سلمان عائشہ کو تکنے لگا۔ اگر پیٹ میں درد تھا تو اس کے دونوں ہاتھ سینے پر دل والی جگہ پر کیوں جمے تھے؟
☆☆☆
ناشتے کی میز پر اب صرف وہ میاں بیوی بیٹھے تھے۔ والد صاحب اسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ والدہ صاحبہ اپنے کمرے کی طرف۔ یوں تو وہ دونوں اب ہاؤس جاب کر رہے تھے اور انہیں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا مگر کہہ سن کر سلمان نے اپنی اور عائشہ کی چھٹی منظور کرا لی تھی۔
''کمرے میں چلیں۔'' اس نے چائے کے دو کپ تھامے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ عائشہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ کمرے میں آ کر عائشہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سلمان کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگا۔
''تم مجھے فرسٹ ائیر سے اچھی لگنے لگی تھیں۔ تم تھی ہی اتنی اچھی......'' سلمان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ''ہر انسان خوشگوار زندگی چاہتا ہے۔ تمہیں دیکھتا تو احساس ہوتا کہ ہاں تم ہی وہ عورت ہو جس کے ساتھ میں ساری زندگی گزار سکتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہارے ہاں رشتہ بھیجا۔'' چائے ختم ہوگئی۔ سلمان نے کپ ایک طرف رکھ دیا۔
عائشہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔
''جب زندگی ایک ساتھ گزارنی ہے تو دکھ سکھ بانٹنے چاہئیں۔'' سلمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے دبانے لگا۔ ''کیا تم میری بات سے اتفاق کرتی ہو؟''
عائشہ کو اثبات میں سر ہلانے میں بھی دقت ہوئی۔
''میں بھی ڈاکٹر ہوں اور تم بھی...... جب میں نے جان لیا کہ تمہارے سر میں درد ہوتا ہے، نہ پیٹ میں تو اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''
عائشہ نے سر اٹھا کر سلمان کو دیکھا اور ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔
''تو وہ دکھ جو تمہیں ادھ موا کیے دیتا ہے مجھ سے بانٹ لو۔ میں اچھا غمگسار ساتھی ہوں۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھوں گا۔'' وہ ہاتھ دباتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا۔'' اور اگر ایسی بات ہے جو شوہر سے نہ کہی جا سکے تو دوست سے کہہ لو۔ میں تمہارا اچھا دوست بھی ہوں۔''

عائشہ کی نگاہیں سلمان کے چہرے سے نہ ہٹتی تھیں۔ جانے وہ کیا تلاش کر رہی تھی اور پھر ان آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے اور وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کا شوہر کتنا اچھا تھا۔ ہر دکھ بانٹنے کے لیے تیار اور وہ خود...... شاید وہ سلمان کے قابل بھی نہ تھی۔

''مجھ سے غلط فیصلہ ہو گیا......'' روتے ہوئے وہ بتانے لگی۔ سلمان نرم تاثرات لیے اسے دیکھتا رہا۔

''میں اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ امی کہتی تھیں محبت کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے۔ پیسوں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے ہاں کہہ دی مگر اب......'' وہ روتی رہی اور بتاتی رہی۔

''میرا محبت کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ یہ دولت و آسائشیں اس کا نعم البدل نہیں۔ میں تم میں اسے ڈھونڈتی ہوں۔ مجھے وہ ہر وقت یاد آتا ہے۔'' ہاتھ پر گرفت ڈھیلی ہوئی اور سلمان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اگلے پل اس کے دل میں آیا کہ عائشہ کو چٹیا سے پکڑے اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر دھکیل دے اور قبل اس کے کہ وہ ایسا ہی کرتا اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ برا خیال آنا برے ہونے کی نشانی نہیں۔ برے ہونے کی نشانی یہ ہے کہ آپ اس خیال پر عمل بھی کر گزریں۔

وہ اٹھا اور عائشہ کے پہلو میں جا بیٹھا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔'' وہ عائشہ کا سر تھپک رہا تھا۔ عائشہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''مگر محبت سے بھی ایک طاقت ور چیز اور ہے۔ اور وہ ہے نکاح۔ وہ بندھن جس میں تم اور میں بندھے ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''اسے بھولنے کی کوشش کرو اور مجھے یاد رکھنے کا طریقہ ڈھونڈو۔ اب کچھ بھی نہیں لوٹایا جا سکتا کہ تمہارا نکاح مجھ سے ہو چکا ہے۔ محبت پس پشت چلی گئی ہے۔''

''میں اسے بھولنے کی کوشش کرتی ہوں مگر......'' وہ روتی رہی اور کہتی رہی۔

''کوشش جاری رکھو۔'' سلمان اس کا سر تھپک رہا تھا، عائشہ روئے جا رہی تھی۔

''میں تمہارے ہر دکھ کا ازالہ کروں گا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

خوبصورت باتیں

☆ انسان کی نرمی کو اس کی کمزوری نہ سمجھو کیونکہ پانی سے نرم کوئی چیز نہیں لیکن اس کی طاقت بھی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

☆ ماں، باپ، استاد اور کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر سبق وہی یاد رہتا ہے جو وقت اور لوگ سکھاتے ہیں۔

☆ تعلیم کی کمی کو تربیت اچھی طرح ڈھانپ لیتی ہے لیکن تربیت کی کمی کو تعلیم کبھی پورا نہیں کر سکتی۔

☆ کسی کی پہچان علم سے نہیں بلکہ ادب سے ہوتی ہے کیونکہ علم تو ابلیس کے پاس بھی تھا لیکن وہ ادب سے محروم تھا۔

☆ اپنی عمر اور پیسے پر کبھی اعتبار نہ کرنا کیونکہ جو چیز گنتی میں آجائے وہ لازمی ختم ہونے والی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری، قصور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ قول بے عمل اور علم بے اخلاص ناقابلِ قبول ہے۔

☆ جو عالم زاہد نہ ہو، وہ اپنے زمانے والوں پر عذاب ہے۔

☆ مصیبتوں کو چھپاؤ کہ اس سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

☆ زیادہ منسومت...... کہ ہنسی غفلت کا اثر ہے اور اس سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ خوف اور امید کے درمیان زندگی گزارو۔

☆ مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے، اس کا ایمان اتنا طاقت ور ہوتا ہے۔

☆ وہ شخص کتنا بدنصیب ہے جس کے دل میں جانداروں کے لیے رحم نہیں ہے۔

☆ وہ رزق جس کی فراخی پر شکر نہ ہو اور معاش کی تنگی جس پر صبر نہ ہو، فتنہ بن جاتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کتنے دنوں بعد وہ میکے آئی۔ وہ اداس اداس انداز۔ وہ کھوئی کھوئی کیفیت۔ نو بیاہتا لڑکیاں اس طرح تو نہیں ہوتیں۔ تنہائی میں رقیہ نے اس سے پوچھا تو وہ رونے لگی۔

''امی! غلط ہوگیا...... سب کچھ غلط۔ یہ ہیرا......'' اس نے ہاتھ میں پہنا بریسلیٹ اتار پھینکا۔

''یہ ہیرا میرے کسی کام کا نہیں۔ وہ آسائشیں مجھے ڈستی ہیں۔ آپ نے غلط مشورہ دیا تھا مجھے۔ میں برباد ہوگئی۔'' وہ روتے ہوئے چیخنے لگی اور رقیہ اسے پچکارنے لگیں۔

''شروع میں ایسے ہی لگتا ہے مگر آہستہ آہستہ تمہیں یہ فیصلہ صحیح لگے گا۔''

''امی بس کردیں......'' اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔

وہ اٹھی اور اس کمرے کی طرف چلی آئی جو شادی سے پہلے اس کے لیے مخصوص تھا اور اب بھی ویسے ہی اس کے لیے مختص تھا۔ کمرے میں آکر اس نے کنڈی لگالی۔

رقیہ کے دل میں تو آیا اس کے پیچھے چلی آئیں مگر رک گئیں۔ ''ابھی نہیں سمجھے گی۔ کچھ وقت لگے گا تو خود ہی سب سمجھ آجائے گا۔'' وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

اور عائشہ بیڈ کے کنارے بیٹھی روتی رہی، روتی رہی۔ روتے روتے تھک گئی۔

''میں تمہیں منہ دکھائی میں پھول دوں گا۔'' نہر کنارے یاسر نے اس سے کہا تھا۔

''صرف پھول......!'' وہ چلتے چلتے رک گئی۔

''اپنے ہاتھ کی بنی چائے بھی پلاؤں گا۔'' یاسر نے اضافہ کیا۔

''بس......!''

''اور کیا تمہیں میری محبت نہیں چاہیے۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات چاہئیں۔'' یہ کہہ کر یاسر ہنسنے لگا۔

''اب ایسا بھی نہیں۔'' اس نے تردید کی تھی۔

مگر حقیقت کیا تھی۔ اس نے ہیرے جواہرات منتخب کرلیے اور محبت چھوڑ دی۔

یہ نہیں تھا کہ سلمان اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ محبت کرتا تھا۔ بے حساب کرتا تھا مگر یہ مسئلہ تھا کہ نہ یہ وہ محبت تھی اور نہ ہی وہ یاسر تھا۔

آنسو بہہ بہہ کر خشک ہوگئے پھر اس پر نہ جانے کیا کیفیت طاری ہوئی۔ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ٹشو سے چہرہ صاف کیا۔ پلکوں پر مسکارا لگانے لگی۔ آنکھوں میں نمی اتری تو مسکارا پھیل گیا۔ وہ منہ دھو آئی اور دوبارہ سے خود کو تیار کرنے لگی۔

آنکھیں سجائیں۔ گالوں پر لالی لگائی۔ ہونٹ رنگے۔ گلے میں چین لاکٹ تھا مگر ایک اور سیٹ پہن لیا اور پھر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ کوئی تیز دھار چیز...... شومئی قسمت سائڈ ٹیبل پر چھری دھری تھی۔ اس نے چھری اٹھائی اور انگوٹھے کی پور سے اس کی دھار چیک کرنے لگی۔

وہ مرجائے تو کیا دنیا رک جائے گی؟

نہیں نا۔ تو پھر اسے مرجانا چاہیے۔

تیز دھار چھری سے انگوٹھے کی پور پر کٹ لگ گیا اور وہ اس کٹ سے خون نکلتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

خدیجہ سمجھتی تھی کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات رشتے بھی اس چمک کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے بہن رقیہ سے ایک فاصلہ رکھا اور اولاد کو بھی یہ بات باور کراتی رہیں۔ یہ نہ تھا کہ ملنا ملانا نہ تھا۔ محبت نہ تھی۔ سب کچھ تھا مگر پھر بھی ایک فاصلہ تھا اور یہ بات یاسر کے ذہن میں بھی تھی۔ ماں نے ہمیشہ اسے سمجھایا تھا مگر جب عائشہ نے خود سے ہاتھ بڑھایا تو وہ کیونکر بھول گیا۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے۔ گھر والوں سے چھپ کر پارکوں اور نہر کنارے ملتے۔ کبھی کسی ہوٹل میں جا کر چائے پیتے تو کبھی کھانا کھاتے اور تجدیدِ وفا کرتے۔

مگر یہ سب باتوں اور ملاقاتوں تک محدود رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن عائشہ نے اس سے کہا۔

''سوری یاسر! میں مزید تم سے نہیں ملوں گی۔''

''اس دل کو چین نہ آئے گا۔'' یاسر نے ہنس کر جواب دیا۔ وہ سمجھا عائشہ مذاق کررہی ہے۔

''میرے لیے سلمان کا رشتہ آیا ہے۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ ویل سیٹلڈ فیملی ہے۔ امی ابو ہاں کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بھی مناسب لگ رہا ہے۔'' یاسر کے لبوں پر مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

''مگر کیوں؟'' وہ بمشکل پوچھ سکا۔

''اچھا مستقبل!''

''میں بھی تمہیں اچھا مستقبل دوں گا۔''

''لفظوں کے محل رہائش کے قابل نہیں ہوتے۔''

''لفظوں کے محل......'' وہ ششدر رہ گیا۔

''تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ وفا کے تمام سلسلے میرے نام کرچکی ہو۔''

''وعدہ خلافی کے لیے معذرت۔'' یہ عائشہ کیا کہہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہی تھی؟ اور اس کا لہجہ سپاٹ کیوں تھا؟

عائشہ فیصلہ سنا کر چلی گئی۔ وہ باور کراتا رہ گیا کہ ایک دن اس کا ہوٹل بھی مرکزی شاہراہ کے کنارے ہوگا مگر......

اور اس مگر پر تمام باتیں رک گئیں۔ لیکن یاسر نے ہار نہ مانی۔ عائشہ سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔

پہلی ملاقات پر عائشہ نے آدھی ادھوری ملاقات کی۔ چند فقروں کے بعد اٹھ کر چلی گئی۔ دوسری دفعہ وہ ملنے ہی نہ آئی۔ وہ رقیہ سے بار بار کہتا رہا عائشہ کو بلائیں مگر انہوں نے دو دفعہ کہا کہ وہ مصروف ہے اور تیسری دفعہ کہا طبیعت خراب ہے اس لیے سوئی ہوئی ہے۔

اور چوتھی دفعہ تو اسے گیٹ سے اندر ہی نہ آنے دیا گیا۔ انٹرکام پر رقیہ نے کہہ دیا۔

''بیٹا! میری طبیعت خراب ہے۔ ورنہ تم سے ملتی اور تم برا مت مانو تو بار بار ہمارے گھر کے چکر مت لگاؤ۔ توقیر کو برا لگتا ہے۔''

اور اسے ان الفاظ پر یقین ہی نہ آیا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ فون کرتا رہا مگر زیادہ تر ملازمہ فون اٹھاتی۔

اور جو دو بار فون عائشہ نے اٹھایا تو کیا کیا کہہ گئی وہ۔

''کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مجھے ہراساں مت کرو۔'' وہ ششدر رہ گیا اور آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگے۔

کیا وہ ایسا نیچ تھا کہ اسے ہراساں کر رہا تھا۔ دل کا درد بے قابو ہوا تو ماں کے پاس جا پہنچا۔ روتے ہوئے دل کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔

ماں نے آنسو پونچھے۔ گود میں سر رکھا۔ ماتھا چوما اور کہنے لگیں۔

''امیروں کے چونچلے...... بھول جا بیٹا۔'' وہ آنسو پیتا یونہی لیٹا رہا؟

اور جس دن عائشہ کی شادی تھی وہ اس دن بھی بریانی بیچتا رہا اور آنسو پونچھتا رہا۔

کیا ہوا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟ یونہی وقت گزرتا گیا۔ زخم ویسے ہرے نہ رہے۔

یہ ایک عام سا دن تھا۔ وہ اپنے ڈھابے پر کھڑا بریانی بیچ رہا تھا کہ ایک گاڑی اس کے ڈھابے کے سامنے رکی۔ وہ لمحے بھر میں گاڑی کو پہچان گیا۔ گاڑی سے عائشہ اتری۔ وہ خود ڈرائیو کر کے آئی تھی۔

یاسر نے ہی تو ڈرائیونگ بہتر کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اور وہ عائشہ جو اپنے کمرے میں خودکشی کرنے کا سوچ رہی تھی، اب یاسر کے سامنے کھڑی تھی۔

سرزنش

میں نے زندگی میں سات بار اپنے نفس کو حقیر سمجھا اور اسے سرزنش دی۔

1۔ سب سے پہلے اس وقت جب میں نے عظمت واقتدار کے لیے امارت اور ریاست کا لباس پہنا اور مجبور و بے کس افراد کی لاچاری اور احتیاج سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

2۔ دوسری بار اس وقت جب میں نے اپنے مخلص دوستوں کے سامنے بہانے تراش کر اپنی صفائی پیش کی اور انہیں اپنی مکاری اور عیاری سے گمراہ کرنے کی کوشش کی۔

3۔ تیسری بار اس ساعت جب آسان اور دشوار میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو میں نے مشکل کے مقابلے میں آسان کو ترجیح دی۔

4۔ چوتھی بار اس وقت جب میں نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا اور یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ آخر دوسرے بھی تو اسی طرح گناہ کرتے ہیں۔

5۔ پانچویں بار اس لمحے جب میں نے اپنی کمزوری اور خوف کی بنا پر اس مصیبت کو برداشت کیا جو مجھ پر نازل ہوئی اور دعویٰ یہ کیا کہ اس طرح میں قوت اور ستم کے مقابلے میں صبر و استقامت کا بے مثل مظاہرہ کر رہا ہوں۔

6۔ چھٹی بار اس لمحے مجھے اپنا نفس حقیر محسوس ہوا اور میں نے اسے سرزنش کی۔ جب میں نے اپنے کپڑے سمیٹے اور اوپر اٹھا لیے تا کہ میرا دامن زندگی کے کیچڑ سے آلودہ نہ ہونے پائے۔

7۔ ساتویں بار اس وقت جب میں مناجات پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور اسے اپنی مدح وثنا اور فضیلت سمجھا۔

سوال جواب

○ سردار: (دوست سے) ''عورتوں کو شادی کے بعد بیگم کیوں کہتے ہیں؟''

دوست: ''شادی کے بعد عورتوں کا سارا غم مردوں کو منتقل ہو جاتا ہے اس لیے انہیں ''بے غم'' بولتے ہیں۔''

محمد امین انجم، ارزانی پور قصور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

وہ خوب سجی سنوری تھی مگر اتنی تیار ہونے کے بعد بھی وہ اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔

یاسر کاؤنٹر پر دیگچے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔

''یاسر! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

یاسر ہاتھ میں چمچ لیے اسے دیکھتا رہا۔ ڈھابے میں کام کرنے والا بیرا اور گاہک چہ میگوئیاں اور اشارے کرنے لگے۔

''اگر میں طلاق لے لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کرلو گے؟'' یہ عائشہ کا سوال تھا۔

ہوا رک گئی۔ سورج بجھ گیا۔ اندھیرا چھانے لگا مگر یاسر ہوش میں آیا اور خود کو حواسوں میں لاتے ہوئے بولا۔

''یہ زندگی ہے کوئی کھیل تماشا نہیں۔ تم طلاق یافتہ ہو جاؤ یا پھر بیوہ۔ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ بھرے بازار میں تماشا مت لگاؤ۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

یاسر نے مڑ کر ایک نظر گاہکوں کو دیکھا۔ اب تو لوگ دکان کے باہر رک کر یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' یاسر نے اس سے گاڑی کی چابی لی۔ اپنے اسسٹنٹ سے دکان سنبھالنے کا کہا اور اسے لے کر چل پڑا۔ گاڑی عائشہ کے میکے کے دروازے پر رکی اور اسے لیے اندر چلا آیا۔ رقیہ اپنے بالوں کے لیے کوئی بیوٹی ٹپ استعمال کر رہی تھیں۔ عائشہ کو یاسر کے ساتھ آتے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

''اپنی شادی شدہ بیٹی کو سنبھالیں۔ میری دکان پر آگئی تھی۔ لوگوں کو بغیر ٹکٹ کے فلم دکھا دی۔'' وہ زیادہ دیر نہ رکا۔ عائشہ روتی کرلاتی رہ گئی مگر وہ چلا گیا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے عائشہ سے محبت نہ تھی۔ اس کا دل بھی ہمکنے لگا تھا اور کئی بار تو اس نے بھی سوچا۔ ہاں تھام لے عائشہ کا ہاتھ مگر یہ زندگی تھی اور وہ یاسر تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا اور اسے ہراساں کیا کرتا تھا۔ وہ ..... کوئی بہت پرانی بات نہ تھی کہ وہ بھول چکا ہوتا۔

اس رات وہ خدیجہ سے کہہ رہا تھا۔

''امی! کوئی مناسب سی لڑکی دیکھ کر میری شادی کردیں۔ مزید تاخیر مت کریں۔''

☆☆☆

سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈا اور خشک۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اندر آتش دان کے پاس زوبی اور نانی ایک ہی شال اوڑھے بیٹھی ہاتھ سینک رہی تھیں۔ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد چھٹیاں گزارنے وہ نانی کے پاس چلی آئی تھی۔ نانی کی باتیں اسے ہمیشہ اچھی لگتیں اور آج نانی نے اسے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تو وہ ششدر رہ گئی۔

''یوں تو اپنے بچوں کو اپنی جوانی کی کج ادائیوں کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے مگر میں نے اس لیے بتایا کہ تم اس قصے سے کچھ سیکھ پاؤ۔'' عائشہ کی آواز میں لرزش تھی۔ اس عمر میں رعشے کا مرض اس کے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی لرزش لے آیا تھا۔

''تمہارے نانا بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔ جب انہیں میں نے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تو کوئی عام مرد ہوتا تو اسی وقت مجھے گھر سے نکال دیتا مگر تمہارے نانا نے مجھے سنبھالا۔ میرے ٹوٹے ہوئے وجود کو سمیٹا اور یہ انہی کی محبت تو تھی کہ مجھے ان سے محبت ہونے میں وقت نہ لگا۔ اور ہم نے بہت خوبصورت زندگی گزاری۔'' عائشہ رک گئی اور زوبی نانی کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھتی رہی۔

''اور وہ صاحب.....'' زوبی نے سوال کیا۔ عائشہ نے ایک طویل سانس بھری۔

''اللہ نے یاسر کو بخت لگایا۔ اس کا مرکزی شاہراہ پر ہمارے اسپتال سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ اب یہاں آئی ہو تو کزنز کے ساتھ وہاں سے کھانا کھا آنا۔ پورا شہر اس ریسٹورنٹ کے کھانوں کا گرویدہ ہے۔'' عائشہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی اور زوبی نانی کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

''زندگی اچھی گزر گئی مگر دل میں ایک خلش رہ گئی کہ میں محبت نہ کرتی اور اگر محبت کی تو بے وفائی نہ کرتی۔ جو انسان کے نصیب میں ہو وہ مل کر رہتا ہے۔ آج یاسر کا بھی تو شہر کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔ خاندان کی ایک تقریب میں اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے گلے کے لاکٹ میں ہیرا دمک رہا تھا۔ زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے محض ظاہری اسباب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ دل کی بات بھی سن لینی چاہیے۔'' اور کاش بزرگوں کی سماعت کے ساتھ ساتھ نگاہ میں بھی گہرائی اور جوہر شناسی کی بصیرت ہو تو بچوں کو اتنی اذیتوں سے نہ گزرنا پڑے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

امانت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شاہ زین رضوان

معاشرہ چاہے مشرقی ہو یا مغربی... ماں کے احساسات وجذبات اور ممتا کی چاشنی قدرت نے یکساں رکھی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ماں تھی جس کی گود حالات نے بھرنے کے باوجود خالی رکھی... مقدر کے چکر اسے ہی کہتے ہیں کہ جستجو اپنے مطلوبہ ہدف تک لاکر بھی اسے نظروں سے اوجھل کردیتی ہے... لیکن اس کا شک جب یقین میں ڈھلا تو وہ بھی مجسم حقیقت بن کر اس کے پاس آگئی۔

محبت کے رشتوں میں گندھی ممتا کی تڑپ اور لگن کی روداد

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس سے پہلے مجھے زندگی میں صرف ایک مرتبہ سوال کرنا پڑا تھا اور اس مرتبہ بھی صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آرہی تھی۔ میں ایک امید و بیم کی کیفیت میں اس کے جواب کا انتظار کررہی تھی..... بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سکوت توڑا۔

''کیتھرین!'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''یہاں آنے سے پہلے تم کتنی جگہ کوشش کرچکی ہو؟''

''دو جگہ۔'' میں نے جواب دیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس نے اپنے سامنے پڑا ہوا پرنٹ آؤٹ اٹھایا اور بولا۔ ''تمہاری لیاقت یقیناً اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ بلکہ تمہاری تعلیم اس ملازمت کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ تم نے اپنے آپ کو بہت سنبھال کر رکھا ہے اور دیکھنے میں بہت اچھی لگتی ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں ناکامی ہوئی۔''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا، گو کہ وہ غلط کہہ رہا تھا۔ میں نے اونی اوورکوٹ کے نیچے ایک پرانا بلاؤز پہن رکھا تھا جس کی آستینیں کثرتِ استعمال سے گھس گئی تھیں۔ میری پتلون بھی گھٹنوں پر سے پھٹ گئی تھی اور جوتوں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔

''میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا خاندانی کاروبار ہے اور میں اپنے کام کے لیے مقامی آبادی پر انحصار کرتا ہوں، اگر میرے بڑوں کو معلوم ہو گیا کہ تم یہاں کام کرتی ہو تو میرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔''

میں کرسی سے کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے وقت کا شکریہ بل۔ میں جانتی ہوں کہ یہ تمہارے لیے مشکل ہے اور تم کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔''

وہ بھی کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ میں واقعی یہ نہیں کرسکتا۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا لیکن وہ اسے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں کیوں واپس آ گئیں کیتھرین۔ تمہارے لیے .... کسی دوسرے شہر میں زیادہ آسانی ہوتی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور گھوم کر میرے سامنے آتے ہوئے بولا۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

دوسرے لفظوں میں وہ مجھے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ یہ میری آخری امید تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''بل پلیز۔ کیا تم کچھ نہیں کرسکتے؟''

''مجھے افسوس ہے۔ کاش میں کچھ کرسکتا۔''

باہر جنوری کی تیز ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اپنے کوٹ کا کالر اوپر کیا اور سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ جگہ میرے گھر سے تین سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ابھی میں چند قدم ہی گئی تھی کہ ایک عورت میری طرف لپکی۔ اس کے ہاتھ میں خریداری کا تھیلا تھا۔ مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ وہ کون تھی۔ اس لیے میرا بدحواس ہونا فطری تھا۔

وہ میرے پاس آ کر رک گئی اور بولی۔ ''تمہارے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، اس نے اپنا تھیلا پاؤں کے پاس گرا دیا۔ اس میں رکھی ہوئی چیزیں سڑک پر بکھر گئیں۔ راہ چلتے لوگ یہ سوچ کر رک گئے کہ شاید اسے مدد کی ضرورت ہو لیکن اس نے ان لوگوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے میری چھاتی پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ ''جہاں سے آئی ہو، وہیں چلی جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟''

مارے شرمندگی کے میری زبان گنگ ہو گئی اور میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ گھر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ وہ عورت جوڈی باربرٹی جو میرے گھر صفائی کا کام کرتی تھی۔ وہ ہفتے میں تین مرتبہ آتی تھی۔ اس نے تقریباً دو سال تک میرے گھر کام کیا تھا۔ میں اس کے معاندانہ رویے پر حیران تھی کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کے پاس مجھ سے نفرت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن جیسا کہ بل نے کہا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہو جائے جب لوگوں کو تمہارے بارے میں پتا چلے گا۔'' میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ شاید میں مقامی آبادی کے ممکنہ ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھی جو کبھی پرسکون اور باوقار ہوا کرتی تھی۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور جلد ہی مجھے نیند آنے لگی لیکن اچانک ہی نچلی منزل سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ عام دنوں کی نسبت زیادہ شدید تھیں۔ نیچے رہنے والا اونچی آواز میں گانے سنا کرتا تھا۔ میں نے اس کی شکایت بھی کی لیکن مجھے بتایا گیا کہ اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کرسکتے۔

آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ نیچے رہنے والے شخص سے الجھنے کی کوشش نہ کروں کیونکہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ بہرحال اسے خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ اس سے غیر ضروری طور پر دشمنی مول لینا عقل مندی نہ ہو گی۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ رات کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اندھیرے میں اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاتا۔ اس کی گولہ باری ہمیشہ دو پہر ایک بجے کے قریب شروع ہوتی۔ لگتا تھا کہ کوئی چیز چھت سے ٹکرا رہی ہے۔

میں نے اپنے لیے لنچ تیار کیا جو دو ابلے ہوئے انڈوں، ایک توس اور ایک سیب پر مشتمل تھا اور بستر کے کنارے رکھے ہوئے الارم کلاک کو آن کر دیا۔ ضرورت کی ہر چیز اس جگہ موجود تھی۔ ایک ہی کمرے میں بیڈ روم، لیونگ روم اور کچن تھا۔ اس سے متصل ایک باتھ روم تھا جس میں ایک چھوٹی سی الماری تھی تاہم یہ جگہ گرم..... صاف اور محفوظ تھی۔

کھانے کے دوران آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ لنچ سے میرا پیٹ بھر گیا اور اب مجھے شام تک کچھ کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی گو کہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے کس وقت روانہ ہونا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ایک بار پھر وقت کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ تیار ہونے کے لیے اور پچیس منٹ پیدل چل کر منزل تک پہنچنے کے لیے۔

جیسے ہی میں نے کھانا ختم کیا' آوازیں آنا پھر شروع ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے ہی کچھ ہو رہا ہے۔ نیچے رہنے والا زور زور سے کوئی چیز چھت میں مار رہا تھا۔ اس نے سات یا آٹھ مرتبہ ایسا کیا اور میں مجبور ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے باوجود مجھے ایک لمحے کے لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹانے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ دس فٹ کے فاصلے پر ایک اور دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھی عورت اندر سے جھانک رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے اور یہ آوازیں کیسی ہیں۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

مجبوراً مجھے سامنے کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسری بار میں نے زور سے دستک دی۔ ایک آدمی باہر آیا۔ اس نے ایک ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا جس پر کسی کلب کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسا جرائم پیشہ شخص لگا جو اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہو۔

"یہ ضربیں تم لگا رہے ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ میں نے دوبارہ کہا۔ "تم میرے فرش پر ہتھوڑے برسا رہے ہو۔"

"تم میرے دروازے پر دستک دے رہی تھیں؟"

"کیونکہ تم میرے فرش پر ضربیں لگا رہے تھے۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے چہرے پر بدنما مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "میں تو بانس پر کپڑا لپیٹ کر چھت صاف کر رہا تھا۔"

مجھے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گئی۔ سرد ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے پر لگ رہے تھے۔ میں نے پرانی جینز اور پنڈلیوں تک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ کوٹ میں نے ایک بڑے شاپنگ مال سے خریدا تھا۔ میں اس زمانے میں مانچسٹر سے خریداری کیا کرتی تھی۔ یہ کوٹ اسی زمانے کی یادگار تھا لیکن اب میرے پاس کچھ نہیں تھا سوائے میری بیٹی الزبتھ کے۔ وہ بھی مجھ سے دور ہو گئی تھی اور میں اس کی واپسی کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی پیدائش قبل از وقت ہو گئی تھی۔ وہ دس ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس کے پھیپھڑے کام نہیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے تتلی کے چھوٹے پر ہوں۔ جولین اور میں نے اسپتال کے قریب ایک کاٹیج کرائے پر لیا تا کہ ہم اس کے پاس رہ سکیں۔ وہ تین ماہ کی ہو گئی تھی لیکن اس کا وزن چھ پونڈ سے بھی کم تھا۔ جب لوگ اس کی عمر پوچھتے تو میں جھوٹ بولتی کہ یہ نوزائیدہ بچی ہے کیونکہ میں لوگوں کے سوالات سن سن کر تنگ آ چکی تھی۔ بس میرا دل چاہتا کہ اسے سینے سے لگائے رکھوں۔

میرے پاس اس کی آخری تصویر اس وقت کی ہے جب وہ چار سال کی تھی۔ یہ تصویر ساحلِ سمندر پر لی گئی تھی۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔ اٹھارہ مہینوں میں تین خاندانوں نے اس کی پرورش کی پھر ایک جوڑے نے اسے گود لے لیا۔ میرے والدین کا انتقال ہو گیا تھا اور بھائی نے میری بیٹی کو اپنے پاس رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس جوڑے نے بچی کو گود لینے کے لیے جو شرائط رکھیں وہ میں نے قبول کر لیں۔ یہ کوئی مشکل فیصلہ نہیں تھا کیونکہ کاشانۂ اطفال میں اسے گھر کا ماحول نہیں مل سکتا تھا۔ ویسے بھی میں جیل کی دیواروں کے پیچھے قید تھی۔ اس لیے اس سے دور رہنا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن رہائی کے بعد یہ میرے لیے ایک چیلنج بن گیا۔

میں اپنے آپ کو سمجھاتی رہی کہ اسے صرف ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں تا کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کس حال میں ہے پھر میں یہاں سے کہیں اور جا سکتی ہوں۔ گزشتہ چار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سال سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس سے پہلے مجھے لیٹر بکس اسکیم کے تحت سال میں ایک مرتبہ اس کا خط مل جاتا تھا۔ یہ اسکیم جیل میں قید ماؤں، ان کے بچوں اور انہیں گود لینے والوں کی مدد کے لیے شروع کی گئی تھی لیکن پھر بعض وجوہات کی بنا پر یہ اسکیم ختم کردی گئی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر یہ بچے اپنے ماضی سے جڑے رہے تو ان کے مستقبل پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

یہ خطوط سوشل سروسز کے ذریعے آتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈینس فیرے کو الزبتھ کے بارے میں لکھتے ہوئے پریشانی کا سامنا تھا۔ اس کے باوجود میں الزبتھ کو خط لکھتی رہی۔ میں نے اس سے معذرت کرنے کے بجائے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ کہ میں ہر روز اسے یاد کرتی ہوں اور کبھی نہیں بھول سکتی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈینس نے میرے خط... الزبتھ تک نہیں پہنچائے اور نہ ہی میرے بار بار کہنے کے باوجود اس کی کوئی تصویر مجھے دی۔

اسکول کے قریب پہنچ کر میں نے اردگرد کا بغور جائزہ لیا کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ میں نے سڑک کے پار ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا کہ کسی کو میری موجودگی پر شک نہ ہو، زیادہ تر والدین کاروں میں آرہے تھے البتہ صرف ایک عورت سیاہ رنگ کے کتے کے ساتھ پیدل آتی ہوئی دکھائی دی۔ پھر وہاں ایک ڈبل ڈیکر بس آکر رکی لیکن الزبتھ اس میں سوار نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ اسکول میں ہو یا کوئی کھیل مثلاً ہاکی یا نیٹ بال کھیلنے کے لیے رک گئی ہو۔

بچے اسکول کے مرکزی دروازے سے باہر آرہے تھے اور فوراً ہی وہ علاقہ نیوی بلیو یونیفارم سے بھر گیا۔ تین لڑکیاں میری طرف آتی دکھائی دیں۔ ان کے بال سیاہ اور وزن غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا لیکن ان میں الزبتھ نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں مزید پانچ منٹ وہاں کھڑی انتظار کرتی رہی لیکن الزبتھ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ مایوس ہوکر میں گھر کی طرف چل دی۔

میں سڑک پار کرنے ہی والی تھی کہ ایک سلیٹی رنگ کی کار میرے پاس آکر رکی۔ اس میں سے ایک عورت اتری اور مجھے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیتھرین روڈز؟''

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''ڈی سی جون آرنلڈ۔ کیا میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں؟''

''نہیں شکریہ۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔''

''بیٹھ جاؤ کیتھرین۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں انکار نہ کرسکی اور اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی اور اس نے کار کا رخ میرے گھر کی جانب موڑ دیا۔ میں نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے میرے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا یا یہ کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں نے زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ بلا ضرورت نہیں بولنا چاہیے۔ راستے میں یونہی میں نے گردن گھما کر دائیں جانب دیکھا تو اس کی شکل جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اسے جانتی ہوں' ایک بار میں نے اسے الزبتھ کے اسکول میں دیکھا تھا وہ بچوں کو آگ سے بچنے کی احتیاط کے بارے میں بتارہی تھی۔

جب ہم ونڈرمیئر کے علاقے میں پہنچے تو وہ اپنی گاڑی لائبریری سے متصل کار پارکنگ میں لے گئی اور بولی۔ ''میں تمہیں دروازے کے سامنے نہیں اتاروں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر باتیں بنائیں۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا لیکن یہ سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اب میں جاسکتی ہوں؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

میں نے جھک کر اپنا پلاسٹک بیگ اٹھایا اور دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ وہ بولی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ تم اسکول نہیں جاسکتیں؟''

میں اس کا منہ دیکھنے لگی۔ ''تم مجھ سے وعدہ کرو کہ دوبارہ وہاں نہیں جاؤ گی۔'' اس کا لہجہ نرم لیکن پیغام واضح تھا۔ ''تم جانتی ہو کہ بچی کو گود لیتے وقت یہ شرط بھی عائد کردی گئی تھی۔''

میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''میں کوئی مشکل کھڑی کرنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ وہ خیریت سے ہے۔''

''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم اسے جانتی ہو؟''

''بہت زیادہ تو نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہے۔''

''وہ کیسی ہے؟''

''اس کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''کیسے مسائل؟'' میں چونکتے ہوئے بولی۔

اس نے کندھے اچکا دیے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اسے اس سے زیادہ بتانے کا اختیار نہیں۔

''کیا وہ اس سے پیار کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم تم اتنا تو بتا سکتی ہو۔''

''ہاں اسے بہت محبت ملتی ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے بتانے کا شکریہ۔''

''تم یہ سمجھ لو کہ اگلی بار میں متعلقہ لوگوں کو رپورٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی اگر تم نے الزبتھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔''

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آج کی ملاقات ریکارڈ نہیں ہوگی؟''

''نہیں لیکن تمہیں وہاں دیکھ لیا گیا ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''ایک عورت نے تمہیں وہاں انتظار کرتے دیکھا۔ وہ تمہیں پہچان گئی اور سوچنے لگی کہ تم وہاں کیوں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے پوچھوں، اس سے پہلے کہ کوئی اور تمہاری شکایت کر دے حالانکہ یہ میرا کام نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گئی۔

اگلے روز مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ یہ ایک فلاحی تنظیم تھی اور اسے ایک مخیر شخص نے قائم کیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو اچھا اور کارآمد کام دینا چاہتا تھا جو پسندیدہ ملازم نہیں سمجھے جاتے۔ اگر میں یہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو مجھے ایک نوجوان لڑکے اور ایک عورت کے ساتھ کام کرنا پڑتا۔ لڑکا منشیات کا عادی تھا اور وہ عورت دو مرتبہ چوری کے الزام میں جیل جا چکی تھی۔

میں ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے بارے میں خوفزدہ تھی۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے۔ جیل میں میرا واسطہ جن عورتوں سے پڑا وہ بہت ہمدرد، حوصلہ بڑھانے والی اور دوسروں کے دکھ درد بانٹنے والی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جیل کی پہلی رات بہت بری ہوتی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جیل جانے کا خوف اس سے کہیں زیادہ برا ہوتا ہے۔ جب مجھے سزا سنائی گئی تو میں نے بہت سکون محسوس کیا۔ مقدمہ ختم ہو چکا تھا اور رہائی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس سزا کو اپنی تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس روز میں نے الزبتھ کے ساتھ ایک گھنٹا گزارا اور اسے سینے سے چمٹا کر خوب پیار کرتی رہی۔ پھر وہ چلی گئی۔ اسے جانا ہی تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہی ہونا ہے۔

میں اپنی بیٹی، اپنے گھر، اپنی آزادی اور اچھے مستقبل کے امکانات سے محروم ہو گئی۔ مجھے بارہ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا لیکن دس سال بعد مجھے پیرول پر رہائی مل گئی۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے دوبارہ گولی مار دیتی اور ایک بار پھر جیل چلی جاتی کیونکہ سزا یافتہ کے لقب کے ساتھ جینا مجھے گوارا نہیں تھا۔

توقع کے برعکس میری ملازمت بہتر ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجھے ایک وردی فراہم کی جس میں گرم جیکٹ، جوتے، اونی ہیٹ، ٹوپی اور دو جوڑی دستانے شامل تھے۔ ٹیکس اور انشورنس کی قسط کٹ جانے کے بعد مجھے ہفتے کے ایک سو ستر پونڈ مل جاتے تھے۔ میں نے پہلی تنخواہ میں موبائل سمیت ضرورت کی کئی چیزیں خرید لیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کسی بہتر جگہ رہائش اختیار کر لینی چاہیے۔

• ایک دن جب میں کام سے واپس آئی تو میں نے اس بوڑھی عورت کو دروازے پر کھڑے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اندر جانے لگی۔ میں نے اسے پکارا لیکن وہ نہیں رکی البتہ دوسری بار آواز دینے پر رک گئی۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس گئی اور آہستہ سے کہا۔

''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''میں کسی سے نہیں ڈرتی۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر کیوں مجھ سے بھاگ رہی تھیں؟''

''میں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔''

''یہی بات تمہارا پڑوسی بھی کہتا ہے۔ کیا تم دونوں ایک ہی طرح سوچتے ہو؟''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ''میں کل یہاں سے جا رہی ہوں۔ مجھے ایک بہتر جگہ مل گئی ہے۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''جانے سے پہلے ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس کے دروازے پر کبھی دستک مت دینا۔ وہ مہمانوں کا آنا پسند نہیں کرتا۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور اوپر چلی گئی۔

میں صبح سوا سات بجے گھر سے نکلتی ہوں کیونکہ ساڑھے سات بجے ایلن مجھے پوسٹ آفس کے پاس سے اپنی گاڑی میں بٹھا لیتا ہے۔ اس روز جب میں نیچے آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ کا دروازہ پوری طرح بند نہیں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا۔ اس وقت میرے کانوں میں بوڑھی عورت کے الفاظ گونجے۔ ''وہ مہمانوں کا آنا پسند نہیں کرتا۔''

مجھے تجسس ہوا کہ اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ میں نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کا فلیٹ میرے مقابلے میں بڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی اور وہ دونوں بازوؤں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ فضا میں الکوحل کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شراب کی ایک خالی بوتل اس کی کہنی کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے کار کی چابیاں اور پچاس پونڈز کے نوٹوں کی دس گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں دبے قدموں اس میز تک گئی۔ میری نظریں اس رقم پر جمی ہوئی تھیں۔

دس منٹ بعد میں ایلن کے ساتھ اس کے ٹرک میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ ایلن اسٹیئرنگ وہیل پر انگلیاں مار رہا تھا۔ جب بھی ساندرہ کو آنے میں دیر ہوتی، وہ اسی طرح کی حرکتوں سے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ ''کیا میں جاب شیٹ دیکھ سکتی ہوں؟''

وہ نیچے کی جانب جھکا اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک رول کیا ہوا پرنٹ آؤٹ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ جب میں وہ کاغذ دیکھ رہی تھی، وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج ہم سینٹ میری چرچ کی گھاس کاٹیں گے۔ اس کے بعد ٹروٹ بیک برج کی سڑک پر صفائی کریں گے۔''

ٹروٹ بیک برج کا نام سنتے ہی میں چونک گئی۔ الزبتھ کا اسکول وہیں واقع تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آج زیادہ کام نہیں ہے۔'' میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جاب شیٹ ایلن کو واپس کی اور کافی کا تھرماس سفری تھیلے میں رکھنے سے پہلے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ بظاہر میں اپنی ٹوپی تلاش کر رہی تھی لیکن میرا ہاتھ کسی اور چیز کو ٹٹول رہا تھا۔

''آج پھر تمہیں دیر ہوگئی۔'' ایلن نے ساندرہ کو دیکھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''گڈ مارننگ۔''

''تم اٹھارہ منٹ دیر سے آئی ہو۔'' ایلن نے پھر کہا۔

''اور تمہیں یہ گراں گزر رہا ہے۔'' ساندرہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیتھی! ذرا مجھے اخبار تو دینا۔''

میں نے کبھی ایلن یا ساندرہ سے الزبتھ کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ اس لیے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ میں نے اپنے شوہر جولین پر گولی چلائی تھی لیکن وہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ انہیں کیس کی دیگر تفصیلات کا علم نہیں ہوگا۔

ایلن نے اس سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا جو اسکول کی طرف جا رہی تھی۔ میں سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ صفائی کر رہی تھی۔ ابھی تیسرا بیگ بھرا تھا کہ میں نے گھنٹی کی آواز سنی۔ یہ چلنے کا اشارہ تھا لیکن ایلن ڈرنک لینے پیٹرول پمپ گیا ہوا تھا۔ میں اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ بچے میرے پاس سے گزر رہے تھے۔ میری نظر ایک موٹی لڑکی پر گئی جو سڑک کے دوسری جانب چل رہی تھی۔ میں اس وقت خوفزدہ ہوگئی جب ایک لڑکا اس کے عقب میں آیا اور اس نے آدھا سیب کا ٹکڑا اس کے سر پر دے مارا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے گال سرخ ہوگئے اور اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

''ہائے الزبتھ۔'' لڑکا چلایا اور میں اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔

لڑکی نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس نے سڑک پار کی اور بالکل میرے سامنے آگئی۔

ساندرہ نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''یہ وہی ہے۔''

''کون؟''

''تمہاری بیٹی۔'' اس نے کہا۔ گویا وہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔

لڑکی تھوڑا سا آگے بڑھ کر بس کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ جاننے کے بعد کہ یہی میری بیٹی الزبتھ ہے، مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں اس کی جانب دو قدم بڑھی۔ اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ نہیں چاہتی کہ میں اس کے قریب آؤں، گوکہ وہ مجھے نہیں جانتی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا پھر مجھے اس روز کی بات یاد آگئی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مجھے یہاں دیکھ لے اور معاملہ مزید خراب ہو جائے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں واپس ٹرک پر آگئی۔ گھر واپس آتے ہوئے راستے میں ساندرہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

اوکلے ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ کے ساتھ ایک تعمیراتی کمپنی کی وین کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ساندرہ اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ایلن کو خدا حافظ کہا۔ ایلن عقبی شیشے میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ساندرہ آہستہ سے بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ تم اس سے بات کروگی۔''

''تمہارا خیال غلط تھا۔'' میں نے کہا۔

میں عمارت میں داخل ہوئی۔ دو آدمی نیا دروازہ لگا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

ان میں سے ایک بولا۔ ''کسی نے دروازے کے ساتھ زور آزمائی کی ہے۔ اس سے صرف تالے کو نہیں بلکہ چوکھٹ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اب نیا دروازہ لگانا پڑ رہا ہے۔''

''یہ کس کی حرکت ہے؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں لیکن پہلی منزل پر رہنے والا کافی شور مچا رہا ہے۔''

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگی تو کسی کے چلاّنے کی آواز سن کر مجھے تشویش ہوئی۔ میرا پڑوسی دعویٰ کر رہا تھا کہ اس کی رقم غائب ہے جو غلط نہیں تھا۔ عمارت کا نقشہ کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ مجھے اوپر جانے کے لیے اس کے دروازے کے آگے سے گزرنا پڑتا۔ کمرے کے باہر لکڑی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بائیں جانب دیکھا۔ اس کے فلیٹ کا دروازہ بھی زبردستی کھولا گیا تھا اور اوپر کا قبضہ غائب ہونے کی وجہ سے وہ تیس درجے کے زاویے پر جھول رہا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آئی۔ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی۔ چند سیکنڈ بعد ہی مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر دروازے پر دستک ہوئی لیکن میں خاموش کھڑی رہی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اندر موجود ہو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

میں نے آہستگی سے کیبنٹ کا دراز کھول کر ایک چھری نکالی جو پھل اور سبزیاں کاٹنے کے کام آتی تھی پھر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ہیلو کہنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور بولا۔

''تم صبح کتنے بجے جاتی ہو؟''

''سوا سات۔''

''آج بھی اسی وقت گئی تھیں؟''

''ہاں۔''

''کیا تم نے کسی کو میرے دروازے کے قریب دیکھا تھا؟''

''نہیں۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر واپس جانے کے لیے مڑنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟''

''اس کا انحصار سوال کی نوعیت پر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آج میں نے یہاں بہت گڑبڑ دیکھی۔ صرف عمارت ہی نہیں بلکہ تمہارے دروازے کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ان حالات میں کیا یہاں رہنا محفوظ ہے؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی تمہیں پریشان کرے گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس رات میں ٹھیک طرح نہ سو سکی۔ ذرا سے کھٹکے پر آنکھ کھل جاتی۔ میں نے رات ہی کو اپنے سفری بیگ میں ضرورت کی سب چیزیں رکھ لی تھیں۔ البتہ ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ اور بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر رہنے دی جس سے ظاہر ہو کہ میرا واپس آنے کا ارادہ ہے کیونکہ آج نہیں تو کل میرے فلیٹ کی تلاشی ہونی تھی۔

میں نے ایلن کو ایک پیغام کے ذریعے اپنی بیماری سے مطلع کیا اور بتایا کہ جب کام پر واپس آنا ہوا تو اسے اطلاع کردوں گی۔

نیچے آئی تو وہ لانڈری کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''آج جلدی اٹھنا پڑ گیا۔ مجھے کپڑے دھونے تھے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ''میں سونے جارہا ہوں۔ تم سے شام کو ملاقات ہوگی۔''

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہ دیکھ رہا ہو۔ اس لیے گیسٹ ہاؤس کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اس جگہ آئی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بیگ سے اس کی چابیاں نکالیں اور کار میں سوار ہوگئی۔ دس منٹ بعد میں نے بڑی احتیاط سے اپنی گاڑی ایک منی بس اور کار کے درمیان کھڑی کی۔ وہ جگہ الزبتھ کے اسکول سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھی، اب مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

''الزبتھ... تم الزبتھ ہی ہونا؟''

''ہاں۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا میں تم سے بات کرسکتی ہوں؟''

''کس سلسلے میں؟''

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم کار میں بیٹھ جاؤ؟'' میں نے تجویز پیش کی۔

اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا پھر بولی۔ ''تم کون ہو؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں نے فوری طور پر اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی ماں ہوں۔ ”میں کیتھرین روڈز ہوں۔“

اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ میرا نام سن کر وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیتھرین روڈز کون ہے۔

”تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟“ میں نے اسے آزمانے کے لیے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس سے پہلے میرا نام سنا ہے؟“

اس نے سر ہلا دیا لیکن اس کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ ”تم آ گئیں؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کار موٹر وے کی طرف بڑھا دی۔ میں نے کسی منزل کا تعین نہیں کیا تھا لیکن الزبتھ نے کہا کہ میں کار چلاتی رہوں۔ دراصل مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کار میں بیٹھے گی بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرا نام سنتے ہی چل دے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ بولی کہ میں اسے اسکول سے دور لے جاؤں۔

”اگر میں وہ نہ ہوں جو میں نے بتایا ہے تو؟“

”اور کون مجھ سے بات کرنا چاہے گا؟“ اس نے کہا۔

”اس کے علاوہ تم میرا نام بھی جانتی ہو۔“

”مجھے خوشی ہے کہ اس نے تمہارا نام نہیں بدلا۔ میرا مطلب تمہاری موجودہ ماں ہے۔“

”وہ بدلنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ میرا نام جارجیا رکھنا چاہتی تھی لیکن ڈیڈی نے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے تمہیں دکھ ہوگا۔“

”تم کس نام کو ترجیح دو گی؟“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہاری ممی اور ڈیڈی کیسے ہیں؟“

”ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے جب میں آٹھ برس کی تھی۔“

”مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم اس سے ملتی رہتی ہو؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ممّا یہ نہیں چاہتی۔ ڈیڈی ان کی کسی دوست کے ساتھ چلے گئے تھے جس کا ممّا کو بہت افسوس تھا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ڈیڈی سے ملنے سے منع کر دیا۔“

”وہ کہاں رہتے ہیں؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”وہ تم سے رابطے میں نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں صرف اس وجہ سے اسے کسی کو گود دینے پر تیار ہوئی تھی کہ الزبتھ کو ایک فیملی مل جائے گی لیکن اسے باپ سے دور رکھنا معاہدے کا حصہ نہیں تھا۔

میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے خط ملتے تھے؟“

”نہیں۔“

”تم سوچتی ہو... گی کہ میں نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔“

”ہاں۔“

آگے چل کر مجھے ایک کافی ہاؤس کا بورڈ نظر آیا۔ میں نے عمارت کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور بولی۔ ”میں کافی پینا چاہتی ہوں۔ تمہیں کچھ چاہیے۔“

”نہیں۔“ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

”کیا تم اندر نہیں آؤ گی؟“

”میں یہیں انتظار کروں گی۔“

میں لیڈیز روم میں گئی اور سنک پر کھڑے ہو کر منہ دھونے لگی۔ میں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو کیتھرین؟ تمہیں احساس ہے کہ تم نے اسے اغوا کر لیا ہے؟“

صبح گھر سے نکلتے وقت میرا خیال تھا کہ اگر میں اس سے بات کرنے میں کامیاب ہو گئی تو یہی کافی ہوگا۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ محفوظ اور خوش رہے پھر میں یہ جگہ چھوڑ دوں گی جب تک وہ اٹھارہ برس کی نہیں ہو جاتی۔ میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اس سے قانون کے مطابق سوشل سروس کے ذریعے رابطہ کر سکتی تھی۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ آنے پر تیار ہو جائے گی۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کر کافی، چاکلیٹ اور سوپ لیا اور کار کی طرف چل دی۔ میں نے ٹرے اپنے اور اس کے درمیان رکھی تو وہ بولی۔ ”میرے باپ کے بارے میں بتاؤ جو میرا حقیقی باپ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اسے قتل کر دیا تھا۔“

”وہ غیر ارادی قتل تھا۔“ میں نے کہا۔

”کسی کو شاٹ گن سے مار دینا غیر ارادی قتل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے حادثاتی کہا جا سکتا ہے۔“

”یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر میں فخر کر سکوں۔“

”پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟“

”اس لیے کہ اس کے ہاتھ بہت چلنے لگے تھے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شراب پی کر تو وہ بالکل آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔''
''بس یہی ایک وجہ تھی؟''
''یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اس کا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا جارہا تھا۔ اس کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ مقامی کونسل کا چیئرمین بھی منتخب ہو گیا تھا لیکن بارہ سال قبل اسے کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہو گیا۔ وہ یہ ناکامی برداشت نہ کر سکا اور اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کر دی۔ وہ اپنا غصہ مجھ پر اتارتا تھا۔ اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور جب میں اسے شراب پینے سے روکتی تو وہ اور زیادہ تشدد پر اتر آتا۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ اس سے شادی کر کے غلطی کی کیونکہ لوگوں نے مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا تھا پھر میں نے وہی کیا جو بہت سی عورتیں ان حالات میں کرتی ہیں۔ میں نے لوگوں سے چھپانا شروع کر دیا۔ ان پر یہی ظاہر کرتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ میں اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔''
''وہ ہمیشہ گھر میں شاٹ گن رکھتا تھا۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن وہ نشے میں دھت گھر آیا اور اپنی لینڈ روور لے جا کر باغ میں تمہارے وینڈی ہاؤس سے ٹکرا دی۔ شکر ہے کہ تم اس کے اندر نہیں بلکہ قریب ہی موجود تھیں۔ تم نے چلانا شروع کیا تو اس نے تمہیں مارا جب میں اس پر چلائی تو اس نے اپنی گن نکال لی۔ اس وقت تک میں تمہیں اپنی گود میں لے چکی تھی اور وہ ہم دونوں کو نشانے پر لیے ہوئے تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے التجا کی کہ ہمیں گولی نہ مارے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ٹریگر دبا دیا لیکن گولی نہیں چلی۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت وہ ہمیں نہ مار سکا تو بعد میں ضرور ایسا کرے گا۔''
''وہ کار میں سے فالتو کارتوس لینے گیا تو میں نے اس کی جیکٹ سے دو کارتوس نکال کر گن لوڈ کر لی۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے اسے ان کا خیال نہیں آیا۔ وہ جیسے ہی واپس آیا میں نے اسے گولی مار دی۔''
''میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ تم نے اس پر گن تانی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے گولی مارنا چاہتی تھیں۔''
''ہاں مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی۔''
''لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا؟''
''نہیں جیسا کہ میں نے کہا وہ یا میں، میرے وکیل نے ذاتی دفاع کا نکتہ اٹھایا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے مرتے ہوئے دیکھتی رہی اور میں نے ایمبولینس کو نہیں بلایا جب تک مجھے اس کے مرنے کا یقین نہیں ہو گیا۔ اسی لیے مجھے بارہ سال کی سزا ہوئی۔''
''میری مما کہتی ہے کہ تم پاگل ہو گئی تھیں۔ تم نے غصے میں آ کر اسے گولی مار دی اور مجھے تنہا چھوڑ دیا کیونکہ تم ذہنی طور پر اس قابل نہیں تھیں کہ ایک ماں کی ذمے داری سنبھال سکو۔''
''اب تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی۔'' میں نے کہا۔
''اب یہ تم پر ہے کہ اس پر یقین کرو یا نہیں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔''
الزبتھ مسکرائی اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی توجہ کسی اور جانب ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھی۔
''کیا تم کسی مشکل میں ہو؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''تھوڑی بہت۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں اپنے ساتھ لا کر میں نے پیرول کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔''
''اوہ۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔
''اور یہ کار بھی چوری کی ہے اور شاید اس وجہ سے مجھے دوبارہ جیل جانا پڑے۔'' وہ اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔
''لمبے عرصے کے لیے؟''
''نہیں۔ شاید دو مہینے کے لیے۔''
میں نے مڑ کر دیکھا۔ تین پولیس والے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ''جہاں تم جا رہی ہو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''کیا میں تمہیں خط لکھ سکتی ہوں یا ملنے آ سکتی ہوں؟''
''ضرور۔ مجھے خوشی ہو گی۔''
اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پولیس والے اب چند گز کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ الزبتھ میرے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے بولی۔ ''تم نے میرے لیے جو کیا۔ اس پر میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''
''یہ میری خوش نصیبی ہے۔''
''کیتھرین روڈز۔'' ایک پولیس آفیسر نے کہا۔
میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آ رہی ہوں۔''
''اپنا بیگ مت بھول جانا۔'' میں نے اسے بیگ پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ حیران ہوئی۔
''اس کی تہ میں کچھ ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔
''اس میں کچھ رقم ہے بلکہ کافی زیادہ۔ میرے واپس آنے تک اسے حفاظت سے رکھنا۔''
اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے چوری کی رقم امانت کے طور پر محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر دی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

محفلِ شعر و سخن

❋ مہتاب ادریس..... راولپنڈی

اس ایک پل میں یہاں ایک عمر بیت گئی
تری نگاہ کرم ہے کہ گردشِ ایام

❋ کمال انور..... کراچی

غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے
آندھی اڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشاں اسی راستے میں تھے

❋ صلاح الدین..... ٹنڈوالہیار

میرے ہونٹوں پہ نہیں تیرے گلے
یہ تو ہیں عرضِ محبت کے صلے

❋ راجہ ثاقب محمود جنجوعہ..... پنڈ دادن خان

سارے عہد کا بوجھ تھا سر پر، دل میں سارے جہاں کا غم
وقت کا جلتا بلتا صحرا ہم نے جس دم پار کیا
جاگتی گلیوں، اونچے گھروں میں زرد اندھیرا ناچتا ہے
جس لمحے سے ہم ڈرتے تھے، اس نے آخر وار کیا

❋ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

سپرد کرکے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں میں لوٹ آؤں گی

❋ داؤد اشفاق..... حجرہ شاہ مقیم

مدتوں پہلو میں پالا اور ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہوگیا

❋ ماہین فاطمہ..... حجرہ شاہ مقیم

میرے پختہ ارادے خود مری تقدیر بدلیں گے
میری قسمت نہیں محتاج ہاتھوں کی لکیروں کی

❋ ماہین بابر، فضل عباس..... گلیانہ روڈ کھاریاں

بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا
بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آ بھی جاتی ہے
اسے بھی غم نہیں ہوتا، مجھے بھی غم نہیں ہوتا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

❋ ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مقیم

برس رہی ہے حریم ہوس میں دولتِ حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

❋ اشفاق شاہین..... لاہور

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

❋ عبدالجبار رومی انصاری..... قصور

سکتے میں سب چراغ تھے، تارے تھے دم بخود
میں اس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی
اب کے بھی ہے جمی ہوئی آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دھند جو پچھلے برس میں تھی

❋ محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال

مرہم نہ بن سکے گی کبھی معذرت تیری
دل توڑنے سے پہلے تجھے سوچنا تو تھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

❄ بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
میں اداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے فرار پر
نہ دیے جلیں مری آنکھوں میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے

❄ ثمینہ علی......حیدرآباد
رُخ بدلنے میں اُسے دیر ہی کیا لگتی ہے
جس کسی کو بھی زمانے کی ہوا لگتی ہے
لوٹ آتے ہیں سرِشام پرندے گھر کو
اور پرچھائیں بھی دیوار سے جا لگتی ہے

❄ جہاں زیب احمد......لاڑکانہ
صد شکر، تو نے خواب سے چونکا دیا مجھے
صد شکر، ہو رہا ہے ترا التفات کم
تخلیقِ فن کروں گا بعنوانِ ارتقاء
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
آپ کہتے ہیں تو تسلیم کیے لیتے ہیں
ورنہ حالات سنبھل جائیں یہ ممکن تو نہیں

❄ طلحہ کمال......کراچی
نمی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوائیں آئی تو ہیں
برس بھی جائیں گی آخر، گھٹائیں چھائی تو ہیں
اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا
وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں

❄ شرمین عباسی......فیصل آباد
کل کو کل پر رکھوں جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے، آج کی رات یہیں رہ جاؤ
کب تک یوں پردے پردے میں حسنِ محبت کو جھٹلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والو سامنے آؤ

❄ محمد رشید سیال......روہڑی
تیرا کیا جائے گا میرا ہو کے اے جانِ ادا
چند لمحوں کے لیے ہم کو خوشی مل جائے گی

❄ عصمت علی......سرگودھا
روٹھنا اور مان جانا چاہتوں کا حسن ہے
کیسے دل تیرے جھگڑنے پر بگڑنا چھوڑ دے

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
دیکھو تو کتنے چین سے! کس درجہ مطمئن!
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہوئے

❄ ایس سجاد......ضلع اوکاڑہ
بزم سے اٹھ جائیں جب ہم گریباں چاک لوگ
کس کے گھر جائیں گی شہرِ عشق کی رسوائیاں

❄ نورالعین......اسلام آباد
ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اُکسانے آئے ہیں
ضمیرِ ارتقاء میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں
جو گردش میں رہیں گے اور کبھی خالی نہیں ہوں گے
ہم ایسے جام بزمِ دہر میں چھلکانے آئے ہیں

❄ فیصل خان......بہاولپور
کس کی تحویل میں تھے کس کے حوالے ہوئے لوگ
چشمِ گریہ میں رہے دل سے نکالے ہوئے لوگ
کب سے راہوں میں تری گرد بنے بیٹھے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے وقت کو ٹالے ہوئے لوگ

❄ مدحت......کراچی
دنیا بھی تو پاتال سے باہر کا سفر ہے
منزل کبھی رستوں کے حوالے نہیں کرنا
جس آگ سے روشن ہوا احساس کا آنگن
اس آگ کو اشکوں کے حوالے نہیں کرنا

❄ راحیلہ شفیق......سندھی ہوٹل، نیو کراچی
ہمارے عالمِ فرقت میں تنہائی نہیں ہوتی
تصور کی ملاقاتوں میں رسوائی نہیں ہوتی

❄ زرین خان آفریدی......حیدرآباد
جدائی صرف فاصلوں کا ہی تو نام نہیں
کچھ لوگ تو صدیوں سے ہاتھ تھامے جدا بیٹھے ہوتے ہیں

❄ اوشا راٹھی......مٹھی سندھ
لذتِ وصل سے بھی بڑھ کے مزہ آئے گا
اپنی تنہائی سے دل اپنا لگا کر دیکھو

❄ تبسم بانو......سیالکوٹ
رات آئی ہے بلاؤں سے رہائی دے گی
اب نہ دیوار نہ زنجیر دکھائی دے گی
یہ دھندلکا سا جو ہے اس کو غنیمت جانو
دیکھنا پھر کوئی صورت نہ سجھائی دے گی

❄ چلبلی ہیر......سیالکوٹ
دل کے احساس سے ملتا ہے محبت کو دوام......
پیار کے بول تو ہر شخص لیے پھرتا ہے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

❄ سعدیہ خورشید......ملتان

سب سے مشکل ہے اذیت یہ گوارا کرنا
دل سے اترے ہوئے لوگوں میں گزارہ کرنا

❄ محمد عمیر......کراچی

شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اُس کا چہرہ تھا کسی شب میں ستارے جیسا

❄ جنید احمد ملک......گلستانِ جوہر، کراچی

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

❄ مہر النساء......ساہیوال

کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دھند

❄ ذیشان انصاری......جہلم

اٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

❄ احمد علی......رحیم یار خان

جو دل کے سمندر سے ابھرتا ہے یقیں ہے
جو ذہن کے ساحل سے گزرتا ہے گماں ہے

❄ بشارت علی......چنیوٹ

درد کا احساس مجھ کو درد سے پہلے بھی ہے
چوٹ وہ سہلا رہا ہوں جو ابھی کھائی نہیں

❄ زاہد علی......کوئٹہ

پت جھڑ میں ڈالیوں پہ جو گزری گزر گئی
پھیلی ہوئی زمین کی جھولی تو بھر گئی

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد

ڈھونڈتا ہوگا ہمیں بھی تو ستارہ کوئی
گھر سے نکلیں تو نکل آئے گا رستہ کوئی

❄ حسان احمد......لاہور

تجھے نہیں ہے ابھی فرصت کرم نہ سہی
تھکے نہیں ہیں مرے ہاتھ بھی دعا کرتے

❄ زوہیب احمد ملک......گلستانِ جوہر، کراچی

شدتِ درد میں ہونٹوں پہ دعا کا ہونا
ثابت اس سے بھی تو ہوتا ہے خدا کا ہونا

❄ عامر علی......شاہ فیصل کالونی، کراچی

وعدہ تو ہے شب کا، مگر اب دن نہ کٹے گا
حیراں ہوں کہ یہ آج کی شب جانے کب آئے

❄ کہکشاں......پشاور

کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فق ہے رنگ تمہارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماؤ

❄ فاطمہ کنول......منڈی بہاؤالدین

بہت قریب نہ آؤ، کہ دور سے بھی ہم
وہ آنچ آئی کہ مرجھا گئے دلوں کے چمن

❄ عذرا وقار......خانیوال

اے ستارہ نشیں! چمن پیما
مانگتے ہیں ثبوت وحدت ہم

❄ نعمان راحیل......لاہور

مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

❄ فیض احمد......میانوالی

کچھ درگزر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
ورنہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے

❄ جمعہ خان......پشاور

تم اتنی دور سے چل کر مرے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو، تھکن مجھے دے دو

❄ فرید احمد......فیصل آباد

اک ٹیس فضا کے دل میں اٹھی
یا تیر نکل گیا کماں سے

❄ جاوید اختر رانا......پاکپتن شریف

تیرے ہجر میں ذہن سلگتا تھا، تیرے قرب میں آنکھیں جلتی ہیں
تجھے کھونا ایک قیامت تھا تیرا ملنا اور عذاب ہوا

کوپن برائے شمارہ اپریل 2018

محفلِ شعر و سخن

نام: --

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پتا: --

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حبس زدہ

مظہر سلیم ہاشمی

زندگی جب زنداں کا منظر نامہ بن جائے تو سانس لینے میں گھٹن کا احساس انسان کی ہمت ختم کر دیتا ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی ماحول میں زندہ رہنے پر مجبور تھی جہاں اس کی جان کا دشمن کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا اپنا سگا باپ تھا... ایسے میں جو گھر اس کی پناہ گاہ تھا وہی اس کی مقتل گاہ بن گیا۔

ایک پتھر دل باپ کی شقیق القلبی...... ایک لرزہ خیز واردات

ایڈ کو اپنے باس زولو کی بیٹی کو بوسٹن سے واپس لانے کا کام ملا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے کام کا ماہر تھا بلکہ بوسٹن کے بارے میں بھی تفصیل سے آگاہ تھا۔ ویسے بھی تمام کارندوں میں وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ پارس نے تمام تفصیلات دوبارہ سے زیادہ دہرائیں، حالانکہ... ایڈ کو یہ سب پہلی مرتبہ میں ہی ذہن نشین ہو گیا تھا۔ اس نے پارس کی لاف وگزاف میں دخل دینے کی بالکل کوشش نہ کی اور اپنی بیئر کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتا رہا۔

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''امید تو نہیں ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوگی..... لیکن اگر ہو بھی جائے تو تم پولیس والوں سے واقفیت رکھتے ہو..... امید ہے کہ سب بہ آسانی سنبھال لو گے۔ وہاں کے گلی کوچے تمہارے جانے پہچانے ہیں..... فرار کے وقت تم کسی اندھی گلی میں بھی پھنسنے سے رہے..... مجھے پوری توقع ہے کہ تم اسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے آؤ گے.....''

ایڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیئر کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زولو کا حکم کون ٹال سکتا ہے؟ اگر اسے اس کام کے لیے منتخب کر ہی لیا گیا تھا تو وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پارس کی موجودگی البتہ اس کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بن رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زولو کو آخر ایک پیچ کا آدمی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہ سب کام اسے براہِ راست بھی تو بتا سکتا تھا۔

البتہ اسے زولو پر اعتماد تھا، اس وجہ سے وہ پارس کی باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔

''کیا تم کل نکل سکتے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اگلے دن وہ اپنی گاڑی میں پوری تیاری کے ساتھ بوسٹن کی جانب رواں دواں تھا۔ ساتھ والی نشست پر اس کا بیگ پڑا تھا جس میں ضرورت کے مطابق کپڑے تھے۔ اپنی نائن ایم ایم کی اسمتھ اینڈ ویسن گن اس نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں دو فاضل میگزینز کے ساتھ چھپا رکھی تھی۔

وہ جمعے کا دن تھا اور اپنی منزل تک پہنچنے میں اسے چار گھنٹے کا وقت درکار تھا۔

ابھی سیاحوں کی آمد کا موسم شروع نہیں ہوا تھا، ٹریفک کا دباؤ کم ہونے کے باوجود اس نے اپنی شیورلے کی رفتار ستر سے زیادہ نہیں ہونے دی تھی۔ میساچوسٹس کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل فون سے ایک پرانا نمبر ملایا۔

''کون بول رہا ہے؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فون اٹھانے والے نے پوچھا تو اس کا لہجہ مشرقِ وسطیٰ کے رہائشی ہونے کا غماز تھا۔

''کرٹ..... میں ایڈ..... مصروف تو نہیں ہو؟''

''او خدایا..... تم..... تم کہاں سے بول رہے ہو؟''

''سٹرٹ برج کے آس پاس ہوں.....'' وہ سڑک کنارے لگے سائن بورڈ کو پڑھتے ہوئے بولا۔

''یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ کیا تم میرے پاس رکو گے؟ میں نے آج ایک دعوت کا اہتمام کیا ہوا ہے..... سب پرانے لوگ جمع ہوں گے..... تمہاری آمد تو پارٹی کو چار چاند لگا دے گی..... تم آ رہے ہو نا؟'' کرٹ بولتے بولتے بے یقینی سے پوچھ بیٹھا۔

''کوشش کروں گا.....'' ایڈ کے لہجے میں ہچکچاہٹ سی تھی۔

''رات تو میرے گھر پر ہی گزارو گے نا؟''

''ہاں..... لیکن ساری رات نہیں..... مجھے پارٹی ادھوری چھوڑ کر ایک خاص کام کے لیے جانا پڑے گا..... اور شاید پھر شب بسری کے لیے کسی ہوٹل کو ٹھکانا بناؤں گا.....''

''چارلس ہوٹل کیسا رہے گا؟ تمہاری بکنگ کرا دوں وہاں پر؟''

''اوہ نہیں..... تمہارا شکریہ کرٹ لیکن میں چاہوں گا کہ اس بار میں اپنا انتظام خود کروں..... ہاں البتہ بروکلین کے پاس کسی ہوٹل کا پتا بتا دو تو مجھے انتخاب کرنے میں آسانی ہوگی۔''

''نیوٹن ہوٹل بہترین رہے گا..... لیکن مجھ سے مل کر جانا.....'' یہ کہہ کر وہ ایڈ کو پتا سمجھانے لگا لیکن اس نے بات کاٹ دی۔

''مجھے یاد ہے ایڈریس تمہارا..... اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ میں سب بھول جاؤں.....''

''تم بس شام کو جلدی آ جانا، اگر تمہارا کام اس میں حائل نہ ہو تو..... غروبِ آفتاب کے بعد سے ہی پارٹی شروع ہو جائے گی..... اور بہت دیر تک چلے گی..... تم جلدی آ جاؤ گے تو ہمیں باتیں کرنے کا وقت مل جائے گا..... بہت وقت بیت گیا ایڈورڈ میرے بچے..... بہت وقت.....''

''میں پہنچ جاؤں گا.....'' اس سے پہلے کہ کرٹ مزید جذباتی ہوتا ایڈ نے ہامی بھرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

زولو نے اپنی بیٹی کا نام ہی الیسا رکھا تھا جو کہ آ بیل مجھے مار والی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ الیزا نام سن کر ہی ایڈ کو ڈھول مٹی اور میک اپ میں لتھڑی حسینہ یاد آ جاتی تھی۔ بچپن سے اب تک وہ الیزا سے کئی بار مل چکا تھا..... حتیٰ کہ اس کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔

''مشکل ہی ہے کہ اس کو یہ بات یاد ہو.....'' اس نے سوچا۔

وہ کم سنی سے ہی ایک بدتمیز لڑکی شمار کی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نخرے کرنا اور غلیظ گالیاں بکنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

اب وہ بیس برس کی ہو چکی تھی اور اتنی نادان تھی کہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نیو یارک سے بوسٹن بھاگ کر آنے کی بے وقوفی کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید وہ اپنے باپ کے صبر کا امتحان لینا چاہتی تھی...... دیکھنا چاہتی تھی کہ کہاں تک ... اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موم کر سکتی ہے۔ اس کی گستاخیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں...... ایڈ کو خدشہ تھا کہ کہیں کسی روز...... زولو اپنی بیٹی کے قتل کا حکم ہی نہ دے دے اور ایڈ میں سرتابی کی مجال تک نہ تھی۔

کمرے کی تنہائی میسر آتے ہی ایڈ نے اپنی جیکٹ اتار کر الماری میں لٹکا دی۔ نقرئی بکل والے ہولسٹر میں مقید اپنے پسٹل کو نکال کر ایسے ہاتھ میں جھلایا جیسے وزن کر رہا ہو۔ میگزین کی چودہ گولیوں کے ساتھ ایک گولی چیمبر میں بھی موجود تھی۔ ہینڈ گن کے ساتھ اس نے دو اضافی میگزین احتیاط کے ساتھ ہی بیڈ کے ساتھ والی دراز میں رکھ دیے۔

نیم گرم پانی سے غسل لے کر وہ فارغ ہو چکا تھا، سو دروازے پر ہونے والی دستک کا جواب اس نے محض ایک تولیے میں ملبوس دیا، ویٹر گرما گرم کھانا لایا تھا جس کو اس نے شانِ بے نیازی سے بیس ڈالر کی ٹپ دے دی۔

”شکریہ مسٹر فاریسٹر......“ ویٹر تشکرانہ انداز میں جھک گیا۔

”ارے...... خیر ہے۔“ ایڈ نے مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

کھانا کھانے کے دوران وہ ہائی وے سے گزرتے ٹریفک کو ہی تکتا رہا۔ اس کے دل میں آیا کہ کاش وہ دوسری جانب والا کمرا لیتا تو بل کھاتے دریا پر ڈوبتے سورج کا نظارہ دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کر سکتا تھا۔

کھانے اور پھر ستانے کے کچھ دیر بعد ہی اس کی شیوی ایک بار پھر سیاہ کولتار والی سڑک پر رواں دواں تھی۔ اندھیرا تیزی سے پھیل چکا تھا اور اس نے بھی ہینڈ گن کو اپنی سیٹ کے نیچے محفوظ کر دیا تھا۔ کیمبرج ہمیشہ کی طرح پُرہجوم اور یادگار تھا۔ اپنی شیوی کو ڈیوس اسکوائر کے پاس پارک کر کے وہ پیدل ہی دوسرے بلاک میں موجود کرٹ کے گھر کی جانب چل پڑا۔

تین منزلہ مکان کی پُرشکوہ عمارت پوری شان سے ایستادہ تھی۔ پارٹی کی وجہ سے روشنیوں کی خصوصی سجاوٹ کی گئی تھی۔ ایڈ نے گھوم کر چاروں طرف سے جائزہ لیا اور باغ کی آرائش کے لیے کی گئی کرٹ کی کوششوں کو سراہے بنا نہ رہ سکا۔ گھر کی عقبی سمت میں ٹھہر کر وہ نظارہ کرنے لگا۔ پہلی منزل کی کھڑکی سے اس نے دو اجنبی عورتوں کو باتوں میں محو دیکھا...... تھوڑی دیر بعد اس کی متلاشی نظریں اپنے میزبان کو ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گئیں۔ پچھلے تین سال کے مقابلے میں وہ کافی بھاری ہو گیا تھا۔ حسبِ سابق اس کی بھوری ناک پر جمی نظر کی عینک اب گری کہ تب گری کا اثر دے رہی تھی۔ وہ کسی سے ہاتھ ہلا ہلا کر بات کر رہا تھا اور آنکھیں مشروب کے نشے سے مخمور نظر آ رہی تھیں۔

دوسری کھڑکی سے آنے والی آواز پر وہ متوجہ ہوا تو کھلکھلا اٹھا۔ اپنے جہازی سائز کے پنجے اٹھائے ایک روٹ وائیلر نسل کا کتا...... ایڈ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی غراہٹ اتنی زیادہ تھی کہ وہ شیشے کی اوٹ سے بھی سنائی دے رہی تھی۔ کرٹ نے چونک کر اپنے کتے کو دیکھا اور اس کی غراہٹ پر باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایڈ کی ادھوری جھلک میں کوئی بھی تعین کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دونوں ہی کھڑکی سے ہٹ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ان کا سایہ عقبی دروازے پر نمودار ہو گیا۔

”میں چھوڑوں گا نہیں تم کو...... آوارہ لڑکو...... یہ کتوں سے ہوشیار رہنے کا بورڈ میں نے خوامخواہ نہیں لگا رکھا...... بروزر حملہ کرو......“ کرٹ نے چلاتے ہوئے کہا اور اپنے کتے ’بروزر‘ کی زنجیر چھوڑ دی۔

بروزر ایڈ کی جانب تیزی سے بڑھا جو کہ ابھی تک ساکت کھڑا تھا۔ جیسے جیسے وہ ایڈ کے قریب آ رہا تھا ویسے ویسے ہی اس کی غراہٹ خوشی آمیز انداز میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ایڈ نے بھی پرجوش انداز میں بروزر کو گلے لگا لیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دو چار بوسے دے ڈالے۔ کرٹ جو پہلے بے یقینی کا شکار تھا بروزر کے اس انداز پر خوش ہو گیا اور ایڈ کو چند باتیں سنا دیں۔

”میری خوش نصیبی...... میں تمہیں دیکھ پایا......“ اس کی آواز فرطِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ”یہ میرے کتے کو پیار کرنا چھوڑو اور ذرا روشنی میں آؤ شیطان لڑکے...... تمہیں اچھی طرح دیکھے زمانے بیت گئے۔“ کرٹ کے انداز میں حقیقی محبت جھلک رہی تھی جو فی زمانہ خال خال ہی لوگوں کو میسر آتی تھی۔

”اور اس رکھوالی کے کتے کو تو اس کے کام سے ہی ہٹا دینا چاہیے...... نکما اتنا ہے کہ غیر متعلقہ لوگوں کے آنے پر حملہ کرنے کے بجائے پیار جتانے لگتا ہے۔“

ایڈ کا اس بات پر قہقہہ گونج گیا۔

”ہاں ہاں...... ہنس لو...... ویسے چاہے تم اسے میرے پاس چھوڑ گئے تھے لیکن یہ ہمیشہ سے تمہارا ہی رہا ہے...... دیکھا کیسے پل بھر میں تمہیں پہچان لیا......“ کرٹ ناراضی آمیز لہجے میں ایک بار پھر محبت جتاتے ہوئے بولا اور ایڈ کو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گلے لگالیا۔

"یہ بالکل اصلی ہے...... میرے بار سلوتا والے دوست کا تحفہ ہے......وہ بھی تمہاری طرح خوش لباسی کے خبط میں مبتلا ہے......" طویل عرصے بعد ملاقات کے تکلفات سے گزرنے کے بعد کرٹ اسے اپنے اسٹڈی روم میں لے آیا تھا اور گلاس پکڑا چکا تھا۔

"تم جس سلسلے میں آئے ہو...... کیا آج رات ہی وہ کام سرانجام دینا ہے؟" اس نے ایڈ سے پوچھا۔

"ایک اور گلاس کے بعد تو بالکل بھی نہیں......" ایڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوشش کروں گا کہ کل تک کام، انجام بخیر ہوجائے......"

"پھر واپس نیویارک؟"

"ارادہ تو اتوار کی واپسی کا ہے......"

"تب میرے ساتھ لنچ ضرور کرنا۔ ہم ساحل پر جائیں گے...... اور وہاں تمہارے پسندیدہ 'گائے کے گوشت کے پسندے' ضرور کھائیں گے۔"

"اف...... کیا دور یاد دلا دیا؟ میں تو بھول بھال ہی گیا ہوں کہ ان کا ذائقہ کیسا ہوتا تھا...... یقیناً چلیں گے۔"

"ہاں اور اصلی والے پہ چلیں گے...... ان کی شہرت دیکھ کر یہاں بہت سے نقال اپنی دکانیں سجا کر بیٹھ گئے ہیں...... لیکن اصلی والے تو کمال کے ذائقہ دار ہوتے ہیں...... گوشت کے اندر تک سمندری نمک کی لذت کو محسوس کیا جاسکتا ہے......"

مزید مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اسٹڈی روم کے دروازے کے باہر سے آنے والی ان کی آوازیں ایڈ بخوبی سن سکتا تھا۔ بروزر کان نہوڑائے اس کے قدموں میں اونگھ رہا تھا۔

"تمہارے نئے شاگرد کیسے ہیں؟"

کمرے میں چھائی خاموشی کو ختم کرنے کا اس سے کوئی بہتر طریقہ نہ ملا تو اس نے یہی سوال داغ دیا۔

"بے وقوف...... کم عقل...... پتا نہیں کہاں سے منہ اٹھا کر آجاتے ہیں۔ تمہارے زمانے کے مقابلے میں تو یہ کچرے کا ڈھیر لگتے ہیں ایڈورڈ...... اسمارٹ فونز کے اتنے شوقین ہیں کہ میں ان کو باغ والے حصے میں ہی رو کے رکھتا ہوں...... ہمیشہ خدشہ ہی لگا رہتا ہے کہ اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا تو کسی ٹرک کے نیچے نہ آجائیں......" کرٹ نے بھڑاس نکالنا شروع کر دی تھی۔

"پھر بھی...... کوئی تو قابل ہوگا......؟"

"تم ہمیشہ میری آنکھوں کے تارے رہے ہو...... تم جانتے ہو کہ میرے پسندیدہ طالب علم تھے...... میرا چمکتا تارا...... میری امید...... تمہیں غلط صحیح کی بہت اعلیٰ پہچان تھی لیکن ساتھ میں تمہیں حقیقی دنیا کے چلن سے جو آگہی تھی وہ صدیوں میں ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے...... میرے بچے ایڈورڈ، تمہارے زمانے میں اچھی نیت والوں کی کمی نہیں تھی۔ سب ہی جوان لوگ انقلاب لانے کے خواہش مند تھے...... ایک پُرامن انقلاب۔ یہ بس تمہاری عقل ہی تھی کہ تم نے خوابوں میں رہنے کے بجائے سیاست کو عملی طور پر اپنی زندگی میں شامل کرلیا......" کرٹ کی آنکھیں مشروب کے نشے سے سرخ ہورہی تھیں اور وہ کتاب زندگی کی پرانی یادوں کے باب تیزی سے پلٹتا جارہا تھا۔

دوسرے دور کے آغاز پر کرٹ نے اس کے ہاتھ میں جو تھمایا تھا...... ایڈ ابھی تک اسی گلاس سے مختصر چسکیاں لے رہا تھا۔

"آہ...... یہ دنیا کسی ظالم درندے کے مانند ہے جو اپنے خونخوار پنجوں میں انسان کو جکڑ لیتی ہے...... محبت اور خلوص والے جذبات کو ملیامیٹ کر کے ہی اسے چین آتا ہے...... ہم کسی مقصد کے تحت اس دنیا میں وجود پذیر ہوتے ہیں......"

کرٹ غالباً بہکنے لگا تھا لیکن عین موقع پر سنبھل گیا۔

"تم...... میرے بچے تم...... ہمیشہ سے ہی یہ بات سمجھتے تھے۔ انیس سال کی عمر میں بھی تم اس بات سے واقف تھے کہ یہ کانٹوں کا بستر ہے......"

"تم نے دنیا کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" کرٹ نے اپنا گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا" حالانکہ تم تو جانتے بھی تھے کہ اس دنیا کو کیسے بدلا جاسکتا ہے......"

"کس نے کہا میں نے کوشش نہیں کی؟" ایڈ کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"پھر تم کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ کیا پیسا کمانے کی چاہ اتنی بڑی تھی کہ دنیا میں امن لانے کا خواب اس کے سامنے ماند پڑ گیا؟ یا پھر تم نے اپنی کوئی نئی دنیا ہی تلاش کر لی؟"

"نہیں پروفیسر...... ایسا کچھ نہیں...... میں بس یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس دنیا کا نظام کیسے چلتا ہے؟" ایڈ نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔

پروفیسر کرٹ کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ اتنے دنوں کی بے کلی کی وجہ اسے سمجھ آگئی تھی...... اس ظالم دنیا میں نارمل زندگی کی طرف

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

واپسی کا ارادہ جواب تک دماغ کے بند دریچوں میں قید تھا وہ سب قفل توڑ کر باہر آ گیا تھا۔

کرٹ کے دماغ پر خمار طاری ہو گیا تھا۔ لیونگ روم میں جاری پارٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ ضرورت سے زیادہ چہک رہا تھا۔ مہمان اپنی مستیوں میں مگن تھے۔ ایک جانب چند جوڑے تیز موسیقی پر رقص میں مصروف تھے۔ کرٹ نے جب ایڈ کو لوگوں سے متعارف کرانا شروع کیا تو اس نے اجازت لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ کرٹ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا۔

''یہ دیکھو...... یہ ایڈورڈ...... میرا دمکتا تارا...... یہ میری آخری امید تھا...... اب نیویارک میں کسی سائے کے مانند رہتا ہے...... دیکھو میری اس ناکامی کو...... اس نے سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔''

ایڈ اسی راستے سے واپس ہو لیا جہاں سے وہ داخل ہوا تھا۔ کھلی ہوا میں گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اپنی کار کی جانب چل پڑا۔ پروفیسر کرٹ کے الفاظ اس کے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

☆☆☆

ایڈ اپنے ہوٹل میں صبح چھ بجے تک محوِ خواب رہا۔ بھرپور نیند کے بعد اس نے کرس ہیمنڈ کی فوٹو کو بغور دیکھا جو پارس نے اسے روانہ ہونے سے قبل دی تھی۔ وہ گٹھے ہوئے مضبوط بدن کا مالک تھا جس پر جابجا ٹیٹو گدے ہوئے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی پناہ میں آ کر الیزا خام خیالی کا شکار ہو گئی تھی کہ وہ اب محفوظ ہو گئی ہے۔

ہیمنڈ خود کو ساؤتھ بوسٹن کے ایک گینگ سے متعلق بتاتا تھا، حقیقت میں وہ سڑک چھاپ موالی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بڑے جرائم پیشہ لوگوں کی گاڑیاں ڈرائیو کرتا یا کبھی کبھار بوڑھوں، بچوں سے مار پیٹ کر کے اپنی بدمعاشی کا بھرم قائم رکھتا تھا۔

''تم نے شاید...... کافی عرصے سے اسے نہ دیکھا ہو...... اور اس لوفر کے اردگرد جانے کتنی آوارہ عورتیں منڈلا رہی ہوں گی، اس لیے یہ بھی لیتے جاؤ۔'' پارس نے الیزا کی ایک تازہ فوٹوگراف دیتے ہوئے کہا تھا۔

بلیک اینڈ وائٹ ہونے کے باوجود ایڈ کو وہ اس میں کافی دلکش محسوس ہوئی۔ ہوا کے جھونکوں سے لہراتے بالوں کے ساتھ وہ ایک جانب دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی بات کو بہت غور سے سن رہی ہو......

بروکلین کی ایک گلی کا ایڈریس بھی اس کو لکھ کر دیا گیا تھا جس پر یہ پیغام درج تھا......

''لڑکا ہر جمعے کی رات، رات گئے تک شہر میں موج مستی کرتا ہے لیکن واپس اپنے انکل کے مکان پر ہی لوٹتا ہے۔''

روٹ نائن پر اپنی شیوی دوڑاتے ہوئے ایڈ اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ بروکلین کی گلیوں میں داخلے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار بڑی مدھم کر دی تھی۔ قیمتی پتھروں سے بنی عمارتیں اس وقت سنسان ویرانوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ مکان والی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی اس کی جانب چل پڑا۔ سو سال پہلے کے کسی اصطبل کی آرائش کر کے مکان کی صورت حاصل کرنے والی وہ عمارت اپنے اردگرد سے بڑا مختلف تاثر پیش کر رہی تھی۔ سامنے کا حصہ اگرچہ چھوٹا تھا لیکن نیم دائرے کی شکل والے ڈرائیو وے میں دو گاڑیاں ٹھہرانے کی گنجائش موجود تھی۔ ایک سرمئی ٹرک کی نمبر پلیٹ دیکھ کر ایڈ کو یاد آیا کہ یہ الیزا کی ملکیت ہے...... شاید اس کے باپ نے ایک سال قبل سالگرہ کے تحفے میں اسے دیا تھا۔ دوسری کار کوئی یوربی اسپورٹس کمپنی کی تھی...... جو کہ ساتھ والے لان کی گھاس کو روندتے ہوئے پارک کی گئی تھی۔

ایڈ نے مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور تیزی سے دستک دے ڈالی۔ تقریباً فوراً ہی ایک چینی.... شکل والے شخص نے دروازہ کھولا اور اس کی جھری میں سے دیکھتے ہوئے بولنا چاہا۔

''کون......'' الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایڈ کی زوردار ٹکر سے دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ کچھ بولنے کی حسرت لیے بری طرح کراہ اٹھا۔

ایڈ کسی خودکار مشین کی طرح متحرک تھا...... اس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران اس نے نہایت تیزی کے ساتھ ہولسٹر سے گن نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ خوش قسمتی سے مضبوط لکڑی کا دروازہ اس شخص کے عین منہ پر لگا تھا جس کو پکڑ کر وہ دہرا ہوا جا رہا تھا۔

اندر داخل ہو کر ایڈ نے سب سے پہلا کام دروازہ بند کرنے کا کیا اور اس کے بعد اس چینی نقوش والے شخص پر اپنی گن تان لی۔ شدید چوٹ کے باوجود بھی وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں تھا۔ اس لمبے تڑنگے شخص کے پاس بھی ایک عدد پستول موجود تھا لیکن فی الحال وہ اپنے چہرے کے بارے میں زیادہ فکرمند تھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑ رہی تھیں جبکہ ہاتھوں سے اپنے منہ کو سہلا رہا تھا۔ وہ گہرے سانس لے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہا تھا لیکن ابھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایڈ نے اپنی گن سے اشارہ کیا اور وہ سمجھنے کے انداز میں تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

اب بھی اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔

ایڈ فوراً ہی اس کے پیچھے پہنچا اور پوری قوت سے گھما کر ایک لات اس کی کنپٹی پر رسید کر دی۔۔ اور وہ چوٹ کھا کر اپنے بھاری وجود کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ ایڈ نے اس کی لمبی بے ہوشی کا اندازہ لگانے کے ساتھ ہی اس کا ریوالور نکال لیا، ایک جھٹکے سے اس کا چیمبر کھول کر چھ کی چھ گولیاں فرش پر پھینکیں اور ریوالور کو ساتھ پڑے ایک آرائشی پودے والے گملے میں ڈال دیا۔

مکان ایک سیدھی لائن میں بنا ہوا تھا جس میں ایک کے بعد ایک کمرا قطار کی صورت میں موجود تھا۔ ایڈ نے تیزی سے لیونگ روم، طعام گاہ اور باورچی خانے کو پار کیا...... دروازے کھلے ہونے کے باعث اسے رک کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

اگلا دروازہ مقفل تھا اور دیگر کے مقابلے میں مختصر بھی تھا۔ ایڈ نے دھکا مارنے سے قبل گن کو مضبوطی سے اپنے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور دوڑ کر ایک زوردار ٹکر رسید کر دی۔

ایڈ اور چوبی دروازہ بیک وقت کمرے کے فرش پر آن گرے تھے۔

کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن....... ٹوٹے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی ایڈ کے لیے کافی تھی۔ ایک سایہ سا تیزی سے اس کی جانب آیا لیکن اس نے قابل دید پھرتی سے اپنے بدن کو جنبش دی اور ایک جانب ہو گیا۔ اس نے آنے والے کو سختی سے پکڑا اور تیزی سے اس کے جسم کو دائیں جانب دھکیلتا ہوا راہداری میں لے آیا۔

ہیمنڈ نے گالیاں دینے کی کوشش کی لیکن بازو مروڑنے پر وہ چلا کر ہی رہ گیا۔ روشنی میں ایڈ نے جائزہ لیا تو اس کی بلند قامتی اور ڈیل ڈول سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ قدیم طرز کے بنوائے گئے ٹیٹو پوری طرح سے عیاں تھے کیونکہ ہیمنڈ کے بدن پر اس وقت صرف ایک زیر جامہ تھا۔ ایڈ نے دھکا دے کر اسے ٹائلوں والے خوبصورت فرش پر گرا دیا۔

پارکس نے آمد سے قبل اس کو زولو کی ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی تھیں...... اور ایڈ کو بیئر پینے کے دوران کہی گئی وہ ساری باتیں ازبر تھیں۔

”اس کی پھینٹی لگا دینا...... اور اگر ضروری سمجھو تو بے شک جان سے مار دینا...... لیکن اس کی مار لگانا از حد ضروری ہے...... کوشش کرنا کہ یہ مار الیزا کے سامنے لگاؤ۔ اس احمق کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ وہ کس گدھے کے ساتھ بھاگی ہے جو مار پڑنے پر بری طرح رینگنے لگتا ہے......“

ایڈ نے گن اس پر تانتے ہوئے الیزا کو اندھیرے کمرے میں آواز دی۔ وہ بستر کی چادر میں لپٹی فوراً باہر نکل آئی۔ کسی بگڑی ہوئی شہزادی کے بجائے وہ اس وقت شدید خوفزدہ لڑکی لگ رہی تھی۔ ایڈ نے ہیمنڈ کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ایڈ سے قد میں کوئی دو تین انچ اوپر ہی تھا اور وزن میں کوئی پچاس پونڈ زیادہ۔

ایڈ نے گن سے میگزین باہر کھینچ لیا، چیمبر میں موجود اکلوتی گولی بھی ماہرانہ انداز سے باہر نکالی اور گن سمیت سب کچھ کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اب وہ نہتا ہیمنڈ کے سامنے کھڑا چیلنج کر رہا تھا۔

”آجاؤ......“

”ماں......“ ہیمنڈ ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔

اس کی رفتار طوفانی تھی اور اس وقت وہ کسی انسان سے ٹکراتا تو شاید اس کی جان جانے کا سبب بن سکتا تھا۔ ایڈ نے سانس روک لی۔

اس نے ہیمنڈ کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا اور اسے اپنے سر پر ہاتھ مارنے تک رکا رہا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ بلند ہوا ایڈ پھرتی سے ایک جانب ہوا اور اسی لمحے اپنی داہنی ٹانگ پر گھومتے ہوئے ایک لیفٹ راؤنڈ ہارس کک ہیمنڈ کی پسلیوں میں جڑ دی۔ اسٹیل کے تلے کی ضرب خوفناک تھی اور ایسی آواز آئی جیسے برف کے ٹکڑے کو توڑ دیا گیا ہو۔

ایڈ اچھل کر ایک جانب ہو گیا...... وہ چاہتا تھا کہ ہیمنڈ محسوس کرے کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہیمنڈ نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی گھٹنے کے بل ڈھے سا گیا۔ وہ ایڈ کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ تکلیف کی شدت سے اس کے چہرے کا زاویہ ہر لمحہ تبدیل ہو رہا تھا۔

”کھڑے ہو لڑکے...... ذرا اپنی جوانی کا جوش ادھر بھی تو دکھاؤ......“ ایڈ ابھی تک اپنی جگہ پر دھیرے دھیرے اچھل رہا تھا...... الیزا یہ سب نہ سہہ سکی...... وہ دیکھ چکی تھی کہ ہیمنڈ بری طرح زخمی ہو چکا ہے۔

”بے غیرت انسان......“ وہ ایڈ سے مخاطب ہوئی۔

”اسے چھوڑ دو...... چلتی ہوں میں تمہارے ساتھ...... کیا یہ کافی نہیں ہوگا؟“

ہیمنڈ کے حواس کسی قدر قابو میں آ چکے تھے۔ اپنے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دائیں پہلو کو دباتے ہوئے وہ ایک بار پھر ایڈ کی جانب بڑھا۔

ایڈ نے اس بار دونوں کے درمیان فاصلہ کم کیا..... ہیمنڈ نے فوراً اپنا چہرہ بچانے کے لیے ہاتھ اوپر کیے..... لیکن یہی ایڈ کی چال تھی۔ اس نے فوراً اس کے مضروب پہلو پر ہاتھ رکھ دیا اور تیزی سے دبانے لگا۔

ہیمنڈ کی فلک شگاف چیخیں نکل گئیں۔

اس نے ایڈ کا گلا پکڑنے کی کوشش کی لیکن بے تحاشا درد کی کیفیت نے اس کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

ایڈ نے ابھی تک دباؤ ڈالا ہوا تھا..... اس نے اچانک بازو پکڑ کر مروڑ دیا اور ٹوٹی پسلی کو ایک جھٹکا دے دیا۔ درد کی شدت سے ہیمنڈ کا چہرہ سرخ سے جامنی ہو گیا تھا اور آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ الیزا نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔

دزدیدہ نگاہوں سے ایڈ نے دیکھ لیا تھا کہ وہ تیزی سے کمرے کی اندرونی جانب لپکی تھی چنانچہ اس نے ہیمنڈ سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک طوفانی مکا اس کی آنکھ پر جڑ دیا۔ بے ہوش ہو کر ہیمنڈ کسی بوری کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ایڈ تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ الیزا اس وقت ایک چھوٹے کیلیبر کی ہینڈ گن میں گولیاں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ ایڈ نے اس کے ہاتھ تھامے اور مروڑ کر آرام سے گن چھین لی۔ وہ کراہی اور اس کے کندھے ڈھلک گئے جیسے شکست خوردہ ہو گئی ہو۔

یہ ایڈ کو بے وقوف بنانے کی کوشش تھی جس میں وہ کامیاب رہی۔ ایڈ کا چہرہ اس کی پہنچ میں تھا، اس لیے جیسے ہی وہ ڈھیلا پڑا اس نے فوراً اپنے لمبے ناخنوں سے ادھیڑ ڈالا۔ خراشیں اتنی گہری تھیں کہ ان سے خون رسنے لگا لیکن وہ ابھی تک چلاتے ہوئے اس کا منہ نوچنے کی کوشش میں مگن تھی..... ساتھ ساتھ وہ ہذیانی انداز میں قہقہے بھی لگا رہی تھی۔ ایڈ کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے ایک مکا اس کے چہرے پر بھی جڑ دیا، وہ لڑھکتی ہوئی الماری کے سامنے قالین پر گر گئی۔

ایڈ چند لمحوں تک اس کے سینے کے نشیب و فراز پر نگاہ جما کر دیکھتا رہا جہاں مدھم سانسیں رواں تھیں۔

جب اطمینان ہو گیا کہ وہ اس بار کوئی مکر نہیں کر رہی تو وہ تیزی سے جھکا اور ہینڈ گن کو اٹھاتے ہوئے خواب گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ چرس اور دیگر منشیات موجود تھیں لیکن ہیروئین کی عدم موجودگی پر اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ زد لو کو شک تھا کہ وہ ہیروئین کا نشہ کرنے لگی ہے..... اس کی بانہیں زرد اور پتلی تھیں لیکن انجکشن کے داغوں سے صاف تھیں۔

ایڈ نے احتیاط سے الیزا کو اپنی گود میں لیا اور اچھی طرح اس کی کہنی کو دیکھا۔ اس کے سوجے ہوئے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ چوٹ کے نشان کے ساتھ ایک ہلکا سا کٹ بھی ابھر آیا تھا۔ وہ نرمی سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اچھا..... نہیں..... کیا؟“ وہ بے ربط سا بولنے لگی۔

”آرام سے..... آرام سے..... جاگتی رہو..... ٹھیک ہے؟ زیادہ دیر بے ہوش رہیں تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ اب تم اٹھ جاؤ اور میرے ساتھ رہو..... ہمیں برف کی ضرورت ہے..... کیا تم کھڑی ہو سکتی ہو؟“ ایڈ نے پچکارنے کے انداز میں حکم دیا۔

وہ اسے سہارا دے کر کچن تک لے آیا..... الیزا کے قدم ابھی تک لرز رہے تھے لیکن ایڈ کو اطمینان تھا کہ وہ اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے خود کو سنبھال رہی تھی۔

ہیمنڈ ابھی تک اسی حالت میں زمین چاٹ رہا تھا جس میں ایڈ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ ایڈ نے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں برف ڈال لی۔

”اپنی چیزیں فٹافٹ سمیٹ لو..... تمہیں ابھی گھر بھی جانا ہے.....“

”اچھا.....“

ایڈ نے اسے موقع دیا کہ وہ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لے..... اس دوران اس نے مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ مکان ہیمنڈ کے انکل فران ڈوئل کی ملکیت تھا..... جو کہ علاقے کا مشہور غنڈا تھا۔ فران کی بہن، کرس ہیمنڈ کی ماں تھی..... اسی وجہ سے وہ نکما ایک کار، ٹیٹو والی باڈی اور اس گھر کا مالک بن بیٹھا تھا۔

مکان کی زیبائش نہایت عمدہ انداز میں کی گئی تھی..... لگتا ہی نہیں تھا کہ اس میں ہیمنڈ جیسا کوئی غنڈا، موالی بھی رہتا ہوگا۔ انیسویں صدی کی خوبصورت تصاویر سے ایک ایک دیوار مزین تھی۔ شطرنج کی بساط کی طرح سفید و سیاہ ٹائلیں فرش کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھیں..... جبکہ گملوں میں سجے آرائشی پودوں کا سبزہ آنکھوں کو ایک خوشگوار تراوٹ بخشتا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیاں باہر کے خوبصورت مناظر کو قابل دید بنا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اس مکان کی تزئین و آرائش کے لیے کسی پیشہ ور کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

الیزا ایک چست پتلون اور سیاہ رنگ کی بڑی شرٹ پہن کر باہر نکلی۔ چہرے کی مطابقت سے بڑے دھوپ کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

چشمے نے چہرے کا زخم بڑی حد تک چھپا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا لیڈیز بیگ تھا جس میں چند جوڑے کپڑے بہ آسانی آسکتے تھے۔

"بس...... کیا یہ سب تمہاری ضرورت کے لیے کافی ہوگا؟"

"میرے پاس بس یہی کچھ ہی ہے......" اس نے سسکتے ہوئے کہا اور ہیمنڈ کی جانب دیکھنے لگی جو کہ اب گھٹی گھٹی آواز میں کراہ رہا تھا۔

"چینگ کہاں ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

قطار در قطار کمروں والی راہداری سے گزرتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا تھا لیکن ایڈ نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ الیزا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، جب اس نے چینگ کو دروازے کے پاس اوندھا لیٹا دیکھا۔

"کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟"

"نہیں......"

الیزا کی آنکھوں میں بے یقینی تھی لیکن وہ اس کے پیچھے مکان سے نکل کر چپکے سے چلتی ڈرائیو وے تک پہنچ گئی۔

"میرے ٹرک کا کیا ہوگا؟"

"مجھے یقین ہے کہ زدلو تمہیں ایک نیا لے دے گا...... یا پھر کسی کو بھیج دے گا کہ یہاں سے آکر لے جائے......"

"لعنت ہو...... میں خود ڈرائیو کروں گی...... اور تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔" اس کا پرانا اکھڑ مزاج واپس آرہا تھا۔

"بھول جاؤ......"

"نہیں...... ایسا مت کرو...... میں تمہیں شاید جانتی ہوں...... نام کیا تھا تمہارا؟"

"ایڈ......"

"ایڈ...... صحیح...... دیکھو ایڈ...... ڈیڈی اکثر تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ تم ان کے نزدیک بہترین ہو...... ہر چیز میں...... پلیز مجھے اپنے پیچھے آنے دو...... میں اب کہاں جا سکتی ہوں؟ اس تماشے کے بعد اگر میں یہاں واپس لوٹی تو ہیمنڈ کے گھر والے میری جان لے لیں گے...... سمجھے؟ میں تمہارے پیچھے آؤں گی...... اس طرح میری گاڑی کم از کم ایک ایسے مکان کے سامنے سے نہیں ملے گی جہاں تم ایک آدمی کو قتل کر چکے اور دوسرے کو مرنے کی حد تک مار کے بے ہوش چھوڑ آئے ہو......"

"میرا نہیں خیال وہ آدمی مر چکا ہے......"

"مجھے تو وہ کوئی مردہ ہی لگ رہا تھا...... ایڈ......"

ایڈ نے اردگرد دیکھا اور پھر پلٹ کر الیزا کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی...... وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم اپنے باپ کو جانتی ہو......"

"ہاں...... بڑے اچھے طریقے سے جانتی ہوں......"

"وہ تم سے پہلے ہی ناراض ہے......"

"ہاں...... یہ بھی جانتی ہوں......"

"تم نے ایک ایسی حرکت مزید کی تو وہ مجھے تمہیں مارنے کا بھی حکم دے سکتا ہے......"

"تم نے پہلے ہی مجھے مارا ہے......"

"مارنا مطلب جان سے مارنا...... سمجھیں؟"

"ہاں...... سمجھ گئی......"

"تم نے مجھ سے جان چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا...... سمجھ گئیں؟"

"ہاں سمجھ گئی ایڈ......"

"اچھی طرح؟"

"ہاں......" وہ اس کے قریب آگئی لیکن ایڈ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔

"مجھے ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑے گا...... تم یہ بات جانتی ہو؟" ایڈ نے اس بار آہستگی سے کہا تھا۔

"جیسے تمہارا دل کرے ویسے کرو......" وہ اس کے کندھے سے لگ کر جھولنے لگی۔

"میرے پیچھے پیچھے آنا......" ایڈ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

الیزا کے شاور لینے کے دوران ایڈ کی پارس سے طویل بحث ہوئی...... کم از کم اسے تو وہ بہت طویل لگی۔ ایڈ چاہتا تھا کہ الیزا کی 'بازیابی' کے بعد اب کوئی بھی اسے آکر وہاں سے لے جائے۔ وہ باقی کا اختتام ہفتہ اپنی مرضی سے اپنی پسند کے لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا...... کچھ ذاتی معاملات نمٹانا چاہتا تھا۔

واپسی کی خواہش سر پر چڑھنے لگی تھی۔

بیس اکیس سالہ ایک لڑکی کو وہ اپنے ساتھ ہر جگہ گھسیٹنے کے حق میں بالکل بھی نہیں تھا۔

"یہاں تو اس وقت کوئی اور بھی دستیاب نہیں ہے......" پارس نے فوری طور پر انکار کر دیا۔

نومبر کا آغاز ہو چکا تھا اور میونسپل الیکشن سر پر آن پہنچے تھے۔

"دراصل......" پارس ہچکچایا...... "ہمیں تمہاری بھی یہاں پر اشد ضرورت ہے...... تمہیں کتنا وقت لگ جائے گا یہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اپنا...... ''ذاتی کام'' ختم کرنے میں......؟''

''شاید پورا ویک اینڈ لگ جائے...... لیکن اگر اتنی ہی میری ضرورت ہے تو میں کل سہ پہر واپسی کے لیے روانہ ہو سکتا ہوں......''

فون پر خاموشی سی چھا گئی...... ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ریسیور پر ہاتھ رکھ کر آواز کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایڈ کو شدید الجھن ہونے لگی تھی کہ اسی وقت پائرس لائن پر واپس آ گیا۔

''ہاں...... زولو صاحب اپنی بیٹی کے حوالے سے بہت پریشان ہیں...... وہ اس کو فوراً اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں...... ایڈ...... تمہارا یہ ''ذاتی کام'' واقعی کوئی اہم نوعیت کا ہونا چاہیے......''

''میں ابھی اس کو بس پر بٹھا کر واپس بھیج سکتا ہوں۔ اگر اتنی ہی بے چینی ہے تو...... وہ چار گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گی...... پھر تم اس کو بس اسٹاپ سے پک کر سکتے ہو......''

''ایڈ...... ایڈ...... پلیز...... تم تو سمجھ دار ہو۔ مگر وہ راستے میں کسی بھی اسٹاپ پر اتر گئی تو؟ اور اگر وہ یہاں نہیں پہنچتی تو تم کس منہ سے زولو کا سامنا کرو گے؟ اگر تمہیں واقعی کوئی بہت ضروری کام ہے تو اس کو نمٹاؤ اور لڑکی کو لے کر فوراً واپسی کی راہ لو...... اسے تمہارے ساتھ ہی واپس آنا ہے ہر حال میں......''

''اور اس کا ٹرک؟''

ایک بار پھر لائن پر خاموشی چھا گئی......

''مسٹر زولو چاہتے ہیں کہ جیسے تم مناسب سمجھو ویسے ہی اس ٹرک سے نجات حاصل کر لو...... چاہے اپنے کسی آدمی کی مدد سے واپس لے آؤ یا وہیں کسی کو بیچ دو...... اس کام کی بھی تمہیں علیحدہ سے قیمت مل جائے گی...... لیکن لڑکی کو ہر حال میں اتوار تک یہاں پہنچ جانا چاہیے......'' پائرس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

ایڈ نے غصے میں اپنا فون ایک جانب پھینک دیا...... ''قیمت مل جائے گی......'' پائرس کے الفاظ نے اس کی روح تک کو سلگا دیا تھا...... ایک وقت تھا جب زولو خود ایڈ کو حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اب اس کے چیلے اس کے ساتھ زر خرید غلاموں والا سلوک کر رہے تھے۔ غصے میں آ کر اس نے اپنی شرٹ اتار کر ایک جانب پھینک دی اور تیزی سے پش اپ لگانے کے بعد اس نے اپنے غصے کی آگ کو کسی قدر سرد ہوتا محسوس کیا۔

وہ سخت کسرت کے بعد تیزی سے سانس لے رہا تھا جب الیزا صرف ایک تولیے میں لپٹی غسل خانے سے باہر نکلی۔

سنگھار میز کے آئینے پر لگی اپنی تصویر دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ ایڈ نے خود کو ذہنی طور پر اس حوالے سے کسی بھی قسم کے سوال کے لیے تیار کر لیا لیکن وہ کچھ بھی نہ بولی۔ تصویر واپس لگاتے ہوئے وہ پرسوچ انداز میں اس پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتی رہی پھر تیزی سے ایڈ کے پاس آ گئی۔

اب وہ انگلیاں ایڈ کے سینے پر پھیر رہی تھی مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی پھر اس کا ہاتھ اس کے پیٹ تک پہنچ گیا لیکن ایڈ نے پیچھے ہٹنے کی بالکل کوشش نہ کی۔

''ایک بوڑھے آدمی کے حساب سے تو بہت سخت ہے تمہارا جسم......''

''اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوں......''

''ہم...... تو ہم کب روانہ ہوں گے؟''

''مجھے کچھ کام ہے...... مجھے آج کسی سے ملنا ہے...... کچھ ادھورے کاموں کو کل پورا کرنا ہے...... اس کے بعد ہم واپس جا سکتے ہیں......''

''مجھے یہ زخموں کے نشان اچھے لگ رہے ہیں......'' وہ سرگوشی میں بولی اور اس کے سینے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ وہ چند لمحے تو ہکا بکا کھڑا رہا پھر حرکت میں آیا تو وہ دونوں بستر پر تھے ...اور جذبات کے سیلِ رواں میں دونوں ڈوبنے ابھرنے لگے۔

شاور لیتے ہوئے ایڈ نے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہ کی...... وہ ابھی تک شک میں تھا کہ الیزا اسے جل دے کر کہیں رفو چکر نہ ہو جائے۔ وہ باہر آیا تو الیزا اس کی ہی ایک شرٹ پہنے اپنے حسن کی جلوہ نمائی میں مصروف عمل تھی...... وہ بستر پر لیٹا تو وہ اس کے گرد لپٹ سی گئی۔

''میں اپنے باپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی......''

''یہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے......''

''میں پھر بھاگ جاؤں گی...... اور اس وقت تک بھاگتی رہوں گی جب تک میرا باپ میرے پیچھے آنا بند نہیں کر دیتا...... یا تم آ کر میری جان نہیں لے لیتے...... تب تو یہ تمہارا مسئلہ ہو گا نا؟''

ایڈ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں روشنیوں کا راج تھا۔

''تم گھر چھوڑ کر بھاگو یا نہ بھاگو...... وہ شاید جلد ہی تمہیں مروا دے گا......'' وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

وہ بنا آواز کے رونے لگی۔

''میں جانتی ہوں......'' اس نے سسکی بھری۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ایڈ......؟''

''ہاں بولو......''

''کیا اس نے میری ماں کو بھی قتل کروایا تھا؟''

''ہاں......''

وہ یہ بات جانتی تھی پر کبھی کسی دوسرے کے منہ سے نہیں سنی تھی وہ تڑپ کر رہ گئی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

''کیا تم میری ماں کو جانتے تھے؟''

''ہاں......''

''کیسی لگتی تھی وہ؟''

''بہت اچھی طرح تو نہیں جانتا...... میں خود اس وقت اپنے لڑکپن میں تھا...... تم سے بھی چھوٹا...... میں بروکلین میں ہوتا تھا لیکن ہم دعوتوں میں اکثر جاتے تھے۔ میں اکثر اوقات ویٹر ہوتا تھا اور میز پر رکھے مشروب میں کمی نہ آنے دینا میری ڈیوٹی ہوتی تھی۔ وہاں زولو بھی آیا کرتا تھا۔ تمہاری ماں اس کے مقابلے میں بلند قامت تھی۔ اونچا بولنے والی...... بخدا بہت خوبصورت تھی...... ہر دلعزیز......''

''تم نے میرے باپ کے پاس کیسے کام شروع کیا؟ اور بروکلین کیوں چھوڑ دیا؟''

''میرے ایک انکل وہاں ہوتے تھے...... انہوں نے خرچہ دیا کہ میں کالج جا سکوں۔ چار سال وہاں گزارے...... پھر چند سال فوج میں...... جب واپس آیا تو سب کچھ زولو چلا رہا تھا...... اس نے مجھے کام کی پیشکش کی جو میں نے قبول کر لی......''

''کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟''

''ہمم...... ہم دوست ہیں......'' یہ کہتے ہوئے ایڈ نے نظریں چرا لیں۔ دونوں بڑی دیر تک ہم آغوش رہے اور ایک دوسرے کے بدن سے گرمی چراتے رہے۔

☆☆☆

ایڈ اور کرٹ کی ملاقات ساحل پر ہوئی جہاں انہوں نے بیف سینڈوچ کھائے۔ ایڈ بھول چکا تھا کہ وہ کتنے لذیذ تھے اور وہ کتنے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ بروز ساحل پر آنے والے پنچھیوں کو اڑاتا رہا اور وہاں سے فراغت ملتی تو ایڈ کے گرد اٹکھیلیاں شروع کر دیتا۔ ایک جانب الیزا بھی غسلِ آفتابی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے...... عام دنوں کی نسبت، پہلے سے کہیں زیادہ بوجھ......'' پروفیسر کرٹ نے سوال کیا۔

''بس کام کا ہی بوجھ ہے اور کیا؟''

''نہیں...... کچھ اور ہی مسئلہ ہے...... نہ بتانا چاہو تو اور بات ہے......''

''مجھے افسوس ہے......''

''اپنا افسوس اپنے پاس رکھو......'' کرٹ سیاہ پڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کتنا بدل گئے ہو؟''

''ویسا ہی تو ہوں......''

''کاش ایسا ہوتا...... اب تو تم اس روشنی کا سایہ معلوم پڑتے ہو جو کبھی ان گلیوں کو روشن کرنے کے لیے تمہاری صورت میں نکلا کرتی تھی...... اب تو تمہیں دیکھ کر میں خود ڈر جاتا ہوں...... بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ تم کسی کو قتل بھی کر سکتے ہو......'' کرٹ اپنی بات پہ خود ہی ہنس پڑا۔

''جو کام تمہیں خود تمہارے قابل نہ چھوڑے اس کو کرنے کا کیا فائدہ؟ چھوڑ دو یہ سب کچھ ایڈورڈ...... کچھ نہیں رکھا اس سیاست میں...... نوجوان لوگوں کو تو یہ نچوڑ کے رکھ دیتی ہے......'' وہ ہمیشہ کی طرح اس کا پورا نام لے کر مخاطب تھا۔

''میں جانتا ہوں...... اور شاید تمہارے کہنے سے قبل ہی اس بارے میں سوچ رہا تھا......''

''آہا...... یعنی کہ تم اپنی اس زندگی سے واقعی ناخوش ہو...... میرے بچے جب بھی واپسی ہو گی تم مجھے کھلی بانہوں کے ساتھ خود کو خوش آمدید کہتے پاؤ گے......''

''ہاں میں واقعی ان خطوط پہ سوچ رہا ہوں...... اور اپنی کچھ ذمے داریاں پوری کرتے ہی میری واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا......''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے...... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں...... واپسی کا راستہ کبھی سہل نہیں ہوتا...... تو ذرا سنبھل کر میرے بچے...... ویسے تم واپس آ کر میرے ساتھ کیمبرج میں پڑھانے کا کام بھی کر سکتے ہو......''

''تمہارا بہت شکریہ کرٹ...... ہر بات کے لیے خاص طور پہ میری سوچ کو ایک راہ پر ڈالنے کے لیے......'' وہ سرمئی ہوتے سمندر کی وسعت میں نگاہوں کو گم کرتے ہوئے بولا۔

''اوہ میرے بچے...... یہی تو میرا کام ہے کہ کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھلا دوں......'' کرٹ ہنسا تا کہ ماحول کی سنجیدگی کچھ کم ہو سکے۔ ایڈ کا شانہ تھپکتے ہوئے وہ خود بھی ریت اور سمندر کی اٹکھیلیاں دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''تمہاری عمر ہے کتنی آخر؟''

''اکتالیس سال......''

''اوہ......''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"میں جانتا ہوں تم نے زیادہ کا اندازہ لگایا ہوگا...... صحیح کہہ رہا ہوں نا......؟"

"تقریباً ساٹھ......"

وہ اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی ساتھ میں ہنسنے لگی۔

وہ اس کو اپنے ساتھ ہی ہر جگہ لے کر گھوم رہا تھا۔ پرانے پب میں اسے بلیکی ملا تو دونوں نے مل کر بیئر پی اور ایک دوسرے کو اپنے قصے سنائے۔ وہ بھی ایڈ کو دیکھ کر بے حد حیران تھا لیکن محض آدھے گھنٹے میں وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے پچھلے دس سال سے اکٹھے ہی وقت گزار رہے ہوں۔ الیزا خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا سینڈوچ کھاتی رہی...... وہ اتنے میں ہی بے حد خوش تھی۔

ایڈ کچھ پرانے دوستوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ کیٹی اوہارا ... فلاڈیلفیا میں موسیقی کی استاد بن چکی تھی اور سولیون...... لاس اینجلس میں اپنی لاء فرم کھول چکا تھا۔ الیزا حیران تھی کہ وہ بوڑھا آدمی دو گھنٹے تک ایڈ سے باتیں کرنے کے باوجود مزید پر مُصر تھا لیکن ایڈ نے معذرت کی اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ اب بھی اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایڈ کوئی مہمانِ خصوصی ہو...... جو بھی اس سے ملتا اس کے پاس سے ہٹنا گوارا نہ کرتا۔ جب سولیون کے بڑے مکان سے وہ الیزا کے ساتھ باہر نکلا تو ہلکی سی کبیدگی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

"انکل تو بڑی زوردار پارٹی کرتے ہیں...... لگتا ہے تمہاری ان کے ساتھ بڑی گہری دوستی ہے۔"

"ہاں...... بڑا اچھا وقت ساتھ گزارا ہے ہم نے...... لیکن یہ میرے دوست کے والد تھے......"

"ہاں لگ رہا تھا...... لیکن پھر بھی تم نے ان کے ساتھ کافی وقت گزار لیا......"

"چلو اب واپسی کا وقت آ گیا...... اگر ہم زیادہ دیر ایسے سڑکوں پر گھومتے رہے تو ہیمنڈ یا اس کے چیلوں کی نظر میں آ جائیں گے...... وہ یقیناً تمہاری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔"

"ہم یہاں کرنے ... کیا آئے تھے؟ کیا صرف تمہارے کالج کے پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے؟"

"ہاں...... کیا تم نے کبھی کالج جانے کے بارے میں سوچا؟"

"نہیں...... ہاں...... لیکن ڈیڈی...... میرا مطلب زولو کہتا ہے کہ یہ نری بکواس ہے۔"

"ہاں ہے تو صحیح لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہیں کالج میں اچھے لوگ نہیں ملتے......" وہ اپنی شیوی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہمم......" وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"کیا تم واقعی جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں......"

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں...... بس اب چلو......" وہ اداس لہجے میں بولی تو ایڈ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ان دونوں نے ستر میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں ہی طے کر لیا تھا اور اب جنوب کی جانب سفر کر رہے تھے۔ پاٹرس کا فون آیا تو ایڈ کے ماتھے پر تیوریاں نمودار ہو گئیں۔ اس نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں اور ہوں ہاں میں ہی جواب دیتا رہا۔ نارنجیوں کے درخت تیزی سے پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔

"کیا کام ہو جائے گا؟" پاٹرس نے پوچھا۔

"ہاں......" ایڈ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا تھا۔

الیزا اس کے کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ہم جلد ہی کسی سنسان سڑک پر مڑ جائیں گے نا؟"

اس کے انداز میں زمانے بھر کا درد بسا ہوا تھا۔

ایڈ کو ایسا لگا جیسے کسی نے خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا ہو...... اپنی توجہ گاڑی چلانے پر مرکوز کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اس تکلیف سے آزاد ہوا۔

چھدرے درختوں کے بعد اب جنگل گھنا ہو رہا تھا......

"ہاں بس تھوڑی دیر میں......" اس نے اپنے لہجے کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کی لیکن لرزش پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

زولو نے بیٹی کی نادانیوں کو مستقل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ الیزا کی سسکیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں...... اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے گاڑی کے خفیہ خانے کو کھولا...... گن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس کرٹ کے الفاظ چکرا رہے تھے......

"واپسی کے سفر میں آخری کام کبھی بھی سہل نہیں ہوتے......"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قسط نمبر: 12

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

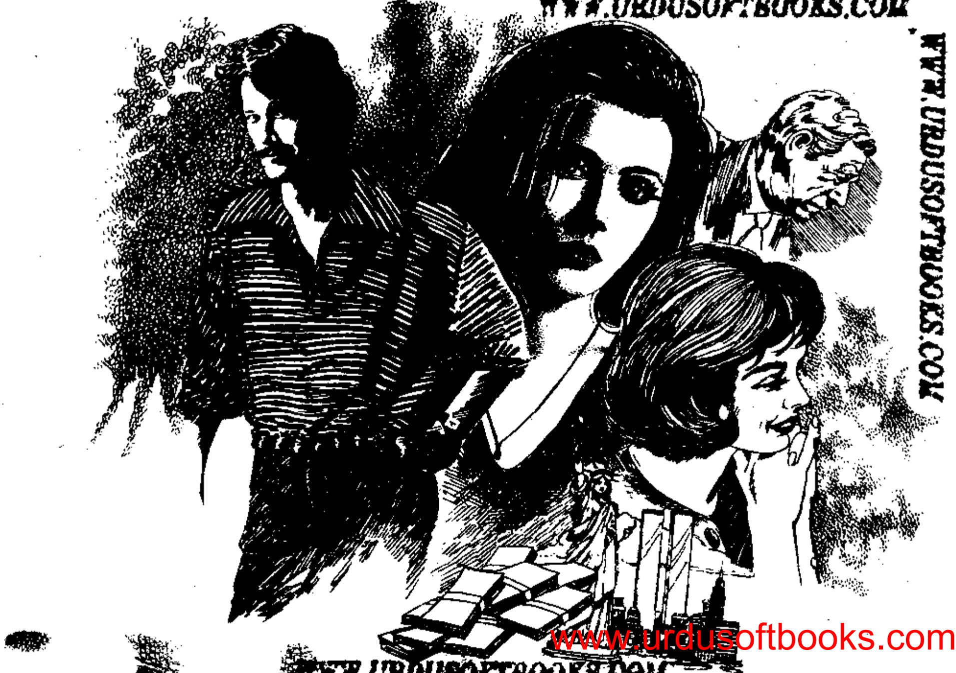

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

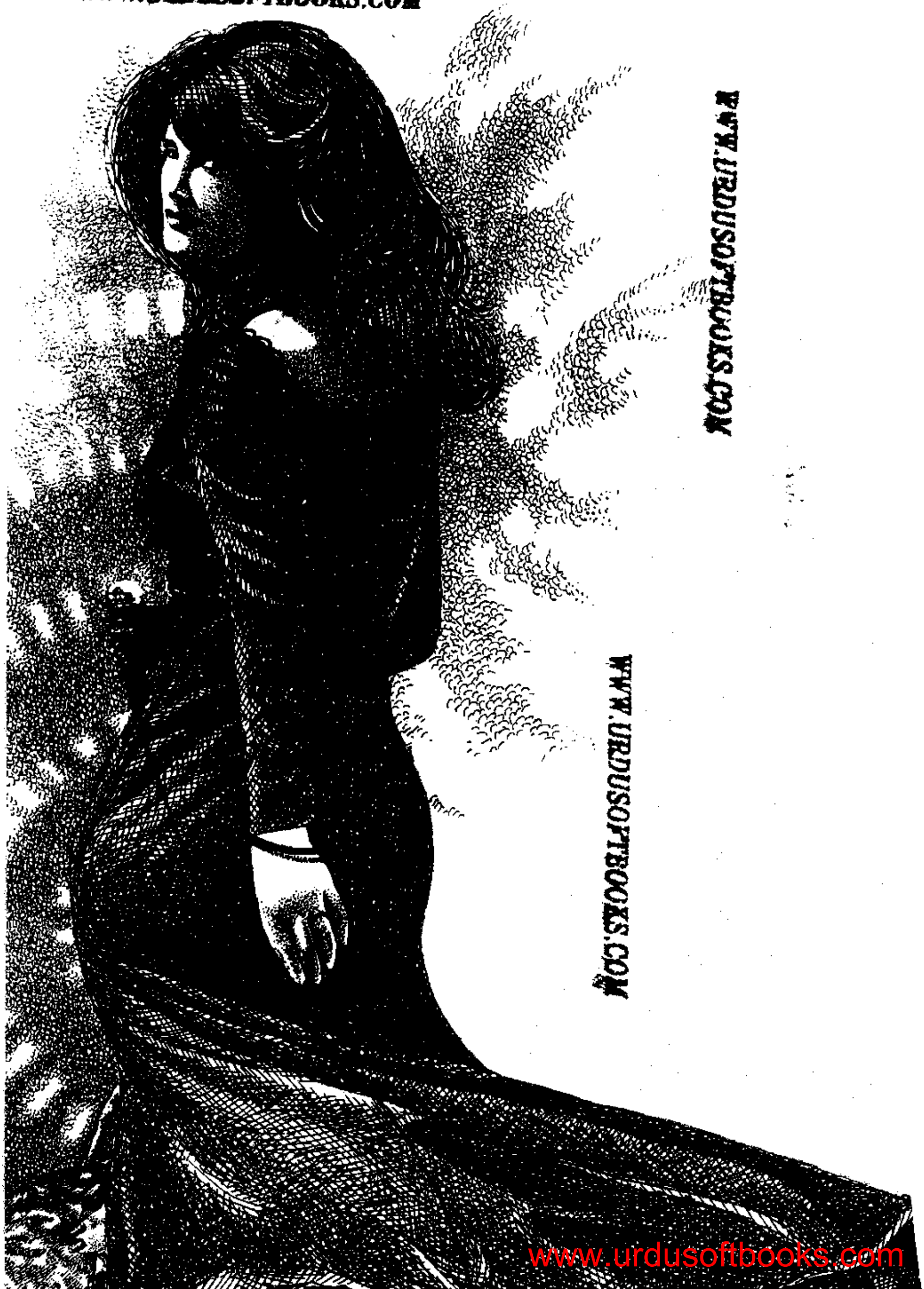

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔اس کی اپنی بیوی ریتا میگڈالین سے علیٰحدگی ہو چکی تھی۔وقتِ رخصت ریتا اپنی اکلوتی بیٹی ٹفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد وا لیا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا...... ''میرے بچے! انتظار کرو۔وقت آنے پر تمہیں سب بتادوں گا۔'' یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ارلنگٹن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔علی کا دامن صاف تھا۔پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو ٹی ٹکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔''وِنی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے درِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ایک رات وِنی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔اس مارا ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی...... ''مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔'' اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔وِنی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ایک روز جب شارو اسٹیلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موا کر دیا۔آیندہ روز پیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتّر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔راضی ہونے پر ان بہتّر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتّر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔پرسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتّر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاڈ اور ریما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آگیا۔یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کوفی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آگیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جاکر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردیں۔علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔ اس نے علی کو دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کرکے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتادی۔وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی،علی کو اس کی رہائش گاہ کے پتے پر ایک لفافہ ملا جس میں ایک پیغام تھا جسے پڑھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

خط کی تحریر کے آغاز میں میری ماں کو ایک غلیظ گالی دی گئی تھی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوکر نہایت ہی عامیانہ زبان میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔تحریر کے ایک ایک لفظ سے تیزاب ٹپکتا تھا۔

”تمہارا باپ میرا مجرم تھا۔اس کمینے نے مجھے دس کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔آج سے بائیس سال پہلے دس کروڑ بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ میں نے اپنے مجرم کو کتے کی موت مار دیا پھر تمہاری ماں کو میں نے گندی نالی کا کیڑا بننے پر مجبور کردیا۔یہ بوڑھی بلی نو سو چوہے کھا کر عمرہ کرنے چلی تھی۔ میں نے اس کی زندگی کا چراغ بھی گل کردیا۔تمہاری ماں کو فنا کے گھاٹ اتارنا میرے لیے بھی مشکل نہیں تھا لیکن مجھے تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ میں نہیں جانتا تھا،اس خبیث عورت نے تمہیں کہاں بھیج دیا تھا۔

اب پتا چلا ہے کہ تم جدہ میں چھپے بیٹھے تھے۔اچھا ہوا،تم آگئے۔اس خط کو پڑھنے کے بعد تم میری تلاش میں نکلو گے لیکن مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے۔مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم کانپ جاؤ گے،ہانپ جاؤ گے اور تمہاری زبان باہر نکل آئے گی۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں،تڑپاؤں گا، دوڑاؤں گا،سسکاؤں گا اور تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپاہج بنادوں گا پھر تم کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے بھیک مانگتے دکھائی دو گے۔تب میرا انتقام پورا ہوجائے گا......“

میں بہ دقت تمام اس تحریر کو ایک بار ہی پڑھ سکا۔ ایک ایسے وقت پر جبکہ میں اپنی ماں کے حکم کی تعمیل میں اپنے دیرینہ دشمن کو نظرانداز کرکے واپس امریکا جانے کا ارادہ کرچکا تھا، اس بدخصلت دشمن نے بڑے کھلے الفاظ میں مجھے للکارا تھا۔اس وقت میرے دماغ میں بارودی دھماکے ہورہے تھے۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر آنکھیں بند کرکے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔اس کے بعد میں گہری اور ہموار سانسیں لینے لگا۔سانس کا انسان کی سوچ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ انسانی دماغ کو بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اول آکسیجن،دوم گلوکوز اور یہ دونوں خون کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہیں۔میں بھی طویل اور گہری سانسوں کے ذریعے اپنے دماغ کی تواضع کرنے لگا۔دھیرے دھیرے میری حالت میں بہتری نمودار ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری سوچ کا جہاز ائرپاکٹ سے باہر نکل آیا ہو۔ چند لمحے پہلے میری کھوپڑی کے اندر ابلنے والا آتش فشاں رفتہ رفتہ سرد ہونے لگا تھا۔

چنگیز خان کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ماں نے عظیم کے ہاتھ میرے لیے نیلے کور والی جو ڈائری بھجوائی تھی اس میں چنگیز خان کا تفصیلی ذکر موجود تھا۔یہ شخص میرے باپ کی موت اور میری ماں کی بربادی کا ذمے دار تھا اور اس تحریر کے توسط سے چنگیز خان نے میری ماں کو قتل کروانے کا اعتراف بھی کرلیا تھا اور مجھے عبرتناک انجام تک پہنچانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ میں تو ماں کی فرمائش پر چنگیز خان کو ذہن سے نکال چکا تھا لیکن یہ بدذات شخص کھل کر سامنے آگیا تھا تو اب ماں کی خواہش سے صرفِ نگاہ کرتے ہوئے اس مخنث شیطان سے دو،دو ہاتھ کرنا اور اسے جہنم واصل کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

نیلی ڈائری میں رقم ماں کی داستان کے مطابق،میری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پیدائش سے پہلے میرے والدین کراچی میں رہتے تھے۔ میرے والد کا اپنا بزنس تھا۔ وہ طلائی زیورات کی میکنگ کا کام کرتے تھے۔ ان کا چھوٹا سا کارخانہ صدر کے علاقے میں تھا۔ چنگیز خان بنیادی طور پر ایک سنار تھا لیکن اس پیشے کی آڑ میں وہ بہت سے مذموم دھندے بھی جاری رکھے ہوئے تھا جن میں سونے کی اسمگلنگ، منشیات کی ترسیل، بلیک مارکیٹنگ اور اسی نوعیت کے دوسرے کام بھی شامل تھے۔ نیلی ڈائری سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق چنگیز خان کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی۔

کسی معاملے پر والد صاحب کی چنگیز خان سے چپقلش ہوگئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تنازع بڑھتا رہا اور چنگیز خان نے بڑے واضح الفاظ میں والد صاحب سے کہا کہ اسے پتا چلا ہے، والد صاحب اس کے دشمنوں سے مل گئے ہیں۔ چنگیز خان جس قماش کا شخص تھا اس کے پیشِ نظر اس کی دوستی شرفاء سے تھی اور نہ ہی دشمنی نیک افراد سے۔ ایک بے بنیاد شک کی بنا پر وہ خواہ مخواہ والد صاحب کا دشمن بن گیا تھا۔ اس نے بعض جرائم پیشہ افراد کے ذریعے والد صاحب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں لیکن والد صاحب نے اس کی بکواس کی پروا نہیں کی اور اپنی ڈگر پر گامزن رہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، چنگیز خان سونے کی اسمگلنگ میں بھی ملوث تھا۔ اس سلسلے میں اسے ایک طاقتور سیاسی شخصیت کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مارکیٹ میں یہ خبر بھی گرم تھی کہ مذکورہ سیاسی شخص سونے کی اسمگلنگ میں چنگیز خان کا بزنس پارٹنر بھی ہے۔ حالات میں اس وقت ایک سنگین موڑ آیا جب ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر چنگیز خان کی سونے کی ایک بھاری کھیپ پکڑی گئی۔ اس سونے کی قیمت لگ بھگ دس کروڑ روپے بنتی تھی۔ اسمگل شدہ سونے کی یہ کھیپ ضبط کرلی گئی۔ چنگیز خان کو بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

والد صاحب کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن چنگیز خان نے سارا الزام انہی کے سر پر ڈال دیا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ والد صاحب اس کے دشمنوں کے آلۂ کار بن گئے تھے اور ان کی مخبری پر چنگیز خان کا مال ہانگ کانگ میں پکڑا گیا تھا۔ اس آتش گیر خط میں چنگیز خان نے اپنے اسی دس کروڑ کے نقصان کا ذکر کیا تھا اور اس کچی تحریر کے ذریعے اس نے میرے والدین کے قتل کا اقبال بھی کرلیا تھا۔

میں نے ''کچی تحریر'' کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اس پرچے کو بہ طور ثبوت کہیں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مضمون سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ ساری باتیں چنگیز خان ہی نے لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں کوریئر سروس کا وہ لفافہ بھی ایک دم بوگس تھا۔ مطلب یہ کہ مذکورہ لیٹر باقاعدہ کسی کوریئر سروس سے مجھ تک نہیں پہنچا تھا۔ ایک معروف کوریئر سروس کا برانڈڈ مخصوص لفافہ ضرور اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا لیکن اس انویلپ پر نہ تو ٹریکنگ آئی ڈی کا کوئی اسٹیکر چسپاں کیا گیا تھا اور نہ ہی شپمنٹ کا باقاعدہ کوئی اندراج تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کوریئر سروس کا کسی طرح لفافہ حاصل کرکے اسے میرے نام اور ایڈریس پر دستی ڈیلیور کردیا گیا تھا۔ لفافے کے پیچھے چنگیز خان کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا تھا جس کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ فرضی ایڈریس ہوگا۔ میں نے لفافہ الٹ پلٹ کر اچھی طرح چیک کرلیا۔ اس پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کی بنا پر یا جس کی مدد سے میں مذکورہ کوریئر کمپنی کی ہیلپ لائن پر کال کرکے اس شپمنٹ کے حوالے سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرسکتا۔

ان لمحات میں میرا ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں خط کے ان مندرجات پر غور کرنے لگا جو سراسر میری ذات سے متعلق تھے۔ خط بھیجنے والا میرے اصل نام اسد علی سے واقف تھا۔ اسے ماں کے بنگلے کا پوسٹل ایڈریس معلوم تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ میں جدہ سے آیا ہوں اور سلمیٰ حیدر کا بیٹا ہوں۔ ان تین پوائنٹس کو ذہن میں رکھ کر میں خط لکھنے والے کو اپنے اردگرد کے لوگوں میں ٹریس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عظیم اور اس کی فیملی کو معلوم تھا کہ میں سلمیٰ اور حیدر علی کا بیٹا اسد علی ہوں مگر میں جدہ نہیں، بلکہ امریکا سے آیا ہوں۔ وہ لوگ نہ تو چنگیز خان کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور نہ ہی ماں کے بنگلے کے پوسٹل ایڈریس سے واقف تھے۔ دس کروڑ روپے والے سونے کی کہانی کا میں نے بھی ان سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں پر شک کرنا خارج از امکان تھا۔

دوسرا نمبر بینا کا تھا۔ میری زبانی بینا کو میری حقیقت تو معلوم ہوچکی تھی اور وہ یہاں کے بنگلے کے پوسٹل ایڈریس سے بھی بہ خوبی آگاہ تھی لیکن وہ ناظم آباد کے کسی رہائشی چنگیز خان سے ہرگز ہرگز واقف نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہانگ کانگ میں پکڑے جانے والے چنگیز خان کے دس کروڑ مالیت کے سونے کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ جب ماضی میں یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بینا محض دو سال کی ایک ننھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سی بچی تھی اور جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں ہوا کرتی تھی۔ اس تناظر میں بیٹا کا نام شک زدہ افراد کی موجودہ فہرست سے نکل جاتا تھا۔

اب باری تھی نادر شاہ کی۔ نادر شاہ میرے اصل نام سے بھی واقف تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ میں سکلی حیدر کا بیٹا ہوں اور جدہ سے آیا ہوں۔ نادر شاہ چونکہ ماں کے بنگلے کی فروخت میں پوری طرح موجود تھا بلکہ یہ کام اسی کے ہاتھ سے ہورہا تھا لہٰذا بنگلے کا پوسٹل ایڈریس اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک طویل عرصے سے ماں کے ساتھ جڑا ہوا تھا چنانچہ وہ ماں کے دشمن چنگیز خان کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس امر کے بھی روشن امکانات تھے کہ وہ دس کروڑ کے سونے والی اسٹوری سے بھی لاعلم نہیں ہوگا......!

میری تفتیشی سوچ نادر شاہ کے نام پر آکر رک گئی۔ یہ شخص ڈے ون سے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ عظیم نے بھی اس پر اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ ماں کے تمام تر مالی معاملات کلی طور پر نادر شاہ کے ہاتھ میں تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ماں کا بینیفشری تھا۔ میرے ذہن نے چیخ کر کہا...... یا تو یہ شخص ماں کا قاتل ہے اور یہ لیٹر اسی نے میرے نام ڈلیور کرایا ہے تاکہ میں گھبراہٹ میں فوراً پاکستان سے چلا جاؤں اور یہ ماں کے مال پر عیاشی کے لیے آزاد ہوجائے...... یا پھر یہ چنگیز خان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور جدہ سے میری آمد کی اطلاع اسی نے چنگیز خان تک پہنچائی ہے۔ اس صورت میں خط والی تحریر چنگیز خان کی طرف سے ہوجاتی تھی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوریئر سروس سے مجھ تک پہنچی تھی یا کوریئر سروس کی آڑ میں مجھ تک دستی پہنچائی گئی تھی......!

نادر شاہ کو ٹریپ کرنے کے لیے پلک جھپکتے میں، میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آگیا۔ تخلیق کی زبان میں اسے ''آمد'' کہا جاتا ہے۔ ایک فوری فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں شانت ہوگیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے آئیڈیا کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے اسی ٹائپ کا ایک سادہ کاغذ لیا جیسے کاغذ پر میرے لیے وہ زہریلا خط لکھا گیا تھا پھر مذکورہ ہینڈ رائٹنگ کی کم و بیش کاپی کرتے ہوئے میں نے لکھنا شروع کیا......

''میں تمہاری ماں کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ تمہارا باپ حیدر علی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اس نیک دل انسان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں اپنے دوست کی موت کو اب تک نہیں بھول پایا ہوں اور اب تو کسی شقی القلب درندے نے تمہاری عظیم ماں کی بھی جان لے لی۔ وہ پاکیزہ عورت چند روز بعد عمرے کی سعادت حاصل کرنے والی تھی لیکن شاید اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ بیٹا! میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ تم جب تک پاکستان میں ہو، میں تمہاری ہر نوعیت کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ تمہارے کسی بھی چھوٹے بڑے کام آکر مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ کوئی بھی ضرورت ہو، کسی تکلف سے کام نہیں لینا...... تمہارا انکل، چنگیز خان۔''

میں نے اصل کاغذ کو اپنے پاس محفوظ کرلیا اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اس خط کو کوریئر والے لفافے کے اندر رکھا اور اپنے سیل فون پر نادر شاہ کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو بیٹا...... خیریت؟'' اس کی بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انکل! کیا آپ ابھی میرے پاس آسکتے ہیں؟''

''کیا ہوا...... تم ٹھیک تو ہونا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں آجائیں، پھر بتاتا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''آپ سے ایک بہت ضروری معاملہ ڈسکس کرنا ہے۔''

''او کے......'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''شکریہ انکل۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے لائن کاٹ دی۔

اگلی کال میں نے عظیم کو کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ اس کے انداز میں تشویش پائی جاتی تھی۔

''برو! سر کا درد کیسا ہے؟''

''ٹرانسفر ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔'' میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

چنگیز خان کے دہشت ناک اور وحشت انگیز ''خط'' کو پڑھ کر میرے دل و دماغ پر جس اذیت نے حملہ کیا تھا، اب میں اس کے اثرات سے مکمل طور پر باہر آگیا تھا۔ میرے اس جواب پر عظیم نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''برو...... میں سمجھا نہیں!''

''ارے یار...... تم تھکے ہوئے گھر پہنچے ہو اور میں تمہیں پھر ایک مہم پر روانہ کرنا چاہتا ہوں نہ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس طرح میرے سر کا درد تمہارے سر میں ٹرانسفر ہوجائے گا۔''

''برو! تم درد سر کی بات کررہے ہو، تمہارے لیے تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میری جان بھی حاضر ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم حکم کرو، مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر تم میرے پاس آجاؤ۔" میں نے بتایا۔ "تمہیں ایک آدمی کے تعاقب میں روانہ کرنا ہے۔"

"کون آدمی!" اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "اور ایسی کیا ایمرجنسی آن پڑی ہے جو کسی بندے کے تعاقب کی ضرورت پیش آرہی ہے......؟"

"اس آدمی کا نام ہے...... نادر شاہ!" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایک خاص حوالے سے مجھے اس پر شک ہوا ہے۔ اس معاملے کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ جان لو کہ شاہ جی پندرہ بیس منٹ میں میرے پاس پہنچ رہا ہے۔ میں اسے اس وقت تک اپنے گھر میں روکے رکھوں گا جب تک تم یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ تمہیں گھر کے اندر نہیں آنا بلکہ باہر گلی میں یا کسی بھی ایسی جگہ پر رک کر انتظار کرنا ہے جہاں نادر شاہ کی نظر نہ پڑے۔ جب نادر شاہ مجھ سے ملاقات کر کے گھر سے نکلے تو تم محدود فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرو گے۔ تم نے اس کا گھر تو دیکھا ہوا ہے نا؟"

"ہاں، دیکھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"صرف ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ میرے گھر سے نکل کر وہ اپنے گھر جائے۔" میں نے کہا۔ "باقی ننانوے فیصد میرا اندازہ ہے کہ وہ نارتھ ناظم آباد کا رخ کرے گا۔"

"اوکے......" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تم بڑے محتاط انداز میں میری گلی ہی سے اس کے پیچھے لگ جاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "اسے کسی بھی صورت اپنے تعاقب کا شک نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے گھر جاتا ہے تو تم دس، پندرہ منٹ تک اس کے گھر کے نزدیک رک کر انتظار کرو گے۔ عین ممکن ہے کہ وہ گھر کا چکر لگا کر واپس آئے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو تم نے پھر اس کے تعاقب میں لگ جانا ہے اور اگر وہ پندرہ منٹ تک گھر سے باہر نہیں نکلتا تو پھر تم واپس اپنے گھر چلے جانا......" لحاتی توقف کر کے میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ان کیس، اگر میرے اندازے کے مطابق، وہ یہاں سے نکل کر سیدھا نارتھ ناظم آباد جاتا ہے تو تم نے اس گھر کی لوکیشن اور نمبر وغیرہ نوٹ کرنا ہے جہاں نادر شاہ جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔ تم اپنے گھر چلے جانا۔ باقی باتیں ہم کل کریں گے۔"

"سمجھ گیا۔" اس نے کہا۔ "میں تمہارے گھر کے قریب پہنچ کر تمہیں انفارم کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

ہمارے بیچ سیلولر رابطہ ختم ہوا تو میں نے بینا کے نمبر پر کال کی۔ اس نے فوراً میری کال ریسیو کر لی اور خاصی توانا آواز میں بولی۔

"ہیلو علی! کیا ہو رہا ہے؟"

"اپنی دوست کا انتظار۔" میں نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

وہ شوخی سے مستفسر ہوئی۔ "کون سی دوست؟"

"جو اس وقت قریب ہے۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"کس کے قریب......" وہ چہکی۔ "تمہارے یا تمہارے دل کے؟"

"جو بھی سمجھ لو......" میں نے گول مول جواب دیا۔

"بھئی! میں تم سے چند گز کے فاصلے پر موجود ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اور شارو مجھ سے بھی کم فاصلے پر تمہارے دل میں بیٹھی ہے......!"

"تو تمہاری سمجھ بس اتنی سی ہے۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں نے کہا، جو بھی سمجھ لو اور...... تم نے یہ سمجھ لیا؟"

"تو کیا میں نے غلط سمجھا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "جیسا میں نے سمجھا، کیا ویسا نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ "اگر اس وقت مجھے شارو کی یاد آرہی ہوتی تو میں اسے کال کرتا۔ تمہیں فون کیا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تم یاد آرہی ہو اور...... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"اوکے......" وہ خوشگوار انداز میں بولی۔ "میں آرہی ہوں۔"

"آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس، اسٹینڈ بائی رہو۔ میں فری ہو کر تمہیں کال کرتا ہوں پھر ہم لانگ ڈرائیو پر چلیں گے۔"

"آئیڈیا اچھا ہے۔" وہ ستائشی انداز میں بولی پھر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم کس سے فری ہونے کے بعد مجھے کال کرو گے۔ اس وقت کس کے ساتھ ہو؟"

"شارو کے ساتھ۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''جھوٹے......'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''اگر تم شارو کے ساتھ مصروف ہوتے تو مجھے ٹچ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔''

''جب میں تمہارے ساتھ مصروف ہوتا ہوں تو شارو کو ٹچ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''کیا میں نے کبھی ایسا کیا؟''

''تم بہت بدمعاش ہو۔'' وہ ایک خاص انداز سے بولی۔ ''بدمعاشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''

''اس کا ایک خاص سبب ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا؟''

''تمہیں دیکھ کر خوامخواہ بدمعاشی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دل مچل اٹھتا ہے اور میں مجبور ہو جاتا ہوں......''

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''بتاؤں گا...... جب ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔''

''ٹال رہے ہو......؟''

''نہیں...... کنفرم کررہا ہوں۔''

''او کے۔ میں ٹھیک دس منٹ کے بعد تمہیں ریڈی ملوں گی۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''پھر جب تم اشارہ دو گے تو میں گھر سے نکل آؤں گی۔''

''جب میں تمہیں فون کروں تو تم اپنی ریڈ کلٹس پر سوار ہوکر زمزمہ بلیوارڈ پر آجانا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں وہیں پر جوائن کروں گا۔ ہم تمہاری گاڑی میں جائیں گے اور ڈرائیو تم کرو گی...... او کے!''

''او کے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے فون رکھا تو جمشید نے اطلاع دی کہ شاہ جی آئے ہیں۔ میں نے جمشید سے کہا کہ وہ شاہ جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے، میں وہیں آرہا ہوں۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد میں اور نادر شاہ ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں کوریئر سروس والا وہ لفافہ بھی اپنے ساتھ لایا تھا جس کی بارودی تحریر نے مجھے اس اقدام پر مجبور کیا تھا تاہم میں نے لفافے کے اندر والے پرچے کو بدل دیا تھا۔

میرے ہاتھ میں اس لفافے کو دیکھ کر نادر شاہ نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس لفافے کی حقیقت سے واقف نہیں تھا اور یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا اور اس معاملے میں اندر باہر سے بہت پکا تھا اسی لیے اس کے چہرے سے کچھ بھی جھلک نہیں رہا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔ ''بیٹا!

حرام وحلال جانوروں کی پیدائش

یہ بھی کم حیران کن بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو ہمارے کھانے کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً گائے، بکری، مرغی، مچھلی وغیرہ ان کی پیدائش میں ازحد برکت بھی رکھ دی ہے۔ روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہورہے ہیں مگر ان کی نسلیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہونے کو آتیں۔ جبکہ وہ جاندار جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے ذبح نہ ہونے کے باوجود ان کی نسلیں ختم ہورہی ہیں اور ان کی نسلوں کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہے۔

☆☆☆

سطح زمین پر پہاڑوں کا کردار

زمین کی سطح پر بلند و بالا پہاڑوں نے زمین کی محوری گردش میں ایک نپا تلا توازن قائم کیا ہوا ہے۔ (ٹھیک اسی طرح جس طرح ہم اپنی گاڑی کے پہیوں میں چھوٹے چھوٹے لوہے کے ٹکڑے چپاں کرکے پہیوں کی محوری گردش کو Balance رکھتے ہیں) بصورتِ دیگر اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو زمین کا محور جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک جہت میں قائم نہ رہے بلکہ بدلتا رہے۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلاستون بنایا تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین پر پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈانواڈول نہ ہونے لگے اور اس پر ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔'' (سورۃ لقمان 31: آیت 10)

سعید الظفر صدیقی کی کتاب ''ماورائے آب وگل'' سے اقتباس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

خیریت تو ہے نا۔ تم نے اچانک مجھے کیوں بلالیا، سب ٹھیک تو چل رہا ہے نا؟‘‘

’’پریشانی والی کوئی بات نہیں انکل۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’بس، آپ سے تھوڑی معلومات حاصل کرنا تھیں۔‘‘

’’کیسی معلومات؟‘‘ وہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

’’آپ ماں کے سچے خیر خواہ ہیں۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ’’اس لیے آپ میرے والد صاحب کے مخلص دوستوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے؟‘‘

’’تمہارے باپ کا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’بس چند افراد ہی سے اس کی میل ملاقات تھی۔‘‘

’’کیا آپ والد صاحب کے کسی ایسے دوست کو جانتے ہیں جس پر انہوں نے بہت سے احسانات کیے ہوں۔‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’اور وہ شخص ادھر کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں رہتا ہو؟‘‘

اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا ہوئے۔ میرے سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

’’بیٹا! مسئلہ کیا ہے...... مجھے کھل کر بتاؤ!‘‘

’’مسئلہ کوئی نہیں ہے انکل۔‘‘ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

’’میں ایک ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو نارتھ ناظم میں رہتا ہے اور والد صاحب سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اس کا نام چنگیز خان ہے......!‘‘

آخری جملہ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ اچھل پڑا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

’’چنگیز خان ...... یہ شخص تمہارے باپ کا دوست کیسے ہوسکتا ہے......؟‘‘

میں بڑی احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ نادر شاہ کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ اس کے بے اختیار اچھلنے پر میں نے تھوڑا آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔

’’کیا آپ کسی چنگیز خان کو جانتے ہیں؟‘‘

اس نے بڑی ہوشیاری سے میرے ہاتھ میں موجود لفافے کی طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’ہاں، جانتا ہوں مگر وہ تو تمہارے باپ کا دشمن ہے۔ کیا سلمٰی بہن نے تمہیں چنگیز خان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟‘‘

’’ماں نے کسی شخص کا نام لیے بغیر مجھے اپنی بپتا سنائی تھی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ میرے جذبات کو بھڑکانا نہیں چاہتی تھیں۔ اگر وہ اپنے دشمنوں کے نام مجھے بتادیتیں تو اس بات کا امکان تھا کہ میں غصے سے بے قابو ہوکر انتقام لینے اٹھ کھڑا ہوتا اور ماں مجھے خون خرابے سے بچانا چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے خاموشی سے ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن......‘‘

میں نے اپنے لہجے میں مصنوعی دکھ بھرتے ہوئے لحاتی توقف کیا تاکہ نادر شاہ کو ایسا محسوس ہو کہ ماں کی موت نے مجھے بے حد کمزور کردیا ہے پھر اضافہ کرتے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا۔

’’لیکن مالک کو یہ منظور نہیں تھا......‘‘

’’سلمٰی بہن بہت ہی سمجھ دار اور بردبار خاتون تھیں۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ تمہاری حفاظت اور سلامتی کی خاطر ہی انہوں نے تمہیں چنگیز خان کے نام سے بہت دور رکھا ہوگا لیکن سلمٰی بہن اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں اور تم بھی یہاں سے جانے والے ہو لہٰذا تمہیں چنگیز خان کے بارے میں بتانے میں، میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا......‘‘ اس نے ذرا دیر کو رک کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

’’چنگیز خان بہت ہی خطرناک قسم کا انسان ہے۔ اسی نے تمہارے باپ کو قتل کرایا تھا۔‘‘

اب میرے اچھلنے کی باری تھی۔ ’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل؟‘‘ میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ’’اگر چنگیز خان میرے والد صاحب کا دشمن ہے تو پھر یہ خط......!‘‘

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔ ’’خط...... کیا مطلب؟‘‘

’’آپ خود دیکھ لیں۔‘‘ میں نے کوریئر کمپنی والا لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے فوراً میرے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا پھر کھول کر اس کے اندر موجود تحریر کو پڑھنے لگا۔ میں نے اپنی عقابی نگاہ اس کے چہرے پر گاڑ دی۔

پرچے پر نظر پڑتے ہی اس کے دیدے پھٹ گئے۔ اسی لمحے میرے سیل فون کی میسج ٹون دھیرے سے بجی۔ میں نے چیک کیا۔ وہ عظیم کا ایس ایم ایس تھا۔

’’برو! میں پہنچ گیا ہوں۔‘‘

’’اوکے۔‘‘ میں نے ریپلائی کیا۔ ’’جیسے ہی نادر شاہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جانے کے لیے اٹھے گا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں پوری طرح تیار بیٹھا ہوں۔" اس نے کہا۔
میری نظر اس دوران میں مسلسل نادر شاہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ الجھن آمیز حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ تحریر ایسی بھی طویل نہیں تھی کہ اسے پڑھنے میں زیادہ وقت لگتا۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ اس خط کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ میں نے مداخلت ضروری جانی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"انکل! آپ نے چنگیز خان کا خط پڑھ لیا؟"
اس کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ کیسے ہوگیا؟"
یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ یا تو اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ خط کی تحریر نے اس کی سماعت معطل کردی تھی اور یا پھر اس نے میری بات کو سن، ان سنی کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت وہ ناقابلِ یقین صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
"کیا کیسے ہوگیا شاہ جی......؟"
وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مم...... میرا مطلب ہے...... کہ چنگیز خان تمہیں ایسا خط کیوں لکھے گا...... اس کے اندر یہ تبدیلی کیسے آگئی......؟"
"یہی تو......" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ آپ نے بتایا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے ایک خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ میرا ہمدرد بن کر مجھے خط لکھ رہا ہے۔ یہ کیا معما ہے شاہ جی؟"
"میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا ہے......" وہ بڑے شاطرانہ انداز میں بات کو بناتے ہوئے بولا۔
"مجھے بھی سمجھائیں انکل۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"میں تو چنگیز خان سے ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا اسی لیے آپ کو بلایا ہے تاکہ اس کے بارے میں آپ سے معلومات حاصل کرسکوں۔ مجھے تو یہ شخص خاصا بھلا لگا ہے۔"
"ہرگز نہیں!" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم اس شیطان سے ملنے کے بارے میں کبھی بھول کر بھی نہیں سوچنا۔ میں اس کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہ خبیث تمہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کی سازش کے جال میں قدم رکھنے کی غلطی نہیں کرنا بیٹا...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

سوری

گاہک۔ "سردار صاحب دو انڈے دے دیجیے۔"
سردار۔ "سوری میں مرغی نہیں، دکاندار ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆

جلدی

سردار ہوائی جہاز میں جھگڑا کر رہا تھا کہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔ سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ آپ کی سیٹ آگے ہے۔
ایک آدمی اٹھا اور سردار کے کان میں کچھ کہا۔ سردار بھاگ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
لوگوں نے حیران ہو کر اس آدمی سے پوچھا۔ "آپ نے ایسا کیا کہا کہ سردار فوراً مان گیا؟"
آدمی بولا۔ "میں نے بس اتنا کہا ہے کہ آگے والے جلدی پہنچ جائیں گے۔"

☆☆☆☆☆☆

عیادت

سردار دوست سے۔ "اب تمہاری کھانسی کا کیا حال ہے؟"
دوست۔ "کھانسی تو بند ہوگئی ہے بس ذرا سانس رک رک کے آرہی ہے۔"
سردار۔ "پریشان مت ہو۔ سانس بھی بند ہوجائے گی۔"

☆☆☆☆☆☆

COMMING SOON

سردار کی اپنے باپ سے لڑائی ہوگئی۔ سردار نے غصے میں اپنے باپ کی تصویر اٹھائی اور قبرستان میں جا کر دیوار کے ساتھ لٹکا کر نیچے لکھ دیا۔
"COMMING SOON"

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"بالکل سمجھ رہا ہوں انکل۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے خیر خواہ ہیں، میرے لیے سب سے زیادہ بھروسے والے ہیں۔ میں تو وہی کروں گا جو آپ مجھ سے کہیں گے۔"

"شاباش بیٹا! تم بڑی دانش مندانہ باتیں کر رہے ہو۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ "میری ایک بات کو غور سے سنو۔ اگر تم نے میرا مشورہ مان لیا تو سمجھ لو، پھر تمہاری زندگی کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

"آپ بتائیں انکل۔" میں نے مصنوعی سراسیمگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلی فرصت میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔"

"جتنا جلدی ممکن ہو، تم واپس جدہ چلے جاؤ۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "چنگیز خان کو پتا چل چکا ہے کہ تم کراچی میں ہو۔ وہ کسی بھی حیلے بہانے سے تم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کی رسائی کا ایک ہی مطلب ہے......"

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا تو میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "میری موت...... آپ یہی کہنا چاہ رہے ہیں نا؟"

"اللہ تمہاری حفاظت کرے بیٹا۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن سچائی سے نگاہ چرائی بھی نہیں جا سکتی۔ زمینی حقائق تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں کی دھرتی تمہارے لیے تنگ کر دی جائے گی۔"

"آپ فکر نہ کریں انکل!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں کل ہی کی کسی فلائٹ میں اپنی سیٹ کنفرم کراتا ہوں۔ جب ماں ہی باقی نہیں رہیں تو میں یہاں رک کر کیا کروں گا......"

"بیٹا! جان ہے تو جہان ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم نے حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا ہے۔ تمہاری جتنے بجے کی فلائٹ کنفرم ہو، مجھے ضرور بتا دینا۔"

"ضرور بتاؤں گا انکل!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ ان شاء اللہ! فون پر ہمارا رابطہ رہے گا۔"

"ان شاء اللہ......" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ خط اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں انکل۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "میں نے کون سا اس کاغذ کے ٹکڑے کا اچار ڈالنا ہے بلکہ اگر میری مانیں تو اسے پھاڑ کر پھینک دیں۔ اس فضول پرچے سے ہمیں کیا لینا دینا......"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ واقعی ایک فضول سی چیز ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ایک خاص مقصد سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس بات کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ چنگیز خان سے اس تحریر کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ کسی دوسرے یا تیسرے شخص نے چنگیز خان کی آڑ لے کر یہ چال چلی ہو تاکہ تمہیں شکار کیا جا سکے۔ ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ یہ جو کوئی بھی ہے، تمہارا دوست تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے انکل۔" میں نے بڑی مضبوطی سے اس کے خیال کی تائید کر دی۔

"تم آرام کرو۔ میں چلتا ہوں۔" وہ الوداعی انداز میں بولا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ خیر کرے گا۔"

"جی انکل......!" میں نے بس اتنا ہی کہا۔

وہ ڈرائنگ روم سے نکلا تو میں نے عظیم کو کال کی۔

"وہ آ رہا ہے۔ تم ریڈی ہونا......؟"

"ایور ریڈی برو۔" وہ کراری آواز میں بولا۔

"مجھے بڑی بے قراری سے تمہاری رپورٹ کا انتظار رہے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کام بہت ہوشیاری سے کرنا ہے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ تمہارا انتظار طوالت نہ پکڑے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آگے جو اللہ کو منظور۔"

"مالک کی مرضی کے سامنے سب بے بس ہیں۔" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"نادر شاہ تمہاری اسٹریٹ سے نکل کر زمزمہ بلیوارڈ کی سمت بڑھ رہا ہے۔" عظیم نے بتایا۔ "میں اس کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔"

میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔ "آل دی بیسٹ!"

میں نے تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ سے جو گفتگو کی تھی اس سے ایک بات تو پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ کسی نہ کسی حوالے سے اس معاملے میں ملوث ضرور تھا۔ میرے تحریر کردہ خط کو پڑھ کر اس کی آنکھوں اور چہرے پر جس نوعیت کے تاثرات نمودار ہوئے تھے اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی دقت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس کے ری ایکشن سے بے یقینی جھلکتی تھی۔ اس کا یہ جملہ قابلِ غور اور نہایت ہی توجہ کا حامل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھا...... یہ کیسے ہوگیا؟

گویا وہ کچھ اور ''ہونے'' کی توقع کر رہا تھا اور یہ ''کچھ اور'' وہ اصلی خط بھی ہوسکتا تھا جو میں نے غائب کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس تحریر کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اگر یہ خط اسی نے مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے بھیجا تھا تاکہ میں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوجاؤں تو پھر خط کی تبدیلی پر اس کا ردِعمل عین فطری تھا اور اگر یہ خط اس کی طرف سے نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ خط چنگیز خان کی جانب سے آیا ہے تو بھی اس کا ری ایکشن جسٹیفائی ہوجاتا تھا۔ اس امر کے امکانات فی الحال صفر کے برابر نظر آرہے تھے کہ نادرشاہ مذکورہ خط سے قطعی لاتعلق یا لاعلم ہو۔ اب جو بھی حقیقت تھی، چند منٹ کے بعد اسے روزِ روشن کے مانند عیاں ہوجانا تھا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے فوراً کال ریسیو کرلی۔ دوسری طرف عظیم تھا۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں اس نے بتایا۔

''برو! اس بندے نے بدر کمرشل کی جانب رخ نہیں کیا۔''

''اس کا مطلب ہے، اس کا ارادہ اپنے گھر جانے کا نہیں ہے۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا وہ نارتھ ناظم آباد کی جانب جارہا ہے؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ دوٹوک الفاظ میں بولا۔

''ہرگز نہیں کا کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''مطلب یہ کہ وہ اس وقت شارع فیصل پر چڑھ چکا ہے اور اس کا رخ ائرپورٹ کی جانب ہے۔'' عظیم نے بتایا۔

''یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آرہی۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''وہ میرے گھر سے نکل کر ائرپورٹ کیوں جارہا ہے؟''

''ابھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی کہ وہ ائرپورٹ ہی جارہا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں صرف اتنا بتایا ہے کہ اس کا رخ ائرپورٹ کی جانب ہے۔ تم دس پندرہ منٹ رکو...... میں تمہیں اپ ڈیٹ کرتا ہوں۔''

''اوکے...... آئی ایم ویٹنگ۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

عظیم نے مجھے جو صورتِ حال بتائی تھی، اس کے مطابق تو نادرشاہ اپنے گھر گیا تھا اور نہ ہی اس کا نارتھ ناظم آباد جانے کا کوئی ارادہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ذہن میں کون سی منزل تھی، یہ اسی وقت معلوم کیا جاسکتا تھا جب وہ کہیں پڑاؤ ڈالتا۔ اس کے ٹھہرنے کے مقام کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس کے پاس گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جس شخص سے بھی ملنے جارہا تھا، ایک بات تو طے تھی کہ اس جگہ اور اس شخص کا مجھے بھیجے گئے خط سے گہرا تعلق تھا......!

میں بڑی بے صبری سے اپنے بیڈروم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا، مجھے عظیم کی کال کا انتظار تھا۔ مجھے وہی بتاسکتا تھا کہ نادرشاہ کہاں اور کس کے پاس گیا تھا۔ میں نادرشاہ کی اس پراسرار حرکت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب عظیم تھا۔

''ہاں عظیم۔'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا رپورٹ ہے......؟''

''بھائی صاحب! آپ کا بندہ محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے میں گھسا ہے۔'' عظیم نے بتایا۔ ''بنگلے پر ''خان ہاؤس'' کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ میں نے مذکورہ بنگلے کا نمبر اور لوکیشن ذہن نشین کرلی ہے۔ اب بتاؤ، آگے کیا کرنا ہے؟''

''صرف پندرہ منٹ انتظار۔'' میں نے کہا۔ ''کسی بھی محفوظ مقام پر کھڑے ہوکر نادرشاہ کی واپسی کا انتظار کرو۔ اگر وہ اس دوران میں باہر نہ نکلے تو تم اپنے گھر جاسکتے ہو۔''

''اور اگر تمہاری دی ہوئی مہلت سے پہلے وہ بنگلے سے نکل آئے تو......؟''

''تو بھی تم اس پر لعنت بھیج کر اپنے گھر چلے جانا۔'' میں نے کہا۔

''خان ہاؤس کی کیا مسٹری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق، والد صاحب کی چنگیز خان نامی ایک شخص سے دشمنی تھی اور اسی بدبخت نے میرے باپ کو قتل کرایا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں عظیم کو بتایا۔ ''ماں کی خواہش کی خاطر میں نے ہر نوعیت کے انتقامی جذبات کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کوریئر سروس سے ایک لیٹر ملا تھا جو چنگیز خان کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اس خط میں چنگیز خان نے میرے باپ اور ماں کو قتل کروانے کا اعتراف کیا ہے اور مجھے بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ میں اس وقت جو کچھ کررہا ہوں یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ چنگیز خان کوئی اتنا احمق انسان ہوگا کہ تمہارے والدین کی موت کا یوں تحریری اعتراف کرے گا۔'' اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔''

''میں نے بھی خط پڑھ کر اسی انداز میں سوچا تھا اور

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میرا شک نادر شاہ کی طرف گیا تھا۔" میں نے عظیم کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ نادر شاہ نے مجھے ڈرانے کے لیے یہ چال چلی ہے تاکہ میں خوفزدہ ہو کر فوراً سے پیشتر جدہ واپس چلا جاؤں۔ میں نے چیک کرنے کے لیے شاہ جی کو اپنے پاس بلایا اور اسے مذکورہ دھمکی آمیز خط کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے چلا جاؤں ورنہ میری جان کو خطرہ ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نادر شاہ میرے گھر سے نکل کر کس طرف کا رخ کرتا ہے اسی لیے میں نے تمہیں اس کا تعاقب کرنے کو کہا تھا۔"

"سمجھ گیا برو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور یہ کم بخت تمہارے پاس سے رخصت ہو کر ایم اے سوسائٹی کے ایک ایسے بنگلے میں پہنچا ہے جس کے گیٹ پر "خان ہاؤس" نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے، یہ چنگیز خان کا گھر ہو......"

"میری معلومات کے مطابق، میرے باپ کا قاتل چنگیز خان کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں رہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے، اس نے رہائش تبدیل کر لی ہو۔"

"میں کسی طرح پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ "خان ہاؤس" میں کون رہتا ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "ویسے یہ تو ثابت ہو گیا کہ نادر شاہ مشکوک کردار کا مالک ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "میں ماں کی وجہ سے اس شخص کو برداشت کر رہا تھا ورنہ روزِ اول سے یہ بندہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔"

"ڈونٹ وری برو۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "میں "خان ہاؤس" کے مکینوں کی کنڈلی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر سارے کنکشنز کھل کر سامنے آجائیں گے۔"

"او کے دوست! تم اپنی ریسرچ جاری رکھو۔" میں نے کہا۔ "کل دن میں ملتے ہیں۔ اب میں آرام کروں گا۔"

"تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔" وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ "میں سمجھ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ کل جب ہماری ملاقات ہوگی تو تمہیں بتانے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہوگا...... ان شاء اللہ!"

"ان شاء اللہ......!" میں نے تہِ دل سے کہا۔

☆☆☆

بینا کی سرخ کلٹس کراچی کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ میں اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر موجود تھا اور وہ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے عظیم سے یہی کہا تھا کہ اب میں آرام کروں گا لیکن بینا چونکہ پہلے سے اسٹینڈ بائی تھی اس لیے ہم لانگ ڈرائیو پر نکل آئے تھے۔ اس خط نے میری سوچ میں خاصی افراتفری مچائی تھی۔ میں سونے سے پہلے اپنے دماغ کو پُرسکون کر دینا چاہتا تھا اسی لیے چاندنی رات میں بینا کی معیت کو انجوائے کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم زمزمہ سے نکلے، اس نے تیکھی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب بتاؤ، مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ مجھے دیکھتے ہی تمہیں بدمعاشی سوجھنے لگتی ہے؟"

"سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے......!" میں نے ونڈ اسکرین کے پار نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اگر ریکارڈ کی سطح پر سوئی کے لیے بنے ہوئے مخصوص راستے میں کوئی خرابی ہو تو سوئی اٹک ہی جایا کرتی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"اوہ...... تو ریکارڈ کی درستی کے لیے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔" میں نے بہ دستور گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔" وہ ایک ادا سے بولی۔ "گینداس وقت تمہاری کورٹ میں پڑی ہے۔"

"او کے...... اگر بال میری کورٹ میں ہے تو شاٹ بھی مجھے ہی لگانا ہوگی۔" میں نے اس کی جانب گردن موڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دیکھ کر دماغ میں بدمعاشی کا کیڑا اس لیے کلبلانے لگتا ہے کہ تمہاری شکل ایک فیمیل اسپینش راک اسٹار سے بہت زیادہ ملتی ہے۔"

"اس راک اسٹار کا نام شارو ہے یا ڈیلفینا؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "یہ دونوں بھی تو اسپینش ہی ہیں نا......!"

"تم میری بات کو مذاق میں لے رہی ہو۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "جبکہ میں سنجیدہ ہوں۔ کیا تم نے کبھی آئینے میں خود کو غور سے نہیں دیکھا؟"

"روز کئی بار دیکھتی ہوں۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "مگر میں سمجھ نہیں پا رہی کہ میرے چہرے میں کون سی ورلڈ فیم راک اسٹار کی مشابہت پائی جاتی ہے۔"

"میں شاکرا کی بات کر رہا ہوں۔"

"شاکرا...... وہاٹ؟" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "کیا تم کسی لوکل سنگر کا ذکر کر رہے ہو......؟"

"برا سا منہ بنانے کے بجائے تھوڑا منہ کو بگاڑ کر بولو تو بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ عموماً انگریز بولتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو......؟" وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

”ویری سمپل!“ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں نے تمہارے سامنے جس روک اسٹار کا ذکر کیا ہے، ذرا انگریزوں کے انداز میں منہ بگاڑ کر اس کا نام لو۔“

”شاکرا......شاکیرا......“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

”ویل سیڈ بے بی۔“ میں نے بہ دستور زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا اشارہ شکیرا از اپنل مبارک ہی کی طرف تھا۔ کیا کبھی کسی اور نے اس بات کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کیا؟“

”ہاں...... بعض لوگوں کو ایسا لگتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”لیکن میں نے کبھی اس مشابہت پر زیادہ توجہ نہیں دی۔“

”پہلے کبھی توجہ نہیں دی تو اب دو۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اتنی شدید تاکید......“ وہ شک آلود نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا شکیرا تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

اس کے سوال میں ایک خاص نوعیت کی انکوائری پائی جاتی تھی۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یس...... آف کورس۔“

”اوہ...... تو یہ معاملہ ہے!“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دل شکیرا میں اٹکا ہوا ہے، دوستی شارو سے چل رہی ہے اور مجھ سے محض ٹائم پاس......“

”تم غلط سمجھ رہی ہو پینا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم اور شارو میرے لیے دونوں اچھی دوست ہو۔ باقی جہاں تک شکیرا کا معاملہ ہے تو اس صف میں، میں کوئی اکیلا ہی نہیں کھڑا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق، اس دنیا کا کم از کم ہر دوسرا مرد شکیرا کو پسند کرتا ہے اور ہر دسواں مرد اس کا دیوانہ ہے۔“

”تم مرد حضرات اتنے ندیدے کیوں ہوتے ہو؟“ اس نے تبسم ریز لہجے میں پوچھا۔

”تم جانتی ہو، میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں اس لیے تمہارے سوال کا میں ٹیکنیکل جواب دوں گا۔ تمہیں میرا جواب پسند آئے یا نہ آئے، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“

”یہ تو میں جواب سننے کے بعد فیصلہ کروں گی۔“ وہ گاڑی کو میٹروپول سے شارع فیصل پر ڈالتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”مرد طبعاً عیاش ہوتا ہے۔ اس کی اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا بھر کی حسین و جمیل عورتوں کو وہ اپنے تصرف میں یا کم از کم اپنے قبضۂ قدرت میں یا اس سے بھی کم اپنے لنک میں رکھے۔ اس معاملے میں غریب مرد بے چارہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اس کی یہ فطری خواہش تخیل اور تصور تک محدود رہتی ہے جبکہ صاحبِ ثروت مرد حضرات اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا ہے۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ میں مرد کی نفسیاتی خواہش کی بات کر رہا ہوں۔ جو شخص اللہ سے دوستی کر لیتا ہے، اس ذات پاک کی خوب صورتی سے آشنا ہو جاتا ہے پھر دنیا کی کوئی بھی حسین شے اس کی نگاہ میں نہیں سماتی......“

”تم تو بڑے کھل کر مردوں کی فطرت کو بیان کر رہے ہو۔“ وہ گہری نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایسے ہی صاف گو لوگ پسند ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”شاید اس لیے کہ میں خود بھی ایسی ہی ہوں۔“

”پلیز واپسی کے راستے پر گاڑی موڑ لو۔ ایک عمارت کو دیکھ کر مجھے کچھ یاد آ گیا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مذکورہ عمارت واپسی کے راستے پر پڑتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں جانا چاہتا ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......!“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آگے نزدیک میں کوئی کٹ نہیں ہے۔ ہمیں چند کلومیٹر سیدھا جانے کے بعد واپسی کے لیے مڑنے کا راستہ مل سکے گا۔“

”ٹھیک ہے، جیسے تمہیں آسانی ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

دراصل وہ بلڈنگ اچانک میری نگاہ میں آ گئی تھی جس میں ریجنل ٹی وی چینل کا سیٹ اپ لگا ہوا تھا۔ میں نے آج رات کے ابتدائی حصے میں آٹھ سے نو بجے تک یہیں پر جی ایم سر سے ملاقات کی تھی۔ یہ شخص میرے دل و دماغ میں اتر گیا تھا۔ سر کی باتوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی تھی۔ ہماری ایک گھنٹے کی ملاقات پل بھر میں گزر گئی تھی اور میرے اندر تشنگی کے ایک وسیع و عریض صحرا کو بچھا گئی تھی۔ چینل والی عمارت کو دیکھ کر میرا دل مچل اٹھا تھا کہ میں جی ایم سر کے ساتھ مزید کچھ وقت گزاروں۔ اسی لیے میں نے پینا کو گاڑی موڑنے کے لیے کہا تھا۔

میری ہدایت پر پینا نے مذکورہ بلڈنگ کے سامنے واقع پل کے نیچے گاڑی پارک کی تو میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ بلڈنگ کے داخلی راستے کے قریب جی ایم سر ٹہل رہے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا۔ مجھ پر نگاہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پڑتے ہی جی ایم سر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں بینا کے ساتھ تیزی سے ان کی جانب بڑھ گیا۔

وہ بڑی محبت سے ملے اور رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔ ''پروگرام کی وجہ سے مجبوراً میں آپ کو زیادہ وقت نہیں دے سکا تھا۔ ہماری ملاقات ادھوری رہ گئی تھی۔ مجھے پتا تھا، آپ دوبارہ میرے پاس آئیں گے اسی لیے میں آپ کے استقبال کی خاطر یہاں ٹہل رہا تھا۔''

میں نے ان سے یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کی کہ انہیں کیسے پتا چلا کہ میں دوبارہ ان سے ملنے آؤں گا؟ ویسے سچی بات یہ ہے کہ میرا جی ایم سر کی طرف آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ ان کے یہ الفاظ میری یادداشت میں محفوظ تھے۔

''آپ کو بار بار مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔'' چینل والی بلڈنگ کو دیکھ کر یکایک میرے دل میں جی ایم سر سے ملنے کا خیال ابھرا تھا۔ تو کیا...... یہ خیال میرے ذہن کی سیلف پروڈکشن تھا یا کسی بیرونی قوت کے زیرِ اثر پیدا کیا گیا تھا؟ اگر آخرالذکر امکان پر غور کیا جاتا تو پھر بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ یہ خیال میرے ذہن میں جی ایم سر نے اپنی کسی روحانی قوت کی مدد سے اجاگر کیا تھا اسی لیے وہ بلڈنگ سے باہر بڑے اعتماد کے ساتھ میرا انتظار کررہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی خواہش کے مطابق میں ضرور آؤں گا اور ......میں بے اختیار ہوکر چلا آیا تھا۔

''سر! آپ شرمندہ نہ کریں۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میری اتنی اوقات کہاں کہ آپ جیسا عبقری میری راہ دیکھ رہا ہو۔''

''انسان کی اوقات پر بعد میں بات ہوگی۔'' وہ اپنی روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے پھر اپنے قریب کھڑے نوجوان سے کہا۔ ''تفسیر! تم میڈم کو اندر لے جاؤ۔ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔''

''میڈم'' سے جی ایم سر کی مراد بینا تھی۔ تفسیر نامی اس نوجوان نے فرماں برداری سے کہا۔

''اوکے سر!''

بینا نے تفسیر کے ساتھ جانے سے پہلے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ جی ایم سر مجھے اپنے ساتھ لے کر سروس روڈ پر ایک جانب بڑھنے لگے۔

''کھانا کھالیا آپ نے؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''نہیں سر۔''

''چائے پراٹھا چلے گا نا؟''

''آپ کا حکم سرآنکھوں پر۔''

''ادھر ہوٹل پر بہت عمدہ چائے پراٹھا ملتا ہے۔'' وہ مجھے اپنی معیت میں چلاتے ہوئے بولے۔ ''آپ کے بہانے میں بھی کھالوں گا۔''

میں نے مختصراً کہا۔ ''جی سر۔''

وہ مجھے مختلف گلیوں میں سے گزار کر چینل والی بلڈنگ کے پچھواڑے والے علاقے میں لے آئے۔ ہم نے ریلوے لائن کو عبور کیا اور مذکورہ ہوٹل پر پہنچ گئے۔ اس ہوٹل پر بیٹھنے کے لیے کرسی میز کا بندوبست نہیں تھا بلکہ اس مقصد کے لیے کئی ایک چوبی تخت بچھے ہوئے تھے جن پر بیٹھے ہوئے گاہک چائے اور پراٹھے سے دل بہلا رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک خالی تخت پر نشست جمالی۔

''آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں آپ کو کس ڈھابے پر لے آیا ہوں۔'' جی ایم سر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کی کمپنی میں بہت کمفرٹ فیل کررہا ہوں۔ چھپر ہوٹل کا بھی ایک اپنا ہی مزہ ہے۔''

جی ایم سر نے کڑک پراٹھے اور چائے کا آرڈر دیا پھر ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ''آپ اپنا سیل فون آف کردیں۔'' انہوں نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

میں نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل کردی۔

انہوں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے امریکا والے نمبر کا سم کارڈ بھی سیل فون میں لگا ہوا ہے؟''

''جی سر۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''کچھ عرصے کے لیے آپ اس سم کارڈ کو نکال کر کہیں رکھ دیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''وہ عورت جو امریکا سے آپ کے پیچھے آئی ہے، اس کے پاس آپ کا یہ نمبر ہے۔ وہ اس نمبر سے آپ کو بہ آسانی ٹریس کرسکتی ہے۔''

''میں گھر پہنچ کر آپ کی ہدایت پر لازمی عمل کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے میری ٹریسنگ اور ٹریکنگ کے لیے وہ میرے پاسپورٹ کا سہارا بھی لے سکتی ہے۔''

پھر میں نے جی ایم سر کو بتایا کہ امریکی شہریت رکھنے والے افراد کے بلیو پاسپورٹ کے اندر ایک خفیہ چپ لگی ہوتی ہے جس کی مدد سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ جب چاہے سیٹلائٹ سسٹم کے تحت دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے شہری کی لوکیشن کا پتا چلاسکتا ہے۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔
''گھوڑے کو چوری ہونے سے بچانے کے لیے اسے کھونٹے پر مضبوطی سے باندھنے کا حکم ہے۔اس کے بعد اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ پاسپورٹ چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ نہیں ہوتا جبکہ یہ سیل فون آپ ہر وقت کیری کرتے ہیں۔ یہ پاسپورٹ کی بہ نسبت آپ کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔
اس دوران میں بیرے نے چائے پراٹھا سرو کر دیا۔
جی ایم سر نے کہا۔ ''کیا بات ہے۔ آپ کافی الجھے ہوئے نظر آ رہے ہیں...... کوئی پریشانی ہے کیا؟''
''سر! میں اپنی ایک دوست کے لیے بہت فکر مند ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے اسے امریکا سے اغوا کر کے کیوبا پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔''
''کیا آپ کے فکر مند ہونے سے اس کی خیر خبر مل جائے گی؟'' انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''نہیں سر!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور پریشان ہو رہا ہوں۔''
''تو گویا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یوں پریشان ہونے سے آپ کی دوست کی مشکل آسان ہو جائے گی؟'' وہ اپنی مقناطیسی آنکھوں کو میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے مستفسر ہوئے۔
''نہیں سر!'' میں نے ایک مرتبہ پھر سر کو نفی میں جنبش دی۔ ''اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدام کرنا ہوگا۔''
''تو کریں عملی اقدام......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔
بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کیسے سر؟''
''اسے شدت سے یاد کریں۔'' انہوں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی چائے پراٹھے پر بھی توجہ دیں۔''
میں ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے شارو کو یاد کرنے لگا۔ انہوں نے کہا۔
''انسانی جذبات کے اندر بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ یہ ٹائم اینڈ اسپیس کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو کروڑوں اربوں کلومیٹرز کا فاصلہ نینو سیکنڈ میں طے کر سکتے ہیں مگر...... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟''
ان کے اچانک کیے گئے سوال نے مجھے چونکا دیا، میں نے پوچھا۔ ''میں نے کیا کر دیا سر؟''
''آپ اپنی گمشدہ دوست کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''
''آپ نے یہی تو کہا تھا۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔
''میں نے کہا تھا، اپنی دوست کو شدت سے یاد کریں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''اور ''یاد'' دماغ سے نہیں، دل سے کیا جاتا ہے۔ دماغ کا کام سوچنا ہے اور دل کا کام محسوس کرنا ہے۔ دماغ معاملات کو الجھاتا ہے اور دل معاملات کو سلجھاتا ہے۔ سو، ڈونٹ تھنک...... جسٹ فیل!''
''ہو گیا سر......!'' میں پُرجوش انداز میں بولا۔
انہوں نے پوچھا۔ ''کیا فیل آئی ہے؟ آپ نے اپنی دوست کے بارے میں کیا محسوس کیا ہے؟''
''شارو کی عزت اور جان محفوظ ہیں۔'' میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں بتایا۔
''بس اتنی سی بات تھی۔'' وہ نپے تلے الفاظ میں بولے۔ ''آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس عمل کی پریکٹس گاہے بہ گاہے کرتے رہا کریں۔ رفتہ رفتہ آپ مشاق اور تجربہ کار ہوتے جائیں گے۔ آپ کے اندر ایک نادیدہ ایپلی کیشن انسٹال ہو چکی ہے۔ جب بھی آپ کسی ہنگامی صورتِ حال میں اس ایپ کو استعمال کریں گے، آپ کو موقع محل کی مناسبت سے فوری جواب مل جائے گا۔''
جی ایم سر کا جو ابتدائی تعارف مجھ تک پہنچا تھا اس کے مطابق، وہ اس ریجنل ٹی وی چینل میں آئی ٹی کے معاملات کو دیکھتے تھے لیکن میرے ذاتی تجربے کی روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ وہ بہت ہی پہنچی ہوئی شخصیت ہیں۔ انہوں نے خود کو چھپانے کے لیے چینل کی اس جاب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔
''شکریہ سر!'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔''
''شکریہ اس مالک کا ادا کریں جس نے چائے پراٹھے کی شکل میں یہ رزق آپ تک پہنچایا ہے۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''اور آپ مالک کی اس نعمت کو لفٹ ہی نہیں کرا رہے!''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں نے ''سوری'' کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھالیا اور پراٹھے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بہت مہان ہستی ہیں۔''

''یہ جو میڈم آپ کے ساتھ آئی ہیں، انہیں آپ کے ساتھ وہی کچھ ہوگیا ہے جو آپ کو اپنی گمشدہ دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔'' میرے آخری جملے پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ ''اس لیے آپ کبھی اسے آزمانے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ قدرت آپ کی گمشدہ دوست کے حوالے سے آپ کو بھی کڑی آزمائش میں ڈال سکتی ہے۔''

''میں آپ کی ہدایت کو یاد رکھوں گا۔'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔

''اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''محبت کرنے والے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی خاطر جان دینے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔''

میں اندر سے کانپ کر رہ گیا تاہم زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔

وہ بولے۔ ''آپ تینوں کسی مثلث کے تین زاویوں کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہو، چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی آپ لوگ خود کو ایک دوسرے سے زیادہ عرصے کے لیے دور نہیں کرسکتے۔ آپ اپنی گمشدہ دوست کے پیچھے بھاگو گے اور یہ میڈم آپ کے تعاقب میں رہے گی۔ زندگی کی آخری سانس تک یہ دوڑ دھوپ جاری رہے گی۔''

''کیا ہم لوگ کبھی اپنی منزل پر پہنچ بھی پائیں گے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''زندگی کی آخری منزل موت ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اور ہم سب ایک دائرے میں محوِ سفر اپنی اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ دانستہ میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں اصرار مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔

''سر! کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ ڈیلفینا اسلام آباد میں کیا کرنے آئی تھی اور اب کراچی کا رخ کیوں کررہی ہے؟''

''آپ کے دوسرے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ آپ کی ''محبت'' میں کراچی آرہی ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''البتہ، راولپنڈی اور اسلام آباد سے ایک خاص مقصد سے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اس جوڑے کا سراغ لگا سکے جو کم و بیش بیس سال پہلے امریکا سے اچانک غائب ہوگیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا بالکل آپ کی عمر کا......''

''او مائی گاڈ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''تو ڈیلفینا غریدہ، الفریڈ اور ان کے بیٹے کی تلاش میں اسلام آباد آئی تھی؟''

''اسے پتا چلا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں۔'' جی ایم سر نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''اس نے اپنے ذرائع استعمال کرکے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ یہ جوڑا جب امریکا سے پاکستان پہنچا تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا لہٰذا اب آپ کی اس امریکی مہربان، قدردان ڈیلفینا کو کافی حد تک یقین ہوگیا ہے کہ انہیں جس باکمال نوجوان کی تلاش ہے وہ آپ کے سوا اور کوئی نہیں۔''

''یہ تو خاصی خطرناک صورتِ حال ہے سر۔'' میں نے تشویش بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا پھر اپنی جیب سے چنگیز خان والا خط نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں، میں پہلے ہی کن جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہوں۔''

انہوں نے بڑی توجہ سے وہ خط پڑھا پھر مجھے واپس کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے جان بوجھ کر خود کو ان جھمیلوں میں پھنسایا ہے ورنہ سیدھی سی بات تھی۔ آپ اپنی ماں کی خواہش کے مطابق ان کے حکم کی تعمیل کرتے۔ کسی جھگڑے پھڈے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر مالک کا لکھا تو پورا ہونا ہی ہے نا......'' لحاتی توقف کرکے انہوں نے مذکورہ خط کی جانب اشارہ کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یہ سب لوگ کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں سے کسی کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی خود آگے بڑھ کر آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اسے اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالیں۔ آپ کو درحقیقت چیل، کوّوں اور گدھوں کی جانب سے محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ بوٹی نوچنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟''

ان کا اشارہ ڈیلفینا، ایبل بام اور آرزک جیسے افراد کی طرف تھا۔ جن کے لیے انہوں نے ''چیل، کوّے اور گدھ'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی سر! میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔''

''آپ کا واسطہ اس وقت دنیا کے طاقتور ترین افراد

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے ہے۔'' وہ اپنی ہاتھوں کی پشت کو گھورتے ہوئے دھیمے انداز میں بولے۔ ''اسکل اینڈ بونز بڑی فعال سیکرٹ سوسائٹی ہے۔ ان سے بھی آگے کی چیز 'ایلومیناتی' سیکرٹ سوسائٹی ہے۔''

''سر! آپ ان لوگوں کے بارے میں بڑی وسیع معلومات رکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کو یہ خوف نہیں کہ آپ کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؟''

''نہیں......!'' وہ قطعی لہجے میں بولے۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کو جو کچھ بتایا یہ کوئی خفیہ راز نہیں ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ سیکرٹ سوسائٹی سے متعلق ایسی باتیں بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔ ویسے سیکرٹ سوسائٹی والے عموماً اپنے رازوں کو چھپاتے نہیں ہیں لیکن کسی غیر متعلق (نان ممبر) شخص کو یہ اپنی خفیہ پریکٹس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔''

''جی سر! یہ تو میں بھی جانتا ہوں اسی لیے ڈیلفینا نے مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''لگا دیا تھا نہیں......'' وہ تصحیح کرنے والے انداز میں بولے۔ ''بلکہ وہ اس وقت بھی اسی مشن پر کمربستہ ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے سر۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر کہا۔ ''سر! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟''

''ضرور پوچھیں جناب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''ہم اسی مقصد سے یہاں بیٹھے ہیں۔''

''فلسفے کی پروفیسر ایما ایپل بام نے مجھے بتایا تھا کہ یہودی پوری دنیا پر حکمرانی کے لیے ایک خصوصی جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس حوالے سے ان کی مقدس کتاب تالمود میں بڑے واضح طور پر لکھا ہے کہ جب مسلسل چار مکمل چاند گرہن یہودیوں کے مذہبی تہوار والے مہینوں میں لگیں گے تو وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑیں گے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''آپ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ ''تالمود'' یہودیوں کی ایسی ہی کتاب ہے جیسے ہمارے ہاں احادیث کی کتب ہیں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ''یہودی اکابرین نے تالمود میں بھی ترمیم و اضافہ فرما رکھا ہے۔ ہمیشہ کے لیے ساری دنیا پر حکمرانی کا خواب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔''

''سر! آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''اس وقت بھی تو ساری دنیا کو وہی چلا رہے ہیں۔ آگے چل کر یہ اور زیادہ مضبوط ہوسکتے ہیں۔''

''جتنا مضبوط ہونا تھا، ہولیے۔'' وہ غیر متزلزل لہجے میں بولے۔ ''اب ان کا انحطاط شروع ہونے والا ہے۔ یہ اپنی حکمرانی کا عرصہ گزار چکے۔ قدرت کسی قوم کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی۔ کسی زمانے میں عیسائیوں کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ پھر یہی اعزاز مسلمانوں کو کافی عرصے تک حاصل رہا۔ آج کل یہودیوں کی باری چل رہی ہے۔ اگلا نمبر چینی قوم کا ہے۔''

''اوہ......!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آئندہ کی سپر پاور چین ہوگا؟''

''بالکل!'' وہ چٹانی لہجے میں بولے۔ ''میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اسی لیے میں عنقریب چین جا رہا ہوں۔''

''صرف گھومنے پھرنے یا......''

''میں وہاں پر مستقل رہائش کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔ ''میں کیا سوچ رہا ہوں، یہ تو میرے آقا کا فرمان ہے اور اب مرشد کا حکم بھی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں سر۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''صدیوں پہلے میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا، علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''اس فرمان کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ چین عرب سے ایک دور دراز ملک تھا۔ دوسرے یہ کہ چین اس زمانے میں علم و دانش کا گہوارہ ہوا کرتا تھا اور بلاشبہ آج بھی ہے۔ میں بھی اپنی جہالت کو ناپنے اور علم کی پیاس بجھانے چین جا رہا ہوں۔''

''آپ نے اس کائنات کی عظیم ترین ہستی کے جس فرمان کا ذکر کیا، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے کسی مرشد کے حکم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے سر...... کیا آپ صاحب سلسلہ ہیں؟''

''چند سال پہلے کسی شخص کے توسط سے میں شمالی علاقہ جات میں ان سے ملا تھا۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساڑھے چودہ سو سال پہلے مسجد نبوی کے صحن میں آقا ﷺ کی محفل میں بیٹھا ہوں۔ بس میں اسی لمحے ہار گیا۔ اپنا سب کچھ میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا بلکہ میں نے اپنا آپ ان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کے سپرد کردیا۔ اب میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ آپ کو نظر آرہا ہے، میرے مرشد کا دیا ہوا ہے۔ مرشد نے مجھے صرف دو باتوں کی تلقین کی تھی۔ اول، بلاتفریق نسل ورنگ اور مذہب وملت آپ نے ہر انسان کا احترام کرنا ہے اور حتی الامکان اس کی مدد بھی کرنا ہے۔ دوم، مرشد کی بات پر اپنے ذہن کو سوچنے کی زحمت نہیں دینا۔ دل وجان سے ایمان لاکر من وعن اس پر عمل کرنا ہے......'' لمحاتی توقف کرکے انہوں نے ایک ہموار سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''مرشد کا حکم تھا ٹی وی چینل جوائن کرلو۔ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر اس ریجنل چینل پر ملازمت کرلی۔ اب مرشد کا حکم ہے چھن جائیں...... اس حکم کی بھی تعمیل لازم ہے۔''

''اب سمجھ میں آگئی بات۔'' میں نے ستائشی نظر سے جی ایم سر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہ آپ کی سپلائی کس گرڈ اسٹیشن سے ہے۔''

''جو شخص کسی گرڈ اسٹیشن سے منسلک ہوتا ہے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں رہتی۔'' وہ آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''آج پورا چاند ہے۔ دیکھیں کیسا چمک رہا ہے۔''

آج تیرھواں روزہ تھا۔ اس حساب سے غروب آفتاب کے ساتھ ہی چاند کی چودہ تاریخ شروع ہوگئی تھی۔ کھلے آسمان پر چودھویں کا چاند بڑا دل کش و دل نشیں دکھائی دے رہا تھا۔ ''چاند کو چھوڑو اور اس بات پر غور کرو کہ سیکرٹ سوسائٹی والے کچے کام نہیں کرتے۔ آپ بھی ڈیلفینا اور اس کی سوسائٹی کو ہلکا نہ لیں......''

''سر! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں!'' وہ قطعی لہجے میں بولے۔ ''میں آپ کو سمجھا رہا ہوں تاکہ آپ سے کسی بھی قدم پر کوئی غلطی نہ ہو۔''

''سر! اگر میرے پاس کوئی آپشن باقی نہ بچے۔ میں ان لوگوں کے سامنے مجبور ہوجاؤں تو ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''آپ نے ٹام اینڈ جیری کارٹون تو دیکھا ہوگا؟''

''جی، میں یہ کارٹون بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اگر آپ شوق سے دیکھتے ہیں تو ایک بات آپ نے خاص طور پر نوٹ کی ہوگی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اگرچہ ٹام ہر وقت جیری کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور اسے ہلکان کرکے رکھ دیتا ہے لیکن جب بھی جیری کسی مشکل میں پڑ جائے تو ایک مخلص دوست کی طرح ٹام اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ یہی معاملہ سیکرٹ سوسائٹی والوں کا بھی ہے۔ یہ اپنے شکار کے ساتھ ''ٹام اینڈ جیری'' والا کھیل کھیلتے ہیں۔ اسے دوڑاتے ہیں، بھگاتے ہیں اور ہلکان کرتے ہیں اور جب وہ ہانپ کر زمیں بوس ہوجاتا ہے تو پھر اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ جب یہ کسی کو اپنا دوست بنالیتے ہیں تو پھر وفاداری کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے وفائی اور غداری کا ایک ہی مطلب ہے...... موت! ایک ایسی موت جس کے معمے کو کوئی حل نہیں کرسکتا۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو......'' انہوں نے ذرا دیر کو رک کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جب آپ کے پاس کوئی آپشن باقی نہ بچے تو ان کے بیچ گھس جایئے گا۔ ذرا پتا تو چلے کہ بغیر کھڑکیوں اور دروازوں والی پراسرار عمارتوں کے اندر کون سا طلسماتی کھیل کھیلا جاتا ہے......!''

''آپ کا مطلب ہے، ایسی صورت میں مجھے سیکرٹ سوسائٹی جوائن کرلینا چاہیے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی!'' انہوں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''اور وہ...... روح کو گروی رکھوانے کا معاملہ......!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ان کی رکنیت کی بنیادی شرط یہی ہے اور میں کسی بھی قیمت پر یہ افورڈ نہیں کرسکتا۔''

''ہم اس وقت انتہائی صورت حال یعنی ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی بات کررہے ہیں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ''اول تو مجھے امید ہے، ایسی نوبت آئے گی ہی نہیں، بہ صورت دیگر اگر آپ کو سوسائٹی جوائن کرنے کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے تو پریشان نہ ہوں۔ آپ اندر سے جو کچھ بھی ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اگر باہر سے آپ بھی بدل جائیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مرشد نے آپ کی روح پر ایک ایسا لاک لگادیا ہے کہ وہ مالک کائنات کے سوا کسی کے تصرف میں جا ہی نہیں سکتی۔''

''مرشد نے میری روح پر لاک لگادیا ہے......'' شدت حیرت سے میری آواز کافی بلند ہوگئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟''

''میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔'' وہ معتدل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

انداز میں بولے۔

"لیکن ...... انہوں نے ...... یہ لاک کیسے لگایا......؟" میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔
"میں تو آپ کے مرشد سے کبھی ملا بھی نہیں......!"

"آپ کو ایسے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے مرشد کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔" وہ نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "مرشد ہر جگہ موجود ہیں اور انہیں ہر شے کی خبر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اچانک دوبارہ میرے پاس نہ آتے اور میں آپ کے استقبال کے لیے چینل کے باہر نہ ٹہل رہا ہوتا۔ میرا مرشد اللہ والا ہے اور...... اللہ والے کی تعریف آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔"

"آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے سر......!" میں کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ کو اس وقت حیران نہیں بلکہ فکرمند ہونا چاہیے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔

"کیوں سر......؟"

"میڈم آپ کی کھنچائی کرنے کے لیے یہاں آ رہی ہیں۔"

"کون میڈم......؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"وہی لیڈی جس کے ساتھ آپ میرے پاس آئے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "مزید انتظار ان کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ تفسیر کے ساتھ ادھر ہی آ رہی ہیں...... ہماری جدائی کا وقت آن پہنچا ہے اسد علی صاحب!"

ادھر ان کی بات ختم ہوئی، ادھر چھپر ہوٹل کے سامنے مجھے بینا کی سرخ کلٹس نظر آئی۔ گاڑی کی عقبی نشست پر تفسیر نامی نوجوان بیٹھا تھا۔ جی ایم سر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں چوبی تخت چھوڑ دیا۔

تفسیر گاڑی سے نکل کر ہماری جانب بڑھنے لگا تو جی ایم سر نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بہت زور سے بھینچا۔ چند لمحات میں یہ پُرجوش معانقہ اختتام پذیر ہو گیا۔ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کر دیا۔

"اللہ آپ کا حامی و ناصر!"

☆☆☆

بینا کا موڈ آف تھا۔ واپسی کے سفر میں وہ سنجیدہ اور چپ چپ تھی۔ میں اس کی ناراضی کا سبب جانتا تھا۔ اس کا خفا ہونا جائز تھا۔ میں اسے چینل پر بٹھا کر، کچھ بتائے بغیر وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ جی ایم سر کے ساتھ ہونے والی اس اہم گفتگو میں، میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ وقت گزرنے کا بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ ہم لگ بھگ سوا گیارہ بجے وہاں پہنچے تھے اور اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم کھانا کھا کر گھر سے نکلی تھیں؟"

"تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم میری دوست ہو۔ اگر تم گھر سے کھانا کھائے بغیر نکلی ہو تو یقیناً تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔"

"میرا اتنا زیادہ خیال کرنے کا بہت شکریہ۔" وہ رکھائی سے بولی۔

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنے کے لیے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔

"اس میں شکریہ ادا کرنے والی کون سی بات ہے۔ مجھے خود بھی شدید قسم کی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ اگر کہیں کھانے پینے کے پوائنٹ پر چلو تو تھوڑی پیٹ پوجا ہی کر لیتے ہیں۔"

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو کھا لو۔" وہ بدستور روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔ "میں نہیں کھاؤں گی۔"

"مطلب یہ کہ تمہارا غصہ تھوکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "اور یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟ یہ وہ راستہ تو نہیں جس سے ہم آئے تھے۔ کہیں مجھے پٹوانے کا پروگرام تو نہیں؟"

"تمہاری حرکتیں تو ایسی ہی ہیں کہ جس پر بہت زور کی پٹائی ہونا چاہیے۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے برج سے دوسرا راستہ لے لیا ہے اور اب میرا اسی ویو کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔"

میں نے واپسی کے راستے کی وضاحت پر غور نہیں کیا اور شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میں نے پچھلے ایک گھنٹے میں تمہارے ساتھ ایسی کون سی حرکت کی ہے جس پر تم اتنی برہمی دکھا رہی ہو۔ میں نے تو تمہیں چھوا تک نہیں......!"

"اب میں کبھی تمہیں چھونے بھی نہیں دوں گی۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"کیوں......؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں نے ایسا کیا قصور کر دیا ہے جو تم اتنی ظالم بن گئی ہو؟"

"تمہارے پاس چھوانے والیوں کی کیا کمی ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "تین تین تو اسپیشل ہی ہیں۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "جبکہ میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری ناراضی کی وجہ کچھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اور ہے۔ اگر تینوں کا کوئی ایشو ہوتا تو تم چینل پر پہنچنے سے پہلے مجھ سے خفا ہوتیں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے اسی گھنٹے سوا گھنٹے میں ہوا ہے۔"

"بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"مجھے وہاں بٹھا کر تم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ میں بھوکی پیاسی بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی اور بدمعاشی دیکھو کہ تم نے اپنا فون بھی آف کر رکھا تھا۔"

"تم تو جانتی ہو، میں انتہائی بدتمیز اور بدمعاش قسم کا انسان ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "جہاں تک سیل فون آف کرنے کی بات ہے تو وہ میں نے سر کے کہنے پر کیا تھا۔ باقی تمہیں میری وجہ سے جو کوفت اٹھانا پڑی اس کے لیے میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔"

"جاؤ، تم بھی کیا یاد کرو گے۔" وہ فراخ دلی سے بولی۔ "میں نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔"

"نہیں ہوگی میڈم۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"میڈم......؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے گھورا۔

"یہ ٹائٹل تمہیں جی ایم سر نے دیا ہے۔" میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر تیکھے انداز میں دریافت کیا۔ "یہ جی ایم سر کون صاحب ہیں جو انہیں اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہو اور ان کے کہنے پر اپنا فون بھی آف کر دیتے ہو؟"

"جی ایم سر بہت عظیم شخصیت ہیں۔" میں نے احترام بھرے لہجے میں بینا کو بتایا۔ "میری نظر میں ان کا درجہ، ایک روحانی راہنما کا ہے۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کی خواہش کی تعمیل کی جائے۔ میں دل و جان سے انہیں اپنا گرو مان چکا ہوں۔"

پھر میں نے اسے جی ایم سر کی چینل والی جاب کے بارے میں بھی تفصیل سے آگاہ کیا تاہم یہ نہیں بتایا کہ سر نے مجھے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ سر کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بینا میری چاہت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اگر میں سر کی باتیں اس کے علم میں لے آتا تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ وہ سر کی تلقین کو میری کمزوری سمجھ کر سینہ زوری پر اتر آتی۔ وہ میرے ساتھ قربت کی جتنی منازل طے کر چکی تھی، اسی کی بنا پر وہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ اگر اسے یہ پتا چل جاتا کہ میں اپنے گرو کی ہدایت پر اس کا خیال رکھنے کا پابند ہوں تو پھر پتا نہیں، وہ میرا کیا حشر کرتی۔ میں اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ذمے داریوں کے بوجھ میں اضافہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔

"پتا ہے، وہاں کیا ہوا؟" وہ خاصے جوشیلے انداز میں بولی۔

"کہاں؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"ارے، میں اس ریجنل چینل کی بات کر رہی ہوں۔"

اس نے بڑے خوشگوار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے وہاں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو مجھے دبئی میں بھی ایک دو بار نظر آیا تھا۔ شاید وہ کوئی اینکر، وینکر ہے۔"

بینا کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے مخصوص فطری انداز میں بات کر رہی تھی۔ میری "معذرت" نے خاصا موثر کام دکھایا تھا۔

میں نے کہا۔ "تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ شوبز سے متعلق افراد کا تو دبئی میں آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری پریشانی کا سبب یہ تھا کہ وہ اینکر کہیں مجھے پہچان نہ لے اور میرے ماضی کے حوالے سے کوئی ہلکی بات نہ کر دے۔"

"میری بات کو توجہ سے سنو بینا۔" میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جس زاویے سے تم ڈر رہی تھیں، اگر وہ اینکر تمہیں پہچان بھی لیتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی چیپ حرکت نہ کرتا۔ اور پھر جب تم نے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے تو مجھے یقین ہے مالک اب تمہیں کسی انسان کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔ اس خوف کو دل و دماغ سے نکال دو کہ اس حوالے سے کبھی تمہیں ندامت اٹھانا پڑے گی اور آخری بات یہ کہ......" میں نے ذرا دیر کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم اپنے شرمناک ماضی کو دفن کر کے آگے بڑھ چکی ہو۔ تمہارے پاس اب خوش حال، حال اور روشن مستقبل ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ کبھی اپنے ماضی کا مجھ سے ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی کبھی اس بارے میں سوچ کر خود کو لعن طعن کرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بات پر عمل کروں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا اور جذباتی لہجے میں کہا۔

"تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ اس سنبھلنے میں تم میرا ساتھ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دو گے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ کی پشت پر اس نے توے سے اتری ہوئی گرم چپاتی رکھ دی ہو۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"بینا! کیا تمہیں بخار ہے؟ تمہارا ہاتھ تپ رہا ہے۔"

"صرف ہاتھ نہیں، پورے بدن کی یہی کیفیت ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولی۔ "جب گھر سے نکلی تو اس وقت نارمل تھی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"تمہیں فوری طور پر کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔" میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "یہ بخار تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہو گا علی!" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "مجھے ٹھیک کرنا کسی ڈاکٹر کے بس کا کام نہیں۔ یہ بخار تمہاری دوستی نے مجھے تحفے میں دیا ہے۔ اس کا علاج بھی تم ہی کرو گے۔ اس مرض میں تم ہی میرے ڈاکٹر ہو۔"

"بولو...... میں تمہارے لیے کیا کروں؟"

"میرے سوال کا دوٹوک جواب دو۔" اس نے میرے ہاتھ کے اوپر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔ "مجھ سے وعدہ کرو کہ اس سلسلے میں تم میرا ساتھ دو گے؟"

یہ بات وہ مجھ سے تھوڑی دیر پہلے بھی کر چکی تھی۔ میں نے کہا۔ "ضرور تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم میری دوست ہو۔ جو بھی میرے بس میں ہوا، میں ہر قیمت پر کروں گا۔ تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہو گی۔ تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"اگر تم پر مجھے بھروسا نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے ساتھ نہ ہوتی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "مجھے تمہاری زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ پر بھی کامل یقین ہے لیکن......"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے پوچھا۔

"لیکن کیا؟"

"زندگی کے بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ کامل یقین اور پختہ بھروسا ہونے کے باوجود بھی بار بار پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ساتھ بھی اس قسم کا تعلق قائم ہو گیا ہے کہ اپنائیت کے بل بوتے پر بار بار پوچھنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنا حق لگتا ہے۔"

جی ایم سر بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتا چکے تھے کہ بینا اپنے دل میں میرے لیے کس نوعیت کے جذبات رکھتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے جذبات کو کھل کر بیان نہیں کر پا رہی تھی یا دانستہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی جبھی وہ اپنی اندرونی کیفیت کو "دوستی، تعلق اور اپنائیت" ایسے لبادے اوڑھا کر میرے سامنے پیش کر رہی تھی۔

"اگر تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو تو یقین کر لو کہ میں ہر ممکنہ انداز میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔ "بتاؤ، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔ "میں تم سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ ہی تو ہو......!"

"میں نے جدہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ تم نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تم جدہ میں ہوتے ہو۔" وہ میری سنی، ان سنی کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی۔ "لیکن پھر تمہاری حقیقت کھل کر میرے سامنے آ گئی اور اب تم مجھے جرمنی میں سیٹل ہونے کا مشورہ دے رہے ہو جو مجھے کسی بھی طور قبول نہیں ہے۔"

"پھر میں تمہارے لیے کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمہیں واپس امریکا جانا ہے تو میرے لیے وہاں پہنچنے کا بندوبست کرو۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں اپنی مدد آپ کے تحت کوشش کروں گی اور تمہارے پاس پہنچ کر دکھاؤں گی۔ میں تم سے زیادہ ضدی اور ہلنٹ ہوں۔"

"مجھے مت بتاؤ کہ تم کتنی ضدی اور ہلنٹ ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بات مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں امریکا ضرور بلاؤں گا لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں؟" وہ تیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"تمہیں پتا ہے کہ ماں نے میرے ریفرنس سے امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے اپلائی کیا تھا اور ان کا کام بھی ہو گیا تھا۔ یہ ساری تفصیل میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ "لیکن مالک کو ماں کا امریکا جانا منظور نہیں تھا اس لیے مالک نے ماں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس واقعے کی اطلاع امریکن ایمبیسی کو بھی ہے۔ اگر میں فوری طور پر دوبارہ اپنا ریفرنس استعمال کروں گا تو وہ ریفیوز بھی کر سکتے ہیں۔ میں ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم تھوڑا انتظار کر لو تو مناسب رہے گا۔"

"مثلاً کتنا انتظار؟" اس نے پوچھا۔ "تم تو دو چار دن میں یہاں سے نکل جاؤ گے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"میرا پروگرام تو یہی ہے کہ میں اگلے ہفتے میں کسی بھی دن امریکا روانہ ہوجاؤں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا ہوسکے گا یا نہیں۔ کل کیا ہونا ہے، یہ صرف مالک کے علم میں ہے یا پھر مالک اپنے کسی خاص بندے کو یہ علم دے دے۔"

"ٹھیک ہے علی! تم جیسے کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی۔" اس نے کہا۔ "میں ساری زندگی بھی تمہارا انتظار کرسکتی ہوں۔"

"ہمیں ہر کام کے لیے کوشش ضرور کرنا چاہیے لیکن یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں بعض معاملات کو مالک پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔"

"بے شک!" وہ پورے تیقن سے بولی۔ "اور مالک جو بھی کرتا ہے اس میں بندے کی بہتری ہی ہوتی ہے۔"

"اب کی نا تم نے پتے کی بات۔" میں نے کہا۔

"میں تو ہمیشہ پتے ہی کی بات کرتی ہوں۔" وہ اترائی۔ "لیکن معلوم نہیں، تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے۔" پھر بڑے زعم سے بولی۔

"جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو تو صرف میرے بارے میں بات کیا کرو۔"

"اور جب تمہارے ساتھ نہیں ہوتا تب تو اجازت ہے نا......"

"بدمعاشی شروع......" اس نے مجھے گھورا۔

"جب تم موقع فراہم کروگی تو میں کیوں چوکوں گا۔" میں نے چوٹ کی۔

اس نے مجھے گھورا پھر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی جلدی سے اس نے کہا۔ "علی! کیا ہمارے پاس کرنے کے لیے اپنی باتیں کم ہیں جو ہم دوسروں کو ڈسکس کرتے پھریں۔ قدرت نے ہمیں جو موقع دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

ہم سی ویو پہنچ گئے۔ مجھے ذرا بھی بھوک نہیں تھی لیکن بینا چونکہ میری وجہ سے بھوکی بیٹھی رہی تھی اس لیے میں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کی طرح مجھے بھی شدید بھوک محسوس ہورہی ہے۔ ہم نے ریسٹورنٹ سے چند فوڈ آئٹم لیے اور اس کے پچھواڑے لگی ہوئی بینچوں کی طرف آگئے۔ یہاں سے سمندر بہت قریب تھا۔ ہم نے ایک بینچ پر نشست جمائی اور پیٹ پوجا میں مصروف ہوگئے۔

وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی۔ نصف شب کے وقت پورا چاند ہمارے سر پر تھا۔ ٹھنڈی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کے کنارے یہ نظارہ کچھ زیادہ ہی دل کش اور رومان پرور محسوس ہورہا تھا۔ مرطوب ساحلی ہوائیں چاندنی رات کی سحر انگریزی میں کئی گنا اضافہ کررہی تھیں۔ اس سٹنگ ارینجمنٹ میں اس وقت رش نہیں تھا لہٰذا ہمیں مکمل تنہائی میسر تھی۔ ہم پیٹ پوجا کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کررہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بینا! تمہارا کب تک اس گھر میں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"وہاں اب ایک پل بھی رکنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔" اس نے کہا۔ "بس چند دن کی مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اپنا چائنا ٹاؤن والا اپارٹمنٹ سیل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس سلسلے میں، میں نے اپنی دوست کو بتا بھی دیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اس نے کہا ہے کہ ہفتہ دس دن میں وہ اپنا کوئی اور بندوبست کرکے اپارٹمنٹ خالی کردے گی۔"

میں بینا کے چائنا ٹاؤن والے اس اپارٹمنٹ پر ایک مرتبہ جاچکا تھا اور وہاں اس کے ساتھ کچھ وقت بھی گزار چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، جب تک وہ اپارٹمنٹ خالی نہیں ہوجاتا تم ادھر ہی ہوگی جہاں اس وقت رہ رہی ہو؟"

"دوسرا آپشن تمہارا گھر ہے۔" وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ "جب تک تم کراچی میں ہو، میں تمہارے پاس شفٹ ہوجاتی ہوں، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو......!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ بنگلا تمہارے لیے محفوظ نہیں ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "جو گھر تمہارے لیے محفوظ ہے، وہ میرے لیے کیوں نہیں؟"

"تمہیں یقین نہیں آئے گا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ گھر میرے لیے بھی قطعی غیر محفوظ ہے۔"

"مجھے واقعی یقین نہیں آیا۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "تم یقین دلانے کی کوشش کرو۔"

"اس کا سبب ہماری دشمنی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ دشمنی جس کی نذر میرا باپ ہوا اور اسی دشمنی نے میری ماں کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔ یہ ایک طویل، دکھ بھری کہانی ہے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔" وہ ہمدردی بھرے انداز میں بولی۔ "کیا تم مجھے یہ اسٹوری سنانا پسند کرو گے؟"

بینا اب میرے اتنے قریب آ گئی تھی کہ یہ معاملات اس کے ساتھ شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا پھر جی ایم سر نے بھی مجھے اس کی سنجیدگی، خلوص اور وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اس کے بعد بینا میرے لیے معتبر ہو گئی تھی۔

"میں تمہیں اپنی دشمنی کی داستان تفصیل سے سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں بیٹھ کر نہیں۔ کھانا ختم کرو، گھر چلتے ہیں پھر اطمینان سے بات ہوگی۔"

"او کے۔ یہ ٹھیک ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارے رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے پر کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"ہرگز نہیں!" وہ قطعی انداز میں بولی۔ "میں جس کے لیے کام کرتی تھی وہ ہستی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں اور میں نے اس تاریک راہ کو ترک کر کے روشنی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے ہر معاملے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہوں۔ میں جہاں بھی رہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے اس بنگلے کا چارج آنٹی نگینہ نے سنبھال لیا ہے اور میں اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم صبح ہی میرے پاس شفٹ ہو جاؤ۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

"تم میری وجہ سے پریشان نہیں ہونا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ موت تو ایک سفاک حقیقت ہے۔ سات پردوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ، یہ اپنا راستہ بنا لیتی ہے پھر اس سے کیا ڈرنا۔ اگر تمہارا ساتھ مجھے میسر رہے تو میں اس سفاک حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں اب اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آگ اور خون کا یہ کھیل ہم دونوں مل کر کھیلیں گے۔"

ان لمحات میں وہ ایک بدلی ہوئی بینا دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے میں ایک شیرنی کی بہادری نظر آئی۔ اس کے تیور دیکھ کر میرے دل کو خاصا اطمینان ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا میرے ساتھ رہنا زیادہ ضروری تھا بجائے اس کے کہ میں اس سے دور بھاگتا یا اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کرتا۔

دانشوروں نے کہا

☆ ہر آدمی سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ لیکن بے تکلفی بہت کم لوگوں کے ساتھ رکھو اور ان بہت کم لوگوں پر اعتماد کرنے سے پہلے انہیں اچھی طرح آزما لو۔

☆ جس نے ایک بار اعتماد شکنی کی ہو، اس پر کبھی بھروسا نہ کریں۔

☆ اعتماد کا پودا، آہستہ آہستہ نشوونما پاتا ہے۔

☆ جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے، اس پر اعتماد نہ کریں۔

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔

☆ عورتیں مردوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتیں لیکن کسی خاص مرد کے معاملے میں اپنے اس اصول کو بھول جاتی ہیں۔

مرسلہ: راحیل نواب...... ملتان

سادگی

ایک سردار ٹی وی خریدنے گیا۔ دکاندار نے ایک ٹی وی دکھایا۔

"سر، یہ لے لیں اس کا ریموٹ گلی کے کونے سے ہی چینل پکڑ لیتا ہے۔" کچھ دنوں بعد سردار ٹی وی واپس کرنے آ گیا۔

دکاندار نے کہا۔ "سر، کیا خرابی ہے؟"

سردار نے کہا۔ "خرابی تو کوئی نہیں ہے بس بندہ بار بار گلی کی نکڑ پر جائے تو اچھا نہیں لگتا۔"

☆☆☆☆☆☆

لاعلاج

ڈاکٹر۔ "آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے ہیں اگر آپ ان کا خیال رکھیں، ٹینشن نہ دیں، لڑائی نہ کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔"

شوہر۔ "ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

بیوی: "لاعلاج ہو تم۔"

☆☆☆☆☆☆

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد ریسٹورنٹ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

جب ہم گھر پہنچے تو وہاں میرے لیے کافی پریشانی پائی جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جمشید نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے تو جمشید نے فکرمندی سے پوچھا۔

''سر! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر تمہارے حواس کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی پریشانی والی بات ہے؟''

''ہم سب آپ کے لیے فکرمند تھے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ کا فون بھی آف آ رہا تھا۔ شکر ہے، آپ خیریت سے سلامت لوٹ آئے ہیں۔''

''میرے فون کا چارج ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ آف ہو گیا۔'' میں نے ایک فوری بہانہ کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے لیے کون سب پریشان تھے؟''

''میں، بنگالی بابو اور شاہ جی۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری اور بنگالی بابو کی پریشانی تو سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''لیکن شاہ جی کو کیا فکر لاحق ہو گئی تھی میری؟''

''پتا نہیں سر......'' وہ سادگی سے بولا۔ ''شاہ جی یہاں آئے تھے اور آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ انہوں نے آپ کو کئی فون کیے مگر آپ کا فون بند آ رہا تھا۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔ جب آپ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تو وہ یہاں آئے تھے۔ کہہ کر گئے ہیں کہ آپ جیسے ہی آئیں، میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دوں۔''

''تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''تھوڑا فون چارج کرلوں پھر میں خود اس سے بات کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر...... میں سمجھ گیا۔'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''نادر شاہ کو تم نے اندر تو نہیں بٹھایا تھا؟''

''نہیں سر!'' وہ نفی میں سر کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میری ان سے گیٹ پر ہی بات ہوئی تھی۔ ویسے آپ شاہ جی کو کال کر لیجیے گا۔ انہوں نے ایک بڑی عجیب کی تھی۔''

''کیا عجیب بات؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے......!''

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ شاہ جی کے ''استفسار'' پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے جمشید۔ نادر شاہ دراصل آنٹی سلمٰی کو پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے گھبرا گیا ہے اسی لیے اسے میری بھی فکر رہنے لگی ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ جائے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''اللہ آپ کی حفاظت کرے سر!'' وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

''میں نے کہا۔ ''آمین......!''

''آپ کے لیے کھانا لگواؤں سر؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، ہم نے کھانا کھا لیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب ہم آرام کریں گے اور جب تک صبح میں خود نہ اٹھوں، کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔''

''ٹھیک ہے سر! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''اور کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اس وقت تک بنگلے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا جب تک مجھے اس کی آمد کی اطلاع نہ دے دو۔''

''آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی سر۔''

''گڈ......!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم اپنی میڈم کے نمک خوار اور سچے وفادار ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی سمجھداری کی توقع ہے۔ جب میں بنگلے پر موجود نہ ہوں تو کسی بھی شخص کو اندر نہیں آنے دینا، چاہے وہ میرا دوست عظیم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''میں نے آپ کی ہدایات کو ذہن نشین کر لیا ہے سر۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا...... ان شاءاللہ!''

''شاباش!'' یہ کہتے ہوئے میں نے جمشید کو رخصت کر دیا۔

ہم بیڈ روم میں آئے تو بینا نے کہا۔ ''یہاں کی صورتِ حال تو خاصی گمبھیر نظر آ رہی ہے اور یہ نادر شاہ کچھ زیادہ ہی ایفی شینسی نہیں دکھا رہا؟''

''تم بالکل درست انداز میں سوچ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ذرا فریش ہو جائیں پھر اس پر کھل کر بات کرتے ہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد.... تازہ دم ہو کر ہم ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر جگہ جامع انداز میں بینا کو اپنی زندگی کی کہانی سنادی۔ سیکرٹ سوسائٹی کے موضوع کو میں نے دانستہ ٹچ نہیں کیا تھا۔ میرا فوکس چنگیز خان سے والد صاحب کی دشمنی اور ماں کی موت تک محدود تھا۔ میں نے چنگیز خان کا خط بھی بینا کو دکھایا اور نادر شاہ کے ری ایکشن سے بھی اسے آگاہ کیا۔ اس سے قبل میں بینا کو ماں کے ٹرسٹ والے منصوبے کی تفصیلات بتا چکا تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تو یہ نادر شاہ کافی مشکوک شخص لگ رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں، یہ بندہ تمہیں خوفزدہ کر کے یہاں سے بھگانا چاہتا ہے تاکہ میڈم کی رقم پر آزادانہ عیش کر سکے۔ مجھے شک ہے، یہ خط بھی نادر شاہ ہی کی کارستانی ہے۔''

''میرا اور عظیم کا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔

''علی! اس مسئلے کا ایک آسان سا حل ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کون سا حل؟''

''تم میڈم کے بیٹے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تم ان کے اکلوتے وارث ہو۔ تم اگر چاہو تو نادر شاہ سے سارے اختیارات واپس بھی لے سکتے ہو۔''

''یہ جتنا آسان نظر آتا ہے، حقیقت میں اتنا ہے نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات درست ہے کہ میں سلمیٰ حیدر علی کا سگا اکلوتا بیٹا ہوں مگر قانوناً اس بات کو ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے اور میں اس بکھیڑے میں بھی نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خاصے پاپڑ بیلنا پڑیں گے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اس دولت و جائداد سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔''

''تم عجیب بات کر رہے ہو۔'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کسی اور کی نہیں، تمہاری اپنی دولت ہے۔ اس پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر میں اپنی آئی پر آجاؤں تو میں یہ سب کچھ حاصل بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے ماں سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا ہے۔ ماں کا خواب ضرور پورا ہوگا۔''

آواز

چیزیں چھوٹی ہی نہیں بہت بڑی بھی ہو رہی ہیں مثلاً یہ اسپیکر سسٹم ملاحظہ فرمائیں۔ آئی پوڈ کے لیے بنایا گیا ڈوک سسٹم پرانے وقتوں کے عظیم الجثہ پیانو اور گراموفون سے بھی بڑا ہے۔ اس کی لمبائی چار فٹ ہے۔ اس میں 28 اسپیکرز لگے ہیں۔ کسی بھی آئی پوڈ وغیرہ کو اس سے منسلک کر دیں، پھر اس کی ''سمع خراشی'' دیکھیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس کی آواز بہت بڑھا دی جائے، یہ کانوں کے پردے پھاڑ سکتی ہے۔ 125 واٹس کی طاقت سے 95 ڈیسی بل کی آواز خارج ہوتی ہے جو اگر کانوں سے مسلسل ٹکراتی رہے تو سماعت سے مستقل محرومی کا خطرہ ہوتا ہے۔ اتنی شدید آواز ایک بڑے طیارے کے ٹیک آف پر آتی ہے۔ اس کا وزن قد کاٹھ کی مناسبت سے ہے، یعنی 102 کلوگرام...... لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ آواز کو بہت کم بھی کر سکتے ہیں یعنی یہ بیک وقت بہت شدید، تیز اور نہایت ہلکی آواز دے سکتی ہے۔

مالموسویڈن کی کمپنی ''اسٹوڈیو پر'' نے اسے بنایا ہے۔ آج کے دور میں مشینیں ہاتھوں سے نہیں بنائی جاتیں لیکن اسے ہاتھوں سے بنایا گیا ہے، یہ اس کی اضافی خوبی ہے۔ آپ اس سے سی ڈی پلیئر یا ٹی وی بھی منسلک کر سکتے ہیں۔ اسے ''وال آف ساؤنڈ'' کا نام درست طور پر دیا گیا کیونکہ یہ دیوار کی طرح وسیع و عریض نظر آتی ہے۔

فون نمبر

1۔ فجر 2 فرض، ظہر 4 فرض، عصر 4 فرض، مغرب 3 فرض، عشا 4 فرض، 3 وتر واجب۔

2۔ ٹوکن آنسوؤں کا ڈالنا نہ بھولیں۔

3۔ سنت اور نوافل کے ذریعے رابطے کو مزید بڑھایا جا سکتا ہے۔

4۔ ارجنٹ کال آنسوؤں سے بھرپور چہرے سے تہجد۔

5۔ فری کال۔ درود شریف ابراہیمی کثرت سے۔

مرسلہ: ملک محمد انور، جی ٹی روڈ، واہ کینٹ۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''یہ تو تب ممکن ہوسکے گا جب اس پروجیکٹ کا انتظام کسی ایمان دار شخص کے ہاتھ میں ہوگا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''کیا تمہیں نادر شاہ سے ایمان داری کی توقع ہے؟''

''قطعاً نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اسی لیے تو میں نے یہ بساط بچھائی ہے۔''

''کون سی بساط؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں اور عظیم مل کر ایک ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہم نادر شاہ کو ایکسپوز کردیں گے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''جب شاہ جی کی حقیقت کھل جائے گی تو پھر ہم بہ زورِ بازو اسے مجبور کردیں گے کہ وہ ماں کی جائیداد اور ٹرسٹ کے معاملات سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوجائے تاکہ میں یہ ذمے داری کسی اہل اور دیانت دار شخص کے سپرد کرسکوں۔ امید ہے، اس مشن میں مجھے چنگیز خان کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوجائیں گی۔ اگر موقع ملا تو میں اس کا برسوں کا ''حساب'' بھی چکتا کردوں گا۔ اس مہم جوئی میں اب تم بھی میرے ساتھ ہو۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟''

''جب تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر ساتھ چلنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو پھر ڈر کیسا علی۔'' وہ بڑی دلیری سے بولی۔ ''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ شاہ جی آسانی سے تمہارے قابو میں آئے گا۔ یہ بڑا شاطر بندہ ہے۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون شاطر ہے اور کون مشطور۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ایک مرتبہ اس ڈور کا سرا میرے ہاتھ لگ جائے پھر میں اس کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر رہوں گا۔''

''بائی دی وے، تمہارے ذہن میں کوئی دوسرا نام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، ٹرسٹ کے معاملات کو کسی ایمان دار شخص کے سپرد کرنے کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی دوسرا نام ہے۔'' وہ ضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یا یہ ذمے داری خود سنبھالنے کا ارادہ ہے؟''

''میرا تو اس معاملے میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو ہر صورت واپس امریکا جانا ہے۔ امریکی شہریت کا حامل شخص چھ ماہ سے زیادہ امریکا سے باہر قیام نہیں کرسکتا۔ یہ میں ایک جنرل رُول بتا رہا ہوں ورنہ کسی اسپیشل کیس میں صورتِ حال مختلف ہوجاتی ہے اور جہاں تک ٹرسٹ کے انتظام وانصرام کے حوالے سے سیکنڈ آپشن کا سوال ہے تو میرے ذہن میں عظیم کا نام ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ یہ کام بڑے اچھے انداز میں کرسکے گا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک کام اور بھی کرو۔ اس سے شاہ جی کی حقیقت اور بھی کھل جائے گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ عظیم لوگوں کا عمرہ اور حج کا ایک سیٹ اپ بنا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ظاہر ہے، اتنا بڑا کام چلانے کے لیے ان کا ایک مخصوص ٹریول ایجنٹ بھی ہوگا جس سے یہ لوگ تھوک کے حساب سے ٹکٹ بنواتے ہوں گے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مگر کرنا کیا ہے؟''

''تم عظیم سے کہہ کر کسی قریب ترین فلائٹ میں جدہ کے لیے ایک ڈمی ٹکٹ بنوالو۔'' اس نے اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر شاہ جی کو بتاؤ کہ تم فلاں دن فلاں فلائٹ سے روانہ ہو رہے ہو۔ تمہاری روانگی کی کنفرمیشن کے بعد دیکھتے ہیں، وہ کون سی چال چلتا ہے۔''

''گڈ آئیڈیا......'' میں نے ستائشی نظر سے بینا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''لو، ابھی تماشا دیکھو۔''

میں نے اپنے سیل فون کو آن کیا تو دیکھا وہاں پر نادر شاہ اور جمشید کی کئی کالیں لگی ہوئی تھیں اور ان دونوں سے پہلے بینا کی کالز بھی موجود تھیں۔ یہ سب کالز اس دوران میں کی گئی تھیں جب میرا فون آف تھا لہٰذا یہ مسڈ کالز کی شکل اختیار کرچکی تھیں۔ ان کے علاوہ عظیم کا ایک ٹیکسٹ بھی ان باکس میں پڑا تھا۔ میں نے وہ ٹیکسٹ کھول کر پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''برو! فون اس لیے نہیں کررہا کہ تمہارے آرام میں خلل نہ پڑے۔ میں نے نادر شاہ اور ''خان ہاؤس'' کے حوالے سے اچھی خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں۔ مزید سنسنی خیز خبریں کل کسی وقت مجھ تک پہنچ جائیں گی۔ کل جمعے کی نماز کے بعد ملتے ہیں۔ ٹیک کیئر۔''

میں نے عظیم کا یہ میسیج بینا کو پڑھوایا پھر نادر شاہ کا نمبر ملا دیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے میری کال ریسیو کرلی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سیل فون تھامے میری ہی کال کا انتظار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کررہا ہو۔ میں نے نادر شاہ کی آواز بینا کو سنانے کی غرض سے اسپیکر فون آن کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو......!''

''ہیلو بیٹا! تم کیسے ہو؟'' اس کی تشویش بھری آواز ابھری۔

میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''انکل! میں ٹھیک ہوں۔''

''بیٹا! تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''میں ذرا عظیم کی طرف چلا گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''ان کے دوست کی ایک ٹریول ایجنسی ہے۔ مجھے اپنا جدہ کا ٹکٹ کنفرم کروانا تھا۔''

''ٹکٹ کب کا کنفرم ہوا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہفتے کی صبح میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔

وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''شکر ہے، یہ کام بھی نمٹ گیا۔ میں تو تمہارے لیے بہت پریشان ہوگیا تھا اور تمہارا فون بھی مسلسل آف جارہا تھا۔''

''میرے فون کا چارج ختم ہوگیا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''انکل! آپ میرے لیے اتنے پریشان کیوں تھے۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''ارے بیٹا! وہی چنگیز خان کا معاملہ ہے......''

''کیا اس بدبخت نے آپ کو بھی کوئی خط بھیج دیا ہے؟''

''نہیں بیٹا! مجھے وہ کیوں خط بھیجے گا۔ مجھ سے اس کا کیا لینا دینا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نے تمہارے والے خط کے بارے میں تھوڑی تفتیش کی ہے۔ میرا شک بالکل درست نکلا۔ وہ خط چنگیز خان ہی نے تمہیں لکھا ہے۔ خط کا مضمون دوستانہ اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ تم اس کے جال میں پھنس جاؤ اور وہ تمہیں شکار کرلے جس طرح اس نے پہلے تمہارے باپ اور پھر ماں کو شکار کیا ہے۔ بس، تم کسی طرح بہ حفاظت یہاں سے رخصت ہوجاؤ۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں سلمٰی بہن کی روح کو کون سا منہ دکھاؤں گا۔''

میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی اس ریسرچ کا ذریعہ کیا ہے؟ نہ ہی میں نے یہ سوال کیا کہ جو خط میں نے اسے دکھایا ہی نہیں، اس کے مندرجات کی اسے کیسے خبر ہوگئی۔ میں نے نادر شاہ کو اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دکھایا تھا جس میں چنگیز خان نے والد صاحب کی دوستی کا دم بھرا تھا جبکہ چنگیز خان کی طرف سے موصول ہونے والے خط کو میں نے نادر شاہ سے چھپایا تھا اور جو باتیں ابھی نادر شاہ کررہا تھا، یہ سب چنگیز خان والے خط میں تحریر کی گئی تھیں۔ ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ نادر شاہ کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی نہیں تھی۔ یا تو چنگیز خان والا خط نادر شاہ نے مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے ڈیلیور کرایا تھا اور یا پھر وہ اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا جس کی جانب سے مذکورہ خط بھیجا گیا تھا۔ اس صورت میں وہ شخص چنگیز خان تھا یا کوئی اور...... نادر شاہ کا لازمی اس کے ساتھ ربط ضبط تھا۔ یہ تمام تر خیالات چند سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزر گئے۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا انکل! آپ کی پُرخلوص دعائیں میرے ساتھ ہیں۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''پھر ایک دن ہی کی تو بات ہے، پرسوں صبح تو میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ آج کا دن میں احتیاطاً گھر میں بیٹھ کر گزار لوں گا بلکہ آدھا دن ہی تو گزارنا ہوگا۔ میں ابھی سوؤں گا تو پھر دوپہر ہی میں اٹھوں گا۔''

''اللہ تمہیں نظرِبد سے بچائے بیٹا۔'' وہ منافقت بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ شام میں چکر لگائیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''میں افطار کے فوراً بعد ٹھیک آٹھ بجے تمہارے پاس آؤں گا۔'' اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''پھر گپ شپ ہوگی۔''

''اوکے انکل! گڈ نائٹ۔'' میں نے کہا۔

اس نے بھی ''گڈ نائٹ'' کہہ کر فون بند کردیا۔

میں نے سیل فون ایک طرف رکھا تو بینا نے کہا۔

''مجھے تو شاہ جی کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ یہ بندہ تمہیں جلد از جلد یہاں سے بھگانے کے چکر میں ہے۔''

''میری تجزیاتی رپورٹ بھی یہی کہتی ہے۔'' میں نے دوبارہ سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اینی ہاؤ، کل شام میں نادر شاہ کا ڈراپ سین ہوجائے گا۔''

''تمہارے ذہن میں اس حوالے سے کوئی آئیڈیا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

''ہاں، ایک آؤٹ لائن ہے میرے ذہن میں۔''

میں نے سیل فون کو آف کرنے کے بعد کھول لیا اور بینا سے کہا۔ ''لیکن عظیم سے ملاقات کے بعد کوئی حتمی پلان تیار کیا جائے گا۔ یہ بات طے ہے کہ کل کے دن میں، نادر شاہ کے معاملے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

''تم اپنے سیل فون میں سے سم کارڈ کیوں نکال رہے ہو؟'' اس نے میری مصروفیت کے پیشِ نظر پوچھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"یہ میرا امریکا والا نمبر ہے۔" میں نے بتایا۔ "میرے راہنما نے کہا تھا کچھ دنوں کے لیے میں یہ سم کارڈ اپنے سیل فون سے نکال کر کہیں رکھ دوں۔"

"تمہارے گرو نے ایسا کیوں کہا؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ "کیا اس کے پیچھے بھی کوئی راز چھپا ہوا ہے؟"

"جی ایم سر کی ہر بات کے پیچھے کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سم کارڈ کو سیل فون سے نکال کر رکھ دینے میں کون سی حکمت پوشیدہ ہے؟" اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

"میرا یہ نمبر ڈیلفینا کے پاس محفوظ ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "سر کا خیال ہے کہ وہ اس نمبر کے ذریعے میری لوکیشن ٹریس کرسکتی ہے۔"

"تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیلفینا اس وقت کراچی میں موجود ہے۔" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"وہ پچھلے چند روز سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں تھی۔" میں نے اسے بتایا۔ "آج رات کسی وقت وہ کراچی پہنچ جائے گی اسی لیے سر نے مجھے یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کو کہا ہے۔"

"پہلی ملاقات میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہاری دوست ہے اور جدہ سے تمہارے پیچھے یہاں آرہی ہے۔" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بعد میں جدہ والی کہانی فیک نکلی۔ تم امریکا سے آئے ہو تو یہ ڈیلفینا بھی امریکا ہی سے تمہارے پیچھے لگ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ کیا واقعی یہ تمہاری دوست ہے؟"

"یہ ایسی دوست ہے کہ جس کے اندر ایک خطرناک دشمن چھپا ہوا ہے۔" میں نے سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ایک ایسی دشمن ہے کہ جس کے اندر ایک مہربان دوست پوشیدہ ہے۔"

میں نے بینا سے گفتگو کے دوران میں عظیم کو ٹیکسٹ کردیا۔ "جب کل جمعے کی نماز کے بعد میرے پاس آؤ تو میرے لیے اپنے ٹریول ایجنٹ سے بارہ جولائی کی صبح کی کسی فلائٹ کا کراچی ٹو جدہ کا ایک ڈمی ٹکٹ بنوالانا۔ یہ سب نادر شاہ کو الو بنانے کے لیے ہے۔" اس کے بعد میں نے ٹیکسٹ میں اپنی پرسنل ڈیٹیل بھی ڈال دی۔

"تمہارا اس سے دور بھاگنے اور چھپنے کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کی وجہ سے کوئی سنگین خطرہ محسوس کررہے ہو۔" بینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا میرا اندازہ غلط ہے؟"

"نہیں۔ تم نے صد فیصد درست اندازہ قائم کیا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "جب تک میں اس کی دوستی قبول نہیں کرلیتا، وہ میرے لیے بدترین دشمن ہے اور اگر میں اس کا، دوستی کے لیے اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیتا ہوں تو پھر وہ اس دنیا کی ساری نعمتیں، تمام سہولتیں، سب آسائشیں میرے قدموں میں ڈھیر کردے گی۔"

"اوہ...... کیا وہ بہت پیسے والی ہے؟"

"وہ نہایت ہی بااختیار اور بااقتدار ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "پیسا اس کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"

اسی لمحے میرے سیل فون کی میسج ٹون بجی۔ میں نے دیکھا، عظیم نے رپلائی کیا تھا۔ "برو! کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو سو گیا تھا۔" میں نے مبنی برمصلحت اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ابھی آنکھ کھلی تو تمہارا ٹیکسٹ نظر آیا۔ سوچا رپلائی کردیتا ہوں۔"

"کیا ڈیلفینا سے چیٹنگ چل رہی ہے؟" بینا نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ عظیم ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیا تم سے دو منٹ کے لیے بات ہوسکتی ہے؟" عظیم کا ٹیکسٹ موصول ہوا۔

میں نے رپلائی کیا۔ "شیور۔"

اگلے ہی لمحے اس کی کال آگئی۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس نے کہا۔ "برو! میں چند اپ ڈیٹس تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور...... میں سن رہا ہوں۔" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"نادر شاہ محمد علی سوسائٹی کے جس بنگلے میں گیا تھا وہ کسی کے ڈی خان کی ملکیت ہے۔" عظیم نے مجھے بتایا۔ "کے ڈی خان نے اپنا بنگلا جنید خان نامی ایک شخص کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ جنید خان کا تعلق شوبز سے ہے۔ اس نے مذکورہ بنگلے میں پرائیویٹ پروڈکشن ہاؤس کھول رکھا ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن نادر شاہ کا کسی ٹی وی پروڈیوسر سے کیا تعلق بنتا ہے؟"

"برو! میں نے تمہیں اس وقت اپنی بات سنانے کی زحمت ایسے ہی نہیں دی۔" وہ پرجوش انداز میں بولا۔ "میں نے نادر شاہ اور جنید خان کے بیچ کنکشن کا پتا بھی چلا لیا ہے۔ میرا ایک دوست اسی گلی میں رہتا ہے جہاں جنید خان کا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ میرے دوست کی جنید خان سے اچھی علیک سلیک ہے۔ وہ اکثر جنید خان سے ملنے اور ڈراموں کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ریکارڈنگ دیکھنے اس بنگلے پر جاتا رہتا ہے۔ میرے اس دوست کا نام ساجد محمود ہے۔ نادر شاہ جب بنگلے کے اندر گیا تو میں ساجد کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ بنگلے کے سامنے کرسیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھ کر ساجد سے گپ شپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کے دوست رخصت ہوگئے۔ میں ساجد کے گھر کے باہر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کررہا تھا کہ نادر شاہ جنید خان والے بنگلے سے برآمد ہوا۔ مذکورہ دونوں بنگلے زیادہ دوری پر نہیں ہیں۔ میں نے دیکھا، نادر شاہ کے ساتھ ایک بھاری بھرکم شخص بھی تھا۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ نادر شاہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم وہ میری نگاہ میں تھا۔ ساجد نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔

''لگتا ہے، خان صاحب نے مرغا گھیر لیا ہے......!''

''کون خان صاحب...... کیسا مرغا؟'' میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں ساجد سے پوچھا۔

اس دوران میں نادر شاہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔ ساجد نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''یہ جو پروڈکشن ہاؤس والے جنید خان ہیں نا، یہ کافی دنوں سے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کو گھیرنے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ پرائیویٹ پروڈکشن میں اسٹیٹ ایجنٹ سے سرمایہ کاری کروانا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خان صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہیں ورنہ وہ کسی کو سی آف کرنے بنگلے سے باہر تک نہیں آتے۔''

میں نادر شاہ اور ایک بھاری بھرکم شخص کو بنگلے سے نکلتے ہوئے دیکھ چکا تھا لیکن میں نے ساجد پر اپنی دلچسپی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں کہا۔

''ہاں یار! پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ ہر کوئی اسی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔''

''عظیم! تمہیں اندازہ نہیں، یہ جنید خان کتنا شاطر اور گھاگ شخص ہے۔'' ساجد نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میری ایک بات نوٹ کرلو۔ یہ اسٹیٹ ایجنٹ کو فٹ پاتھ پر لے آئے گا۔''

''میری بلا سے یار۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''وہ اسٹیٹ ایجنٹ کو کسی شیش محل میں بٹھائے یا فٹ پاتھ پر پھینک دے، مجھے ان دونوں سے کیا لینا دینا۔''

''تھوڑی دیر کے بعد میں ساجد کو ''خدا حافظ'' کہہ کر وہاں سے لوٹ آیا۔ تبھی میں نے تمہیں ٹیکسٹ کیا تھا۔'' عظیم یہ تمام تفصیلات بیان کرچکا تو میں نے کہا۔

''یار! تم نے بڑی سنسنی خیز معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بدذات نادر شاہ ہمارے سامنے مکمل طور پر ایکسپوز ہوگیا ہے۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ چنگیز خان والا وہ نفرت انگیز اور دھمکی آمیز خط نادر شاہ ہی نے مجھے ڈیلیور کروایا تھا تاکہ میں خوفزدہ ہوکر فی الفور یہاں سے روانہ ہوجاؤں اور وہ میری ماں کی دولت پر عیش کرسکے لیکن''...... میں نے لمحاتی توقف کرکے دانت پیسے اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں اس کمینے کو یہ گھناؤنا کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔ ماں کا پیسا اس طرح برباد ہو، یہ میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گا۔''

''فکر نہیں کرو برو!'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے نادر شاہ سے نمٹنے کے لیے ایک زبردست منصوبہ بنالیا ہے۔ وہ خبیث آنٹی سلمیٰ کا ایک پیسا بھی اِدھر اُدھر نہیں کرسکے گا۔ تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔''

''نادر شاہ افطار کے فوراً بعد میرے پاس آئے گا۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''تم سوا آٹھ بجے تک پہنچ جانا اور وہ ٹکٹ بھی بنوا کر اپنے ساتھ لانا جس کا ذکر میں نے ٹیکسٹ میسیج میں کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم ایسے وقت میں میرے پاس پہنچو جب نادر شاہ پہلے سے موجود ہو اور اسے یہی محسوس ہو کہ تم میرا ٹکٹ ڈیلیور کرنے آئے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شام تمہارے بنگلے پر ہوں گا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اور یہ ڈمی ٹکٹ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن شام سے پہلے دن میں بھی تو ہماری ملاقات ہونا ہے نا۔ تم نے اپنی والدہ کا پاسپورٹ اٹھانے جانا ہے۔''

''پاسپورٹ میں کلیکٹ کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اطمینان سے شام میں آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے برو۔'' اس نے کہا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔''

''لیکن تم مجھے بتاؤ گے کہ نادر شاہ کے حوالے سے تم نے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پلان از ویری سمپل۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''جب کل شام میں نادر شاہ تمہارے گھر سے رخصت ہوگا تو راستے میں کسی جگہ سے چند نامعلوم افراد اسے اٹھالے جائیں گے۔ یہ مقام جہاں سے نادر شاہ کو اٹھایا جائے گا، وہ تمہارے بنگلے سے کافی فاصلے پر ہوگا۔ شاہ جی کو نہایت ہی رازداری کے ساتھ ایک خفیہ اڈے پر پہنچادیا جائے گا جہاں پر میرے آدمی اس کی اچھی خاصی ''خاطر داری''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کرنے کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع کریں گے اور اس سیشن کو باقاعدہ شوٹ بھی کیا جائے گا تاکہ بعدازاں نادر شاہ اس آڈیو ویڈیو ثبوت کی موجودگی میں کسی بات سے انکار نہ کر سکے۔ اس کی زبان سے جو جو اعترافات ہوں گے، اس کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔"

"ویری فنٹاسٹک آئیڈیا۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "لیکن نادر شاہ کو یہ شک نہیں ہونا چاہیے کہ اس معاملے میں میرا یا تمہارا کوئی ہاتھ ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا برو!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "نامعلوم افراد کی کارروائی بڑی پراسرار ہوتی ہے جس کا ہر پہلو ہمیشہ نامعلوم ہی رہتا ہے۔"

"گڈ!" میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ "تم نے اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا ہے نا کہ نادر شاہ سے کس قسم کے سوالات کرنا ہیں؟"

"تم فکر نہیں کرو برو......" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "جو نامعلوم افراد شاہ جی کو چند گھنٹوں کے لیے اپنا "مہمان" بنائیں گے وہ سب پروفیشنل ہیں اس لیے ان کی کارکردگی میں بہت پرفیکشن ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ان نامعلوم افراد کو سب کچھ اچھے سے سمجھا دوں گا کہ شاہ جی کے اس خصوصی "انٹرویو" میں اس سے کون کون سے سوالات کرنا ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور پوچھا۔ "تم نے بتایا ہے کہ وہ لوگ پروفیشنل ہیں، اس کا مطلب ہے اس کام کے لیے انہیں پے بھی کرنا ہوگا؟"

"یہ تو انڈراسٹوڈ ہے برو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"او کے ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

مزید ایک منٹ کی گفتگو کے بعد ہمارے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔ اس دوران میں بینا بڑی توجہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سیل فون رکھا تو اس نے پوچھا۔

"کس مشن کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے؟"

میں نے اسے عظیم سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ "شاہ جی اسی قابل ہے۔" اس کے انداز میں نفرت پائی جاتی تھی۔

"جو جس قابل ہو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے تو وہ خوش رہتا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یہ فارمولا تم ڈیلفینا پر استعمال کیوں نہیں کرتے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔

عظیم کا فون آنے سے پہلے میرے اور بینا کے درمیان ڈیلفینا زیرِ بحث تھی اور میں بینا کو اس کی طاقت اور اختیار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بینا بڑی حاضر دماغ تھی۔ ادھر عظیم سے میری گفتگو اختتام پذیر ہوئی، ادھر اس نے ڈیلفینا کے تذکرے کو جاری کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ فارمولا طالب، مطلوب پر استعمال کرتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"اس وقت نادر شاہ ہمارا مطلوب ہے اور ہم اس کے طالب۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے ہم یہ فارمولا اس پر استعمال کر رہے ہیں جبکہ ڈیلفینا کے معاملے میں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ اس کیس میں وہ طالب اور میں مطلوب ہوں اور...... وہ مجھ پر یہ فارمولا استعمال کرنے والی ہے۔ وہ کسی وقت بھی مجھے منظر سے غائب کر کے اپنے کسی خفیہ اڈے پر پہنچا دے گی اور بڑے خطرناک انداز میں مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔"

میں نے یہ بات بڑی سنجیدگی سے کی تھی اور اس میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی۔ ڈیلفینا اسی نوعیت کے عزائم کے ساتھ میرے تعاقب میں تھی۔ ایک بار وہ مجھے ایک دوست کی حیثیت سے بہتر گھٹنے کے لیے مہمان بنا کر پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ٹھہرا چکی تھی۔ اب کی بار اس کا انداز دوستانہ نہیں، دشمنانہ تھا۔ اگر اب میں اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ یقیناً مجھے کسی عقوبت خانے کی یاترا پر لے جاتی......!

میری بات کے جواب میں بینا کے چہرے پر سراسیمگی نمودار ہوئی پھر اس نے تشویش بھرے میں لہجے میں کہا۔

"یہ ڈیلفینا تو بہت ہی خطرناک عورت لگتی ہے۔"

"تمہاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ۔" میں نے کہا۔ "وہ جن لوگوں کی آلۂ کار ہے وہ اس دنیا کے طاقتور ترین افراد ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اس دنیا کا نظام وہی لوگ چلا رہے ہیں۔"

"میں ڈیلفینا کے سیٹ اپ کے بارے میں تفصیلاً جاننا چاہتی ہوں۔" وہ گہری دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ "کیا ایک دوست کی حیثیت سے تم مجھے یہ سب بتانا پسند کرو گے علی؟"

"ضرور......" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک دوست ہونے کے ناتے تمہیں میرے تمام آن اینڈ آف کا علم ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد میں نے مختصر الفاظ میں بینا کو ڈیلفینا کی ہسٹری، عزائم اور مقاصد کے بارے میں بتا دیا۔ البتہ میں "اسکل اینڈ بونز" کے داخلی معاملات کی تفصیل میں نہیں گیا تھا۔ اس نے نہایت انہماک سے میری بات سنی پھر گمبھیر لہجے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

میں بولی۔

''علی! تم تو خاصی تشویشناک سچویشن سے گزر رہے ہو لیکن تمہارے چہرے سے کوئی پریشانی نہیں جھلکتی۔''

''کیا رونی صورت بنا کر ہم اپنے حالات کی سختیوں کو ختم کر سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''یا اس طرح ہمارے مصائب کم ہو سکتے ہیں؟''

''تم ایک بہادر اور حوصلہ مند انسان ہو۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہارے لیے کچھ کرتی ہوں......''

''کیا......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بینا! تم میرے لیے کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''میں تمہارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کا بندوبست کروں گی۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ ''بس، مجھے ایک دن دو۔ تھوڑا ہوم ورک کرنا ہوگا۔''

''کیا واقعی یہ کام تمہارے بس کا ہے؟'' میں نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا تم مجھے اتنا ہی بے بس سمجھتے ہو؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا......'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں تمہاری حفاظت کے لیے ایک ایسی پناہ گاہ کا انتظام کروں گی جو ڈیلفینا کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگی۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ''اس کمینی کی سوچ کا پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکے گا......''

میری سلامتی کے لیے وہ ڈیلفینا جیسی بارسوخ اور خطرناک عورت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ جی ایم سر کی بات پر مجھے رتی برابر بھی شک نہیں تھا کہ بینا میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ اس کے تیور سے ایسے ہی عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔

ان لمحات میں اس جاں نثار حسینہ پر مجھے بہت پیار آیا۔ میں نے محبوبیت بھرے انداز میں کہا۔

''اتنی دور بیٹھ کر تم کیا خاک میری حفاظت کر پاؤ گی!''

اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر اندازِ دل ربائی سے مسکرائی پھر چھم سے میرے پہلو میں آ گئی۔

☆☆☆

گیارہ جولائی کی دوپہر کو میں نے بینا کے ساتھ جا کر امریکن ایکسپریس سے ماں کا کینسل ویزا والا پاسپورٹ کلیکٹ کرلیا۔ بینا اب میرے پاس ہی شفٹ ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا بیڈروم استعمال کے لیے اسے دے دیا اور خود ماں والے بیڈروم میں منتقل ہوگیا تھا۔ ماں والا بیڈروم، ماسٹر بیڈروم تھا اور وہاں سی سی ٹی وی کیمروں کی کارکردگی کو واچ کرنے کے لیے مکمل انتظام موجود تھا۔ ماں حسبِ ضرورت اپنے کمرے میں بیٹھ کر بنگلے کے سامنے والے اور عقبی حصے کو مانیٹر کرتی رہتی تھیں۔ میں پچھلے دو تین دن سے ایسی صورتِ حال سے گزر رہا تھا کہ اس حفاظتی انتظام کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا لیکن درحقیقت یہ بہت مفید نظام تھا اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دن میں عظیم نے فون کر کے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے ''نامعلوم افراد'' کے ساتھ ڈیل کرلی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے شام نادر شاہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں ڈرائنگ روم میں اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ بینا بھی میرے ساتھ وہاں موجود تھی۔ نادر شاہ نے وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''میں افطار کر کے سیدھا تمہاری طرف آ گیا ہوں۔ بیٹا! یہ تم نے بہت اچھا کیا جو فوراً واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔''

''آپ میرے بڑے ہیں انکل۔'' میں نے برخوردارانہ انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے مشورے کو بھلا کیسے نظرانداز کر سکتا تھا اور پھر سارے حالات بھی میرے سامنے ہیں۔ ماں کو جس طرح ٹارگٹ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا، میں اس دہشت ناک منظر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ سچ کہتے ہیں، میرے لیے یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔''

''اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے بیٹا۔'' وہ معنی خیز نظر سے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا.... ''کیا تمہارا ٹکٹ بن گیا ہے؟''

بینا کی طرف وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ سوالیہ انداز میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے بینا کے حوالے سے اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے سے قبل اس کے پیٹ کے مروڑ کا علاج ضروری جانا اور فرماں برداری سے کہا۔

''جی انکل! میرا کل کا ٹکٹ بن گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں عظیم وہ ٹکٹ لے کر یہیں آ رہا ہے۔ جب تک آپ اگر یہاں موجود رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔''

''ہاں...... میں کچھ دیر ابھی ہوں یہاں۔'' وہ ایک بار پھر کن انکھیوں سے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر میں ایک ضروری کام سے نکلوں گا۔''

میں نے دل میں کہا۔ ''چاچو جان! آپ کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سارے ضروری کام تو ناک منہ سے باہر نکلنے والے ہیں تھوڑی دیر میں۔" پھر میں نے بینا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نادر شاہ سے کہا۔ "انکل! آپ ان کو تو جانتے ہی ہوں گے؟"

"ہاں بیٹا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ سلمٰی بہن کے ساتھ کام کرتی تھیں۔"

"اب میرے ساتھ ہیں۔" میں نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا نہیں بیٹا......؟"

"بینا سے میری دوستی ہو چکی ہے اور یہ آج سے ادھر ہی شفٹ ہو گئی ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے ساتھ جدہ میں پارٹنرشپ بزنس کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ میں وہاں پہنچ کر ان کے لیے ویزا کا بندوبست کروں گا۔ بزنس ویزا کے لیے ان کے تمام ضروری کاغذات میں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جب تک ان کا ویزا نہیں آجاتا، یہ ادھر اسی بنگلے پر قیام کریں گی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......"

بات کے اختتام پر میں نے گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ فوراً سنبھل گیا اور بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نن......نہیں...... مجھے کیوں اعتراض ہوگا بیٹا۔ ویسے ویزا آنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

اس کے ذہن میں کچھ پک رہا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ بینا کے بنگلے پر قیام والی بات سن کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"انکل! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا کوئی الجھن ہے آپ کے ذہن میں؟"

"نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ پوری طرح سنبھلتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ "مجھے کوئی پریشانی یا الجھن نہیں ہے۔ میں تو اس وجہ سے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ آپ کے جانے کے بعد میں یہ گھر ایک فیملی کو کچھ عرصے کے لیے کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "پھر تو آپ شانت ہو جائیں۔ بینا کا ویزا آنے میں زیادہ ٹائم تھوڑی لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ آپ بینا کے جانے کے بعد یہ بنگلا کرائے پر اٹھا دیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔ میں مینیج کر لوں گا۔" وہ سرسری انداز میں بولا تاہم اس کے چہرے پر الجھن موجود تھی۔

اگرچہ اس نے الفاظ سے اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا تھا لیکن یہ اطمینان اس کے چہرے یا آنکھوں سے نہیں جھلک رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ کہاں؟ میں اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تاہم میں نے اپنی بات کی مضبوطی کے لیے کہا۔

"اور انکل! جب بینا کا ویزا آجائے تو آپ ہی نے اس کے لیے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ آپ کو ٹکٹ کا اماؤنٹ دے دیں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"جی بیٹا! میں اچھی طرح سمجھ گیا۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہر کام آپ کے حسب منشا ہوگا۔"

اسی وقت جمشید نے آکر بتایا کہ عظیم آیا ہے۔ میں نے جمشید سے کہا۔ "عظیم صاحب کو یہاں پہنچا دو۔" پھر میں نے نادر شاہ کی طرف گردن گھماتے ہوئے کہا۔

"لیں انکل! میرا ٹکٹ تو آ گیا......!"

وہ نامراد میرے یہاں سے جانے پر اندر سے اتنا خوش تھا کہ اس طرف ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دھیان نہیں گیا کہ جب میں نے اپنا ٹکٹ عظیم سے بنوایا ہے تو بینا کے ٹکٹ کی ذمے داری میں اسے کیوں سونپ رہا ہوں۔

عظیم نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بہ آواز بلند "السلام علیکم" کہا پھر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کے بعد ڈمی ٹکٹ والا لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"برو! کل صبح دس بجے آپ کی فلائٹ ہے۔ آپ آٹھ بجے تک ائرپورٹ پہنچ جانا اور بہت معذرت...... میں تمہیں سی آف کرنے نہیں آسکوں گا۔"

"نو ایشو۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "بینا مجھے ائرپورٹ چھوڑ آئے گی۔" پھر میں نے ٹکٹ والا لفافہ نادر شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انکل ٹکٹ آ گیا ہے۔ آپ بھی چیک کر لیں......"

میں نے لفافہ کھولے بغیر نادر شاہ کو تھما دیا تھا۔ اس نے لفافے میں سے ٹکٹ نکال کر دیکھا۔ چند لمحات تک وہ بہ غور ٹکٹ کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹکٹ کو لفافے میں رکھ کر لفافہ مجھے واپس کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ اللہ تمہیں خیر خیریت سے لے جائے۔ جدہ پہنچ کر مجھ سے رابطہ ضرور کرنا۔ جب تک تم صحیح

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سلامت اپنے گھر نہیں پہنچ جاتے، مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے انکل! میں اپنے پہنچنے کی آپ کو لازمی اطلاع دوں گا۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "اور اس کے بعد بھی آپ سے رابطے میں رہوں گا۔"

"جیتے رہو بیٹا۔" وہ دعائیہ انداز میں بولا پھر کہا۔

"اب آپ مجھے اجازت دیں اور آپس میں گپ شپ کریں۔ مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔"

پھر وہ مجھ سے اور عظیم سے شیک ہینڈ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد عظیم نے کہا۔ "چاچو جی! ہم تو گپ شپ کریں گے ہی، آپ اپنی خیر منائیں۔ آپ کی جو حجامت بننے والی ہے نا، اس کے بارے میں آپ نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔"

عظیم کی اس بات پر میں اور پینا بے اختیار ہنس پڑے۔

عظیم نے پینا سے پوچھا۔ "آپ نے جرمنی جانے کا فیصلہ کرلیا ہے نا؟"

"نہیں یار۔" پینا کے بجائے میں نے جواب دیا۔

"انہیں اب امریکا جانا ہے۔ فی الحال تو یہ میرے پاس اسی بنگلے پر شفٹ ہو گئی ہیں۔ جب تک میں پاکستان میں ہوں، یہ ادھر ہی رہیں گی۔"

"اور جب تم امریکا چلے جاؤ گے تو یہ وہاں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔" عظیم نے معنی خیز انداز میں باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں غلط سوچ رہا ہوں؟"

"تمہارا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال یہ حالیہ مشن میں ہمارے ساتھ ہیں۔ تازہ ترین صورت حال ان کے علم میں ہے۔ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تینوں ایک کمپنی ہیں۔"

"میں نے تو سن رکھا ہے، ٹو از کمپنی اینڈ تھری ازنن۔" عظیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پھر ہم تینوں ایک کمپنی کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"آپ نے جو سن رکھا ہے وہ ایک انگریزی محاورہ ہے۔" پینا نے براہِ راست عظیم سے کہا۔ "بہت سے انگریزی محاورے ہمارے مشرقی ماحول میں مؤثر ثابت نہیں ہوتے بلکہ حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ان کے معنی اور مفہوم الٹ جاتا ہے۔"

"بہت خوب!" عظیم نے پینا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جواب نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اب ذرا آپ اس انگریزی محاورے کا مشرقی ورژن بنا کر دکھائیں......!"

"ویری سمپل!" میں نے جلدی سے کہا۔ "تھری از کمپنی اف آل آر ون۔"

"یہ بات!" عظیم نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا۔

"تم خوب دوستی نبھا رہے ہو۔ میں نے سوال پینا سے کیا تھا اور ان کی جگہ جواب تم دے رہے ہو۔ اس کو کہتے ہیں...... دوستوں سے ملیں دوست، کر کر لمبے ہاتھ۔"

"ارے یار! دل چھوٹا نہ کرو۔" میں نے عظیم سے کہا۔ "میں تمہارا بھی اتنا ہی دوست ہوں، جتنا پینا کا ہوں بلکہ ہم تینوں برابر کے دوست ہیں۔"

"ویسے میں بھی آپ کو یہی جواب دینے والی تھی لیکن علی نے جلدی دکھادی۔" پینا نے عظیم کے سامنے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔" عظیم نے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔ "جب ہم تینوں آپس میں دوست ہیں تو پھر کوئی بھی پہل کر دے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پینا جی! میں آپ کی کسی بات کا غلط مطلب نہیں نکال رہا۔"

"تھینک یو کور صاحب۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

"دوستی میں "صاحب" جیسے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔" عظیم نے کہا۔ "جس انداز میں آپ اسد کو مخاطب کرتی ہیں ویسے ہی مجھے بھی پکار سکتی ہیں۔"

"بس...... تو آج سے ہمارے بیچ "آپ، جناب اور صاحب وصاحبہ" کا تکلف ختم۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہم ایک دوسرے کو اس کے نام سے نالفتا دوستانہ انداز میں بلائیں گے۔"

"ڈن!" عظیم نے کہا۔

پینا بولی۔ "مجھے منظور ہے۔"

اسی لمحے عظیم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کرتے ہوئے ہم سے کہا۔ "نامعلوم افراد کا فون ہے۔" پھر وہ دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ "ہیلو......!"

چند لمحات تک وہ "ہوں، ہاں" کرتے ہوئے ادھر سے بولنے والے کی بات سنتا رہا پھر "ویری گڈ" کہتے ہوئے اس نے رابطہ موقوف کر دیا۔

عظیم نے فون رکھا تو میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا ہوا؟"

"نامعلوم افراد نے کیا رپورٹ دی ہے؟" پینا نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

''شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اٹھالیا گیا ہے۔'' اس نے انکشاف انگیز انداز میں اعلان کیا۔ ''نامعلوم افراد میں سے دو نے گن پوائنٹ پر اسے گاڑی میں سے نکال کر اپنی ہائی روف میں شفٹ کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے جبکہ باقی دو نامعلوم افراد بائیک پر سوار مذکورہ ہائی روف کے پیچھے جارہے ہیں تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں وہ ہائی روف کو کور دے سکیں۔ انہی میں سے ایک نامعلوم فرد نے مجھے فون کر کے یہ تفصیل بتائی ہے۔''

''مطلب یہ کہ انتہائی سیریس مریض کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔'' بینا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب منزل پر پہنچانے کے بعد اس کا آپریشن کیا جائے گا۔''

''نامعلوم افراد نے شاہ جی کو محمد علی سوسائٹی کے نزدیک سے اٹھایا ہے۔'' عظیم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد سیدھا جنید خان کے پاس جارہا تھا۔''

''مجھے تو لگتا ہے، خان ہاؤس میں اس کم بخت کی نال دبی ہوئی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''جب تک یہ اپنی ذرا ذرا سی بات جنید خان تک نہ پہنچا دے، اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ جنید خان کو اطلاع دینے جارہا تھا کہ میں کل صبح جدہ واپس جارہا ہوں۔ یہ مردود میرے خط کو لے کر بھی سیدھا محمد علی سوسائٹی میں واقع ''خان ہاؤس'' ہی پہنچا تھا۔''

''تم نے اس خط کے ذریعے نادر شاہ کو کیسا بے وقوف بنایا تھا علی......!'' بینا زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

عظیم نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ''تم لوگ کس خط کا ذکر کر رہے ہو؟''

میں نے گزشتہ رات جب عظیم کو نادر شاہ کے تعاقب پر مامور کیا تھا اور وہ شاہ جی کا پیچھا کرتے ہوئے خان ہاؤس تک جا پہنچا تھا تو میں نے اسے چنگیز خان کے زہریلے خط کے بارے میں تو بتا دیا تھا لیکن اس خط کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا جو میں نے نادر شاہ کو تھمایا تھا۔

عظیم کے استفسار پر میں نے اسے اس خط کی اسٹوری سنا دی جو میں نے چنگیز خان والے خط کی تحریر کی کاپی کر کے خود لکھا تھا اور مذکورہ خط کا مفہوم اصل خط کے برعکس ہو گیا تھا۔

''یار! تم نے تو واقعی شاہ جی کو الّو بنا دیا۔'' پوری بات سننے کے بعد عظیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کمینہ شخص اسی سلوک کا مستحق ہے۔''

''ابھی تو میں نے اسے صرف الّو ہی بنایا ہے۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''آگے آگے دیکھتے جاؤ، ہوتا ہے کیا......!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر عظیم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عظیم نے بتایا۔ ''شاکر کا فون ہے۔''

''کون شاکر؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار! وہی نامعلوم افراد کا ایک ساتھی۔'' عظیم نے جواب دیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اسی سے تو بات ہوئی تھی۔ میں نے شاکر ہی کے توسط سے یہ ڈیل کی ہے۔''

''ٹھیک ہے، اس کی کال اٹینڈ کرو۔ ہوسکتا ہے، وہ تمہیں منزل پر پہنچنے کی اطلاع دینا چاہ رہا ہو۔'' میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن سیل فون کا اسپیکر آن کر دو تاکہ ہم دونوں بھی شاکر کی بات سن سکیں اور تمہیں بعد میں یہ کہانی ہمیں نہ سنانا پڑے۔''

عظیم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سیل فون کا اسپیکر آن کیا پھر شاکر کی کال ریسیو کر لی۔ اگلے ہی لمحے اسپیکر میں ایک گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''عظیم بھائی! غضب ہو گیا......''

''کیا ہوا شاکر؟'' عظیم نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''یونیورسٹی روڈ پر چار پولیس موبائلز نے ہماری ہائی روف کو گھیرے میں لے لیا ہے۔'' شاکر نے خوفزدہ انداز میں بتایا۔ ''پولیس والوں کے ارادے بڑے خطرناک نظر آرہے ہیں۔ میں منظر سے غائب ہو رہا ہوں۔ مجھے فون نہیں کرنا کیونکہ میں اپنا فون آف کر رہا ہوں......''

اسپیکر خاموش ہو گیا۔ یقیناً شاکر نے رابطہ منقطع کر دیا تھا اس لیے اس کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی فضا میں سناٹا چھا گیا۔

ہم تینوں ہکا بکا ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔

''یہ کیا ہو گیا......؟''

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دیدہ دلیری

شاکر لطیف

قانون اور اصول کو جب بااختیار طبقہ اپنی رعایا سمجھنے لگے تو مظلوم کو کچھ ایسا ہی لنگڑا لُولا انصاف ملتا ہے جیسے کہ یہاں... رسم و رواج تو شاید رعایا کو جکڑے رکھنے کا محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ ان پر عمل درآمد کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوتا۔

دوسروں کو نصیحت کرنے والے منصفوں کی بے ایمانی اور بے اصولی کا ماجرا

سمندر خان اس وقت اپنے گھر کے سامنے کھڑا پُرخیال نظروں سے وہاں موجود کھیت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش اور رنج و غم کے تاثرات موجود تھے۔ سامنے اس کے کھیت میں افیون کی فصل پک کر تیار ہونے والی تھی۔ اس بار افیون کی فصل تلف کرنے کے لیے فضائی اسپرے بھی نہیں کیا گیا تھا، اس لیے سمندر خان جانتا تھا کہ اس بار اسے اچھا منافع حاصل ہونے والا ہے۔

مگر اس وقت اس کی سوچ کا محور اس کی بیٹی زرگل تھی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جس کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا جس نے اس کی عزت کا سرِعام جنازہ نکال کر اسے ذلیل و رسوا کر ڈالا تھا۔

زرگل اس قبیلے کے سردار شیر خان کے بیٹے بہادر خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کب محبت کی پینگیں بڑھیں اور کب ان کی دیوانگی اس حد تک جا پہنچی کہ وہ اس وادی سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے، سمندر خان آخری وقت تک لاعلم رہا۔ اب اس کے پاس اپنی عزت اور غیرت بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کو پکڑ کر وادی میں واپس لایا جائے اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ غیرت کے نام پر قتل اس علاقے کا قانون تھا۔

سمندر خان کے علاقے کا نام چٹان وادی تھا۔ شاید یہ نام یہاں پھیلی ہوئیں لاتعداد پہاڑی چٹانوں کی وجہ سے تجویز کیا گیا تھا۔ اگرچہ حکومتی دلچسپی کے باعث یہاں روزگار کے دوسرے مواقع بھی پیدا ہو چکے تھے مگر اب بھی یہاں کے مکینوں کا سب سے بڑا روزگار افیون کی کاشت ہی تھا کیونکہ کسی دوسرے کام میں اتنا منافع ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پرکشش حکومتی ترغیب و تحریص کے باوجود یہاں کے باشندے اس پیشے کو ترک کرنے پر تیار نہیں تھے۔ سمندر خان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ تاہم اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی، اس لیے اس کا شمار علاقے کے غریب افراد میں ہوتا تھا۔

سمندر خان اب پچپن برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ وہ مضبوط جسامت اور لمبے قد کاٹھ کا مالک تھا۔ اس کی دو بیٹیاں زرگل اور فرشتہ گل تھیں۔ جوانی میں سمندر خان کی بیوی جنت گل خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی اور اس کی خوب صورتی کا اثر اس کی دونوں بیٹیوں پر بھی آیا تھا، وہ بھی حسن و جمال میں اپنی ماں سے کسی صورت کم نہ تھیں۔ خاص کر چھوٹی بیٹی فرشتہ گل تو گویا کوئی حور معلوم ہوتی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا اس کے چہرے کی معصومیت اور پاکیزگی دیکھ کر مبہوت رہ جاتا۔ وہ اپنی بڑی بہن زرگل سے تین سال چھوٹی تھی۔

سمندر خان کو بیٹے کی بڑی تمنا تھی مگر دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد جنت گل کی گود ہری نہ ہو سکی اور سمندر خان کی یہ خواہش تشنہ ہی رہ گئی۔

اس وقت وہ ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار تھا۔ اس کی بڑی بیٹی زرگل نے سردار کے بیٹے کے ساتھ گھر سے فرار ہو کر پورے قبیلے میں اس کا منہ کالا کر دیا تھا اور اب اس کے پاس اپنی عزت بچانے کی ایک ہی صورت تھی کہ زرگل اور اس کے عاشق کو واپس لا کر یہاں کے دستور کے مطابق موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

چٹان وادی میں برسوں سے یہ دستور رائج تھا کہ جس کی بیٹی اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو جائے، وہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا تھا۔ اب سمندر خان کو بھی اس قانون پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسے زرگل اور اس کے آشنا بہادر خان کو اپنے ہاتھوں سے موت کے سپرد کرنا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس بار یہ اتنا آسان نہ ہوگا کیونکہ بہادر خان اس قبیلے کے سردار شیر خان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

اگرچہ وادی کے دستور کے مطابق گھر سے فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں ہی قصوروار ٹھہرے تھے اور دستور کے مطابق دونوں کو موت کی سزا سنائی جانی تھی مگر سمندر خان کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ زرگل تک تو بات ٹھیک تھی مگر سردار شیر خان اتنی آسانی سے اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے سپرد نہیں ہونے دے گا۔ بہرحال یہ باتیں بعد میں طے ہونا تھیں کہ قبیلے کے لوگ اپنے دستور کو ترجیح دیتے ہیں یا سردار کو۔ فی الحال سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کو گرفتار کر کے واپس چٹان وادی لایا جائے اور پھر جرگے کے سامنے پیش کیا جائے جو دونوں کا موقف سننے کے بعد ان کی سزا کا تعین کرتا۔

کیونکہ کسی لڑکے اور لڑکی کے گھر سے فرار کو ایک اجتماعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے چٹان وادی کے تقریباً پچاس کے قریب مسلح نوجوان بہادر خان اور زرگل کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے۔ سمندر خان کو امید تھی کہ یہ افراد بہادر خان اور زرگل کو کسی بڑے شہر پہنچنے سے پہلے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ورنہ پھر انہیں واپس لانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ وہاں بڑی تعداد میں امریکی این جی اوز کام کر رہی تھیں اور شہر میں خاصی بڑی تعداد میں امریکی فوج بھی موجود رہتی تھی اس لیے وہاں کسی قسم کی زبردستی بھی نہیں کی جا سکتی تھی اور اس طرح سمندر خان ہمیشہ کے لیے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

وہ خود بھی ان دونوں کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا مگر تعاقب میں جانے والوں میں سردار شیر خان کے آدمی بھی شامل تھے۔ انہوں نے اسے روک دیا تھا۔ سمندر خان اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ سردار شیر خان کو خطرہ تھا کہ کہیں سمندر خان جوش میں آ کر اس کے بیٹے پر گولی نہ چلا دے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس وقت وہ انہی پریشان کن حالات میں الجھا ہوا تھا کہ ایک طرف واقع اس کے تین کمروں پر مشتمل چھوٹے سے کچے مکان سے اس کی چودہ سالہ بیٹی فرشتہ گل برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جس سے وہ کھیل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سمندر خان کے چہرے پر برہمی کے تاثرات عود آئے۔

''جنت گل! تم کہاں مرگئی ہو؟'' اس نے غصیلے لہجے میں اپنی بیوی کو آواز دی۔

''کیا ہوا؟'' دوسرے ہی لمحے مکان کے اندر سے اس کی بیوی بھی برآمد ہوگئی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

''اسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔'' سمندر خان نے فرشتہ گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجائے اور میں اسے گولی ماردوں۔''

''زرگل کے کیے کی سزا اسے کیوں دینا چاہتے ہو۔ اس کا کیا قصور ہے؟'' جنت گل تیز لہجے میں بولی۔

''اس کا یہی قصور کیا کم ہے کہ یہ ایک لڑکی ہے۔''

''زرگل کا غصہ اس پر مت نکالو۔'' جنت گل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جب بہادر خان نے زرگل کا رشتہ مانگا تھا تو تم نے انکار کیوں کردیا تھا؟ اگر تم اس رشتے کو قبول کرلیتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

''میں نے انکار نہیں کیا تھا۔'' سمندر خان بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مگر یہ قبیلے کا دستور ہے کہ رشتہ مانگنے کے لیے خاندان کے کسی بڑے کو آنا پڑتا ہے۔ جب بہادر خان کا باپ ہی راضی نہیں تھا تو پھر میں کیسے آمادگی ظاہر کردیتا؟ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زرگل اور بہادر خان کے درمیان خفیہ معاشقہ چل رہا تھا اور میرے انکار کے بعد وہ گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں ضرور اس بات کا پتا ہوگا مگر تم نے جان بوجھ کر اپنی بیٹی کے اس جرم پر پردہ ڈالے رکھا۔''

''میں نے کتنی بار قسم کھا کر تمہیں یقین دہانی کرائی ہے کہ میں اس معاملے سے بے خبر تھی۔ زرگل پہاڑ کی پچھلی جانب بکریاں چرانے کے لیے جاتی تھی اور شاید وہیں اس کے اور بہادر خان کے درمیان ملاقات ہوتی تھی جو محبت میں بدل گئی۔''

''بکواس بند کرو جنت گل۔'' سمندر خان اتنی زور سے دہاڑا کہ فرشتہ گل سہم کر ماں سے لپٹ گئی۔

''عورت سے زیادہ مکار و عیار ہستی اس روئے زمین پر نہیں ہے۔'' سمندر خان نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم عورتوں کو محض مردوں کی خدمت گزاری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہاری حیثیت مردوں کی پاؤں کی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم عورتوں کی وجہ سے ہی مردوں کی عزت خاک میں ملتی ہے۔ زرگل بھی میری بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عورت ہی تھی۔ اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ کر میری برسوں کی کمائی ہوئی عزت لمحوں میں خاک میں ملا ڈالی۔''

''تمہاری ماں بھی ایک عورت ہی تھی سمندر خان۔'' جنت گل سے شاید اپنی توہین برداشت نہ ہوسکی تھی۔

''میری مرحومہ ماں کو درمیان میں مت لاؤ۔'' سمندر خان گرج دار آواز میں بولا۔ ''وہ بہت عظیم عورت تھی کیونکہ اس نے مجھ جیسا بہادر اور غیرت مند بیٹا پیدا کیا تھا مگر تم کیا ہو؟ تم تو بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو۔ اس لیے خود کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔''

جنت گل نے اس بار سمندر خان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مزید بولی تو سمندر خان آپے سے باہر ہوجائے گا اور ممکن تھا اسے مارنا، پیٹنا بھی شروع کردیتا۔ خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی، اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اب سمندر خان کی مار کھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چٹان وادی میں عورتوں کا اپنے مردوں کے ہاتھوں پٹنا عام سی بات تھی اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے سمندر خان اور جنت گل کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

گھڑسوار خاصی تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا سمندر خان کے گھر کی جانب ہی آرہا تھا۔ قریب آنے پر سمندر خان نے اسے پہچان لیا۔ یہ اسی کے قبیلے کا ایک نوجوان تھا۔

''مبارک ہو سمندر خان! تمہاری اور قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔'' قریب آتے ہی وہ بولا۔ تاہم اس نے گھوڑے سے اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ''زرگل اور بہادر خان کے تعاقب میں جانے والے انہیں پکڑ کر واپس لانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔''

''تم کو بھی مبارک ہو۔'' نوجوان کی بات سن کر سمندر خان نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ ''صرف میری ہی نہیں پورے قبیلے کی عزت بچ گئی ہے۔ وہ دونوں اب کہاں ہیں؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''وہ دونوں اب سردار شیر خان کی قید میں ہیں۔ کل ان کی سزا کا تعین کرنے کے لیے جرگہ بیٹھے گا۔ سردار شیر خان کا کہنا ہے کہ جرگے کے افراد جو بھی فیصلہ کریں گے وہ قبول کرے گا، چاہے یہ فیصلہ اس کے بیٹے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔'' نوجوان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جرگے کا کیا وقت مقرر کیا ہے؟'' سمندر خان نے استفسار کیا۔

''کل صبح سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی سردار کے ڈیرے میں جرگہ بیٹھ جائے گا۔ مقررہ وقت پر پہنچ جانا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نوجوان نے گھوڑا واپسی کے لیے موڑا اور پھر اسے دوڑاتا ہوا سمندر خان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی سمندر خان نے مطمئن چہرے کے ساتھ جنت گل کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر اب خوف کے ساتھ ساتھ گہرے رنج و غم کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔ شاید اس لیے کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس کی بیٹی کو مرنے سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کی عبرتناک موت یقینی ہو چکی تھی۔ زرگل اپنی چھوٹی بہن فرشتہ گل سے بہت مختلف تھی۔ وہ بچپن سے ہی بے چین اور باغیانہ طبیعت کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی منہ پھٹ بھی واقع ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو باپ کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی تھی، اس وجہ سے اکثر اوقات سمندر خان سے مار کھاتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ تو سمندر خان نے اسے گولی مارنے کا ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر جنت گل اس کے قدموں میں گر کر اس کی منت سماجت نہ کرتی تو شاید وہ اپنے ارادے پر عمل بھی کر گزرتا اور اب وہ چاہ کر بھی اپنی بیٹی کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی۔

وہ زرگل کی ماں تھی مگر اس کے باوجود اسے آخری وقت تک اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کی بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔ ورنہ شاید وہ زرگل کے آگے ہاتھ جوڑ کر اسے روک لیتی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ زرگل اور بہادر خان گرفتار ہو چکے تھے اور کل انہیں سزا دینے کے لیے جرگہ بیٹھ رہا تھا۔ گویا اس کی بیٹی کے پاس بس آج رات ہی کی زندگی تھی۔

جنت گل جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے سامنے دوسری چارپائی پر سمندر خان گہری نیند سو رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے خراٹوں کی آواز بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔ فرشتہ گل، جنت گل کے ساتھ لیٹی سو رہی تھی۔ وہ چودہ سال کی تھی مگر جنت گل کو اندازہ تھا کہ ذہنی طور پر وہ اپنی عمر سے ابھی کہیں چھوٹی ہے۔ اس کے معصوم ذہن کو اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ اس کی بڑی بہن کس مصیبت سے دوچار ہو چکی ہے۔

یہ رات جنت گل پر بہت بھاری تھی۔ آنسوؤں کا گویا ایک سیلاب تھا جو اس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ اس کے لیے یہ صورتِ حال بڑی کربناک تھی کہ جس بیٹی کو اس نے بڑی محبت سے اپنی بساط کے مطابق پال پوس کر جوان کیا تھا، اسے کل وادی کے قانون کے مطابق اس کا اپنا ہی باپ موت کے سپرد کر دے گا۔ جنت گل کو اس وقت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ صنفِ نازک ہونے کے ناتے وہ کس قدر بے بس اور ناتواں مخلوق ہے۔ شاید سمندر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس وادی میں عورتوں کی اوقات مردوں کی جوتی کے برابر ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اس وادی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ تاہم اس نے وادی سے باہر شہری طرزِ زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں عورتوں اور مردوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر تشدد کرے تو وہ عورت قانون کا سہارا لے سکتی ہے۔ مرد کا عورت پر تشدد ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے مگر اس وادی میں تو عورت پر تشدد بالکل عام سی بات تھی۔

جب اسے زرگل کے بہادر خان کے ساتھ بھاگنے کی خبر ہوئی تو ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ دونوں تعاقب میں جانے والوں کی پکڑ میں نہ آ سکیں اور کہیں دور جا کر اپنی نئی دنیا بسا لیں مگر جنت گل کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ قبیلے کے لوگ بہادر خان اور زرگل کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بہادر خان سردار کا بیٹا تھا۔ آج تک گھر سے بھاگنے والی کسی لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ جنت گل کی وہ رات سسکیوں اور ہچکیوں میں روتے ہی گزر گئی۔ صبح کے وقت اسے ہلکی ہلکی نیند آنے لگی مگر سمندر خان کی آواز نے اسے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

''جنت گل! اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے، مجھے جرگے میں جانا ہے۔''

''آ رہی ہوں آہستہ بولو، فرشتہ گل سو رہی ہے۔''

جنت گل نے کہا اور پھر اپنی چارپائی سے اٹھ گئی......

''کیا بات ہے، تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟'' اس نے قہوہ بنا کر سمندر خان کے سامنے رکھا تو اس نے استفسار کیا۔

''سمندر خان! زرگل ہماری اولاد ہے۔ تم اپنے ہی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہاتھوں اپنی اولاد کو موت کے سپرد کرنے جارہے ہو۔'' جنت گل روہانسے لہجے میں بولی۔

''میرے لیے وہ اسی دن مرگئی تھی جس دن اس نے ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگنے جیسا مذموم فعل سرانجام دیا تھا۔ بطور ایک غیرت مند باپ اس پر عملدرآمد کرنا میرا فرض ہوگا۔'' سمندر خان نے قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

''وہ ہماری بیٹی ہے سمندر خان۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس نے غلطی کی ہے مگر اس کی یہ غلطی معاف بھی تو کی جاسکتی ہے۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ، میں جرگے کے افراد سے اپنی بیٹی کے لیے رحم کی بھیک مانگوں گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' سمندر خان نے غراتے ہوئے کہا۔''تمہاری باتوں سے میں کمزور پڑنے والا نہیں ہوں۔ چٹان وادی کے مکینوں کے فیصلے بھی چٹانوں کی طرح مضبوط اور اٹل ہوتے ہیں۔ میرے بعد آنے والی نسلیں بھی مجھے ایک غیرت مند باپ کے طور پر یاد رکھیں گی۔ جب کبھی بھی چٹان وادی کی غیور قوم کا ذکر آئے گا۔ سمندر خان کا نام سرفہرست ہوگا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے قہوے کا آخری گھونٹ لیا اور ایک طرف رکھی اپنی کلاشنکوف اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ جرگے میں جانے کے لیے اس نے اپنی پگڑی نہیں پہنی تھی کیونکہ یہ یہاں کا قانون تھا کہ جس گھر کی کوئی عورت گھر سے بھاگے اس گھر کا کوئی مرد اس وقت تک اپنی پگڑی نہیں پہن سکتا تھا جب تک وہ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند نہ سلادے۔

جرگے کا وقت ہورہا تھا اس لیے سمندر خان گھر سے باہر نکل آیا۔ جنت گل بھی پریشان چہرہ لیے اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

''سمندر خان! زرگل تمہاری بیٹی ہے۔'' اسے اپنے پیچھے جنت گل کی بے چین سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ بے پروائی سے آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ سردار شیر خان کے ڈیرے پر پہنچا تو جرگے کی کارروائی دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی کرسی پر سردار شیر خان براجمان تھا۔ اس کے پیچھے اس کے مسلح آدمی بڑے مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ زرگل کا باپ ہونے کے ناتے سمندر خان بھی اس مقدمے کا ایک اہم فریق تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کردی گئی۔ سمندر خان سب کو سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی لمحے ان افراد میں سے ایک شخص کھڑا ہوگیا اور اس نے اونچی آواز میں بولنا شروع کردیا۔

''جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ آج آپ کو بہادر خان اور زرگل کی سزا کا تعین کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ اپنی عزت اور غیرت پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے۔ چاہے ہمیں اپنی جان دینی پڑے یا کسی کی جان لینی پڑے۔

''آج بہادر خان اور زرگل کو بھی یہاں کے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی تاکہ ان دونوں کا انجام دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو۔ مگر یہ تقاضائے انصاف ہے کہ ملزمان کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ اس لیے میں کارروائی کے آغاز کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے ملزمان کو حاضر کرنے کا حکم دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شخص اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سردار شیر خان نے اس شخص کا حکم سن کر پیچھے کھڑے ایک آدمی سے کان میں کھسر پھسر کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بہادر خان اور زرگل کو مسلح آدمیوں کے نرغے میں جرگے کے سامنے پیش کردیا گیا۔

بہادر خان چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد کا ایک کڑیل اور خوبرو نوجوان تھا، زرگل اس کے ساتھ کھڑی تھی تاہم اس نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔

بہادر خان کے چہرے پر خوف کے تاثرات نہیں تھے تاہم تذبذب کے تاثرات ضرور موجود تھے۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہورہا تھا جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں کشمکش کی کیفیت سے دوچار ہو کیونکہ وہ قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا اس لیے اسے بھی بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کردی گئی تھی جبکہ زرگل کو صنفِ نازک ہونے کے باوجود کھڑا ہی رہنے دیا گیا۔

سمندر خان خاموشی سے بیٹھا جرگے کی کارروائی کے آغاز کا انتظار کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر زرگل کے لیے نفرت کے تاثرات موجود تھے۔

''بہادر خان ......'' ان افراد میں سے ایک باریش شخص بولا۔''تم نے اور زرگل نے گھر سے بھاگ کر نہ صرف قبیلے کی غیرت کو للکارا ہے بلکہ یہاں کے قانون کو توڑنے کی بھی جسارت کی ہے۔ کیا تم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہو؟''

''ٹھہریئے۔'' بہادر خان کے بولنے سے پہلے ہی سردار شیر خان بول پڑا۔''اصل مسئلہ یہ نہیں کہ یہ دونوں گھر

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے بھاگے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے یہ فیصلہ کس کا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے بیٹے نے زرگل کو گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہو۔ ایسی صورت میں زرگل کے ساتھ رعایت برتی جاسکتی ہے اور اسے سزائے موت نہیں دی جاسکتی لیکن اگر یہ ثابت ہوجائے کہ زرگل نے میرے بیٹے کو بہکایا تھا تو پھر سزا کا اطلاق بھی صرف اسی پر ہوگا۔''

''مگر سردار شیر خان! آج سے پہلے یہی قانون رائج رہا ہے کہ فرار ہونے والے لڑکا اور لڑکی دونوں کو برابر کا قصوروار تسلیم کیا جاتا ہے.....'' ان معززین میں سے ایک شخص بولا۔

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے پہلے ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔'' سردار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ سزا اس لیے دی جاتی رہی ہے کہ دونوں ہی قصوروار ٹھہرتے تھے فرار کا فیصلہ ان کا مشترکہ ہوتا تھا۔

''مگر میرا بیٹا بہادر خان تو فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے کیونکہ تقریباً ایک ماہ پہلے اس پر ایک پراسرار بیماری کا حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اب اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ یہ بظاہر ہوش مند شخص دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے بعد سے یہ نیم پاگل ہوچکا ہے۔ میری آپ سب سے التماس ہے کہ فیصلہ کرتے وقت اس کی ذہنی بیماری کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔ آپ سب جانتے ہی ہیں کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کرسکتا۔ چاہے وہ میرا بیٹا ہو یا کوئی اور۔'' اگرچہ شیر خان نے بات کرتے ہوئے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا اور الفاظ کا بھی مناسب چناؤ کیا تھا مگر اس کے باوجود جرگے کے سبھی افراد نے اس کے الفاظ میں پوشیدہ دھمکی کو واضح طور پر محسوس کرلیا تھا۔ سردار انہیں کیا جتلانا چاہ رہا تھا وہ بخوبی سمجھ چکے تھے۔ جرگے کے افراد کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ سردار سے مخاصمت مول لے کر چٹان وادی میں رہنا بہت مشکل تھا۔

انہیں اب بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ شیر خان کے بدلتے ہوئے تیور سب کو دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کے لیے آخری حد تک جائے گا اور اس کی خاطر وہ کسی خونریز تصادم سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

''سردار شیر خان! آپ کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں یہ بات آپ کو ثابت کرنا ہوگی۔ کیا آپ کے بیٹے کے پاگل پن کا کوئی گواہ موجود ہے؟'' جرگے کے ایک فرد نے مخاصمانہ لہجے میں شیر خان کو مخاطب کیا۔

''میں اس سلسلے میں بیسوں گواہ پیش کرسکتا ہوں۔'' شیر خان مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ویسے تو میری گواہی کافی ہے مگر شاید باپ ہونے کی وجہ سے میری گواہی کو غیر جانبدارانہ سمجھا جائے اس لیے میں اپنے بیٹے کے حق میں چند دوسرے گواہ پیش کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کھڑے کچھ افراد کو اشارہ کیا تو وہ افراد آگے بڑھ کر جرگے کے افراد کے سامنے آگئے۔

یہ سب اسی قبیلے کے مکین تھے۔ ''ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار شیر خان کا بیٹا بہادر خان بیماری کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھوچکا ہے۔'' گواہان میں سے ایک باریش شخص بولا۔

''کیا باقی افراد بھی یہی گواہی دیتے ہیں؟'' جرگے کے ایک فرد نے پوچھا۔

''ہاں ہم سب بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ سردار کے بیٹے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔'' باقی افراد نے بھی یک زبان ہوکر جواب دیا۔ سردار شیر خان نے انہیں رات ہی اچھی طرح ذہن نشین کرادیا تھا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ اس لیے وہ سب بڑے پُراعتماد انداز میں کھڑے تھے اور پھر اس گواہی کے بعد شیر خان سے انعام بھی تو ملنا تھا۔ شیر خان نے جرگے کے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''کیا ایک نیم پاگل شخص پر بھی اسی سزا کا اطلاق ہوگا جو کسی ہوش مند انسان پر ہوگا؟ اگر واقعی تو پھر مجھے آپ سب کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سارے فساد کی جڑ یہ لڑکی ہے، اسی نے میرے بیٹے کو بہکایا تھا۔ دیکھیے۔ اس کے باپ کا جھکا ہوا سر۔ افسوس اس لڑکی نے تو اس کی عزت کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔'' شیر خان نے باقاعدہ سمندر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے سردار کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر واقعی میں سر جھکا لیا تھا۔

''اتنے افراد کی گواہی نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔'' جرگے کا ایک فرد شیر خان کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگرچہ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بہادر خان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے پھر بھی میں چاہوں گا کہ بہادر خان ہمیں بتائے کہ اس لڑکی نے اسے گھر سے فرار ہونے کے لیے کس طرح مجبور کیا تھا؟''

اس شخص کا سوال سن کر سب کی نگاہیں بہادر خان کی جانب مبذول ہوگئیں۔ مجمعے میں گویا ایک سکوت سا طاری

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوگیا۔ بہادر خان کا جواب بہت اہمیت کا حامل تھا۔ زرگل بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی تھی اگرچہ اس نے نقاب اوڑھ رکھا تھا مگر نقاب کی باریک جالی سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد بہادر خان کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ اسے ایک علیحدہ کمرے میں بند کیا گیا تھا۔

اس وادی میں سڑکیں اور گاڑیاں نہیں تھیں۔ کچے راستے بنے ہوئے تھے جن پر سفر کے لیے گھوڑوں اور خچروں کا استعمال ہوتا تھا۔ بہادر خان نے اسے نئی زندگی کی امید دلائی تھی۔ اس سے محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ شہر پہنچتے ہی وہ دونوں نکاح کرلیں گے۔

زرگل اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ کسی غیر مرد کے ساتھ گھر سے فرار ہونے کا کیا مطلب ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہ رہی تھی، وہاں اسے ایک مذموم اور ناقابلِ معافی فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں تھی۔

اگرچہ وہ بچپن سے ہی باغیانہ مزاج رکھتی تھی مگر اس کے باوجود شاید وہ بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی لیکن بہادر خان کی محبت میں مجبور ہوکر وہ ایسا کر بیٹھی تھی۔ بہادر خان نے اسے ایک حسین اور خوشگوار زندگی کا خواب دکھلایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اس کے باپ نے اس کا رشتہ کہیں اور طے نہ کر رکھا ہوتا تو وہ بھی یہ فیصلہ نہ کرتا۔ اس نے قسم کھا کر زرگل کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ زندگی بھر ساتھ نبھائے گا۔ دھوکا نہیں دے گا۔ جب وہ قسمیں کھا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا تو پھر زرگل کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ بہادر خان پچھلے ایک سال سے اس کے پیچھے پڑا تھا۔ چھپ کر اس سے ملنے کے لیے آتا تھا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کی مستقل مزاجی نے آخرکار زرگل کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔

وہ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی کی امید لے کر گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ بہادر خان کا گھوڑا بہت برق رفتار اور طاقتور تھا۔ دو سواروں کے وزن کے باوجود صبح سے لے کر شام تک مسلسل دوڑ سکتا تھا۔ برق رفتاری میں قبیلے کا کوئی دوسرا گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ شاید وہ شہر تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوجاتے مگر راستے میں ایک پتھر پر ٹھوکر لگنے سے گھوڑے کی ٹانگ زخمی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگا۔ اس کی اس سست روی کے باعث ہی تعاقب میں آنے والے ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ بہادر خان کے پاس اپنی کلاشنکوف

گڑبڑ

مانا پڑے گا کہ ہمارا ملک ابھی بہت پسماندہ ہے۔ بوس و کنار وغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں۔ نگاہِ التفات تک کے لیے لائسنس مطلوب ہوتا ہے اور شادی کے لیے لڑکی کا پابند صوم وصلوٰۃ اور سگھڑ اور قبول صورت ہونا شرط ہے اور لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ گزیٹڈ افسر ہو۔ عالی خاندان ہو، پنجابی اور اثنا عشری کو ترجیح دی جائے گی وغیرہ...... یہاں طلب مغرب میں مزے بیٹھے اثر خواب آوری۔ اگلے روز آکسفورڈ اسٹریٹ پر جاتے ہوئے ہم ایک جگہ ٹھٹکے۔ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔ ''آیئے آیئے۔ نئے نئے دوست بنایئے۔'' دوستی بڑی اچھی چیز ہے اور شاعر تک نصیحت کر گیا ہے۔ تو برائے وصل کردن آمدی۔ پردیس میں تو یوں بھی بے یاری و مددگاری کا سماں ہوتا ہے۔ ہم نے قریب جاکر دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑی دوشیزہ نے ہمیں ایک فارم تھما دیا اور ایک ڈاڑھی والے نوجوان کا کھڑے کھڑے بوسہ لیا۔ ہم نے رشک کیا کہ کاش یہ فارم ان صاحب کو دیا جاتا اور...... شاید جلدی میں گڑبڑ اور ردوبدل ہوگئی ہوتی۔

ابن انشا کے سفرنامے ''دنیا گول ہے'' سے اقتباس

- میں اسے بے ایمان کہنا نہیں چاہتی لیکن اگر کسی کے پاس اس سے بہتر لفظ ہو تو میں منہ مانگی رقم دے کر وہ لفظ خریدنے کو ابھی تیار ہوں۔
- جان آف آرک — وہ حسن جسے آگ بھی جلا نہ سکے۔
- ہالی وڈ میں ساری محبتیں پارٹ ٹائم ہوتی ہیں۔
- حسین وہ ہے جسے میں پسند کرتا ہوں مگر دلکش وہ ہے جو مجھے پسند کرتی ہے
- مجھے بڑھاپا پسند ہے بشرطیکہ اس کا مستقبل روشن ہو۔
- تم ہیرا ہو اگرچہ سیکنڈ ہینڈ۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

موجود تھی مگر اتنے آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے گرفتاری دے دی تھی، بہرحال اب وہ پکڑے جا چکے تھے۔

زرگل بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اسے پکڑے جانے کے بعد سے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا مگر وہ پھر بھی یہ سب کچھ حوصلے سے سہہ رہی تھی۔ اس نے بہادر خان کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جینے کے امکانات تو شاید اب معدوم ہو چکے تھے مگر ساتھ میں مرنے کے امکانات روشن تھے اور وہ بہادر خان کے ساتھ مرنے کو بھی تیار تھی۔ عہد کیا تھا اور اب وفائے عہد کا وقت آ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہادر خان بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ وہ محض نام کا بہادر نہیں تھا اور نہ ہی موت کو سامنے دیکھ کر گھبرانے والوں میں سے تھا۔

یہ زرگل کے خیالات تھے اور خیالات کا تعلق بھی خیالی دنیا سے ہوتا ہے۔ حقیقت کی دنیا بڑی مختلف اور تلخ ہوتی ہے۔ بہادر خان نے جرگے کے فرد کے سوال کا جو جواب دیا اس نے زرگل کو حقیقت کی دنیا میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔

''ہاں۔ زرگل نے ہی مجھے فرار کی راہ دکھائی تھی۔ اسی نے مجھے مجبور کیا تھا، ورنہ میرا سمندر خان کی عزت پر قدغن لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زرگل نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے بدنام کر دے گی اور لوگوں سے کہے گی کہ میں نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیماری کی وجہ سے میرا ذہن پہلے ہی صحیح طرح کام نہیں کرتا، اس لیے میں نے پریشانی کے عالم میں زرگل کے ساتھ قبیلے سے فرار کا فیصلہ کر لیا۔''

زرگل نے متحیر نگاہوں سے بہادر خان کا جواب سنا لمحہ بھر کے لیے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ جواب بہادر خان نے دیا ہے۔ وہ بزدل نہیں تھی، بچپن سے ہی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں پر سراپا احتجاج تھی اور اس وجہ سے اپنے باپ سمندر خان سے مار بھی کھاتی تھی پھر بہادر خان کا اتنا بڑا جھوٹ کیسے برداشت کر لیتی۔

اس نے یکلخت اپنا نقاب الٹ دیا اور چیختی ہوئی بہادر کی جانب بڑھی۔ ''ذلیل انسان! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' اس کی جارحانہ پیش قدمی پر بہادر خان اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ زرگل شاید غصے کے عالم میں اپنے ناخنوں سے بہادر خان کا منہ نوچ لیتی مگر سردار شیر خان کے اشارے پر اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اطراف سے اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ زرگل نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر دو طاقتور مردوں کی گرفت میں بے بس ہو گئی۔

''بے حیا لڑکی!'' اسی لمحے سمندر خان اپنی کلاشنکوف سیدھی کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ''تم نے گھر سے بھاگ کر بطور باپ تو میرا سر شرم سے جھکا ہی دیا تھا مگر آج بھرے مجمعے میں بے پردہ ہو کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ میں تمہارے ناپاک وجود کو مٹا دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گن کا رخ زرگل کی جانب کر دیا۔

''نہیں سمندر خان۔'' اسی لمحے سردار شیر خان کی دہاڑتی ہوئی آواز ابھری تو اس نے ٹریگر سے انگلی ہٹالی۔

''سمندر خان میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔'' شیر خان تیز لہجے میں بولا۔ ''مگر ابھی جرگے نے فیصلہ نہیں سنایا ہم سب یہاں کے قانون کے پابند ہیں اور قانون کا احترام کرتے ہیں۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم خود پر قابو رکھتے ہوئے صبر و تحمل سے کام لو اور جرگے کے فیصلے کا انتظار کرو۔''

''سردار ٹھیک کہہ رہا ہے سمندر خان۔'' جرگے کا ایک فرد شیر خان کی تائید میں بولا۔ ''تمہیں اپنی غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ فی الحال صبر سے کام لو اور اپنی کلاشنکوف نیچے کر کے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

سردار اور جرگے کے فرد کی بات سن کر سمندر خان گود میں کلاشنکوف رکھ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا تاہم اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ہے۔

''لڑکی... تمہیں بھی صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا مگر تماشا لگانے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی۔ آرام سے اپنا موقف بیان کرو۔'' جرگے کا وہی شخص درشت لہجے میں بولا جس نے سمندر خان کو صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا۔

''مردوں کے معاشرے میں کسی عورت کے موقف کی بھلا کیا حیثیت؟'' زرگل کے بے باک اور دلیرانہ لہجے نے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔

''میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے بہادر خان کے ساتھ بھاگ کر قبیلے کے قانون کو توڑا ہے اور میرا یہ اقدام غلط بھی ہے۔ میں بہادر خان کی باتوں میں آ گئی تھی کیونکہ میں نے جرم کیا ہے اس لیے مجھے یہاں کے قانون کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

مطابق جو بھی سزا سنائی جائے گی میں اسے قبول کروں گی مگر قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ قانون میں سزا کا تعین کرتے وقت عورت اور مرد کی تفریق نہیں کی جاتی۔ مجھے جرگے کی جانب سے دی جانے والی ہر سزا قبول ہے مگر اس سزا کا اطلاق بہادر خان پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے پاگل نظر آتا ہے؟"

"اس کے پاگل پن کی اتنے افراد نے گواہی دی ہے۔ ہم ان کی گواہی کیوں تسلیم نہ کریں؟" اس شخص نے زرگل سے کہا۔ اس کا لہجہ بدستور درشت تھا۔ شاید وہ عورتوں سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا۔

"چونکہ ان سب گواہان کا حقہ پانی سردار شیر خان سے وابستہ ہے۔ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ کیسے ہوسکتی ہے؟" زرگل پُراعتماد لہجے میں بولی۔

فوری طور پر جرگے کے اس فرد سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر اسی لمحے جرگے کا ایک اور فرد اس کی مدد کو آگے بڑھا اور بولا۔ "اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ان کی گواہی غیر جانبدارانہ نہیں ہے تو پھر بھی بہادر خان کی گواہی تمہاری گواہی سے زیادہ وزن رکھتی ہے کیونکہ مرد عورت سے افضل پیدا کیا گیا ہے۔ کسی کمتر عورت کی گواہی کو کسی افضل مرد کی گواہی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔"

"وہ افضل مرد اسی کمتر عورت کے بطن سے جنم لیتا ہے۔" زرگل نے زہرخند لہجے میں جواب دیا۔ زرگل کی بات وہاں موجود تمام افراد کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے بڑی بیباکی سے وہاں موجود افراد کی انا پر براہِ راست حملہ کیا تھا۔

مجمعے کے اندر سے غصے اور قہر میں ڈوبی دبی دبی آوازیں ابھرنے لگیں۔ سمندر خان کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آئندہ اس کے ہاں کسی بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ اسے اسی وقت زمین میں دفن کردے گا۔ اسے اب بس فیصلے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد تو شاید وہ زرگل کو مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتا۔

"خاموش۔" اسی لمحے سردار شیر خان کی تحکمانہ آواز ابھری تو مجمعے میں ابھرنے والی بھنبھناہٹ تھم گئی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی اکسانے اور بھڑکانے میں خاصی مہارت رکھتی ہے۔" قدرے توقف کے بعد شیر خان بولا۔ "جب اس کی باتوں سے یہ سارا مجمع بھڑک سکتا ہے تو پھر میرے معصوم اور بھولے بھالے بیٹے کی بھلا کیا حیثیت ہے۔ میرے خیال میں اب حقیقت سب پر واضح ہوچکی ہے، اب اپنا فیصلہ سنا دینا چاہیے۔"

سردار کی بات سن کر تمام افراد مدھم آواز میں آپس میں صلح مشورہ کرنے لگے۔

زرگل اب بھی سردار کے آدمیوں کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے سامنے کھڑے بہادر خان کو گھور رہی تھی جو مسلسل اس سے نظریں ملانے سے گریزاں تھا۔ بہادر خان کو رات اس کے باپ شیر خان نے سختی سے یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ اسے جرگے میں کیا کہنا ہے۔ باقی معاملات وہ خود سنبھال لے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ بہادر خان زرگل کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی تھا۔ اس نے شیر خان کو اس رشتے پر راضی کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر شیر خان مسلسل انکاری تھا۔ وہ بہادر خان کے سلسلے میں اپنے کسی عزیز کو زبان دے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زرگل کو لے کر اس جگہ سے فرار ہوا تھا۔ وہ زرگل کے ساتھ ایک نئی دنیا بسانا چاہتا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور گھوڑا زخمی ہونے کی وجہ سے وہ پکڑا گیا۔

پکڑے جانے کے بعد اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہوچکا تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کے حکم پر عمل نہ کیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے موت سے نہیں بچاسکے گی۔ بہادر خان بھی دل ہی دل میں خوفزدہ ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے اس جرگے کے سامنے گواہی دیتے ہوئے باپ کے حکم پر عمل کرڈالا تھا اور پھر اس کے باپ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ زرگل جیسی سیکڑوں لڑکیاں دوبارہ مل جائیں گی۔

اسی لمحے جرگے کے افراد کی آپس میں گفت و شنید ختم ہوگئی۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک باریش شخص کھڑا ہوا اور اس نے باقاعدہ اعلان شروع کردیا۔

"ہم سب ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تمام فریقین کو اپنا اپنا موقف پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔ ہم نے زرگل اور بہادر خان کی باتیں بھی سنی ہیں۔ اگر زرگل کی یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ بہادر خان کے پاگل پن کی گواہی دینے والے افراد سردار شیر خان کے زیرِ اثر ہیں تو پھر بھی ہم یہی فیصلہ کرتے۔

"بہادر خان کا کہنا ہے کہ زرگل نے اسے گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا اور کیونکہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ زرگل کی باتوں میں آکر بہک گیا تھا جبکہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

زرگل کا کہنا ہے کہ اسے بہادر خان نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا، دونوں طرف سے لگایا گیا الزام انصاف کے تقاضوں کے مطابق برابر ٹھہرتا ہے مگر کیونکہ عورت کی گواہی آدھی تسلیم کی جاتی ہے اس لیے بہادر خان کو مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی جاتی ہے اور ہم اس کے موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔

''کیونکہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے اس لیے اس پر ہمارے قبیلے کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ غیرت کے نام پر سزا صرف باہوش شخص کو ہی دی جاسکتی ہے تاہم ان سب باتوں کے باوجود بہادر خان کو بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس سے بہرحال گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس لیے اسے پچاس دنبوں کی قربانی کرنا ہوگی تاکہ اس کے گناہ کا کفارہ ادا ہوجائے۔

''بہادر خان کے برعکس زرگل ایک باہوش وحواس اور عقلمند لڑکی ہے، اس نے گھر سے فرار ہوکر بے حیائی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی اس لیے ہم زرگل کے لیے سزائے موت تجویز کرتے ہیں اور دستور کے مطابق اس سزا پر عملدرآمد اس کا باپ سمندر خان کرے گا۔''

''مجھے فیصلہ منظور ہے۔'' شیر خان مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ کیا فیصلہ ہے بے ضمیرو!'' زرگل خود کو سردار کے آدمیوں سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ سردار کے بیٹے کے خلاف فیصلہ کرنے کی تم لوگوں میں جرأت ہی نہیں۔''

''سب لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اسی لمحے سمندر خان اپنی کلاشنکوف سیدھی کرتے ہوئے دوبارہ کھڑا ہوگیا تو وہ دونوں آدمی زرگل کو چھوڑ کر پیچھے ہٹتے چلے گئے جنہوں نے سردار کے حکم پر اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اطراف سے دوسرے افراد بھی اس خطرے کے پیش نظر پیچھے ہٹ گئے کہ کہیں ناگہانی طور پر سمندر خان کی گولیوں کی زد میں نہ آجائیں۔ سب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سمندر خان اب زرگل پر گولیاں برسانے ہی والا ہے۔ زرگل اپنی جگہ تن کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''ٹھہرو سمندر خان۔'' اسی لمحے ایک فرد نے اسے گولی چلانے سے روک دیا۔ ''ہمارے دستور کے مطابق مرنے والے سے اس کی آخری خواہش ضرور پوچھی جاتی ہے۔'' اس شخص نے کہا اور پھر وہ زرگل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''زرگل، اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ۔ تمہاری ہر جائز خواہش پوری کی جائے گی۔''

اس کا سوال سن کر زرگل ہذیانی انداز میں ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ''ہاں میری ایک آخری خواہش ہے اور یہ بالکل جائز خواہش ہے مگر آپ لوگوں کے لیے اسے پورا کرنا شاید ممکن نہ ہو۔''

''تم اپنی خواہش بیان تو کرو یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ تمہاری خواہش پوری کی جاسکتی ہے یا نہیں۔'' اس شخص نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میرا پیاس کی شدت سے حلق سوکھ گیا ہے میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید پانی مانگتی مگر میں تم لوگوں سے اپنی پیاس بجھانے کی درخواست نہیں کروں گی۔ میری آخری خواہش بس اتنی سی ہے کہ بہادر خان کا نام تبدیل کرکے بزدل خان رکھ دیا جائے کیونکہ اگر کوئی گیدڑ کا نام شیر بھی رکھ دے تو وہ سچ مچ شیر نہیں بن جاتا۔ اس نے مجھ سے محبت کے بڑے بلند وبانگ دعوے کیے تھے یہ کہتا تھا کہ یہ پہاڑوں کا سینہ چیرنے کی ہمت رکھتا ہے۔

''اسے خود پر بڑا ناز تھا مگر اب مجھ پر اس کی حقیقت منکشف ہوچکی ہے۔ یہ تو ایک چوہے سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔'' زرگل کے الفاظ بہت توہین آمیز تھے۔ بہادر خان کا چہرہ تمتما اٹھا مگر وہ پھر بھی خاموش ہی رہا کیونکہ اسے زندگی عزیز تھی۔

''سمندر خان جرگے کے فیصلے پر عملدرآمد کرو۔'' اسی لمحے شیر خان نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ شاید اس سے اپنے بیٹے کی توہین برداشت نہیں ہوئی۔

''ہٹ جاؤ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہوگیا ہے۔'' سمندر خان اونچی آواز میں بولا اور پھر اس کی انگلی ٹریگر پر سخت ہوتی چلی گئی۔

''زرگل کو پانی تو پلادو ...'' ایک فرد اونچی آواز میں بولا۔ ''جان لینے سے پہلے تو جانور کو بھی پانی پلایا جاتا ہے۔'' مگر اس کی بات سمندر خان نے نظر انداز کرتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی سمندر خان کی کلاشنکوف سے نکلا ہوا برسٹ زرگل کا سینہ چھلنی کرگیا اور وہ ایک دھماکے سے زمین پر جاگری۔ اس کا جسم کچھ دیر کے لیے تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں اب بے نور ہوچکی تھیں مگر ان بے نور آنکھوں میں گویا بہت سے سوالات ثبت ہوگئے تھے بہت سی حسرتیں جھلک رہی تھیں۔

''شاباش سمندر خان شاباش۔'' سردار شیر خان نے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آگے بڑھ کر سمندر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنی بیٹی کو مار کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک غیرت مند شخص ہو۔ زرگل کو مارتے وقت نہ تمہارے ہاتھ کانپے نہ تم ہچکچائے۔ میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی اپنی پگڑی بھی۔“ یہ کہتے ہوئے شیر خان نے اپنی پگڑی اتار کر سمندر خان کے سر پر رکھ دی۔

سردار کا کسی کو اپنی پگڑی پیش کرنا اس کی بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ سمندر خان نے اپنی کلاشنکوف کندھے سے لٹکالی اور پھر بڑے فخریہ انداز میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

”زرگل کی لاش کو لے جاؤ اور وادی کی سب سے گہری کھائی میں پھینک دو۔ اسے وادی کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں مدفون ہیں۔ اس بدکردار لڑکی کا مردہ جسم اس قابل ہے کہ اسے سانپ بچھو کھا جائیں۔“ سردار شیر خان نے رعونت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر زرگل کی لاش کو اٹھایا اور پھر ڈیرے کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

”میں آپ تمام افراد کو بھی ایک منصفانہ فیصلہ کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“ سردار نے تمام افراد کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو انصاف کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ آپ کے فیصلے کے مطابق بہادر خان کی طرف سے کل ہی پچاس دنبوں کی قربانی دے دی جائے گی تاکہ سب کو یقین آ جائے کہ یہاں کا قانون سب کے لیے برابر ہے اور قانون کا اطلاق سردار کے بیٹے پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کسی عام آدمی پر۔ ساتھ ہی ساتھ میں نشست ختم کرنے کا بھی اعلان کرتا ہوں۔“ شیر خان نے کہا تو نشست میں شامل اور دیگر افراد سردار اور سمندر خان سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈیرے سے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔

بہادر خان سب سے الگ تھلگ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں زرگل کے کہے ہوئے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے کہ گیدڑ کا نام شیر رکھ دیا جائے تو وہ سچ مچ شیر نہیں بن جاتا۔ بہادر خان کو اپنے پورے وجود پر ایک نامعلوم سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور شاید یہ بوجھ اب اسے عمر بھر اٹھانا تھا۔

”اچھا سردار اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔“ سمندر خان نے بھی جانے کی اجازت طلب کی۔

”ٹھیک ہے مگر تمہاری عزت افزائی کے لیے میرے آدمی تمہیں گھر تک چھوڑنے ساتھ جائیں گے حشمت خان!“ یہ کہتے ہوئے سردار شیر خان نے اپنے ایک آدمی کو آواز دی تو ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص سامنے آ گیا۔

سمندر خان بھی حشمت خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سردار کا بہت قریبی اور اہم آدمی تھا۔ یہ بات پورے قبیلے میں مشہور تھی کہ سردار اپنے تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ اعتماد حشمت خان پر ہی کرتا ہے۔

”حشمت خان! دو مسلح آدمی ساتھ لے لو اور سمندر خان کو عزت کے ساتھ اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے حشمت خان کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ بھی دیا۔

”جی بہتر خان صاحب۔“ حشمت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سمندر خان سردار کے آدمیوں کے ہمراہ ڈیرے سے باہر آ گیا۔ جب وہ ڈیرے میں داخل ہوا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی مگر اب وہ گردن اکڑا کر بڑی شان اور تمکنت سے چل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب چلتے چلتے سمندر خان کے کچے مکان کے پاس پہنچ گئے۔

”تم دونوں یہیں ٹھہرو مجھے سمندر خان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ حشمت خان نے کہا تو ان کے پیچھے چلنے والے دونوں مسلح افراد وہیں رک گئے۔

”تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”میں تمہیں سردار کا ایک پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کی ایما پر تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ میرے خیال میں بیٹھ کر بات ہو جائے تو بہتر ہے۔“ حشمت خان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلتے چلتے اب سمندر خان کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عین اسی وقت گھر کے اندر سے سمندر خان کی بیوی جنت گل برآمد ہوئی۔ سمندر خان کی چھوٹی بیٹی فرشتہ گل بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جنت گل نے بغور سمندر خان کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کی پگڑی کی جانب دیکھا اور ساری صورتِ حال اسے سمجھ میں آ گئی۔ اسے سمندر خان کے تمتماتے چہرے اور سر پر موجود خوب صورت پگڑی سے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی بیٹی زرگل اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز اس نے بھی سنی تھی تو گویا اس وقت ایک باپ اپنی ہی اولاد کا خون بہا رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک سیلابی ریلا تھا جو یکلخت جنت گل کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اس نے برستی آنکھوں کے ساتھ ایک حسرت بھری نگاہ آسمان پر ڈالی اور فرشتہ گل کا ہاتھ تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

''آؤ حشمت خان! ایک طرف بیٹھتے ہیں۔'' سمندر خان نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ہمراہ ایک طرف بچھی ہوئی ایک پرانی سی دری پر بیٹھ گیا۔ ''معاف کرنا حشمت خان اگرچہ تم میرے مہمان ہو مگر اس وقت میں تمہاری قہوے سے تواضع نہیں کرسکتا۔ تم نے میری بیوی کی حالت تو دیکھ ہی لی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' حشمت خان نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ ایک ماں ہے اپنی بیٹی کے لیے غمزدہ ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ بہرحال اس وقت ان باتوں کو چھوڑو، مجھے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔''

''ہاں تم نے کہا تھا کہ سردار نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہے۔'' سمندر خان نے استفسار کیا۔

''بات دراصل یہ ہے میرے دوست۔'' حشمت خان نے باقاعدہ تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ''سردار شیر خان بہت رحم دل انسان واقع ہوا ہے۔ اسے تمہاری غربت کا بڑا احساس اور دکھ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری یہ غربت دور ہوجائے۔ اگر یہ زرگل والا معاملہ درمیان میں نہ ٹپکتا تو میں پہلے ہی اس بارے میں تم سے بات کرچکا ہوتا۔ دراصل سردار نے تمہاری غربت دور کرنے کے لیے تمہیں ایک پیشکش کی ہے اس نے تمہاری چھوٹی بیٹی فرشتہ گل کے لیے رشتے کا پیغام بھیجا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔'' سمندر خان متعجب لہجے میں بولا۔ ''فرشتہ گل ابھی بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم بھی اور پھر سردار کا بیٹا بہادر خان پہلے زرگل کو بھگا کر لے گیا تھا۔ کیا اب اس سے فرشتہ گل کا رشتہ مناسب ہوگا؟''

''تم غلط سمجھے ہو۔'' حشمت خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''سردار شیر خان نے فرشتہ گل کا رشتہ بہادر خان کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے مانگا ہے۔ وہ خود تمہاری بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ فرشتہ گل کو دیکھا تھا اور اسی وقت اسے اپنی دلہن بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو حشمت خان۔'' سمندر خان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جانتے بھی ہو کہ فرشتہ گل ابھی صرف چودہ سال کی ہے اور شاید ذہنی طور پر اپنی عمر سے بھی کہیں چھوٹی جبکہ سردار شیر خان کی عمر پچاس برس سے بھی تجاوز کرچکی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' حشمت خان نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ کوئی انہونی بات ہے؟ کیا اس سے پہلے ہمارے قبیلے میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

''مگر سردار بہت بوڑھا ہوچکا ہے۔'' سمندر خان نے متذبذب لہجے میں کہا۔

''مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سردار کو اپنی دامادی میں قبول کرلینے سے قبیلے میں تمہاری کتنی عزت ہوگی۔''

''مگر لوگ باتیں بنائیں گے کہ سمندر خان بے حس ہوگیا ہے۔ پیسوں کے لالچ میں اپنی چودہ سالہ بیٹی کو ایک پچاس سالہ شخص سے بیاہ دیا ہے۔'' سمندر خان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''اس وقت اس بات کو چھوڑو، یہ دیکھو کہ بدلے میں مال کتنا مل رہا ہے۔ سردار رشتہ قبول کرلینے کی صورت میں تمہیں اپنی افیون کی فصل کے کل منافع میں سے بیس فیصد حصہ دے گا۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی بڑی زمین کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ نکاح کے وقت پانچ لاکھ نقد بھی دے گا۔'' حشمت خان نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی پیشکش کا سن کر سمندر خان انگشت بدنداں رہ گیا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بالکل......'' حشمت خان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سردار اپنا سر تو کٹوا سکتا ہے مگر اپنے قول سے نہیں پھر سکتا۔ ویسے بھی تم جانتے ہی ہو کہ سردار کو نہ سننے کی عادت نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر سمندر خان سوچ میں پڑ گیا۔ سردار کو انکار کرکے اس سے مخاصمت مول نہیں لی جاسکتی تھی اور پھر اس کی پیشکش بھی بہت بڑی تھی۔ سمندر خان کی تو قسمت ہی بدل جاتی۔ اگرچہ جنت گل اپنی بیٹی کے اس رشتے پر کبھی رضامند ہونے والی نہیں تھی مگر تھوڑا سا تشدد کرکے اس کی زبان بند کی جاسکتی تھی۔

حشمت خان ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا کہ یہ وقت زیادہ سوچ بچار کا نہیں تھا۔ سردار کی پیشکش قبول کرلینے میں عافیت بھی تھی اور فائدہ بھی۔ ''مجھے منظور ہے۔'' فیصلہ کرتے ہی سمندر خان بولا۔ ''مگر سردار کو کہہ دو کہ افیون کے منافع میں سے تو بیس فیصد ٹھیک ہے مگر نقد میں پانچ نہیں پورے دس لاکھ لوں گا...... پورے دس لاکھ۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انتقام

انجم فاروق ساحلی

یہ بات تو طے ہے کہ مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کبھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے... انہیں بھی اپنے زورِ بازو پر بڑا ناز تھا... لیکن وہ پھر بھی عقل والوں سے مقابلہ نہ کرسکے... کیونکہ عقل کا پھندا ان کے گلے میں اٹک گیا تھا جہاں بازو زور لگانے کے باوجود رہائی نہ پاسکے۔

جوش میں ہوش کھودینے والے
مجرموں کا عبرتناک انجام

دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجانے سے پہلے میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ سو ڈالر میں، میں نے بالوں کی نئی وگ خریدی تھی اور جھکے ہوئے شانوں کو سیدھا کرنے کے لیے خصوصی سوٹ پر بھی میرے ساڑھے انتالیس ڈالر خرچ ہوئے تھے اور یہ دونوں ہی چیزیں کافی قیمتی تھیں۔ ایک پستہ قد بوڑھے نے دروازہ کھولا۔

''فرمایئے۔'' اس نے انتہائی پُراسرار لہجے میں سوال کیا۔

''مجھے مسٹر اپروز سے ملنا تھا۔'' میں نے مدعا بیان

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کیا۔ ''جناب! مجھے تھامس کہتے ہیں۔ چند منٹ پیشتر میں نے پیٹرول پمپ لیز پر لینے کے لیے بات کی تھی۔''

''اوہو...... تو مسٹر تھامس آپ ہیں؟ آیئے اندر تشریف لے آیئے۔'' مکان اندر سے انتہائی شاندار تھا۔ قیمتی فرنیچر اور دیگر قسم کی آرائشی اشیا بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ایک تنہا شخص کے لیے یہ مکان ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ ''کیا آپ کو پیٹرول پمپ چلانے کا سابقہ تجربہ بھی ہے؟''

''جی ہاں اس سے پہلے میں کئی پیٹرول پمپوں پر کام کر چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ سازوسامان کے اڑھائی سو ڈالرز ادا کر سکتے ہیں تو کل صبح سے ہی پمپ کھول لیں۔''

''جناب! جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ کیا آپ نے میرے بینک سے قرض کی بات کی تھی؟''

''یقیناً میں بینک گیا تھا۔'' اس نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ میرے سوال پر چونک گیا ہو۔ ''میں نے ان تمام لوگوں کے اکاؤنٹ چیک کیے جن سے میرا کاروبار ہے۔ میرے بیس پیٹرول پمپ ہیں اور میں نے ان سب کے لیے سازوسامان کے ڈھائی سو ڈالرز وصول کیے ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے مسٹر اپروز میں نے آپ کا وقت برباد کیا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ ٹھہریے۔ شاید میں اس پمپ کے لیے کچھ رعایت دے سکوں۔''

''صرف اس پمپ کے لیے کیوں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس کا سازوسامان پرانا ہو چکا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پمپ بند پڑا رہے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کرنے کے انداز میں دیکھا اور میری نظر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پڑی انگوٹھی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔

''کیا آپ سازوسامان کے لیے ایک معاہدے پر دستخط کر دیں گے؟''

''یقیناً۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ سامنے پڑی ہوئی ایک ڈیسک کی طرف پلٹا اور پھر معاہدے کے فارموں کا ایک پیڈ اٹھا لایا۔ اس نے معاہدے کے چند فارم نکال کر ڈرائنگ روم کی میز پر پھیلا دیے اور انہیں پُر کرنے لگا۔

''ہم معاہدے اور لیز کے سمجھوتے کی دو دو کاپیوں پر دستخط کریں گے اور ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھیں گے۔''

میں نے سمجھوتے کا مسودہ پڑھا...... ایک گیلن پر تین سینٹ۔

''ایک گیلن پر تین سینٹ کیا کرائے کے اعتبار سے زیادہ نہیں؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''مسٹر تھامس! یہ بھی تو سوچیے کہ آپ سے کسی قسم کی رقم لیے بغیر صرف آپ کی زبان پر اعتبار کرتے ہوئے میں پیٹرول پمپ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس بنیاد پر کیا میں کچھ زیادہ منافع لینے کا حق دار نہیں ہوں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے مسٹر اپروز، میں معاہدے پر دستخط کر دوں گا اور کل صبح ہی پیٹرول پمپ کھول لوں گا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' یہ کہتے ہوئے مسٹر اپروز کے چہرے پر اطمینان کا تاثر نمودار ہوا۔ انہوں نے پیٹرول پمپ کی چابیاں اور وہاں کی ساری اشیا کی فہرست تھما کر مجھ سے اشیا کی فہرست پر دستخط لے لیے۔

''مسٹر اپروز! میں اس شخص سے کہاں مل سکتا ہوں جو اس سے قبل پیٹرول پمپ چلاتا رہا ہے۔'' میں نے دروازے سے نکلتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' وہ کچھ مضطرب نظر آنے لگا۔

''میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اس سے نہیں مل سکیں گے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہوگا۔''

''لیکن اس نے پیٹرول پمپ بند کیوں کر دیا؟'' میں نے اصرار کیا۔

''میرے خیال میں وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا...... خدا حافظ۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

دوسرے دن سورج طلوع ہونے سے قبل ہی میں ایک ٹیکسی میں پیٹرول پمپ جا پہنچا۔ بتیاں جلائیں۔ تیل اور ٹائروں کی الماریاں ٹھیک کیں اور سامنے بچھی ہوئی برف صاف کی۔ چند منٹ بعد ہی میرا پہلا گاہک اندر داخل ہوا۔ ایک اچھے سیلز مین کی طرح میں اپنے گاہکوں سے بہت ہی دوستانہ قسم کا رویہ رکھتا تھا اور انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاہک مجھے بہت پسند کرتے تھے لیکن مسٹر اپروز کو میری تاجرانہ صلاحیتوں پر شک تھا کیونکہ میں نے پیٹرول فی لیٹر کا نرخ، دو سینٹ فی گیلن زیادہ رکھا تھا نیز ٹائر ٹیوب اور دوسرا سامان انتہائی کم قیمت پر فروخت کرتا تھا۔

پہلے ہفتے کے آخر تک میں نے پیٹرول بہت ہی کم فروخت کیا تھا لیکن دوسری اشیا کی فروخت بہت بڑھ چکی تھی۔ سپلائر نہ صرف مجھے زیادہ سے زیادہ سامان دینے کو تیار تھے بلکہ ایک ہفتے کے ادھار پر مال دے رہے تھے۔ پیٹرول کے پلانٹ سے مجھے ادھار نہیں مل سکتا تھا اور مجھے پیٹرول کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوسرے ہفتے کے پہلے دن میں رات کو پمپ بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک لمبی سیاہ بیوک کار پمپ کی حدود میں داخل ہوئی اور دروازے کے قریب رک گئی۔ دو لمبے تڑنگے آدمی کار سے اترے اور آفس میں داخل ہوگئے۔

”کہیے کیسے ہیں؟“ ان میں سے ایک نے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

”فرمائیے جناب۔“ میں نے اٹک اٹک کر کہا اور انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میں اور میرا ساتھی تاجروں کو تحفظ دینے کا کام کرتے ہیں۔ معمولی سی ہفتہ وارا اجرت پر ہم آپ کے پمپ کو آتشزدگی، کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے اور دوسرے نقصانات سے تحفظ فراہم کریں گے اور آپ کو بھی ٹھگوں اور غنڈوں سے محفوظ رکھیں گے۔“

”جی مجھے ابھی ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔“ میں نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔ اس شخص نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ دوسرا آدمی کار سے اتر کر اندر آیا اور گھوم کر ایک پتھر پمپ کے بڑے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ چھناکے سے ٹوٹ کر زمین پر آرہا۔

”میرا مطلب سمجھ گئے۔“ اجنبی نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ اجنبی اچانک پلٹا۔ اس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے دھکا دے کر ڈیسک کی دوسری طرف لے آیا۔

”تم حادثے کا شکار ہوسکتے ہو۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں ادائیگی کردوں گا۔“

سنہری باتیں

☆ہاتھوں کی خوبصورتی کے لیے ہاتھوں سے صدقہ کریں۔

☆آواز کی خوبصورتی کے لیے تلاوتِ قرآن کریں۔

☆آنکھ کی خوبصورتی کے لیے اللہ کے خوف سے آنسو نکالیں۔

☆چہرے کی خوبصورتی کے لیے طہارت کے ساتھ وضو کریں۔

☆دل کی خوبصورتی کے لیے اللہ کا ذکر کریں۔

☆دماغ کی طاقت کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کریں۔

اللہ کو پسند ہے

o......وہ دل جس میں مخلوق کا درد ہو۔

o......وہ جگہ جہاں اللہ کا ذکر ہو۔

o......وہ آنکھیں جس میں حیا ہو۔

o......وہ شخص جو وعدہ وفا کرتا ہو۔

o......وہ آنسو جو خوفِ خدا سے گرے۔

o......وہ خدمت جو بغیر مطلب کے ہو۔

کترنیں

☆زندگی میں چھوٹا بن کر رہو گے تو اللہ پاک بڑی نعمتیں دیں گے۔

☆بڑا ہونے پر تو ماں بھی گود سے اتار دیتی ہے۔

☆تمام تعریفیں اس اللہ رب العزت کے لیے جو اتنا کریم اور مہربان ہے کہ ہماری عبادت اور تقویٰ کو تو ہمارے چہروں سے ظاہر کردیتا ہے مگر ہمارے گناہ ساری دنیا سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

مرسلہ: راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیو کراچی

دوست

میں اچھے دوست کو اچھے وقت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں کیونکہ اچھا دوست اچھا وقت دے سکتا ہے مگر اچھا وقت اچھا دوست نہیں پیدا کرسکتا۔ (شیخ سعدی رحمتہ اللہ)

مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"یقیناً تم ایسا ہی کرو گے۔" اس کے بعد اس نے میری پیٹھ اور چہرے پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ روکا اور مجھے کرسی پر دھکیل دیا۔

"میں اگلے جمعے کی رات کو پہلی قسط لینے آؤں گا۔ دو سو ڈالرز تیار رکھنا۔" اس نے میرا سر پیچھے کی طرف جھکایا اور چہرہ قریب لا کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"یاد رکھنا تمہیں دو سو ڈالرز تیار رکھنا ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی ہوگا۔"

دوسرے دن میں نے پیٹرول پمپ سے مسٹر اپروز کو فون کیا۔

"مسٹر اپروز! کل کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے۔" میں نے اسے بتایا۔

"اوہ۔" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"دو افراد جو خود کو تاجروں کی حفاظتی سروس کا آدمی ظاہر کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور دو سو ڈالرز فی ہفتہ طلب کر رہے ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹے۔ یہ دنیا بڑی ظالم شے ہے۔"

"آپ ان کے بارے میں جانتے تھے مسٹر اپروز؟"

"ہو سکتا ہے کہ میں انہیں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے!"

"اس شخص کا کیا بنا جس نے مجھ سے پہلے پیٹرول پمپ لیز پر لیا تھا؟"

"بیٹے! غالباً اس نے ادائیگی نہیں کی تھی۔ دو ہفتے قبل دریا سے اس کی لاش ملی ہے۔"

"مسٹر اپروز! اس کے بعد آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں پیٹرول پمپ چلاؤں گا۔"

"کیا کہا...... میرے خیال میں تم ایک اچھے لڑکے ہو۔" اپروز نے جواب دیا۔

"لیکن میں آپ کو تین سینٹ فی گیلن اور ان بدمعاشوں کو دو سو ڈالرز فی ہفتہ ادا نہیں کر سکتا۔"

"یاد رکھو! تم نے لیز اور ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔" اس نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ "اگر تم نے پمپ بند کیا تو میں تم پر مقدمہ کر دوں گا۔"

☆☆☆

اگلے جمعے کی رات کو میں نے حساب کتاب کیا تو میرے پاس تقریباً پانچ ہزار ڈالرز کی رقم موجود تھی۔ پیٹرول کے ٹینک خالی ہو چکے تھے۔ ٹائر، بیٹری اور دوسرا سامان بھی تقریباً بک چکا تھا۔ سپلائر نیا سامان دے کر واجبات وصول کر چکے تھے۔ جیسے ہی میں نے باہر کی بڑی لائٹس آف کیں، سیاہ بیوک دروازے کے پاس آ کر رکی۔ طویل قامت دیونما آدمی گاڑی سے نیچے اترا اور ایک بریف کیس لیتے ہوئے آفس میں داخل ہوا۔ اس کا ساتھی اس کی پشت پر ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ طویل قامت آدمی نے بریف کیس میری میز پر رکھ دیا اور ہاتھوں پر دستانے چڑھانے لگا۔

"دو سو ڈالرز۔" اس نے سرگوشی میں مطالبہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رقم تیار ہے۔" میں نے میز کی دراز کھولی اور سائیلنسر لگا ہوا ریوالور نکال لیا پھر سوچنے کا موقع دیے بغیر ہی دونوں کی آنکھوں کو نشانہ بنا ڈالا۔

گولیاں لگتے ہی وہ فرش پر گر پڑے۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور انتہائی احتیاط سے ان کے بریف کیس کا معائنہ کیا۔ میری توقع کے مطابق یہ لوگ میری دکان پر آنے سے پہلے اور بھی کئی جگہوں سے بھتا وصول کر کے لائے تھے۔ بریف کیس میں غنڈا ٹیکس کی مد میں وصول کیے ہوئے سات ہزار ڈالرز موجود تھے۔ میں نے پیٹرول پمپ پر کمائی ہوئی رقم بھی اس میں شامل کی اور بریف کیس کو آہستگی سے بند کر دیا۔

میں نے وگ اتار دی اور جھکے ہوئے شانے صحیح کرنے کے لیے لگائے جانے والے پیڈ بھی قمیص کے نیچے سے نکال لیے۔ یہ دونوں چیزیں میں نے احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھ لیں اور تھوڑی دیر بعد سوٹ کیس اور رقم سے بھرا ہوا بریف کیس لیے بڑی شان سے لمبی سیاہ بیوک میں بیٹھ گیا۔

اصلی لیو تھامس کا نام میں نے ڈائریکٹری سے حاصل کیا تھا۔ پولیس جب اسے گرفتار کرے گی تو وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جائے گا اور اس سے زیادہ حیرت مسٹر اپروز کو اس وقت ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ لیو تھامس اس شخص سے قطعی مختلف ہے جسے اس نے پیٹرول پمپ لیز پر دیا تھا۔

شاید میرا یہ کام قرین انصاف نہ معلوم ہو لیکن وہ شخص میرا حقیقی بھائی اور دو معصوم بچوں کا باپ تھا جسے ان لوگوں نے دریا میں ڈبو کر ہلاک کر دیا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تیسرا حصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

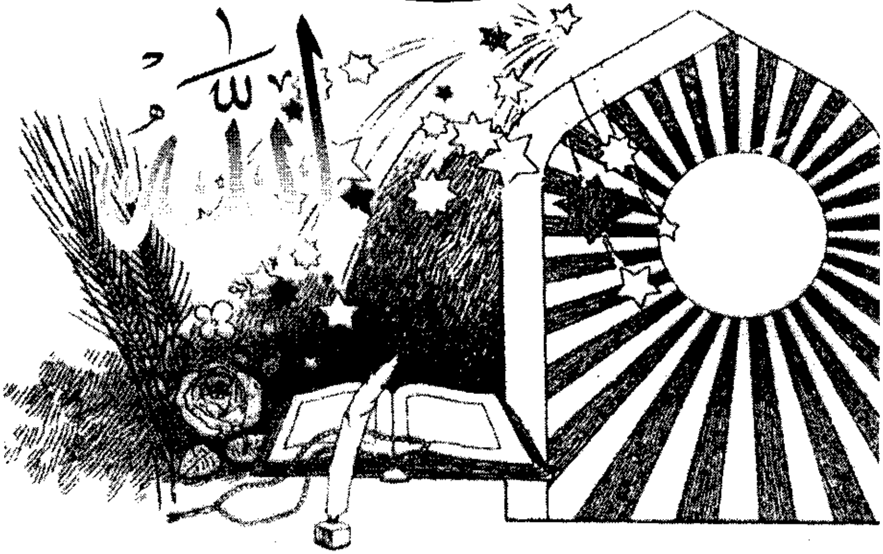

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا۔

”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔" (طٰہٰ)

دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ وہ فرعون کے محل میں جائیں گے اور اسے دعوتِ حق دیں گے لیکن پھر کچھ سوچ کر حضرت ہارون نے یہ تجویز دی کہ پہلے بنی اسرائیل کے بزرگوں کو جمع کر کے انہیں اپنی حالت سے آگاہ کیا جائے تاکہ فرعون کے مقابلے میں وہ ان کے حمایتی بن جائیں۔

صبح ہوئی تو انہوں نے قبیلے کے بزرگوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور جو کچھ ان پر گزرا تھا، وہ سب کہہ سنایا۔ ان بزرگوں نے یہ سن کر کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر لی اور ان کے دکھوں پر نظر کی' انہوں نے اپنا سر جھکا کر سجدہ کیا اور یوکابد کو مبارک باد دی کہ خدا نے ان کے بیٹوں کو بنی اسرائیل کا نجات دہندہ بنایا ہے۔

ان کی والدہ نے جب یہ سنا کہ وہ فرعون کے دربار میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بربنائے شفقت انہیں روکنے لگیں۔

"تم ایک ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحب تاج و تخت بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی۔ وہ تمہارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے۔ تم عام مصریوں تک جا کر اپنا پیغام کیوں نہیں پہنچاتے۔"

"اماں جان! آپ گھبراتی کیوں ہیں۔ ہمیں کہا گیا ہے کہ ہم فرعون کے پاس جائیں۔ خدا کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا۔ اس نے ہمیں یہ نوید بھی سنائی ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ عام مصریوں کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب فرعون کے غلام ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ بھی ہماری بات نہیں سنیں گے۔ ہاں اگر ہم نے فرعون کو قائل کرلیا تو سب ہمارے قائل ہوجائیں گے اور پھر ہمیں بنی اسرائیل کو نکال لے جانے کے لیے فرعون ہی کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔"

"میں تو اس لیے ڈرتی ہوں کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"

"کیا آپ کو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں؟"

"مجھے تو اس پر بھی یقین ہے اور اس کے رسول موسیٰ پر بھی۔ مجھے یہ بھی فخر ہے کہ میں اس کی ماں ہوں۔"

"تو پھر ہمیں خوشی خوشی اجازت دیں اور ہمارے لیے دعائے خیر کریں۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرنے والا ہے اور میں اپنے اس فعل پر نادم ہوں کہ میں نے تمہیں روکنے کی کوشش کی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا معجزاتی عصا اٹھایا اور فرعون کے محل کی طرف چل دیے۔ حضرت ہارون ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ جس بازار سے بھی گزرے استہزائی قہقہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ایک جگہ رک کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں سے پوچھا۔

"تم لوگ ہمیں فرعون کے پاس جاتے ہوئے دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہو؟"

"اس لیے ہنس رہے ہیں کہ جب تم وہاں سے واپس آؤ گے یا لائے جاؤ گے تو تمہاری حالت ہمیں رونے پر مجبور کردے گی۔ ہمیں جتنا ہنسنا ہے ابھی ہنس لیں۔" انہوں نے کہا اور ایک ساتھ پھر کئی قہقہے بلند ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس عظیم مقصد کے لیے روانہ ہوئے تھے ان نادانوں سے الجھ کر اس مقصد سے غافل نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور فرعون کے محل کے سامنے جا کر رک گئے۔

حضرت موسیٰ کے لیے نہ یہ محل نیا تھا نہ اس محل کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ پہرے دار انہیں اچھی طرح جانتے تھے لیکن اس وقت ان کے چہرے پر جو جلال تھا، وہ اس سے لرزہ براندام تھے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے یہ خبر بھی پہرے داروں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ فرعون سے دو دو ہاتھ کرنے آرہے ہیں۔ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت بھی تھی اور فرعون سے ڈرتے بھی تھے۔ انہوں نے بھی وہی مشورہ دیا جو ابتدا میں ان کی والدہ دے چکی تھیں۔

"آپ کیوں فرعون سے جھگڑا مول لیتے ہیں۔ کیا آپ اس کی جلالت و عظمت سے واقف نہیں؟"

انہوں نے وہی جواب پہرے داروں کو بھی دیا جو وہ والدہ کو دے چکے تھے۔

"ہم اپنی رضا سے یہاں نہیں آئے۔ خدا کا حکم ہے اور ہم اسے ٹال نہیں سکتے اور تم فکر نہ کرو۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اس وقت تک پورے شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ بہت سے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لگے چلے آئے تھے۔ محل کے سامنے ایک بھیڑ سی جمع ہوگئی تھی۔ کوئی فرعون کی خدائی سے اس کے منہ پر انکار کرنے آیا تھا۔ کچھ لوگ حضرت موسیٰ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

علیہ السلام کی ہمت کو داد دے رہے تھے تو کچھ لوگ ان پر افسوس کر رہے تھے۔
کچھ دیر کی حیل و حجت کے بعد محل کا دروازہ ان پر کھول دیا گیا۔ غالباً فرعون یہ نہیں چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر دروازے بند کر کے یہ تاثر دیا جائے کہ فرعون ان سے مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ اتنی دیر میں اسے یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ اپنے مشیروں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔
حضرت موسیٰؑ بے خوف و خطر اندر داخل ہوئے اور اس کے تخت کے قریب پہنچ کر اس سے مخاطب ہوئے۔
''اے فرعون۔''
''تم دیوتاؤں کے دیوتا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟'' فرعون کے ایک مشیر نے انہیں ٹوکا۔ ''کیا تو نہیں جانتا کہ تو ''آمن راع'' کے مظہر کے سامنے کھڑا ہے۔''
''اس کا سبب تو میں بعد میں بتاؤں گا، اس وقت تو میں وہ وجہ بتاؤں گا جس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ میں تجھے بتانے آیا ہوں کہ مجھے خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے۔ اے فرعون! ہم تجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا پر یقین لا اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا۔ دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے۔''
''تو نے اپنے دل سے یہ دونوں باتیں خود گھڑی ہیں۔'' فرعون نے حقارت سے کہا۔
''مجھے یہ جرأت کیسے ہوسکتی ہے کہ خدا کا نام لے کر اپنی جانب سے کوئی بات کہوں۔ میری صداقت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مجھے خدا نے معجزات عطا کیے ہیں لہٰذا تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو جنہیں تو نے قیدی بنا کر رکھا ہے، چھٹکارا دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اس سرزمین میں لے جاؤں جہاں ذاتِ واحد کے سوا یہ کسی اور کی پرستش نہ کریں۔''
''ہامان!'' فرعون کی آواز گونجی۔ ''کیا یہ شخص بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد نہیں؟''
''میں نے تو اس کے بچپن ہی میں کہہ دیا تھا۔''
''کیا اس کی قوم ہماری غلام نہیں؟''
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
''یہ بھی غلام ہی ہے بلکہ خانہ زاد غلام۔''
خانہ زاد غلام کا سنتے ہی منفتاح (فرعون) کو کچھ یاد آ گیا۔ اب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔
''اے موسیٰ! کیا تو وہی نہیں ہے جس نے میرے گھر میں پرورش پائی؟ بچپن کی زندگی یہیں گزاری اور کیا تجھے وہ وقت بھی یاد نہیں جب تو نے ایک مصری کو قتل کر دیا تھا اور کہیں بھاگ گیا تھا۔ تجھے نہ ان احسانات کا پاس ہے جو میرے گھرانے کے تجھ پر ہیں اور نہ یہ خوف کہ تو ایک مجرم ہے جسے میں کسی وقت بھی گرفتار کر سکتا ہوں۔''
''مجھے تیری کسی بات سے انکار نہیں۔ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی۔ یہی تو قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جو میرا بھی دشمن تھا اور میری قوم کا بھی، اس سے میری چاکری کرائی۔ اگر اسے میں احسان مان بھی لوں تو تیرا یہ احسان مجھ پر ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس کے صلے میں تو میری قوم کو اپنا غلام بنا لے۔ بنی اسرائیل جیسی عظیم قوم سے بیگار لے اور ان سے ذلیل کام کرائے۔ جہاں تک مصری کے قتل کا واقعہ ہے اس وقت میں بھٹکنے والوں میں سے تھا۔ یہ واقعہ اچانک ہوا تھا اور نزولِ وحی سے قبل ہوا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے نبوت دی اور مجھے رسولوں میں سے بنا لیا۔''
فرعون نے یہ چاہا تھا کہ اپنے احسانات یاد دلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جذبات کو ابھارا جائے لیکن ان کی دلیل سن کر لاجواب ہو گیا۔ اب وہ ایسی بات کرنا چاہتا تھا تاکہ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر فرعون کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔
''اے موسیٰ! میں نے بہت چاہا کہ تجھے وہ رعایت دوں جو خانہ زاد غلاموں کو دی جاتی ہے لیکن تو اس کا اہل نہیں۔ اب تُو سچ سچ بتا تجھے کس مصری دیوتا نے اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے جسے تو نبوت اور رسالت کا نام دے رہا ہے؟''
مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے اور ان سب سے بلند آمن راع تھا یعنی سورج۔
مصریوں کے اثر سے بہت سے بنی اسرائیل کے لوگ بھی ان دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ یہی جتانے کے لیے ان سے یہ سوال کر رہا تھا کہ مجھے سمجھانے چلے آئے ہو، بنی اسرائیل تو خود ان کی پرستش کرتے ہیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کی مزید وضاحت فرعون کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مشیر نے کی۔

''موسیٰ! تم ان دیوی دیوتاؤں سے واقف تو ہوگے۔تم نے مصر ہی میں پرورش پائی ہے۔ان کی پرستش بھی کرتے رہے ہوگے اور آج سورج دیوتا سے مخالفت پر کمربستہ ہو۔تم ضرور کسی شیطانی طاقت کے شکنجے میں آ گئے ہو۔''

''میں تمہارے بنائے ہوئے معبودوں کا قائل نہیں۔میں تو صرف ایک ہی ہستی کا قائل ہوں جو مارتی ہے، زندگی دیتی ہے۔وہ اکیلا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔وہی رب العالمین ہے۔''

''یہ تو نئی بات کیا سناتا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے کہ جس کو تو رب العالمین کہتا ہے۔اگر یہ صحیح ہے تو اس کی حقیقت بیان کر۔''

اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناظرے پر آمادہ ہوگیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔''اگر تجھ میں یقین اور ایمان صحیح کی گنجائش ہے تو تجھ کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو رب العالمین کہتا ہوں، وہ ذاتِ اقدس ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان، زمین اور ان دونوں کے درمیان کل مخلوقات کی ربوبیت ہے۔فرعون! کیا تو دعویٰ کرسکتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اسے تو نے پیدا کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر رب العالمین کی ربوبیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟''

اس دلیل کا جواب فرعون کو تو سوجھا نہیں، وہ اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے وزیروں کی مدد لینے پر مجبور ہوگیا۔

''تم سنتے ہو یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔میری ربوبیت سے انکار کرنے کے لیے کیسی کیسی عجیب باتیں کررہا ہے۔''

''آپ اس سے کہتے کیوں نہیں کہ مارنا اور زندہ کرنا تو آپ کے اختیار میں بھی ہے۔آپ ابھی کسی کے قتل کا حکم جاری کریں تو اسے قتل کردیا جائے۔جسے قتل کا حکم دیا جاچکا ہے اسے معاف کردیں اور حیات بخش دیں۔''

''میں نے معاف کرنے کا نہیں کہا۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ کسی کو قتل کرکے دوبارہ زندہ فرمادیں۔وہ مصری جو میرے ہاتھ سے قتل ہوگیا تھا اسی کو زندہ کردیں۔تم لوگ کیسے خوشامدی درباری ہو کہ جو اپنے آپ کو رب کہتا ہے اس سے اتنا سا امتحان بھی نہیں لے سکتے۔''

''تو اپنے رب سے کیوں نہیں کہتا کہ اس مصری کو زندہ کردے جو تیرے ہاتھوں سے قتل ہوا تھا۔''

''میرے رب کی خدائی ایک نظام کے ماتحت ہے۔ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔جب وقت آئے گا، وہ مصری زندہ کردیا جائے گا۔کیا تو اس پر بھی ایمان نہیں رکھتا کہ جو مرگیا وہ دوبارہ زندہ ہوگا اور اسے زندہ کرنے والا میرا رب ہوگا تو نہیں۔''

''اس طرح تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرا جب جی چاہے گا میں مصری کو زندہ کردوں گا۔''

''کیا تو ان اصولوں کے برخلاف کسی انسان کو پیدا کرسکتا ہے جو اصول خدا نے مقرر کیے ہیں۔کیا تو میرے خدا کے مقرر کردہ اصولوں کا کوئی متبادل نظام پیدا کرسکتا ہے؟ اگر نہیں تو رب العالمین کی ربوبیت سے انکار کیوں کرتا ہے؟''

''جب تیرا رب تمام مخلوقات کا خالق و مالک ہے اور اس مرتبے پر ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو پھر پہلے کے لوگوں نے اس کے غیروں کی پرستش کیوں کی؟ ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کو معبود کیوں بنایا؟ تو اس وقت ان کی رہبری کے لیے کیوں نہیں اتارا گیا؟''

''اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے اور یہ تیرے معبود بننے پر دلیل نہیں۔تجھ سے پہلے کے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔اس لیے کہ میرا پروردگار وہ ہے جس کی ربوبیت کے اثر سے تیرا اور تیرے باپ کا وجود بھی خالی نہیں۔تیرے آباؤاجداد کو بھی وہی وجود میں لایا تھا جو تجھے وجود میں لایا۔''

فرعون کے پاس ان دلیلوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔جب کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور ماننے کو بھی تیار نہ ہو تو پھر سیدھی راہ سے ہٹ کر اناپ شناپ باتیں کرنے لگتا ہے۔فرعون کے پاس بھی جواب ختم ہوگئے تھے۔اس نے اپنے مصاحبوں کو مخاطب کیا۔

''یہ شخص اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔اس کا دماغ چل گیا ہے۔میں پاگلوں سے کیا بحث کروں۔''

''فرعون! اس کا مطلب ہے تیرے پاس مجھے جھٹلانے کے لیے کوئی دلیل نہیں رہی۔ایک مرتبہ پھر سن لے کہ یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے، اس کی ربوبیت جس کے یدِ قدرت میں ہے اس کو میں رب کہتا ہوں یعنی رب العالمین۔اگر تم ذرا بھی عقل سے کام لو اور ضد چھوڑ دو تو بہ آسانی اس حقیقت کو پاسکتے ہو۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس کا ایک ہوشیار مصاحب رخ نسو اس بحث پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا اور بھانپ گیا تھا کہ فرعون لاجواب ہوتا جا رہا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آ گئے تو فرعون کی قوم پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ کسی طرح اس مناظرے کو روک دیا جائے اور پھر کوئی تدبیر سوچی جائے۔

رخ نسو نے ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کی کوشش کی اُس سے پہلے بھی وہ گفتگو میں دخل دے چکا تھا۔

''موسیٰ! اس محل میں تم کوئی نئے نہیں ہو۔ فرعون سے بھی واقف ہو اور اس کے مرتبے سے بھی۔ فرعون کی جو حیثیت اس کی قوم میں ہے اس سے بھی واقف ہو۔ مصری قوم اس کی عبادت کرتی ہے۔ تمہیں اگر اس بے باک گفتگو کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے تو اسے بھی اپنے لیے رعایت سمجھو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فرعون سے دشمنی مول لے کر اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دو۔ تمہیں اگر مال و دولت درکار ہے جس کے لیے تم نے یہ ڈھونگ رچایا ہے تو میں فرعون سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔''

''اس کے لیے مجھے تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں۔ اگر میرا منہ بند رکھنے کے لیے فرعون مجھے مال و دولت دینا چاہتا ہے تو خود اپنی زبان سے کہے۔''

رخ نسو کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اپنے دام میں خود پھنس گیا ہے۔ اگر موسیٰ کے سامنے مال و دولت کے ڈھیر لگائے گئے تو یہ خبر چھپی نہیں رہے گی۔ لوگوں میں فوراً باتیں بنیں گی کہ فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا جواب نہیں تھا۔

اس پیشکش کے جواب میں فرعون نے بھی اس کی طرف غصے سے دیکھا تھا۔

رخ نسو نے ایک قلابازی کھائی اور فرعون کے کان میں کہا۔

''اس گفتگو کو چند روز کے لیے موقوف کر دیا جائے۔ اس کے بعد کوئی تدبیر سوچی جائے۔''

فرعون کا ترکش بھی اب دلائل کے تیروں سے خالی ہو چکا تھا، وہ تو خود فرار کے مواقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے رخ نسو کو اشارہ کر دیا۔

رخ نسو نے کہنا شروع کیا۔ ''دیوتائی کے دیوتا تجھے ایک موقع اور دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت بہتر ہے اس گفتگو کو موقوف کر دیا جائے اور تو چند روز بعد حاضر ہو۔ اس عرصے میں تو بھی سوچ لے گا کہ تیری قوم کے مفاد میں کیا ہے اور میں بھی کوشش کروں گا کہ فرعون کے غصے میں کمی آ جائے ورنہ تو وہ تجھے قید میں ڈالنے کا ارادہ کر ہی چکا ہے۔''

''ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم تو خود یہ چاہتے ہیں کہ فرعون اس طرح ایمان نہ لائے جیسے کہ اس کے پیروکار خوف اور لالچ سے اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہم اسے سوچنے کا موقع دیتے ہیں تاکہ وہ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلے۔''

رخ نسو نے کچھ آدمیوں کو محل کے بڑے پھاٹک کے اردگرد پھیلا دیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جیسے ہی باہر آئیں، انہیں گرفتار کر لینا اور جب تک میرا حکم نہ آئے انہیں باتوں میں الجھائے رکھنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہوتے ہی مصاحبِ خاص نے فرعون کو مشورہ دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے احکام دے دیے جائیں۔

''تو جب بھی سوچے گا الٹا سوچے گا۔ بنی اسرائیل کو ایک راہنما مل گیا ہے۔ اگر اسے گرفتار کیا گیا تو اس کی پوری قوم اس کی رہائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی اور ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اس کا علاج تو یہ ہے کہ موسیٰ کو اس کی قوم کی نظروں میں گرا دو۔ اس کی قوم کو یہ احساس دلا دو کہ موسیٰ اپنی قوم کے کام نہیں آ سکتا بلکہ فرعون سے الجھنے کا نتیجہ قوم کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ موسیٰ کو اس وقت جانے دو لیکن یہ افواہ پھیلا دو کہ موسیٰ، فرعون کو قائل کرنے میں ناکام رہا۔ لاجواب ہو کر واپس چلا گیا اور کہہ گیا ہے کہ تیاری کر کے دوبارہ آئے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جب تک گھر پہنچے، مصری قوم میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ مناظرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست اٹھانی پڑی ہے۔ وہ فرعون کے سامنے ٹک نہیں سکے اور فرار ہو گئے۔

یہ خبر حضرت موسیٰ کو اس وقت معلوم ہوئی جب ان کی بہن حضرت مریم کے شوہر گھر تشریف لائے اور انہوں نے بازاروں میں ہونے والی گفتگو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حقیقت سے آگاہ کیا لیکن وہ پورے شہر کو سمجھانے نہیں جا سکتے تھے۔ انہوں نے معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔

وہ فرعون کی مکاری کو سمجھ گئے تھے کہ انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن یہ خوش آئند بات بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فرعون کے پاس دلائل ختم ہو گئے ہیں اور وہ قائل ہونے لگا ہے۔ یہ اس کی ضد ہے جو اسے آخری حربے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔

ابھی یہ مشکل ایک دن گزرا تھا کہ بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام باہر نکلے تو یہ لوگ بہت مشتعل تھے۔

''اے موسیٰ! تم کیا آئے ہماری مشکلیں تو اور بڑھ گئیں۔ اس سے تو ہم پہلے ہی اچھے تھے۔''

''صاف صاف بتاؤ۔ میں نے تمہاری کون سی مشکلیں بڑھا دیں؟''

''تم نے فرعون کو ناراض کر دیا۔ اب وہ تمہارا بدلہ ہم سے لے رہا ہے۔''

''کیسا بدلہ؟''

''فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو ہم پر حاکم ہیں، حکم دیا ہے کہ اب تم بنی اسرائیل کو اینٹیں بنانے کے لیے ''بھس'' نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ سردار اب ہم سے کہہ رہے ہیں کہ ہم خود ہی جا کر بھس بٹوریں اور اتنی ہی اینٹیں بنائیں جتنی پہلے بناتے تھے۔ اب موسیٰ تم ہی بتاؤ کہ ہم بھس بٹوریں یا اینٹیں بنائیں۔ تم ہمیں سچ سچ بتاؤ فرعون سے تم نے کیا باتیں کی ہیں؟''

''میں نے تو تم لوگوں کو مصر سے باہر لے جانے کی بات ہے۔''

''وہ ہمیں کاہلی کے طعنے دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم کام سے بچنے کے لیے موسیٰ کے ساتھ مصر سے باہر جانا چاہتے ہیں لہٰذا اس کا حکم ہے کہ ہم سے سخت محنت لی جائے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ''تم فرعون کے مظالم سے مت گھبراؤ۔ صبر و شکر سے کام لیتے رہو اور خدا کی ذات سے مایوس نہ ہو۔''

ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گستاخی سے پیش آیا۔ ''خداوند تمہیں سمجھے اور تمہارا انصاف کرے، تم نے تو فرعون اور اس کے خادموں کی نظروں میں ہمیں ایسا گرا دیا ہے کہ گویا ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ ہم مصر کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جائیں گے۔''

''اے میری قوم کے لوگو! میں فرعون کے پاس اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا۔ میں تمہاری خواہشوں کے سامنے خدا کے فرمان کو نظر انداز نہیں کر سکتا، البتہ اسی سے پوچھوں گا کہ تو نے مجھے فرعون کے پاس کیوں بھیجا اور میرے لوگوں کو برائی میں کیوں ڈالا۔ اب تم لوگ جاؤ اور مجھے خداوند سے پوچھنے دو۔''

وہ لوگ چلے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

''میں فرعون کے دل کو سخت کروں گا اور اپنے نشان اور عجائب ملکِ مصر میں کثرت سے دکھاؤں گا تو بھی فرعون تمہاری نہ سنے گا۔ تب میں مصر کو ہاتھ لگاؤں گا اور اسے بڑی بڑی سزائیں دے کر اپنے لوگوں بنی اسرائیل کے جتھوں کو ملکِ مصر سے نکال لاؤں گا اور میں جب مصر پر ہاتھ چلاؤں گا اور بنی اسرائیل کو ان میں سے نکال لاؤں گا تب مصری جانیں گے کہ میں خداوند ہوں اور جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو اپنی لاٹھی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دینا تا کہ وہ سانپ بن جائے۔''

ادھر یہ وحی نازل ہو رہی تھی، دوسری طرف فرعون گھبراہٹ کے عالم میں اپنے درباریوں کو لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مشیر اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ موسیٰ سے ہونے والی گفتگو میں رب العالمین کا تذکرہ نہ چھیڑے۔ لگتا ہے وہ اس موضوع پر خوب تیاری کر کے آیا ہے گفتگو کو موسیٰ کی ذات تک محدود رکھے اور اس سے یہ کہے کہ اگر وہ رسالت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کرے اور کوئی معجزہ دکھائے۔ پس وہ لاجواب ہو جائے گا۔

اس کے مشیروں کے دل میں اللہ ہی نے یہ بات ڈالی ہوگی کیونکہ اللہ کو اپنا معجزہ دکھانا تھا۔ اسی کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر فرعون کے دربار میں جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ اس مرتبہ انہیں روکنے والے مصری نہیں بلکہ خود بنی اسرائیل کے لوگ تھے جو ان کی راہ میں کھڑے تھے۔

''موسیٰ! تم پھر فرعون سے اعلانِ جنگ کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری ذاتی دشمنی میں ہماری مصیبت آ گئی ہے۔ تم اس سے لڑائی مول لے رہے ہو اور ہم پر سختیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم تمہیں ہرگز اس کے پاس نہیں جانے دیں گے۔''

''میری قوم کے نادان لوگو!'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔'' ہم دونوں بھائیوں کو اپنا کام کرنے دو اور کچھ دن صبر سے کام لو۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ذکرالٰہی

ایک بندۂ خدا ایک رات اللہ اللہ کررہا تھا تاکہ اس مالکِ حقیقی کے ذکر سے اس کے ہونٹ شیریں ہوجائیں۔ ابلیس نے یہ دیکھا تو اس کے پاس جاکر بولا۔

''او بےوقوف چپ کر کب تک اللہ اللہ کرنے میں مصروف رہے گا۔ کبھی اس کی طرف سے جواب بھی آیا ہے تجھے؟ جب جواب نہیں مل رہا تو اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟''

وہ بندۂ خدا سوچ میں پڑگیا۔ اس کا دل بہت دکھا۔ اسی خیال میں اسے نیند آگئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف فرما ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں۔ ''اے اللہ کے بندے! تو نے ذکر کیوں چھوڑ دیا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں فکرمند ہوگیا ہوں کہ مجھے اللہ کی طرف سے جواب کیوں موصول نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے پروردگار نے مجھ پر اپنا دروازہ بند تو نہیں کردیا۔''

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ ''مجھ سے اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تجھ کو یہ بتاؤں کہ تو جو اللہ کرتا ہے وہ ہماری ہی تو صدائے لبیک ہے۔ وہ سوزوگداز جو تیرے دل میں پیدا ہوگیا ہے، وہ بھی تو ہمارا ہی بھیجا ہوا ہے۔ کیا میں نے ہی تجھے اس ذکر میں مصروف نہیں کیا؟ کیا تیرا خوف، تیرا عشقِ الٰہی ہماری عنایت نہیں؟ تو جب ایک بار اللہ کہہ کر پکارتا ہے تو تیرے ذکر میں ہماری بےشمار لبیک پوشیدہ ہوتی ہے۔ جو میرا ذکر نہیں کرتے ان کے منہ اور دل پر قفل لگے ہوئے ہیں۔''

اس حکایت میں یہ... پوشیدہ ہے کہ بندہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے، اسے پکارتا ہے تو اس کا مالک و خالق اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہے۔

انتخاب: میمونہ عزیز، کراچی

''مجھے خداوند نے بشارت دی ہے کہ یہ سختیاں کچھ دن رہیں گی، اس کے بعد میں تجھے مصر سے نکال لے جاؤں گا۔ تم فرعون کی دسترس سے باہر چلے جاؤ گے۔''

''تم نے تو کہا تھا تم ہمارے نجات دہندہ ہو۔ ہم تمہارے وعدوں پر خوش ہوگئے تھے مگر اب تو مصری تمہارا بدلہ بھی ہم سے لے رہے ہیں۔''

''میرا وعدہ غلط ہوسکتا ہے مگر میرے رب کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا۔ وہ تمہیں فرعون سے ضرور نجات دلائے گا۔ اب تم راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے جانے دو۔''

بنی اسرائیل نے راستہ دے دیا لیکن صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ ایسا بےدلی سے کررہے ہیں۔ آگے چل کر اگر سختیاں اور بڑھیں تو وہ حضرت موسیٰ کے بالکل ہی خلاف ہوجائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام شاہی محل کے پھاٹک پر پہنچے تو خلافِ توقع پہرے داروں نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا۔ اندر جانے میں بس اتنی دیر لگی جتنی دیر میں فرعون انہیں اندر آنے کی اجازت دیتا۔

فرعون نہایت کروفر کے ساتھ اپنے مشیروں کو اردگرد لیے تخت پر بیٹھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گفتگو میں پہل کی۔

''اے فرعون! ہم نے تجھے سوچنے کا موقع خوب دے دیا۔ تیرے مشیروں نے تجھے کیا صلاح دی اور تو نے کیا فیصلہ کیا۔''

''یہی بات میں تجھ سے پوچھتا ہوں۔ تو نے مجھے اپنا رب مان کر اپنی قوم کے لیے بھلائی کا فیصلہ کیا یا نہیں؟''

''ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں دے کر اس پر زندگی و عمل کی راہیں کھول دیں۔ جس نے ہر چیز کو نعمت جسم و وجود عطا کی اور پھر سب کو منزل کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی۔ تم کیسے رب ہوسکتے ہو۔ تم تو دوسرے انسانوں کی طرح خالی ہو۔ تم میرے رب پر ایمان لاؤ یا پھر بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے کی اجازت دو۔''

''اے موسیٰ! یہی باتیں تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ میں تمہاری بک بک سے تنگ آگیا ہوں۔ اب تم میری ربوبیت تسلیم کرو ورنہ میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا اور تمہاری قوم کو طرح طرح کی اذیتیں دوں گا۔''

''اگر تو رب ہوتا تو بنی اسرائیل بھی تیری ہی مخلوق ہوتے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ۔ ہم ایک بار پھر تجھ سے کہتے ہیں کہ ہم

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دونوں یہاں اپنے خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ہم نے اس کا پیغام تجھ تک پہنچا دیا۔ اب تم لوگ باز آ جاؤ اور گمراہی سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔"

"تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو ایک ان دیکھے خدا کا بھیجا ہوا ہے۔"

"میں خدا کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں۔"

"اگر تو سچا ہے تو لا، وہ نشان دکھا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنا عصا (لاٹھی) زمین پر ڈال دی۔ یہ عصا زمین پر گرتے ہی اژدہے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس اژدہے نے حرکت کی تو کھلبلی مچ گئی۔ فرعون کا دبدبہ خاک میں مل گیا، لوگ اس کی بے ادبی کرتے ہوئے اس کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا اور اب بھاگتے پھر رہے تھے۔ خود فرعون نے اپنے پاؤں سکیڑ لیے تھے۔

"موسیٰ! یہ کیا؟"

"یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔"

"یہ تو سراسر جادو ہے۔ اب اس اژدہے کو قابو کرو۔ ہم نے تمہارا جادو دیکھ لیا۔"

فرعون کو زبردست شکست ہوئی تھی۔ وہ خود کو "رب" کہلواتا تھا اور اب ایک اژدہے سے خوفزدہ ہو کر اپنے تخت پر پاؤں سمیٹے بیٹھا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس سانپ کو قابو کریں۔ اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہہ ضرور رہا تھا کہ یہ جادو ہے لیکن وہ خدا ہی کیا جس پر جادو اثر کر جائے اور اس کے پاس اس کا توڑ بھی نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ میں آتے ہی وہ عصا کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور نکالا تو انتہائی تیز روشن اور چمکدار ہو گیا۔ پھر واپس اپنے گریبان میں ڈالا تو اصلی حالت میں آ گیا۔

سانپ نے لاٹھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ درباریوں کا خوف کسی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو ان کے دل پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر سخت ہو گئے۔

درباریوں نے فرعون سے کہا "یہ تو بہت بڑا جادوگر ہے۔ یہ ہمیں خوفزدہ کر کے ملک مصر سے نکال دینا چاہتا ہے تاکہ خود حکومت کرے اس کے فریب میں ہرگز نہ آنا۔"

"تم نے مجھ سے نشانیاں طلب کی تھیں۔ میں نشانیاں دکھا چکا۔ تم اب بھی اسے جادو کہتے ہو۔ یاد رکھو اگر اب بھی تم انکار کرو تو کئی عذاب تمہارے لیے تیار کھڑے ہیں۔"

فرعون نے بے بسی سے درباریوں کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ ہامان آگے بڑھا تاکہ صورتِ حال کو سنبھالے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موسیٰ کا جادو درباریوں پر چل جائے۔

"تم جو دس سال مصر سے باہر رہے ہو تو تم نے یقیناً کسی ماہر جادوگر سے جادو سیکھ لیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ مصر میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ تم ان سے مقابلہ کر کے ثابت کرو گے کہ تم کسی کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو یا جادوگر ہو۔"

"افسوس کہ تم مجھے جھوٹا سمجھ کر اپنے لیے عذاب خرید رہے ہو۔"

"بس اب مقابلے سے بھاگنے کی باتیں مت کر۔ مقابلے کا کوئی دن مقرر کر لے تاکہ تیرا جھوٹ سب پر ظاہر ہو جائے۔"

"میں مقابلے کے لیے تیار ہوں لیکن وعدہ کر کہ اگر تو مقابلہ ہار گیا تو میرے خدا پر یقین لے آئے گا اور میری قوم کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے گا۔"

"اور اگر تو ہار گیا؟"

"تیرے پاس یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ میں جادوگر نہیں جو تیرے ساحر مجھے شکست دے دیں گے۔ میں تو خداوند کا بھیجا ہوا فرستادہ ہوں اور جو کچھ میں نے دکھایا وہ جادو نہیں معجزات ہیں۔"

فرعون کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے وہ ان کی شرط ماننے کو تیار نہیں تھا اور بات کو گھما پھرا کر ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ کہیں فرعون مقابلے سے دستبردار نہ ہو جائے۔ وہ چاہتے ہی یہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تھے کہ تمام لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں تو وہ اللہ کی نشانیوں اور براہین کو سب کے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح کردیں۔ خدا کا معجزہ غالب رہے گا تو ناچار ان کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑے گا اور اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہے گا۔ نیز یہ سوچا کہ اگرچہ ''وحی الٰہی'' کے مطابق صداقت کا یقین دلا چکا ہوں تاہم فرعون اور اس کے ساتھی اسے جادو کہتے رہے ہیں اور عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر مظاہرہ عوام کے سامنے ہوا اور انہوں نے صداقت کا اقرار کرلیا تو کسی کو لب کشائی کا موقع نہ مل سکے گا۔

''اس کام کے لیے پہلا وقت یوم الزینت (جشن کا روز) ہے۔ تیرے ماہر جادوگر اس روز چاشت کے وقت شہر سے باہر میدان میں جمع ہوجائیں۔''

یہ وقت آپ نے اس لیے طے کیا کہ اس وقت آفتاب کی روشنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ دن چڑھ چکا ہوتا ہے اور ہر چیز خوب واضح اور روشن ہوجاتی ہے۔

فرعونیوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ فی الحال تو موسیٰ اور ہارون کو مہلت دو اور اس دوران تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کردو اور پھر موسیٰ کا مقابلہ کراؤ۔

اس دن کے آنے میں ابھی کئی ماہ تھے۔

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً یوم الزینۃ سے مصریوں کی عید کا وہ دن مراد ہے جو وفاالنیل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا۔

☆☆☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں ''سحر'' کو ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا۔ شاہی دربار تک میں انہیں رسوخ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اہم سرکاری معاملات میں بھی انہی کی جانب رجوع کیا جاتا تھا۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو کی مذہبی حیثیت کے قائل تھے۔ اسی اعتقاد کے پیشِ نظر وہ اس کو سیکھتے سکھاتے تھے۔ مصر بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون کا یہ جادو چل گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں اور یہ اپنے جادو کے زور پر مصری حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ماہر جادوگروں کو جمع کرکے موسیٰ کو شکست دے دی جائے۔

لغت میں سحر کے معنی امرِ مخفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اول وقت کو سحر اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوتی اور علمی اصطلاح میں سحر ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

''سحر حقیقت ہے یا نظر کا دھوکا؟ اس بارے میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ سحر حقیقت ہے اور مضر رساں اثرات رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس میں ایسے مضر اثرات رکھ دیے ہیں جیسے زہر میں۔

اس کے برعکس معجزہ دراصل براہِ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جاسکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا کے نشانات اس لیے عطا کیے گئے کہ ان کے زمانے میں مصر جادو کا مرکز سمجھا جاتا تھا لہٰذا تقاضا تھا کہ ایسے زمانے میں مبعوث ہونے والے نبی کو ایسے معجزات عطا ہوں جو اسی نوع (جادو) سے تعلق رکھتے ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے زیادہ بڑھ جائے تو نبی یہ ثابت کرے کہ اس کے پاس جو معجزہ ہے وہ بشری دسترس سے باہر ہے۔

☆☆☆

''(موسیٰ) چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے شائستہ مذہب کو نیست و نابود کردیں۔ تم اپنا جادو کا قبیلہ اکٹھا کرو اور پھر قطار باندھ کر آؤ۔ جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔'' (طٰہٰ)

درباریوں نے فرعون کو مشورہ دیا اور فرعون نے اپنے تمام اعیان و ارکان کے نام احکام جاری کردیے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہیں ان کو جلد از جلد دارالحکومت روانہ کردو۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ان خطوط کے علاوہ اس نے ایسے افراد بھی مختلف شہروں میں دوڑا دیے جو جادوگروں سے رابطہ کریں اور انہیں مقابلے کے لیے آمادہ کر کے دارالحکومت میں لے کر آئیں۔

قدرتِ الٰہی کی حکمت مسلسل اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ افراد جس شہر میں بھی پہنچتے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ ضرور کرتے۔

ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغامِ حق فرعون کے دربار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مصر کے دوسرے شہروں میں لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ فرعون خود ان کی شہرت میں اضافہ کر رہا تھا۔

ان کے نام کے ساتھ ان کے پیغام کا ذکر بھی ضرور ہوتا تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ان کی لاٹھی سانپ بن جاتی ہے اور وہ اسے اللہ کی نشانی کہتے ہیں۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگتی تھیں کہ ہوسکتا ہے وہ واقعی نبی ہوں جیسے کہ ان سے پہلے نبی آتے رہے ہیں۔

بعض جادوگر تو مقابلے سے پہلے اپنے حریف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کے خواہش مند تھے اور جب انہیں یہ بتایا جاتا کہ موسیٰ وہی ہیں جنہیں بہتے ہوئے پانی میں صندوق سے نکالا گیا تھا اور پھر فرعون کے گھر میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور پھر مصر سے کہیں چلے گئے اور اب آئے ہیں تو یہ کہتے ہوئے آئے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔

ان جادوگروں میں سے بہت سوں کو یہ حالات سن کر یقین ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی وہ ہیں جن کے آنے کی پیش گوئی نجومیوں نے کی تھی۔

وہ یہ سوچتے بھی تھے کہ ان سے مقابلہ کرنا بے کار ہے لیکن فرعون کے حکم سے بے بس تھے اور یہ شوق بھی دامن گیر تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

بعض کو یہ تعجب ہوتا تھا کہ وہ کیسے جادوگر ہیں جو تعداد میں صرف دو ہیں اور فرعون ان کے مقابلے کے لیے ہزاروں جادوگروں کو اکٹھا کر رہا ہے۔

یہ سوچ سوچ کر ان کے دل ڈرے جا رہے تھے۔ غرض مقابلے سے پہلے ہی ان جادوگروں پر بے دلی سی طاری ہو گئی تھی۔ یوم الزینتہ میں دس دن باقی رہ گئے تھے کہ جادوگروں کے قافلے دھڑا دھڑ دارالحکومت پہنچنے لگے۔

فرعون نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ان جادوگروں کو رتھوں میں بٹھایا اور سڑکوں پر ان کا گشت کرایا۔ یہ جادوگر طرح طرح کے جادو دکھاتے ہوئے سڑکوں سے گزر رہے تھے۔

مصریوں میں ایک خاص قسم کا جوش و خروش تھا۔ انہیں بے چینی سے اس دن کا انتظار تھا جب یہ مقابلہ منعقد ہو۔

صرف جادوگر ہی نہیں، دوسرے شہروں کے عام لوگ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے دارالحکومت کا رخ کر رہے تھے۔

ایک جشن تھا جو عید سے پہلے ہی برپا ہو گیا تھا۔

مصریوں کے گھروں میں خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے لیکن بنی اسرائیل کے دل خوف اور اندیشوں سے کانپ رہے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ اگر اس مقابلے میں موسیٰ کو شکست ہو گئی تو پھر فرعون کے مظالم کی حد نہیں ہو گی۔ اب تک تو ہم فرعون ہی سے نمٹ رہے تھے اب یہ جادوگر بھی ہم سے بدلے لیں گے۔

مصر میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ان کے بارہ سرداروں نے آپس میں طے کیا کہ موسیٰ کے پاس چلا جائے اور انہیں سمجھایا جائے کہ وہ اس مقابلے سے دستبردار ہو کر ہمیں مصیبت سے بچا لیں۔ یہ سردار جمع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ کچھ مشتعل تھے کچھ نرم خو۔

''اے موسیٰ! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم فرعون سے صلح کر لو تاکہ ہماری جانیں بچ جائیں۔''

''کیوں؟ تمہاری جانوں کو کیا ہوا۔ مقابلہ تو ہم دو بھائی کر رہے ہیں۔''

''اگر آپ کو شکست ہوئی تو پھر ہماری خیر نہیں۔''

''تم لوگوں نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ مجھے شکست ہو گی۔''

''کیا تم جادوگروں کی کثیر تعداد کا مقابلہ کر سکتے ہو؟''

''تم انہیں جادوگر کہتے ہو اور یہ خوف بھی رکھتے ہو کہ ہمیں شکست ہو جائے گی۔ یہ تو سمجھو کہ ہم جادوگر نہیں۔ ہمیں تو خدا ان کے مقابلے پر بھیج رہا ہے۔ جادوگروں کا خدا فرعون ہے اور ہمارا خدا رب العالمین ہے۔ پھر ہمیں شکست کیسے ہو جائے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گی۔ کیا تمہارا ایمان اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ فرعون سے ڈرنے لگے ہو۔ ایک غیر فانی کے مقابلے میں فانی سے ڈرتے ہو۔ کیا بھول گئے کہ تمہارے اجداد ایک خدا کی عبادت کرتے تھے اور ایمان کے مضبوط تھے۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ ستر جادوگر تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے پر آئے۔
مقابلے سے ایک دن پہلے فرعون نے ساحروں کو طلب کیا اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے موسیٰ کو شکست دے دی تو وہ انہیں اتنا انعام دے گا کہ ان سے سنبھالا نہیں جائے گا اور سب کو اپنے مقربین خاص میں شامل کرے گا۔

جادوگروں نے بھی انعام کے لالچ میں آکر فرعون سے بڑے بڑے وعدے کرلیے۔ یہ وعدے کچھ ایسے بے جا بھی نہیں تھے۔ جادوگروں کو بتادیا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک عصا ہے جو سانپ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور جادو نہیں۔ جادوگروں کو اپنی کثرت پر بھی ناز تھا۔
عید کا دن آیا تو فرعون اپنی پوری فرعونیت کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ اس کے لیے ایک اونچی جگہ پر تخت بچھایا گیا تھا۔ وہ تخت نشیں ہوا تو درباری بھی حسب مراتب بیٹھ گئے۔
لاکھوں کا مجمع تھا جو اس مقابلے کو دیکھنے آیا تھا۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے۔ ان کے لیے یہ صرف مقابلہ نہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ایک طرف مصری جادوگروں کا گروہ اپنے سازو سامان سحر سے لیس کھڑا تھا۔ دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغام بر سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کھڑے تھے۔
جادوگر ایک مرتبہ پھر فرعون کے تخت کے قریب گئے اور کہنے لگے کیا ہمارے لیے انعام ہے اگر ہم غالب رہیں۔ فرعون نے کہا ضرور اور یہی نہیں بلکہ مقربین بارگاہ شاہی بنو گے۔
فرعون کا تو یہ حال تھا کہ اگر اس وقت اس سے کچھ بھی مانگا جاتا تو وہ دینے کو تیار ہوجاتا۔
جادوگر فرعون کے پاس سے ہٹ کر اپنی جگہ پر آئے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تبلیغ ادا کرتے ہوئے جادوگروں کو مخاطب کیا۔ فرعون اور اس کے درباری ان کی آواز کو صاف سن رہے تھے۔
"افسوس ہے تم پر کہ تم ہمیں جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور ہمارے مقابلے پر اتر آئے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تمہیں اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا۔"
درباریوں کو فکر ہوئی کہ کہیں جادوگر ان کی باتوں میں آکر مقابلے سے دستبردار نہ ہوجائیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر جادوگر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان آپس میں اختلافات ہوگئے تھے۔ کچھ کہنے لگے یہ پیغمبر کا کلام ہے اور یہ جادوگر نہیں ہیں۔ کچھ کہہ رہے تھے یہ جادوگر ہیں۔
درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کیا۔
"یہ دونوں بھائی بلاشبہ جادوگر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کرلیں۔ تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰ کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ آج جو بھی غالب آجائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔"
قرآن نے اس مضمون کو یوں بیان کیا۔
"حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا افسوس تم پر۔ دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔ جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا۔ بس آپس میں لوگ ردوکد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہوئیں پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں۔ یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور پر تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت کے مالک بن جائیں۔ پس اپنے سارے داؤ جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ۔ جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوا۔" (سورہ طٰہٰ)
تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ ہر ذہن یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ ایک طرف فرعون جیسے بادشاہ کی ریاستی طاقت اور جادوگروں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کی کثیر تعداد ہے، دوسری جانب دو بھائی اکیلے ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی دنیاوی طاقت نہیں۔ وہ پھر بھی خوفزدہ نہیں۔ کوئی بات ضرور ہے، وہ جو کہتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ شاید یہی سچ ہے۔ پھر شیطان اپنا کام دکھاتا تھا۔ باطل خیالات انہیں گھیر لیتے تھے۔ فرعون کی طاقت کا خیال آتا تھا۔ یہ خیال مصریوں کے دلوں میں بھی تھا کہ موسیٰؑ کی بات مان کر اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنا پڑے گا۔ عصبیت بھی غالب آرہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور مصریوں کے نزدیک بنی اسرائیل غیر مہذب تھے۔ اگر موسیٰؑ کی عملداری ہوگئی تو بنی اسرائیل ان پر حاوی ہوجائیں گے۔ مفت کے غلام ہاتھ سے چلے جائیں گے۔

جادوگروں کی صفوں میں بھی یہی باتیں ہورہی تھیں لہٰذا وہ آگے بڑھنے میں پس و پیش کررہے تھے۔ انعام کا لالچ انہیں اکساتا تھا اور عذاب کا خوف روکتا تھا۔

مصریوں نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا کہ آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ آگے بڑھو اور موسیٰ کا غرور خاک میں ملادو۔ جادوگروں نے یہ آوازیں سنیں تو انہیں ہوش آیا۔ ان میں سے کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔

''موسیٰ اپنی تبلیغ کو چھوڑ۔ تیرے کلام کا ہم پر کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ اب تو تم یہ بتاؤ کہ ابتدا ہماری جانب سے ہو یا پہل تم کرو گے؟''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں تلقین کرکے اپنا حق ادا کردیا۔ اب تمہارا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ رہا پہل کرنے کا معاملہ تو میں تمہارے مقابلے پر نہیں آیا ہوں تم میرے مقابلے پر آئے ہو۔ جادو کا دعویٰ مجھے نہیں تمہیں ہے لہٰذا پہل بھی تم ہی کرو۔''

جادوگروں نے کہا اچھا تو پھر ہم دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ رسیاں اور لاٹھیاں لائے تھے۔ یہی ان کا جادوئی سازوسامان تھا۔ انہوں نے رسیوں کے ٹکڑے اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور نعرے لگانے لگے۔

''فرعون کی عزت کی قسم! ہم ہی غلبہ پانے والے ہیں۔''

اچانک ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ ہزاروں سانپ میدان میں دوڑ رہے تھے۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ سب کی سانسیں رک گئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اپنی شکست کا خوف نہیں بلکہ یہ ڈر پیدا ہوا کہ عوام الناس ان کے جادو کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آجائیں۔ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

''اندیشہ نہ کر تو ہی غالب ہوگا۔ تیرے دائیں ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے۔ جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائے گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے محض جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کسی راہ سے آکے کامیاب نہیں ہوسکتا۔''

اجازتِ الٰہی کی دیر تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ زمین پر گرتے ہی یہ لاٹھی عظیم شکل و صورت والا اژدہا بن گئی۔ اس کے پاؤں بھی تھے اور بڑی موٹی گردن اور بھیانک انتہائی چوڑی گھبرادینے والی شکل تھی۔ اسے دیکھتے ہی لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ یہ اژدہا جادوگروں کی پھینکی ہوئی رسیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ایک ایک کرکے سب کو نگلنے لگا۔

یہ ایسا کرشمہ تھا جو جادوگروں کے دل و دماغ میں بھی نہ آیا ہوگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں نے گواہی دی کہ یہ کوئی جادو اور شعبدہ نہیں بلکہ یہ ایسا حق ہے جس پر حق کے سوا کوئی قادر نہیں ہوسکتا۔ حقیقت ان پر کھل گئی۔

اللہ نے ان کے دلوں سے غفلت کے پردے ہٹادیئے وہ پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہوگئے۔ انہوں نے فرعون کی موجودگی کی پروا بھی نہیں کی اور حاضرین کو گواہ بنا کر اقرار کیا۔

''ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے جو کچھ موسیٰ نے دکھایا ہم اپنے علم کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ ہرگز جادو نہیں بلکہ جادو سے... بالاتر خدا کا معجزہ ہے۔ اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے شک خدا کے رسول ہیں۔''

فرعون ان کے منہ سے الفاظ نہیں چھین سکتا تھا لیکن سمجھ رہا تھا کہ اس کا دام فریب تار تار ہوگیا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دینے کی جو آخری تدبیر تھی وہ بھی ناکام ہوگئی۔ اب اس نے مصریوں کو بہکانے کے لیے فریب کا دوسرا راستہ اختیار کیا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''موسیٰ تم سب کا استاد ہے۔ تم سب نے سازش کر رکھی تھی۔ اسی لیے تو نہ صرف اتنی جلدی شکست تسلیم کر لی بلکہ میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے تاکہ دوسرے لوگ بھی تمہاری پیروی کریں لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ میں تم کو عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ اگر موسیٰ کا خدا تمہیں بچا سکتا ہے تو بچا لے۔ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا کہ مصریوں کا خدا میں ہوں۔''

جادوگروں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کے جو روشن دلائل ہمارے سامنے آ گئے اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطا جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا۔ ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔''

ان جادوگروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرعون کو بھی نصیحت کر ڈالی۔

''اے فرعون! تو مجرموں میں سے مت ہو جا۔ ہماری طرح تو بھی ایمان لے آ ورنہ جہنم تیرا ٹھکانا ہو گا۔ کیا تجھے ثمود اور لوطؑ کی بستیاں یاد نہیں۔ اب بھی وقت ہے ایمان لے آ۔''

فرعون کے لیے عذاب عظیم مقدر ہو گیا تھا۔ کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی اس کے دل کی سختی میں نرمی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی ضد اور بے جا عصبیت نے اسے راہِ راست پر نہ آنے دیا۔ اس نے حکم دیا کہ جو جادوگر موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں انہیں سولی پر لٹکا دو... تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ مجھ سے غداری کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

فرعون نے ان ایمان لانے والوں کو عذاب سے دوچار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ مومنین یہ کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے۔

''ہمارے رب ہم پر صبر ڈال اور ہم کو اسلام کی حالت میں وفات دے۔''

جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہو گئی مگر وہ فرعون کے ظلم و ستم کی وجہ سے اعلان نہ کر سکی۔

''پھر موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک.... گروہ جو اس قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔'' (سورۃ یونس)

جب اس عظیم واقعے میں حضرت موسیٰ فتح یاب ہوئے اور فرعون شکست سے دوچار ہوا تو اس کا پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا ہونا فطری تھا لیکن اس کی ضد کا برا ہو کہ دل کی سختی مزید بڑھ گئی۔ اسے اپنی عافیت سے زیادہ اپنی شان و شوکت کی فکر تھی۔ شاید اب تک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے زیادہ فکرمند نہیں ہوا تھا۔ یہ سمجھتا رہا تھا کہ انہیں زیر کر لے گا۔ دوسرے یہ کہ اب تک موسیٰؑ اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو اس کے دربار تک محدود تھی لیکن اس نے خود ہی گھمنڈ میں آ کر اس جنگ کو محل سے باہر کھلے میدان میں منتقل کر دیا۔ اب اسے یہ ڈر ہو رہا تھا کہ اگر موسیٰؑ سے متاثر ہو کر میری قوم موسیٰؑ پر ایمان لے آئی تو میرے اقتدار کا سورج بالکل ہی غروب ہو جائے گا۔ وہ خود کو ''رب'' کہلاتا تھا اس کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔

یہی حال اس کے سرداروں کا تھا۔ اس اقتدار میں وہ بھی فرعون کے شریک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقتدار کا مطلب یہ تھا کہ انہیں بھی زوال کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ جو فرعون کے نام پر اپنی قوم سے دولت بٹورنے میں لگے ہوئے تھے وہ سب دروازے بند ہو جاتے۔ یہی سردار فرعون کو غلط مشورے دے کر اس کے کفر میں اضافہ کرتے چلے جا رہے تھے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ شکست تو ایسی تھی کہ ان کے ہوش بالکل ہی اڑ گئے۔

تمام سرداران قوم جمع ہوئے اور فرعون کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ موجودہ صورتِ حال پر غور کرنے لگے اور جب بہت باتیں ہو چکیں تو انہوں نے یک زبان ہو کر فرعون سے استفسار کیا۔

''کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد مچاتے پھریں؟ تجھے اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ کیا تو اپنی کمزوری اپنی قوم پر ظاہر کر دے گا کہ تو نے موسیٰ اور اس کی قوم کو زندہ چھوڑ دیا؟ آج جو لوگ تجھے سجدہ کرتے ہیں، تو چاہتا ہے وہ تجھے سجدہ کرنا چھوڑ دیں اور موسیٰ کی باتوں میں آ کر تجھ سے بغاوت کریں اور اس کی قوم ہم پر غالب آ جائے؟ اگر تو نے ابھی کوئی تدبیر نہ کی تو یہ فتنہ بڑھتا جائے گا۔ جلد کوئی تدبیر کر ورنہ ہمیں اجازت دے۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سرداروں نے فرعون کو اتنا برانگیختہ کر دیا کہ اس کے غضب نے خود اسے گھیر لیا اور وہ کفر و ضلالت کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ غصے کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب تم دیکھتے جاؤ کہ میں موسیٰ اور اس کی قوم کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے اور صرف لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ہم جوان ہونے پر انہیں اپنی باندیاں بنائیں۔"

اس وقت دربار میں ہونے والی یہ گفتگو جب دربار سے باہر نکلی تو اس اعلان نے بنی اسرائیلیوں کو سراسیمہ کر دیا کہ فرعون ہمارے بیٹوں کو قتل کرے گا۔

فرعونِ مصر کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کے بارے میں کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی یہ اعلان کیا گیا تھا۔ اس وقت اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں آنے سے روکا جائے اور اب مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان و شوکت کو خاک میں ملا یا جائے اور ان کی قوم کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اس ظالمانہ فعل میں کچھ دنوں کے لیے کمی آ گئی تھی اب پھر اس پر عمل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کسی وقت فرعون کے لیے لشکر تیار کریں تو انہیں نوجوان میسر نہ آ سکیں۔

بنی اسرائیل کی بستیوں میں جان کا خوف پہرے دار بنا ہوا تھا۔ ہوا کو وہ چراغ ہی نہیں مل رہا تھا جسے وہ بجھائے، گھروں میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک بڑے گھر میں چراغ روشن تھا جہاں اسرائیلی قبیلوں کے سردار آپس کی مخالفتوں کو بھلا کر نئی صورت حال پر غور کر رہے تھے۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ نئی مصیبتوں کے ذمے دار حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں بلکہ اس سے پہلے بھی انہی کی پیدائش کو روکنے کے لیے ہمارے بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں تو وہ صرف مفلس و بدحال ہی نہیں ہو جاتی بلکہ ہمت و شجاعت کا جوہر بھی ان میں سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے اتنے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ جب کوئی مصلح یا پیغمبر انہیں اس حالت سے نکالنے کے لیے کوشاں ہوتا بھی ہے تو راہ کی سختیوں سے گھبرا کر خود نجات دہندہ کو الزام دینے لگتے ہیں۔ یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا تھا بار بار یہ کہتے نظر آتے..... کہ ہم غلام ہی ٹھیک تھے، تم نے فرعون سے لڑائی کیوں مول لی۔ اب وہ اس اعلان کا سبب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو سمجھ رہے تھے لہٰذا بپھرے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔

"کیا ہم نے نہیں کہا تھا کہ فرعون کے بھیجے ہوئے جادوگروں سے مقابلہ نہ کرو۔ کیا ہم نے صلاح نہیں دی تھی کہ فرعون سے صلح کر لو۔ اب فرعون نے ہمارے بچوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔ اس سے تو ہم غلام اچھے تھے۔ اب ہماری نسل کشی کی جائے گی۔"

"اس سے اندازہ کر لو کہ فرعون اللہ اس کے رسول اور بنی اسرائیل کا کھلا دشمن ہے۔ تم اس کے خلاف اٹھ کھڑے کیوں نہیں ہوتے۔"

"فرعون تو ہمارا دشمن ہے ہی لیکن ہم پر یہ مصیبتیں صرف تمہاری وجہ سے آئی ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تمہارے آ جانے سے ہمارے مصائب میں کمی آ جائے گی لیکن یہ تو پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ تم خود بھی ہلاک ہو گے اور ہمیں بھی ہلاک کرو گے۔ ہم تمہاری خاطر فرعون سے جنگ کرنے والے نہیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا۔ "اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وراث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کے لیے ہی ہے۔ وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کر دے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنا دے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔"

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابنِ کثیر۔ توریت، ...... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ناکام

منظر امام

کامیابی ہو یا ناکامی... ہمیشہ عمل اور بے عملی کی چادر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے جس سے دنیا بھی حیران رہ جائے، کچھ کرنا بھی نہ پڑے... اس کے لیے تو انسان کو بڑی میٹھی اور گہری نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور نیند کے بعد ایک تفصیلی خواب بھی چاہیے ہوتا ہے۔

ناکامی سے منہ چھپانے اور ڈر جانے والوں کے لیے ایک حساس تحریر

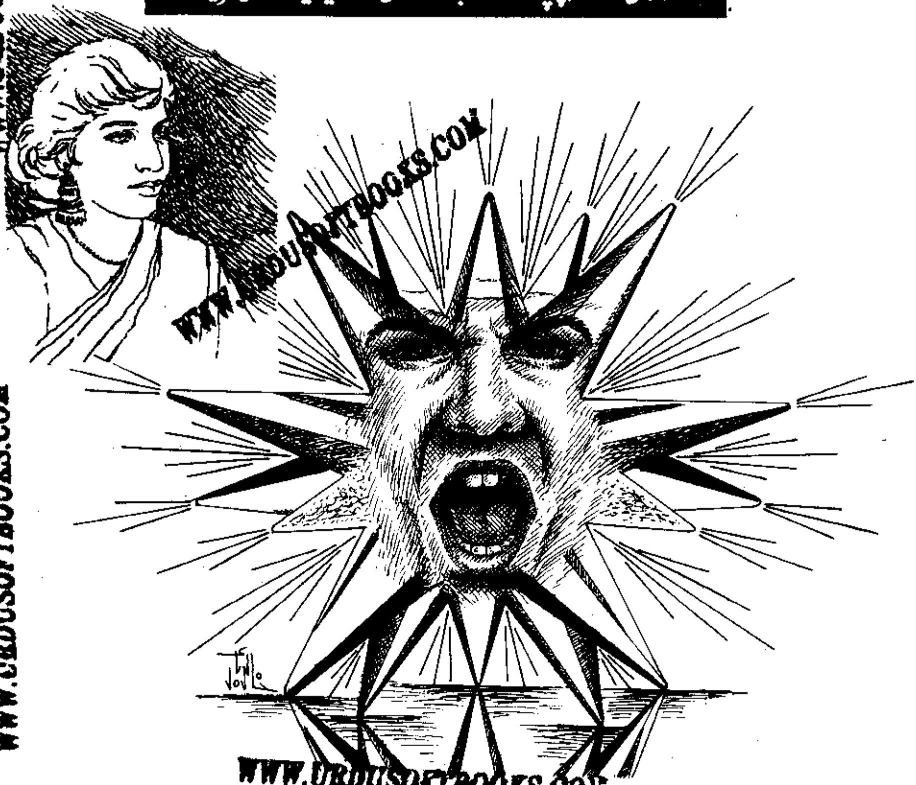

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حامد کے لیے آج کا دن ہی منحوس تھا۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ فلیٹ سے نکل کر جب وہ لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگا تو اچانک ایک سیڑھی کا تختہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک پیر اس تختے میں دھنس کر خلا میں جھولتا رہ گیا۔

وہ بہت مضحکہ خیز پوزیشن میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا ایک پیر ٹوٹے ہوئے تختے کے اندر دھنسا ہوا جھول رہا تھا اور دوسرا پیر اوپر والی سیڑھیوں میں اٹکا ہوا تھا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اور بہت نیچے فرش تھا۔ اگر وہ تختہ مکمل ٹوٹا ہوا ہوتا تو وہ سیدھا نیچے آجاتا۔

اوپر سے کسی فلیٹ کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ خبطی اکرم نیچے آرہا تھا۔ اکرم ایک بوڑھا آدمی تھا اور حامد کی طرح وہ بھی اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی باتیں دماغ کھانے والی ہوا کرتیں۔

وہ سیڑھیاں اترتا ہوا حامد کے پاس آ کر رک گیا۔

''حامد صاحب! آپ اس طرح کیوں لٹک رہے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جناب! میں پھنس گیا ہوں۔'' حامد نے بتایا۔ ''خود دیکھ لیں۔ سیڑھی ٹوٹ گئی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ ایک جھٹکے سے اپنا پیر باہر نکال لیں۔'' اکرم نے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔''

''دیکھیے یہ تو کوئی بات نہیں کہ آپ نے پورا راستہ گھیر رکھا ہے۔ اب مجھے نیچے جانا ہے تو کیسے جاؤں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں جان بوجھ کر اس میں گھس گیا ہوں۔'' حامد غصے سے بولا۔ ''یا مجھے شوق ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس مصیبت میں ڈال لوں۔''

اس دوران نیچے والی منزل کا ایک آدمی اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں پر آیا اور حامد سے نچلی سیڑھی پر آ کر رک گیا۔ ''او بھائی۔'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا رولا مچایا ہے۔ ہٹو ایک طرف۔ مجھے اوپر جانا ہے۔''

''ارے بھائی! میرا پاؤں اس تختے میں پھنس گیا ہے۔'' حامد نے کہا۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو۔ نکالو مجھے۔''

اب اس آدمی پر اصل سچویشن واضح ہوئی تھی۔ ''ہاں یار۔ تو تو واقعی پھنس گیا ہے۔ اب کیا کرے گا...... کیسے نکلے گا؟''

''بھائی! میں اپنی کوشش سے نکل نہیں سکتا۔ تم سب مل کر کوئی راستہ نکالو۔''

کچھ اور لوگ بھی آ کر اوپر نیچے رک گئے۔ وہ سب مل کر اس صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ اب یہ بات ہو رہی تھی کہ دس بار بلڈنگ کے مالک کو کہا جا چکا ہے کہ وہ لکڑی کی سیڑھیاں ختم کر کے سیمنٹ کی پکی سیڑھیاں بنا دے لیکن وہ سنتا ہی نہیں ہے۔

ایک صاحب نے کہا۔ ''میں اس بندے کی اسی طرح پھنسی ہوئی تصویر اخبار والوں کو بھیجوں گا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' کسی نے پوچھا۔

''تم دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ عدالت اس کا نوٹس لے گی۔ بلڈنگ کے مالک کے خلاف کیس ہو جائے گا۔''

''اور جب تک کیا میں اسی طرح پھنسا رہوں۔'' حامد حلق پھاڑ کر چلایا۔

''نہیں، نہیں...... تم بھی نکل آؤ گے۔''

''بلکہ تمہارے لیے تو ایک زبردست چانس ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''کمائی کا ایسا سنہرا چانس ہر ایک کو نہیں ملتا۔''

''اب اس میں میری کون سی کمائی ہو جائے گی؟''

''بہت سامنے کی بات ہے حامد بھائی۔'' ایک نوجوان نے کہا۔ ''تم اس بلڈنگ کے مالک پر کیس کر سکتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم کو ایک ضروری اگریمنٹ پر سائن کرنے کے لیے جانا تھا لیکن سیڑھی میں پھنسنے کی وجہ سے تم نہیں جا سکے۔''

''اور اس پر دوسرا کیس یہ بنتا ہے کہ اس سیڑھی کی وجہ سے تمہاری ٹانگ زخمی ہو گئی ہے۔''

''تم سب کے سامنے تماشا بن کر رہ گئے ہو۔'' کسی اور نے لقمہ دیا۔

''کم از کم پچاس لاکھ کا کیس ہو سکتا ہے اس پر۔''

''بھائی سلیم! پچاس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''نہیں کمال صاحب! اس جیسے دولت مند بندے کے لیے یہ کچھ نہیں ہیں۔''

''خدا کے لیے تم لوگ مجھے نکالنے کی کوشش کرو۔'' حامد نے کہا۔ ''میں کب تک پھنسا رہوں۔''

''حامد بھائی! ذرا یہ تو سوچو کہ تمہاری وجہ سے پوری بلڈنگ میں رہنے والوں کا کتنا بھلا ہو جائے گا۔ یہ سیڑھیاں ختم ہو جائیں گی۔ پکی سیڑھیاں بن جائیں گی اور تم پوری بلڈنگ کے ہیرو کہلاؤ گے۔''

اس دوران میں حامد کے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ کی شہلا بھی آ کر اس بھیڑ میں شامل ہو گئی تھی۔ حامد کا دل اسے دیکھ کر کئی بار دھڑکا تھا اور اس کا بھی شاید یہی حال ہو۔ وہ بھی حامد کے اس کیس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

اس نے حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حامد صاحب! شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ میں ایک چینل کے لیے کام کرتی ہوں۔''

''نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔'' حامد مسکرا دیا۔

''آپ ہمارے چینل کو انٹرویو دے دیں۔ یہ ہماری آج کی بریکنگ نیوز ہوگی۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس انٹرویو کی بنیاد کیا ہوگی؟"

"وہ یہ بتائیں گے کہ آپ میں کتنا حوصلہ ہے۔ کتنی برداشت ہے۔ آپ کس عزم کے ساتھ اس مصیبت کا مقابلہ کررہے ہیں۔"

آس پاس کھڑے لوگوں نے تالیاں بجادیں۔

حامد کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ شہلا خود اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اگر یہ حادثہ برپا نہیں ہوتا تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کرتی ہوئی اس کے برابر سے گزر جاتی۔

اب وہ دل ہی دل میں اس حادثے کا شکر گزار ہونے لگا تھا اور جہاں تک خود اس کے پھنسے رہنے کا معاملہ تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ ذرا سا جھٹکا دے کر اپنے پیر کو آگے پیچھے کرکے اس سیڑھی سے نکل سکتا تھا۔

اس دوران میں بلڈنگ کا ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ایک فائل لیے ہوئے آ گیا۔ اس نے وکیلوں جیسا کالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ حامد کے لیے وہ اجنبی تھا۔ اس نے آتے ہی اپنا تعارف کروایا۔ "ناچیز کو تسلیم فاروقی کہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں دیوانی مقدمات کا ماہر ہوں۔ اس حادثے کا سنتے ہی میں نے مالک کے خلاف کیس تیار کرلیا ہے۔ اب سب کے اور خاص طور پر آپ کے سائن کروانے ہیں۔"

"وکیل صاحب! کیا مالک پچاس لاکھ دے دے گا؟" شہلا نے پوچھا۔

"میڈم! آپ پچاس لاکھ کی بات کررہی ہیں، میں نے تو اسّی لاکھ کا پروگرام بنایا ہے۔"

وکیل کے اس بیان پر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔

شہلا نے اس بار لگاوٹ بھرے انداز میں حامد کی طرف دیکھا۔ "پلیز! سائن کردیں نا۔"

"ہاں ہاں، میں تیار ہوں۔" حامد جھک کر بولا۔

بلڈنگ کا چوکیدار ایک بڑے سے شاپر میں ہوٹل کی چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ یہ چائے سلطان احمد نے منگوائی تھی۔

"بھائی حامد! میں نے سوچا کہ تم اتنی دیر سے پھنسے ہوئے ہو، کچھ کھایا پیا نہیں ہوگا۔ اس لیے چائے اور بسکٹ منگوالی ہے۔"

سلطان احمد کے اس جذبے کو بے حد سراہا گیا تھا۔

نیچے کی منزل کے استاد معظم کے یہاں سے چائے کی ایک درجن پیالیاں آ گئی تھیں۔ سلطان احمد نے سب سے پہلے شہلا کو چائے پیش کی تھی۔ "یہ لیں میڈم! یہ چائے پی لیں۔"

"ارے میں کیوں، آپ حامد صاحب کو دیں۔"

بانسری، عشق اور منشیات

حال ہی میں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پولیس نے کراچی کی ایک نواحی بستی سے ایک انوکھے منشیات فروش کو گرفتار کیا ہے۔ انوکھا! ان معنوں میں کہ اس شخص کا طریقۂ واردات سب سے نرالا تھا۔ اس کے پاس بانسری تھی۔ جب یہ دیکھتا کہ دور دور تک کوئی پولیس والا نہیں ہے، کوئی دیکھ نہیں رہا تو بانسری کی تان چھیڑ دیتا۔ جیسے ہی فضا میں اس کے سریلے سُر پھیلتے یار لوگوں کو علم ہوجاتا کہ معاملہ صاف ہے۔ وہ بھاگ کر آتے اور اس سے اپنی مطلوبہ منشیات خرید لے جاتے۔ ہم نے زندگی میں بارہا چین کی بانسری بجانے والا محاورہ پڑھا اور سنا ہے اس کا صحیح مفہوم کبھی سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ اس لیے کہ بانسری تو بے چینی میں بجائی جاتی ہے۔ آدمی بے چین ہو یا دل بے چین ہو۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اب جبکہ ہم نے یہ خبر پڑھی تو اس محاورے کا سو فیصد مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عقل آتے آتے آتی ہے۔ ظاہر ہے اگر آتے آتے آتی ہے تو جاتے جاتے چلی بھی جاتی ہوگی۔

ہوسکتا ہے جن پولیس والوں نے نواز منشیات کو پکڑا وہ موسیقی سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ انہیں نوازی پسند نہ ہو یا وہ کن رس نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں وہ راگ پسند نہ آیا ہو جو وہ اس وقت بجا رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ہمارے خیال میں وہ بے سرا تو نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ بے سرا ہوتا تو اتنے دنوں سے چین کی بانسری کیسے بجا سکتا تھا؟

ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں اور بزرگوں سے سنتے آئے ہیں، کہا جاتا ہے ایک زمانے میں استاد ایسا راگ گاتے تھے کہ آگ لگ جاتی تھی۔ اس وقت یقیناً ماچس ایجاد نہ ہوئی ہوگی۔ ورنہ اتنی کھکھیڑ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بعض راگ ایسے تھے جو گائے جاتے تھے تو بارش ہونے لگتی تھی۔ اگر واقعی یہ بات سچ ہے تو کراچی کے اوپر گھومتے ہوئے بادلوں کو وہ راگ سنانا چاہیے۔

شفیع عقیل کی کتاب "سرخ سفید سیاہ"
سے آذین رضوان، کراچی کا انتخاب

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ان کو بھی مل جائے گی۔ پہلے آپ تو لیں۔''
شہلا کے بعد حامد کو بھی چائے دی گئی۔ بسکٹ بھی دیے گئے۔ وکیل صاحب چائے ختم کرتے ہی کیس فائل کرنے کے لیے روانہ ہونے لگے لیکن اس سے پہلے انہوں نے حامد سے کہا۔'' حامد صاحب! ایک ہزار روپے تو دیں۔''
''ایک ہزار...... وہ کیوں؟''
''بھئی بلڈنگ کے مفاد کے لیے میں آپ سے اپنی وکالت کی فیس تو نہیں لے رہا لیکن تھانے والوں کو کچھ دینا پڑے گا۔''
''تھانے والوں کو...... میں سمجھا نہیں۔''
''ارے بھائی۔ اس کی ایف آئی آر کٹے گی۔'' وکیل نے کہا۔'' تاکہ مالک کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔ پھر آپ کی طرف سے کیس فائل ہوگا اور آپ کے حق میں فیصلہ ہوتے ہی اسی لاکھ روپے مل جائیں گے۔''
''بھائی جان! اور یہ فیصلہ کتنے دنوں میں ہوگا؟'' حامد نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ اب اس کا پیر اچھا خاصا درد کرنے لگا تھا۔
''کم از کم پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔'' وکیل نے بتایا۔'' وہ بھی اس لیے کہ یہ ایمرجنسی کیس ہے۔''
''وکیل صاحب! کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں۔'' حامد چلآیا۔'' میں پندرہ دنوں تک اسی طرح لٹکا رہوں۔''
''تو کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔'' وکیل طنزیہ انداز میں بول کر دوسروں سے مخاطب ہوا۔
''کیوں بھائیو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
''نہیں بھائی جان! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ رقم بھی تو معمولی نہیں ہے۔ اسی لاکھ کم نہیں ہوتے۔''
''حامد میاں!'' ایک بزرگ نے مخاطب کیا۔
''جی فرمائیں۔'' حامد جھلا کر بولا۔
''تم کو تو یاد ہوگا بیٹا کہ میں تمہارے والد صاحب کا دوست ہوا کرتا تھا۔'' بزرگ نے کہا۔'' اور میں بھی اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔''
''جی فرمائیں۔''
''بیٹا! تمہارے والد مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ تو تم بھی میرا خیال رکھنا بیٹا۔''
''آپ بتا تو دیں...... کیسے خیال رکھوں۔''
''بیٹا! صرف دس لاکھ۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ دونوں اس دس لاکھ میں نمٹ جائیں گی۔''

''نمٹ تو جائیں گی لیکن دس لاکھ آپ کو کہاں سے دوں؟''
''وہ جو اسی لاکھ ملیں گے بیٹا...... ان میں سے دس مجھے دے دینا۔ زندگی بھر دعائیں دوں گا۔ میری بیٹیاں بھی یاد کیا کریں گی۔''
''اوہو! کہاں ہیں میرے پاس اسی لاکھ۔''
''میں جانتا ہوں بیٹا۔ مجھے اس وکیل پر پورا بھروسا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔'' بہت قابل آدمی ہے۔ یہ تم کو اسی لاکھ دلا کر رہے گا۔''
''چاچا میاں۔'' شہلا نے بزرگ کو مخاطب کیا۔
''آپ کو شرم آنی چاہیے کہ ایک آدمی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور آپ اس کے پیسوں سے اپنا حصہ مانگنے چلے آئے ہیں۔'' پھر اس نے سب کی طرف دیکھا۔'' آپ سب کان کھول کر سن لیں۔ ان کے پاس جتنے پیسے ہوں گے، ان کا حساب کتاب میں رکھوں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کوئی دس لاکھ لے کر چلا جا رہا ہے۔ کسی کو پانچ مل رہے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ایک پائی کا حساب میرے پاس ہوگا۔''
''کیوں! کیا تم حامد صاحب کی بیوی ہو؟'' ایک عورت نے جل کر پوچھا۔
''ہوں تو نہیں۔ لیکن ہو بھی سکتی ہوں۔'' شہلا تڑخ کر بولی۔
حامد مسکرا دیا۔ اس دوران پہلی بار اس نے خوشی کی کوئی خبر سنی تھی۔ اس نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ لگاوٹ بھرے انداز میں حامد کو دیکھ رہی تھی۔
اچانک ایک عورت نے اعلان کیا۔'' حامد بھائی! آج رات کا کھانا میری طرف سے ہوگا۔ آپ بتا دیں، آپ کی پسندیدہ ڈش کیا ہے۔ دیکھیں صاحب تکلف مت کیجیے گا۔''
''یہ لو۔'' ایک دوسری عورت چمک کر بولی۔'' رات کے کھانے کا تو میں نے سوچ رکھا تھا۔''
''چلو۔ تم صبح کا ناشتا کرا دینا حامد بھائی کو۔''
حامد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے رونا چاہیے یا ہنسنا چاہیے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو اسی لاکھ کا آسرا ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شہلا جیسی لڑکی کی توجہ حاصل ہونے لگی تھی۔ یہ سب اسی سیڑھی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔
''حامد صاحب! کیا آپ کے ساتھ یہ پہلا حادثہ ہے یا پہلے بھی ہو چکا ہے؟'' خطبی اکرم نے پوچھا۔
حامد بھنا کر رہ گیا۔'' آپ کا کیا خیال ہے کہ مجھے اس قسم کی مصیبت میں پڑنے کا شوق ہے؟''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بہت سے لوگ پبلسٹی کے لیے بھی اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ نائیجیریا کا ایک آدمی بغیر پیراشوٹ جہاز سے کود کر مر گیا تھا۔"

"معاف کیجیے گا۔ مجھے ایسی بے تکی موت کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے پیسوں کے لالچ میں ایسا کیا ہو۔ اسّی لاکھ کے لیے تو آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"بے وقوف انسان۔" ایک بزرگ خفا ہوگئے۔

"اب اس بے چارے حامد کو کیا معلوم کے یہ سودا اسّی لاکھ میں ہوگا۔"

"ارے سب جانتا ہوں میں۔ یہ سب اس وکیل اور اس شخص کی ملی بھگت ہے۔" اکرم نے کہا۔

حامد کا دل چاہا کہ وہ کسی طرح اس سیڑھی سے باہر نکل کر اس کم بخت کا گلا دبا دے لیکن اس کا بدلہ اس شخص نے لے لیا تھا جس نے حامد کی حمایت کی تھی۔ اس نے ایک زوردار گھونسا اکرم کو جڑ دیا تھا۔ بدلے میں اکرم نے اسے ٹکر ماردی تھی۔

ذرا سی دیر میں وہاں بلوا ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ اکرم کی حمایت میں آگئے تھے اور کچھ اس دوسرے شخص کی حمایت میں۔ اچھی خاصی مار پیٹ ہونے لگی تھی۔

اتنی دیر میں شہلا حامد کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کی توجہ لڑنے والوں کی طرف تھی۔

"شہلا!" حامد دھیرے سے بولا۔ "میری ٹانگ اب حرکت کرنے لگی ہے۔ میں اب بڑی آسانی سے اس پھندے سے نکل سکتا ہوں۔"

"نہیں حامد نہیں..... پلیز ایسا مت کرنا۔" شہلا بوکھلا کر بولی۔

"وہ کیوں۔" حامد حیران رہ گیا تھا۔

"خود سوچو۔ اگر تم نے خود کو باہر نکال لیا تو ہمارے خوابوں کا کیا ہوگا۔ تم اسّی لاکھ روپے کہاں سے حاصل کروگے۔ قدرت نے تمھیں زندگی سنوارنے کا ایک موقع دیا ہے۔ اس چانس کو... برباد مت کرو۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔"

"شہلا! یہ دیکھو۔ کیا میں پندرہ دن اسی طرح گزار دوں۔" حامد نے پوچھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں تم نے اپنی پوری زندگی اسی طرح گزار دی ہے، وہاں پندرہ دن اور سہی۔" شہلا نے کہا۔ "اور میں تمھیں خوش کرنے اور بہلانے کے لیے ساری کوششیں کروں گی۔"

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سا ماضی میں جھانکیے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی نیشنل عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جسٹس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں تھیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسراقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے۔ وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

چنانچہ پارٹیاں بنتی بھی رہیں اور ٹوٹتی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آئیں، کیسے کیسے حمایتی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گن گا رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کررہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آرہا ہے۔ لاکھ روغن بادام ملو، چاہے جتنا خمیرہ گاؤزبان عنبرین کھلاؤ، کتنا ہی شربت انار پلاؤ، اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔ چلیے حساب صاف ہوگیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی کئی بنی ہیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو دیکھ لیجیے۔ کتنی لیگیں بن گئیں۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

لوگوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا اب ختم ہو چکا تھا۔
اس بلڈنگ کی یونین کے صدر نے ان لوگوں کو سمجھایا تھا۔ ''دیکھو...... اگر ہم لوگ آپس میں اسی طرح جھگڑا کرتے رہے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''
''تو اب کون سا آ رہا ہے۔''
''آ رہا ہے۔'' صدر مسکرا دیا۔ ''میں نے پورا حساب لگالیا ہے۔ دیکھو، اگر ہم کیس جیت جاتے ہیں تو چالیس لاکھ سیدھے سیدھے حامد کے ہو جائیں گے۔''
''حامد کو اتنی سی بات کے لیے چالیس لاکھ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔'' کسی نے اعتراض کیا۔
''نہیں کیونکہ ان پیسوں پر اسی کا حق ہے۔'' صدر نے کہا۔ ''ہمیں انصاف سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ قیامت کے دن خدا کے سامنے بھی پیش ہونا ہے۔ ہم نے اگر حساب کتاب میں غلطی کی تو ہمارا محاسبہ کیا جائے گا۔''
سب نے صدر کی اس بات کی تعریف کی کیونکہ سب ہی خدا کے خوف سے لرز اٹھے تھے۔
''چلیں۔ مان لیا حامد کو چالیس لاکھ مل گئے۔ اس کے بعد کا کیا حساب ہوگا۔''
''بقیہ چالیس میں سے پانچ وکیل صاحب کو چلے جائیں گے۔'' صدر نے بتایا۔ ''کیونکہ ساری محنت وکیل صاحب کی ہوگی۔''
''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' سب نے تائید کی تھی۔
''اس کے بعد رہ جاتے ہی پینتیس لاکھ...... ہماری بلڈنگ کے دونوں بلاک میں بیس افراد رہتے ہیں اور بیس فیملیز تو ہر فیملی کو ڈیڑھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ اور یہ بھی کچھ کم نہیں ہے، کیونکہ یہ رقم ہمیں بغیر کسی محنت کے یوں ہی مل رہی ہے۔''
''یہ بات تو ہے۔ انصاف اسی کو کہتے ہیں۔''
ان لوگوں کی باتوں سے بے خبر حامد اور شہلا اپنی پلاننگ میں مصروف تھے۔ شہلا کہہ رہی تھی۔ ''سنو حامد! اب چونکہ مجھ میں اور تم میں کوئی دوری نہیں رہی...''
''دوری تو ہے۔'' حامد نے اس کی بات کاٹ دی۔
''اوہو، میرا مطلب ہے کہ نہیں رہے گی۔'' شہلا نے کہا۔ ''اس لیے میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ تم اپنا سارا حساب کتاب میرے ہاتھ میں دے دو گے۔''
''ظاہر ہے۔'' حامد نے پیار بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''تو ہم سب سے پہلے اس بلڈنگ کو چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے کیونکہ اب ہمارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہاں کے لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ ہاں، پچاس لاکھ سے تم اپنا کوئی بزنس شروع کر دینا۔ میرا خیال ہے کہ بوتیک کا کام سب سے اچھا رہے گا۔ میں خود فیشن ڈیزائنر ہوں، اسی لیے میں وہ بزنس سنبھال سکتی ہوں۔''
''چلو۔ جیسے تمہاری مرضی۔'' حامد کی آنکھوں میں بہت سے خواب اتر آئے تھے۔
''اور ایک بات اور......شادی کے بعد ہم سب سے پہلے اسلام آباد اور مری وغیرہ کی سیر کو جائیں گے۔''
''چلو یہ بھی منظور ہے۔ میں تو اب تمہارے کہنے پر چل رہا ہوں۔''
اس دوران میں ایک آدمی ان دونوں کے پاس آ گیا۔ ''معاف کیجیے حامد صاحب! میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ میرا نام مختار ہے۔ میں پچھلے ہفتے اس بلڈنگ میں کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں خود وکیل ہوں اور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتا ہوں۔''
''جی فرمایئے مختار صاحب۔''
''جناب! مجھے جیسے ہی آپ کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کی خبر ملی، میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ سیدھا جج کے پاس پہنچ گیا۔''
''جج کے پاس! وہ کیوں؟''
''آپ کے کیس کو اسٹرونگ بنانے کے لیے۔ جج سے بات ہو چکی ہے۔ آپ کو ایک کروڑ پچاس لاکھ ملنے والے ہیں۔ وہ یہی فیصلہ سنائے گا۔''
''کیا!'' حامد کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ''ایک کروڑ پچاس لاکھ۔''
''جی ہاں۔ میں بھی کچا کام نہیں کرتا۔''
اسی وقت وہ سیڑھی تھوڑی سی ہلی۔ لکڑی کا زینہ چرمرا کر ٹوٹ گیا اور حامد قلابازیاں کھاتا ہوا چیختا ہوا، نیچے گرتا چلا گیا۔ سر کے بل گرنے کی وجہ سے اس کے دماغ میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ہاسپٹل تک جاتے جاتے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔
اس کی موت کے بعد صرف اتنا ہوا کہ بلڈنگ کے مالک نے لکڑی کا زینہ ختم کروا کے سیمنٹ کا پکا زینہ بنوا دیا اور اس کیس کو حادثہ قرار دے کر فراموش کر دیا گیا۔
اب اس بلڈنگ کے وہی شب و روز ہیں۔ وہی زندگی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ سیڑھیاں پختہ ہونے کے بعد اب اس بات کا بھی امکان نہیں رہا کہ ایسا کوئی اور حادثہ کسی اور حامد کے ساتھ پیش آ جائے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تنہائی

نادیہ نور

رقابت اور انتقام میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا سوائے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے... جیون ساتھی جب بار بار ساتھ بدلنے کا عادی ہو تو نہ منزل اس کی منتظر ہوتی ہے اور نہ ہی رستے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس نے بھی "جب میرا نہیں تو کسی کا نہیں" والے فارمولے پر عمل کر ڈالا اور اپنی زندگی سے مطمئن ہو گئی۔

خون جما دینے والے برفیلے موسم کی لہو گرما دینے والی واردات کا احوال

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لیون کے رخصت ہونے کے بعد کی رات کرسٹی نے خواب دیکھا کہ وہ منجمد ہو گئی ہے۔ خواب میں کرسٹی نے خود کو دوری سے دیکھا تھا کہ وہ چت پڑی ہوئی ہے۔ اس کا جسم ایک سفید رنگ کے سلیب کے اندر رکھا ہوا ہے۔ بکھرے ہوئے بال چہرے پر پڑے ہیں۔ آنکھیں مندی ہوئی اور منہ کھلا ہوا ہے۔ وہ گھبرا کر جاگ اٹھی اور جلدی سے لیمپ روشن کر دیا۔ لمحہ بھر تک اس نے ان آوازوں کو سنا جو گیراج کا دروازہ ہوا کے زور سے بار بار کھلنے اور بند ہونے سے

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

بلند ہورہی تھیں۔

یہ آوازیں رات کے سناٹے میں آسیبی سی لگ رہی تھیں۔ وہ بستر سے اتر کر نچلی منزل کے ہال میں گئی۔ راستے میں بجلی کے ہر بٹن کو دبا کر بتی جلادی تھی۔ کرسٹی نے نیچے پہنچ کر کچن کے نل کو کھولا۔ ایک تیز آواز کے ساتھ پانی نے گرنا شروع کردیا۔ اس نے چلو میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر چھڑکا پھر گلاس بھر کے پانی پیا اور سنک کے اوپر موجود کھڑکی کے شیشے پر آنکھیں جما کر باہر کی طرف جھانکا۔ رات صاف تھی۔ درختوں کی قطاروں میں سے باہر کا اسٹور والا شیڈ جو صحن کے عقب میں تھا، نظر آرہا تھا۔ گرنے والی برف اس کی چھت تک پہنچ رہی تھی۔ گیراج کا دروازہ ہوا کے ایک جھونکے سے پُرشور آواز میں کھلا اور بند ہوگیا۔ اسے بند کرنے کے لیے کرسٹی کا باہر نکلنا ضروری تھا جہاں سے کوئی چیختا بھی تو اس کی آواز ہوا کے جھکڑوں میں گم ہوجاتی بیڑک کے اس پار کرسٹی کے قریب ترین پڑوسی کا گھر کئی فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہوا سے کھڑکی کا شیشہ کھڑکھڑایا۔

"خوب! تم مجھے اس قدر ٹھنڈے موسم میں چھوڑ کر چلے گئے۔" کرسٹی نے خود کلامی کی۔

کرسٹی کو لیون کے معاشقے کا علم تھا۔ اتوار کی ایک سہ پہر کو اس نے اوپری منزل پر دھرے فون کو اٹھایا تو اسے لیون کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ نچلی منزل پر کچن میں رکھے ایکسٹینشن پر بول رہا تھا۔ لیون نے کسی کو میگی کہہ کر مخاطب کیا۔ لیون کا لہجہ اس قدر رومانی تھا کہ کرسٹی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے فون کان سے لگائے باتیں سنتی رہی۔ بعد میں اس نے اس معاشقے کو لے کر لیون سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے انتظار تھا کہ کب یہ معاملہ ختم ہوتا ہے مگر یہ معاملہ خاصا لمبا ہوگیا تھا۔

اسی وقت فون بجنے لگا۔ کرسٹی نے گلاس سنک پر رکھا اور مڑی۔

"ہیلو" فون اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ صرف ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی تیز تیز سانس لے رہا ہو۔ "کون ہے؟" کرسٹی نے پھر پوچھا مگر اس بار بھی جواب کے بجائے اسے ہانپ ہی سنائی دی۔ اس نے فون بند کردیا۔ اس نے تیزی سے چلتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں۔ بتیاں جلنے دیں اور اوپر لگے دیوار گیر فون کو کھینچ دیا۔ پھر اپنے نائٹ گاؤن کو کمر کے ساتھ کس کر باندھا اور کمبل اوڑھ کر بستر میں گھس گئی۔ گھر سے باہر ہوا کے ساتھ دروازے کی کھٹا کھٹ برابر ابھر رہی تھی۔ نچلی منزل پر بار بار فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

کرسٹی نے خود کو سکیڑ کر گٹھڑی بنایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دنیا میں جانے کتنے لوگ تھے جو اپنی موت کے خواب دیکھتے تھے مگر پھر بھی سو جاتے تھے اور صبح کو انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال قبل وہ اس قصبے میں آئے تھے۔ قصبے کا نام گروٹر ہلز تھا۔ کرسٹی پرکنس فارمیسی میں ڈسپنسری ٹیکنیشن کی حیثیت سے ملازمت کرتی تھی۔ پرکنس ایک مشہور اور چلتا ہوا اسٹور تھا۔ وہاں اس کا وقت پر لگا کر گزر جاتا تھا مگر اب لیون کے جانے کے بعد یہ ایک مسئلہ تھا کہ وہ وہاں کس طرح دوسروں کا سامنا کرے گی۔ اس نے "پرکنس" کے مالک جوئے کو فون کیا اور اس سے کہا کہ اس کا ایک عزیز بیمار ہوگیا ہے اور وہ بہ عجلت جارہی ہے۔ اسے نہیں معلوم وہ کب واپس آئے گی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کے لیے جگہ خالی رکھی جائے۔ جوئے نے کہا یہ خبر اس کے لیے پریشان کن ہے۔ اب شاید ہی کوئی مناسب نعم البدل مل سکے۔ جوئے نے کرسٹی کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ایک بہترین کارکن تھی اور اسے ہر کوئی پسند کرتا تھا۔ کرسٹی کو آخری بات جھوٹی محسوس ہوئی۔ اس نے فون بند کردیا۔ فریج سے چاکلیٹ کیک نکالا۔ یہ بات جھوٹ نہیں تھی کہ کوئی بیمار ہوگیا تھا۔ دراصل وہ خود بیمار ہوگئی تھی۔ گروٹر ہلز ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیون ٹورنٹو میں ملازمت کرتا تھا جو یہاں سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ کرسٹی کو امید نہیں تھی کہ لیون کے جانے کی خبر جلدی پھیلے گی۔ اس نے میز پر بیٹھ کر کیک کھانا شروع کردیا۔

کرسٹی کو اندازہ تھا کہ میگی بھی کسٹمر سروس میں کام نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے بال جو لانبے سیاہ تھے، ایک عجیب ترغیب آمیز انداز میں بکھرے رہتے تھے۔ وہ تیز رنگوں کی لپ اسٹک لگاتی تھی جسے کرسٹی کئی بار اپنے شوہر کے کالر پر لگی دیکھ چکی تھی۔ میگی ایک تیز لہر جیسی عورت تھی۔ عورتیں جس سے چڑتی تھیں اور مرد جس پر جان چھڑکتے تھے۔

کیک ختم ہوچکا تھا اور کرسٹی گم صم انداز سے بیٹھی فون کی سمت دیکھے جارہی تھی۔ لیون کے چلے جانے کے بارے میں ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا۔ خود کرسٹی کے والدین بھی اس سے بے خبر تھے۔ کرسٹی کے ماں باپ لیون سے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے کیونکہ وہ ان دونوں کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا۔ لیون وجیہہ بھی تھا ہوشیار بھی۔ اس کا جسم کسی کھلاڑی جیسا تھا۔ وہ "دنیا فار انوسٹمنٹ" نامی فرم میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

معاشیاتی مشیر کے عہدے پر تھا اور اپنے پیشے میں بے حد کامیاب بھی تھا۔

کرسٹی کا اندازہ تھا کہ میگی، لیون کی کمپنی میں بطور کلائنٹ گئی ہوگی۔ وہیں اس کی ملاقات لیون سے ہوئی ہوگی اور پھر لیون پر اس کا جادو چل گیا ہوگا۔ اس کا حسن اور انداز کسی جادو سے کم نہیں تھا۔

صبح کی روشنی میز پر پڑ رہی تھی۔ باہر جنوری کا دن کھلا ہوا تھا مگر بے حد یخ بھی تھا۔ مناسب وقت تھا کہ گیراج کے دروازے کو ٹھیک کر دیا جاتا۔ اس وقت دروازہ آواز بھی نہیں کر رہا تھا مگر کرسٹی خود کو اس قدر بھاری محسوس کر رہی تھی کہ وہ کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون کا پلگ نکال دیا۔ وہ کسی کی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی اور باہر کی سمت دیکھنے لگی۔ برف باری پھر شروع ہوگئی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما کی پیش قدمی کے ساتھ برف کے ڈھیر بلند ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ یہ اتنی بلند ہوگئی کہ اگر وہ اس میں سے اپنی کار نکالنا چاہتی تو کئی گھنٹے کھدائی کرنا پڑتی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اسے کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ وہ سو کر وقت گزار رہی تھی حالانکہ اس کا خوفناک خواب ساتھ تھا۔ وہ جلدی سونے لیٹ جاتی تھی۔ بتیاں جلنے دیتی اور دوسرے دن دوپہر میں بڑی مشکل سے اٹھتی اور صرف ضروری کام مثلاً منہ دھونا، کپڑے پہننا وغیرہ تک ہی خود کو محدود رکھتی تھی۔ ویلنٹائن ڈے پر رات کو کوئی نو بجے اس نے اپنے عقبی دروازے پر کسی کی دستک سنی۔ کرسٹی اس وقت لیونگ روم میں ایک کتاب لیے صوفے پر دراز تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں گئی، اس نے سوچا یہ کون ہوسکتا ہے؟ کوئی قاتل...... اسے ہر روز خوفناک خواب دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار ایک جیسا خواب دیکھنے کی وجہ سے وہ منظر کی جزئیات سے اچھی طرح آگاہ ہوگئی تھی۔ برف تلے اس کا برہنہ جسم...... گھٹنے تھوڑے سے سکڑے ہوئے...... اس کی سپید رنگت...... سر پر پیشانی سے اوپر ایک زخم کا نشان اور خون کی ایک خشک لکیر پیشانی تک آتی ہوئی...... کسی کھلے ہوئے منہ جیسی۔

دستک پھر سنائی دی۔ کرسٹی دروازے کی طرف گئی۔ ''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں مارکس ہوں۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''سڑک کے پار رہتا ہوں۔ تمہارے لیے لکڑیاں لایا ہوں۔'' کرسٹی نے دروازہ غیر مقفل کیا۔ دوسری طرف مارکس جون کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے زرد دانت نظر آنے لگے۔ ''ہائے کرسٹی! میں لکڑیاں لایا ہوں۔ بالکل خشک ہیں۔'' وہ دروازے سے اندر آ گیا۔

''انہیں ادھر ہی ڈال دو۔'' کرسٹی بولی۔

''نہیں...... میں انہیں آتش دان کے پاس رکھ دیتا ہوں۔'' مارکس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ وہ کچن سے گزر کر لیونگ روم میں گیا۔ کرسٹی سینے پر ہاتھ باندھے دیکھتی رہی۔ مارکس نے لکڑیاں آتش دان کے پاس قرینے سے رکھ دیں۔ مارکس سڑک کے پار اپنے بوڑھے انکل کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دو بیویاں اور متعدد بچے چھوڑ کر ادھر آیا تھا۔ مارکس نے لکڑیاں رکھ کر خود کو سیدھا کیا۔ ہاتھ جھاڑے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کرسٹی نے سوچا کہیں یہ پیے ہوئے تو نہیں ہے۔ ''مجھے تمہارا خیال آ تا رہا ہے۔'' مارکس نے کہا۔ ''تم ادھر بالکل اکیلی رہ رہی ہو اور موسم اتنا سرد ہے۔ بجلی کسی وقت بھی جاسکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا تم سردی میں ٹھٹھرو۔''

''شکریہ۔'' کرسٹی نے کہا اور پشیمان ہونے لگی کہ مارکس کو اندر کیوں آنے دیا پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''لیون تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔ مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ اسے کچھ دیر ہوگئی ہے پہنچنے میں...... وہ کسی بھی وقت آجائے گا۔''

مارکس نے کرسٹی کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''وہ آج رات آرہا ہے؟ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مہینے بھر سے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

''وہ ملک سے باہر گیا تھا بزنس پر۔ آج رات آرہا ہے۔'' کرسٹی نے جواب دیا۔

''کمال آدمی ہے لیون۔ تمہیں اکیلا چھوڑ گیا۔''

کرسٹی ہال وے میں چلی آئی۔ ''لکڑیوں کے لیے شکریہ...... میں اب ڈنر بنانے والی ہوں۔''

''کسی اچھی سی عورت کو اس طرح اکیلا چھوڑنا اچھی بات نہیں۔'' مارکس نے کرسٹی کی طرف توقع کے ساتھ دیکھا۔ کرسٹی دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس نے تصور میں خود کو بھاگتے اور مارکس کو پیچھا کرتے دیکھا۔ مارکس نے اپنی من مانی کے بعد اسے مار ڈالا اور اس کی لاش جھیل کنارے لے جا کر دفن کر رہا ہے جہاں برف اسے چھپا سکتی تھی۔ اس کا خواب آنکھوں میں تیر رہا تھا۔

کرسٹی نے بڑھ کر عقبی دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک برفیلا جھونکا اندر گھسا مگر وہ اسے کھولے کھڑی رہی۔ مارکس بھی وہیں آ گیا۔ اس نے اپنے جوتے پہنے اور کرسٹی کی

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

طرف بڑھا۔اس کے جسم سے بُو آرہی تھی۔ ''ہمیں کچھ پینا چاہیے کرسٹی۔''

''نہیں۔اس وقت نہیں۔'' مارکس نے لمبی سانس لی پھر ہاتھ بڑھا کر کرسٹی کے گال چھوئے۔کرسٹی بدک کر پیچھے ہٹی۔

''تم ہمیشہ کی طرح ضدی ہو،خیر میں نزدیک ہی ہوں۔جب چاہو بلا سکتی ہو۔'' مارکس نے منہ بنایا اور باہر نکل گیا۔کرسٹی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔تمام کھڑکیاں چیک کیں۔کافی دیر تک اس کا جسم کپکپاتا رہا پھر وہ سونے کے لیے دراز ہو گئی۔

☆☆☆

مارچ کا مہینا آیا تو ساتھ تیز ہواؤں کے جھکڑ اور برف باری لایا۔برف اتنی اونچی ہو گئی کہ گیراج کا دروازہ جام ہو گیا اور اس کا کھلنا، بند ہونا مشکل ہو گیا۔البتہ اب چھت پر سے آوازیں آنے لگی تھیں۔یہ اچھی بات تھی۔اس برف باری میں کرسٹی کی طرف کوئی بھی نہیں آتا۔وہ اس برف سے گھرے گھر میں محفوظ تھی، کسی قیدی کی طرح۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ خود کو برف میں دھنسے کسی تابوت کے اندر بار بار کیوں دیکھتی ہے اور اسے اپنے قاتل کا چہرہ کیوں نہیں نظر آتا۔اگلے دن کرسٹی دیر سے اٹھی۔دو بج رہے تھے۔بیڈ روم میں دھرے کپڑوں کے ڈھیر سے ایک لباس نکال کر پہنا۔کچن میں جا کر کافی بنائی۔سنک میں گندی پلیٹوں اور برتنوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو رہا تھا۔کچن کی ونڈو آدمی کے قریب برف سے اٹ گئی تھی۔کرسٹی نے گرم کافی کا مگ سامنے رکھا اور کھڑکی پر برف سے بننے والے نقوش کو گھورنے لگی۔اسی لمحے اس نے فرنٹ ڈور پر کسی کی دستک سنی۔پہلے اسے گمان ہوا۔دستک دوبارہ سنائی دی۔کرسٹی نے لیونگ روم کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔باہر ایک لمبا شخص نیلے رنگ کے اوورکوٹ میں نظر آیا۔ہوا سے بچنے کے لیے اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔کرسٹی کو وہ معقول اور مہذب آدمی محسوس ہوا۔اس نے دروازہ کھول دیا۔

''ہیلو کرسٹی! میں زیلر ہوں۔'' آدمی بولا۔کرسٹی کو سڑک پر ایک سرخ کار کھڑی نظر آئی۔

''میں زیلر لیو ہوں...... میگی کا شوہر۔''

''اوہ۔تم میگی کے شوہر ہو۔'' کرسٹی نے دھیرے سے کہا۔

''کیا میں اندر آجاؤں؟'' کرسٹی نے اسے راستہ دیا۔زیلر نے اپنے جوتے اتار دیے۔وہ برف سے اٹے ہوئے تھے۔اندر آکر اس نے کوٹ اتار کر ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

کرسٹی صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔زیلر نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو گھمایا۔''میں میگی سے ایک مالی معاملے کو لے کر بات کرنا چاہتا ہوں۔تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

''نہیں۔''

''جانے سے قبل لیون نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''نہیں، کچھ نہیں کہا۔'' کرسٹی بولی۔

زیلر خاموش ہو کر زمین کو گھورنے لگا۔کرسٹی کو حیرت ہوئی کہ میگی جیسی عورت نے آخر اس سے کس طرح شادی کر لی تھی۔زیلر بظاہر تو بے ضرر سا لگ رہا تھا مگر پھر کرسٹی کو اپنا خیال آیا۔وہ خود بھی کوئی حسینہ نہیں تھی جبکہ لیون کسی ہیرو جیسا آدمی تھا۔لوگوں کی نگاہیں پہلی بار دونوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتی تھیں۔شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ لیون جیسے شخص نے ایسی لڑکی سے کیسے شادی رچالی۔

''میگی نے میرے ساتھ بے وفائی کا سلسلہ کافی عرصے قبل ہی شروع کر دیا تھا۔تمہارا شوہر اس کی زندگی میں کوئی نیا نہیں تھا۔'' زیلر تلخی سے بولا۔

''میں جب گھر آیا اور میگی کے کمرے میں گیا تو مجھے بستر بکھرا ہوا ملا تھا۔غالباً وہ لیون کو گھر پر ہی بلایا کرتی تھی مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میگی نے گھر سے یا پھر اپنے اکاؤنٹ سے کوئی رقم نہیں نکالی۔''

''لیکن لیون کے اکاؤنٹ میں ہزار ڈالرز تھے، مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے ساری رقم نکال لی تھی مگر مجھے فرق نہیں پڑتا۔میرے پاس یہ گھر ہے، کار ہے اور میری اپنی رقم بھی ہے۔''

کرسٹی نے رکھائی سے کہا۔

''خوب! تو وہ دونوں دنیا بھر کی سیریں کر رہے ہوں گے۔'' زیلر نے بولتے ہوئے اپنی ٹائی ڈھیلی کی اور اسے اتار کر جیب میں ٹھونس لیا۔

''اگر میگی کوئی رقم لے کر نہیں گئی تو پھر کون سا مالی معاملہ ہے جس کے لیے تم بات کرنا چاہتے تھے؟'' کرسٹی کو زیلر جھوٹا محسوس ہوا۔رقم والی بات پر ہی کرسٹی کے دماغ کو جھٹکا لگا تھا۔اسے خجالت ہونے لگی۔زیلر اچھا آدمی نہیں تھا۔اسے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

زیلر کی آنکھیں کرسٹی کا جائزہ لے رہی تھیں۔اس نے کرسٹی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔زیلر نے عجیب سی نظروں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے کرسٹی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟'' کرسٹی نے اس کے سوال کو گول کر دیا اور بولی۔

''میگی کیسی تھی؟''

زیلر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر ناگواری سے بولا۔ ''وہ...... وہ ایک سرپھری عورت تھی۔''

کرسٹی نے سر جھکا لیا اور سوچا کہ زیلر لیو نامی یہ شخص عورتوں کو سودے بازی کی کوئی چیز سمجھتا ہے۔ وہ میگی سے ناخوش تھا اور اب جب وہ اس کی پہنچ سے باہر تھی تو وہ سمجھتا تھا کہ کرسٹی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ ''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے کرسٹی؟'' معاً اسے زیلر کی آواز سنائی دی۔ ''تم نے بتایا نہیں۔ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟''

کرسٹی نے سر اٹھایا اور تعجب سے بولی۔ ''کیا مطلب؟''

''جھجکنے کی ضرورت نہیں۔'' زیلر نے کہا۔ ''کرسٹی! ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیا ہمیں حق نہیں کہ ہم بھی اپنی تکلیف کا مداوا کر سکیں؟'' اس کے بعد سب کچھ اچانک ہوا۔

زیلر نے عجلت میں کرسٹی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''نہیں، چھوڑو مجھے۔'' کرسٹی نے زیلر کو دھکیلا۔

''یہ نخرے ختم کرو۔'' زیلر نے ہانپتے ہوئے کہا اور کرسٹی کو زیادہ مضبوطی سے دبا لیا۔ ''خود کو خوامخواہ اذیت میں مت ڈالو۔'' کرسٹی کو اپنا خواب یاد آیا۔ میز پر رکھا ہوا لیمپ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس کی ضرب سے زیلر کا سر آسانی سے پھوڑا جا سکتا تھا۔ کرسٹی نے زیلر کے ہاتھوں کو محسوس کیا جو اس کا لباس کھولنا چاہتے تھے۔ اسی لیے کرسٹی کو لیون پر شدید غصہ آیا۔ وہ شادی کے دنوں میں ایک کتے کی خواہش مند تھی مگر لیون کتے کے لیے رضامند نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں ایک کتے نے اسے کاٹ لیا تھا تب سے وہ کتوں سے ڈرنے لگا ہے لیکن کرسٹی نے اکثر دیکھا تھا کہ عام زندگی میں لیون کتوں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ کرسٹی کوئی کتا پالے۔

یہ ویسا ہی ایک معما تھا جیسا لیون گھر میں کوئی بچہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت کرسٹی پاگل ہو رہی تھی، اسے کتے کا نہ ہونا کھل رہا تھا۔ وہ برف کی قبر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ ''اوکے۔'' اس نے جدوجہد ترک کرتے ہوئے زیلر سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اپنے نقصان کی تلافی کا حق ہے۔ میری کلائیاں چھوڑ دو۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔'' زیلر نے کرسٹی کی کلائیاں چھوڑ کر ہولے

اصل خطرہ

بیٹے کی درخواست پر باپ نے اسے خود حفاظتی کے سارے گر سکھا دیے پھر تکے بازی کی بھی ساری مشق کروانے کے بعد باپ بیٹے سے بولا۔ ''اب تم اسکول میں کسی بچے سے دب کر نہیں رہو گے۔''

بیٹا۔ ''یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آپ نے بلی کی طرح ایک گر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' باپ نے حیرانی سے پوچھا۔

''مجھے ڈر لڑکوں سے نہیں تھا۔ دراصل مجھے تو ماسٹر صاحب سے خطرہ ہے۔''

سے اس کا بوسہ لیا۔ کرسٹی نے کوئی مزاحمت نہیں کی مگر آزاد ہوتے ہی اپنا ایک ہاتھ پیچھے کیا اور دوسرے ہاتھ کو زیلر کے اوپری حصے سے نچلے حصے کی طرف لے گئی۔

زیلر کے منہ سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ کرسٹی اچھل کر دروازے کی سمت لپکی جہاں گولف کلب رکھا ہوا تھا۔ وہ چھڑی ہاتھ میں اٹھا کر وار کرنے کے لیے زیلر کی طرف بڑھی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ زیلر گٹھڑی بنا ہوا فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ زیلر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا نچلا جسم دبا رکھا تھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں اور درد کی شدت سے چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

کئی سال پہلے کرسٹی نے اخبار میں ایک چھوٹا سا مضمون پڑھا تھا۔ یہ کسی بوڑھی عورت کے بارے میں تھا جسے ایک شخص نے پکڑ لیا اور اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ اس عورت نے بھی یہی وار اس پر کیا تھا۔ وہ کرسٹی کی یادداشت میں محفوظ تھا اور آج اسی طریقے نے اسے بچا لیا تھا۔

رات جب کرسٹی قصبے کے پولیس اسٹیشن میں تھی، بارش نے قصبے کو آ لیا۔ زیلر لیو کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت ایک پولیس کار نے اسے پہنچایا۔ بے شک یہاں کوئی گواہ نہیں تھا مگر کرسٹی کا کیس مضبوط تھا۔ زیلر اس کے گھر میں پایا گیا تھا۔ کرسٹی نے زیلر پر کیس کر دیا۔ اسپتال سے واپسی پر پولیس آفیسر اس کا منتظر تھا۔ گھر آ کر کرسٹی نے چند پرانے کیک کھائے۔ وہ کچن کی میز

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پر بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر بارش کا شور جاری تھا۔ ہوا میں کچھ گرمی پیدا ہوگئی تھی۔ اس سے برف کے ٹکڑے پگھلنے لگے تھے اور چھت سے نیچے آرہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جھیل پر بھی برف پگھلنے والی ہے اور آس پاس کی تمام زمین صاف ہونے والی ہے۔

سونے کے لیے جاتے ہوئے کرسٹی نے ساری بتیاں جلادیں مگر رات بھی اسے اپنا پرانا خواب نظر آیا۔ لگتا تھا اسے موت کے خیال نے مکمل طور پر جکڑ لیا ہے۔ حالانکہ دن کا تجربہ بھی خاصا اثر انگیز تھا لیکن وہ بھی خواب پر اثر نہیں ڈال سکا۔ صبح ہوئی تو کرسٹی نے محسوس کیا کہ وہ ڈری ہوئی ضرور ہے مگر اس پر قابو پاسکتی ہے۔ باہر فضا بہت شفاف سی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف تھی مگر مطلع صاف تھا اور سورج نکل آیا تھا۔ جس وقت کرسٹی نے برف پر اپنا بیلچہ مارا اسے احساس ہوا کہ برف سخت نہیں رہی، اس میں نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ تین گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے خاصی برف ہٹالی پھر گیراج میں گئی۔ کار اسٹارٹ کی اور اسے باہر نکالا۔ کار کا انجن سرد تھا مگر کام کر رہا تھا۔ قصبے کے مین بازار پہنچ کر کرسٹی نے کافی تعداد میں پھل اور سبزیاں خریدیں۔ دودھ اور دیگر اشیا بھی لیں پھر سارا سامان کار میں ڈالا۔

''ارے کرسٹی! یہ تم ہو۔'' کرسٹی کو اپنے عقب میں کسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے سرینا کھڑی تھی۔ سرینا کے شوہر اور لیون میں شناسائی تھی۔

''اوہ سرینا تم۔''

''کیا حال ہے تمہارا کرسٹی۔'' سرینا نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' کرسٹی نے احتیاط سے کہا۔

''لیون کیسا ہے؟'' سرینا نے پوچھا۔ سرینا چھوٹے قد کی خاصی موٹی عورت تھی مگر اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔

کرسٹی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ ''لیون مجھے چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ ہمارے درمیان علیحدگی ہوچکی ہے۔''

''ارے...... آئی ایم سوری۔'' سرینا ایک دم سے سنجیدہ ہوگئی۔ کرسٹی کے لیے آسانی ہوگئی پھر آرام سے سرینا کے دوسرے سوالات کو بھگتا دیا۔ چلتے چلتے کرسٹی نے سرینا سے کہا کہ لیون کسی عورت کے ساتھ کہیں فرار ہوگیا ہے۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں۔ تم اسے دوسروں کو بتا سکتی ہو۔ میں یہیں رہوں گی۔ فی الحال کام نہیں کر رہی مگر جلد دوبارہ اسٹور پر چلی جاؤں گی۔

گھر پہنچ کر کرسٹی نے گھر کی صفائی شروع کردی۔ وہ آدھی رات تک لگی رہی اور... بالآخر اس نے گھر کو اچھی حالت میں کرلیا۔ اس کے بعد کرسٹی نے غسل کیا اور کھانا کھایا۔ پھر اپنے صاف ستھرے بستر پر لیٹ گئی۔

آنے والے ہفتے میں کرسٹی نے لیون کی تمام چیزیں، لباس اور جوتے وغیرہ جمع کیے اور ضرورت مندوں کو خیرات کردیے پھر تمام الماریاں اور کھڑکیاں صاف کیں۔ لیون کی تمام تصویروں کو جمع کیا اور بنڈل بنا کر بکس میں بند کرکے تہ خانے کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ تہ خانے سے ہی کرسٹی نے باغبانی اور لکڑی کے کام والے اوزار نکالے اور گھر کی صفائی اور مرمت کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔

ایک صبح کرسٹی فون کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور فون ملایا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بات کرنا چاہتی تھی جو کسی اور شہر میں رہتے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس کے اور لیون کے بارے میں ماں نے جان کر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی۔ تب کرسٹی نے پوچھا۔

''مگر مام! تم تو لیون کو بہت پسند کرتی تھیں۔''

''صرف اس لیے کہ وہ تمہیں پسند تھا۔'' اس کی ماں نے کہا۔ پھر اس کے باپ نے بات کی اور کہا۔

''کیا تم ہمارے پاس آنا چاہتی ہو؟''

''نہیں ڈیڈ۔'' کرسٹی بولی۔

''میں چالیس سال کی ہوں، کوئی بچہ بھی نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں ادھر ہی۔'' فون بند کرنے کے بعد کرسٹی نے گیراج کا دروازہ درست کیا پھر اپنے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

کرسٹی نے سوچا کہ یہ ایک اچھا مکان ہے۔ بس اس کو رنگ وروغن اور چھت کو کچھ مرمت کی ضرورت تھی۔ وہاں مکان کے آس پاس بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور اب سبزہ بکھر رہا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ یہ گھر نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہاں سے کبھی نہیں جائے گی۔ میں ایک کتا بھی لوں گی' ان درختوں میں وہ دوڑتا ہوا بہت اچھا لگے گا۔ کرسٹی سوچ بھرے انداز میں چلی اور گیراج کا دروازہ بند کردیا۔ جب وہ مڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنی طرف مارکس کو بڑھتے دیکھا۔

''ہائے کرسٹی۔'' اس نے اپنے زرد دانت نکالتے ہوئے اسے پکارا۔ ''تم نے اپنا مکان صاف کرلیا ہے' مجھے بلالیتیں میں مدد کردیتا۔'' مارکس نے رنگین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم سے کسی سستے سے پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی اور ہاتھ میں کوئی بنڈل دبا رکھا تھا۔ ''آج اتوار کی رات ہے۔'' مارکس بولا۔ ''میں نے سوچا تم تنہا ہوگی۔ تمہیں کمپنی دوں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

گا۔ کچھ پینے پلانے کی چیزیں لایا ہوں۔'' مارکس نے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے کسی کی کمپنی نہیں چاہیے مارکس۔'' کرسٹی کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ''اور سنو، میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گھر آؤ...... سمجھے۔''

مارکس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' کرسٹی نے اسی درشتی سے کہا۔ ''سردیاں سخت تھیں مگر گزر چکی ہیں اور تم مارکس...... اب میرے گھر مت آنا۔ ورنہ میں پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ بس اب چلے جاؤ۔'' مارکس نے اسے گھور کر دیکھا، مڑا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

''لعنت ہو۔'' کرسٹی نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

وہ خواب کی گرفت میں تھی اور خود اپنی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ برف کے نیچے دبی ہوئی آنکھیں جن کا رنگ نیلا تھا' اب سرمئی ہو گئی تھیں۔ چہرے کے زاویے اور گوشت سیاہ ہو گئے اور پھول چکے تھے۔ کرسٹی اپنی برف میں دبی ہوئی لاش کے ساتھ تھی اور قاتل کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کرسٹی نے سوچا آخر مجھے کہاں ڈالا گیا ہے؟ میں کہاں مدفون ہوں؟ خواب میں کرسٹی کو بس اس قدر ہی پتا چلتا تھا کہ اسے جھیل کے آس پاس کہیں دفن کیا گیا ہے۔ وہ خواب کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستگی سے چل رہی تھی کہ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اسے لگا جیسے ہر منظر دھندلا ہو کر ایک سیاہ دیوار بن گیا ہو۔ کرسٹی نے خود کو سنبھالا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ سلیب غائب ہونے لگی۔ اب اسے ایک چھت نظر آ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بلند ہو رہی ہے، فضا میں اٹھ رہی ہے۔ کرسٹی نے نیچے چھت کو دیکھا پھر یہ چھت بھی چھوٹی ہو گئی۔ وہ بہت اوپر اٹھ گئی تھی۔ اب نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح گرم تھی۔ برف نے اب تیزی سے پگھلنا شروع کر دیا تھا۔ پانی چلنے کی نرم آوازوں سے فضا گنگنا رہی تھی۔ کرسٹی نے ایک بیلچہ سنبھالا اور ٹول بکس بغل میں دبایا اور صحن کے عقبی حصے کی سمت چل پڑی۔ یہاں کا شیڈ پتلی دیواروں کا تھا۔ اس کی چھت بھی ٹپکتی تھی۔ یہاں انہوں نے اپنے گھر کا کاٹھ کباڑ ڈال رکھا تھا۔ کرسٹی نے برف صاف کی اور کھینچ کر اس کا دروازہ کھول دیا۔ اندر کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ یہاں نمی اور ٹھنڈک تھی۔ عجیب سی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں کی درزوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی اور نقش و نگار بنا رہی تھی۔

اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی وہ جگہ ہے جو اسے خواب میں ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی۔ یہی اس کا مدفن ہے۔ اس کی لاش یہیں دفن ہے۔ کرسٹی نے لمبی سانس لی اور سوچا کہ انسانی ذہن کیسا کرشمہ ساز ہوتا ہے۔ پھر رک کر فرش کے ایک کونے کی طرف دیکھا اور اپنا ٹول بکس کھولنے لگی۔ وہ کونے کے تختے اکھاڑ رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے جب کئی تختے اکھاڑ دیے تو بیلچہ سنبھالا اور زمین کھودنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد اسے وہ سلیب دکھائی دے گئی۔ اس پر برف کی چھ انچ موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ کرسٹی نے سلیب ہٹا کر نیچے نگاہ ڈالی۔ میگی زیلر...... اب اتنی حسین نہیں نظر آ رہی تھی جیسی وہ ہوتی تھی...... اور اس کے پاس لیون بھی پڑا ہوا تھا۔ اب وہ بھی اتنا خوب صورت نہیں رہا تھا۔

کرسٹی ان دونوں کو دیکھتی رہی...... بالکل غیر جذباتی انداز میں۔ ''تم لوگ ابھی تک گلے سڑے نہیں؟'' کرسٹی نے خود کلامی کی۔ اس کے دماغ میں کچھ عرصہ پہلے کی باتیں گھومیں۔ جب وہ آفس سے لوٹی تھی تو اس نے دروازے پر دو عدد سوٹ کیس دیکھے۔ لیون گھر میں میگی کی لاش کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

لیون نے اعتراف کیا کہ اس کا میگی سے معاشقہ تھا مگر میگی عیاش عورت تھی۔ جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے نیا عاشق ڈھونڈ لیا اور لیون کو چھوڑ دیا۔ اسی بات پر لڑائی ہوئی اور غصے میں آ کر لیون نے میگی کا گلا دبا دیا جس کے باعث وہ مر گئی۔ لیون گرفتاری کے ڈر سے میگی کی لاش کو چھپا کر امریکا جا رہا تھا۔ اس نے اکاؤنٹ سے تمام رقم نکال لی تھی اور کرسٹی سے کہا کہ وہ بعد میں اسے بھی بلا لے گا اور پھر جب وہ لاش کو یہاں دفن کر رہا تھا تو بیلچے کی ایک ضرب سے اس نے لیون کو بھی میگی کے پاس پہنچا دیا۔ باقی کام کرسٹی نے خود کیا تھا مگر اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے سلیب کے پانی کو رہنے دیا جو برف بن گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ لاشیں ابھی تک گلی نہیں تھیں۔ کرسٹی نے اوزار پھینک دیے۔ ہاتھ جھاڑے اور بولی۔

''اگلی سردیوں تک تمہاری شکلیں مسخ ہو چکی ہوں گی اور پھر تمہیں جھیل کنارے پہنچانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہو گی۔''

اس کے بعد کرسٹی نے سامان اٹھایا۔ شیڈ کے دروازے تک آئی اور مڑ کر خلا میں دیکھا اور بڑبڑائی۔

''گڈ بائی...... اینڈ گڈ لک۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حریف

نشور ہادی

”تیرا عشق نچائے گلی گلی“ کی عملی تفسیر بنی وہ بھی ہجر سے بچنے کے لیے ہجرتوں پر مجبور تھی کیونکہ... چاہتوں بھرا ساتھ پانے کے لیے اسے زندگی کی ضرورت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان غیروں سے تو جنگ کرسکتا ہے مگر اپنی ذات اور اپنے رشتوں سے لڑنا آسان نہیں ہوتا اور اسے بھی یہی کٹھن مرحلہ درپیش تھا کہ اس کے مدِمقابل غیر نہیں اپنے تھے، جن کی دسترس سے دور وہ در در بھٹکتی روح بن گئی تھی اور اس سفر نے اسے یہ باور کرادیا تھا کہ انسان کا ذرہ برابر عمل بھی جزا یا سزا بن کر مکافات کی صورت اس کے سامنے آجاتا ہے... اس نے بھی بے خیالی میں ایک انسان کی محض ہمدردی کی بنیاد پر مدد کی تھی لیکن اس کا صلہ اسے کب اور کیسے ملنے والا تھا اس کا ادراک اگر اسے قبل از وقت ہوجاتا تو جی جان سے وہ اسی محاذ پر ڈٹی رہتی۔ بہرحال ایک روز اس مکافاتی عمل نے اس کی آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹا دیا اور دھندلکے میں چھپے منظر کو واضح کردیا مگر... اس پر یقین کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

حفاظت کی چادر میں چھپے نوکیلے خنجروں کی اذیت اور...... بے اعتبار رشتوں کی دلخراش داستان

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

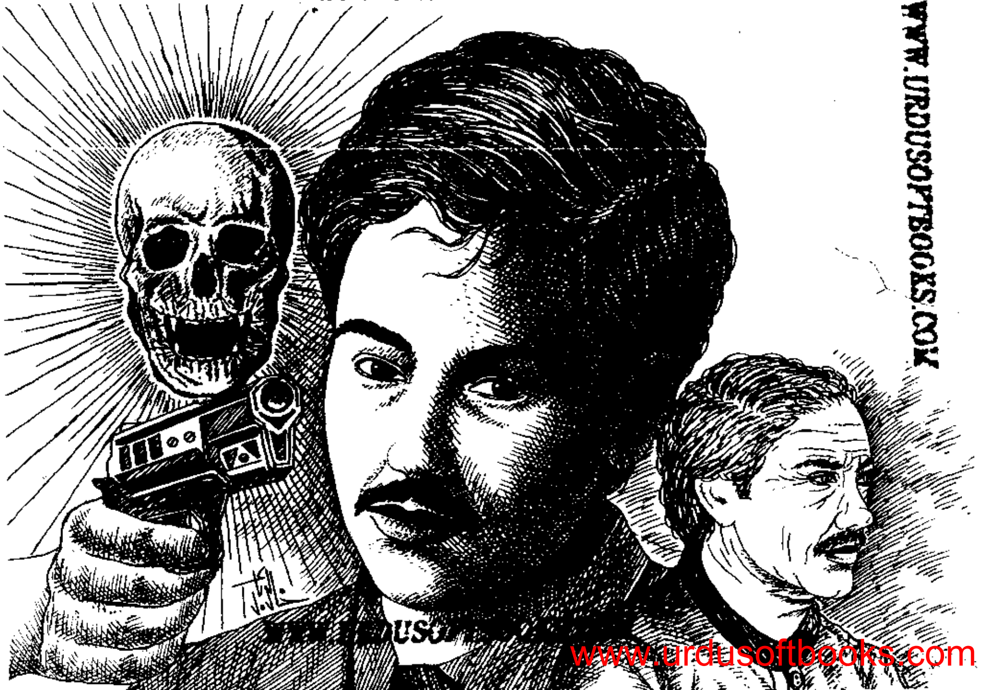

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

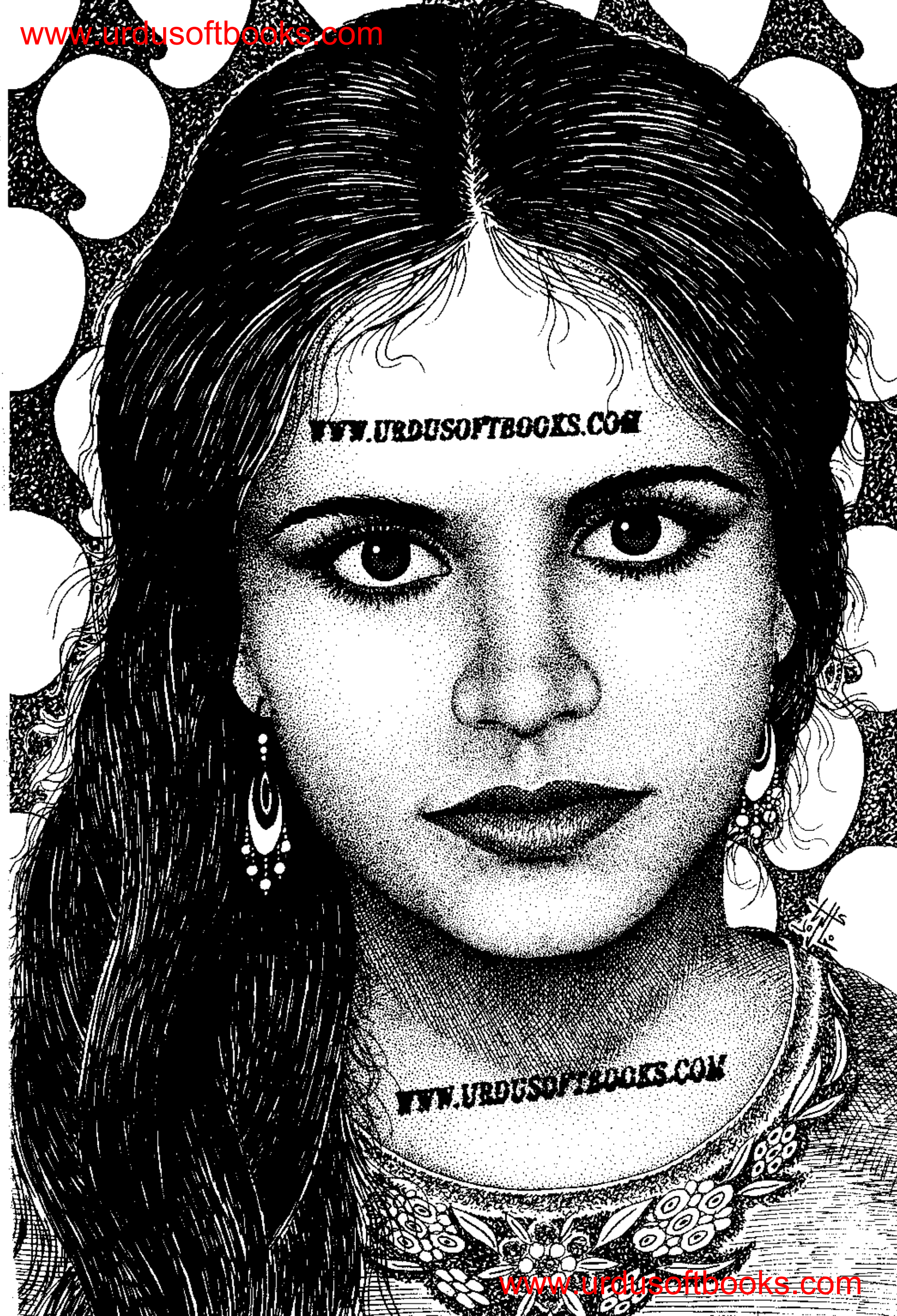

www.urdusoftbooks.com
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اشرف خاں نے سی سی فوٹیج دیکھیں اور چونک گیا۔ وہ اپنے گھر کے جس ڈرائنگ روم میں چند افراد سے جو خاص قسم کی میٹنگ کیا کرتا تھا، انہیں ہر صورت میں راز رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے کمرے کے ان بیرونی حصوں پر کیمرے لگوائے تھے جہاں سے کوئی چھپ کر میٹنگ کی باتیں سن سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ کی وہ تصویر تھی جس میں ایک لڑکی نظر آرہی تھی جس کی عمر بیس اکیس سال کے قریب تھی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ اشرف خاں وہ تصویر دیکھ کر نہ صرف چونکا بلکہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پہلو میں لیٹی ہوئی اپنی بیوی دل شاد خانم پر نظر ڈالی جو سو چکی تھی۔ اشرف خاں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''دل شاد!'' اس کی آواز بھی خاصی تیز تھی۔

دل شاد خانم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''کیا ہوا...... خیریت؟''

''صدف......'' اشرف خاں نے بیوی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''واپس آگئی ہے؟''

دل شاد خانم نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

''اس وقت کیسے خیال آگیا آپ کو؟''

''میری بات کا جواب دو!'' اشرف خاں کا لہجہ خاصا تیز تھا۔

''اب تک تو شاید آہی گئی ہو۔'' دل شاد خانم نے جواب دیا۔ ''بتا تو چکی ہوں آپ کو!...... اس کی کسی دوست کی سالگرہ تھی آج، کہہ رہی تھی کہ وہاں سے کھانا کھا کر ہی آئے گی، ہم لوگ کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میں اسے زیادہ دیر تک، رات کے وقت باہر رہنے کی اجازت نہ دیتی لیکن اس خیال سے دے دی کہ وہ کل سے بہت گم صم اور چپ چپ سی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ سالگرہ میں جا کر اس کا دل بہل جائے گا۔''

''دوبارہ یہ کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی!'' اشرف خاں پھر جھنجلا گیا۔ ''میں نے پوچھا تھا کہ وہ واپس آگئی یا نہیں۔''

''میں بھی جواب تو دے چکی ہوں۔'' دل شاد خانم نے منہ بنایا۔ ''گیارہ بج چکے ہیں۔ آہی گئی ہوگی۔ میں تو آج جلدی سو گئی تھی۔''

اشرف خاں بستر سے اٹھا اور شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہننے لگا۔

''کیا صدف کو دیکھنے جارہے ہیں؟'' دل شاد خانم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اشرف خاں گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

''ڈانٹنا نہیں اسے۔ اجازت لے کر گئی تھی مجھ سے!''

اشرف خاں جواب میں کچھ کہے بغیر دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دل شاد خانم نے منہ بنایا اور لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس پر نیند شدت سے سوار تھی۔

اشرف خاں اپنے کمرے سے نکل کر صدف کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے صدف کی آواز آئی۔ چونکا ہوا انداز تھا کیونکہ گیارہ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔

''میں ہوں۔'' اشرف خاں نے بلند آواز میں کہا۔

فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کی طرف آرہی تھی پھر دروازہ کھول دیا گیا۔ صدف غالباً اسی وقت آئی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔

''بابا!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ہوں۔'' اشرف خاں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''کیا بات ہے بابا؟'' صدف نے سوالیہ انداز میں باپ کو دیکھا۔

اشرف خاں نے گاؤن کی جیب سے وہی تصویر نکالی جس نے اسے چونکایا تھا۔ وہ اس نے صدف کے سامنے کردی۔

''یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا؟'' اشرف خاں کی آواز میں غصہ تھا۔

''جی۔'' صدف کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''اور......'' اشرف خاں بولا۔ ''تصویر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو!''

صدف نے نظریں جھکا لیں۔

''کیا سنا تھا تم نے؟'' اشرف خاں نے تیز آواز میں پوچھا۔

صدف خاموش رہی۔ نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''جواب دو!'' اشرف خاں نے کہہ کر اتنی زور سے دانت پر دانت جمائے کہ اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

صدف نے نظریں اٹھائیں اور آہستگی سے بولی۔

''یہ اتفاق تھا بابا کہ میں کل رات اس طرف نکل گئی تھی۔ میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں وہ سنتی ہوئی آگے نکل جاتی لیکن ایک ایسا لفظ میرے کان میں پڑا کہ میں ٹھٹک کر رک گئی پھر میں نے جو باتیں سنیں، انہی کی وجہ سے میں کل سے اب تک پریشان ہوں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"پریشانی کا سبب؟"

"وہی باتیں۔" صدف نے جواب دیا اور پھر غالباً ہمت کر کے بولی۔ "آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں بابا!"

"اسی کی وجہ سے تم عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہو۔"

"قوم کے ساتھ وہ سب کچھ کرنے سے بہتر ہوتا کہ میں غربت کی زندگی گزارتی۔" صدف کی آواز بھرا گئی۔

اشرف خاں چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ "ابھی تم کسی دوست کی سالگرہ سے آئی ہو۔ امید ہے کہ تم نے وہاں کسی قریبی دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے بابا!" صدف کی نظریں پھر جھک گئیں۔ "کسی کو یہ باتیں بتانے کا مطلب تو یہی ہوتا جیسے میں اپنے ہی جرم کا اعتراف کر رہی ہوں۔"

"اپنی ماں کو بھی نہیں بتایا؟"

"جی نہیں لیکن......" وہ چپ ہوگئی۔

"لیکن......لیکن کیا؟"

اس مرتبہ صدف نے کچھ جرأت کی۔ "اگر آپ نے یہ سب کچھ بند نہ کیا تو......" وہ پھر چپ ہوگئی۔

"تو؟"

"تو نہ جانے کیا ہو!" صدف نے کہا۔ "کل سے ایک طوفان آیا ہوا ہے میرے دماغ میں......مما نے میری تربیت کچھ ایسی ہی کی ہے کہ میں سب کچھ دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی۔"

"بتاؤ گی کسی کو؟" اشرف خاں غرایا۔

صدف خاموش رہی۔ اس نے پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

اشرف خاں اسے ایک منٹ تک گھورتا رہا، پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہاں سے وہ اپنی خواب گاہ میں لوٹا۔ دل شاد خانم بے خبر سو رہی تھی۔ اشرف خاں نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کمرے سے نکل کر بنگلے کے ٹیرس پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔

"یس باس!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میری بیٹی صدف کو جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں باس! ہم میں سے کون نہیں جانتا ہوگا آپ کی بیٹی کو۔"

"ختم کر دو اس کو۔"

"جی!" بہت چونکی ہوئی آواز تھی۔

اشرف خاں نے کہا۔ "کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ موت حادثاتی معلوم ہو۔"

"لل......لیکن......باس......"

"یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔" اشرف خاں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سالگرہ کی تقریب سے صدف اسی وقت لوٹی تھی جب اشرف خاں اس کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ شب خوابی کا لباس بھی نہیں پہن سکی تھی پھر اشرف خاں کے جانے کے بعد تو اس کا ذہن اتنا منتشر ہوا کہ اسے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ صرف سینڈل اتار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں اشرف خاں کی نہ صرف اس وقت کی باتیں چکرا رہی تھیں بلکہ وہ گفتگو بھی جو اس نے گزشتہ رات چھپ کر سن لی تھی جب اشرف خاں اپنے بزنس پارٹنر صدیق وڑائچ سے کوئی خاص بات کر رہا تھا۔

ان سب باتوں کی وجہ سے صدف کی نیند اس کی آنکھوں سے بہت دیر تک اڑی رہی۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی جب اس کی آنکھ لگی اور اس رات اس نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا۔

وہ ایک چمک دار انسانی کھوپڑی تھی جس کے چار دانت بھی تھے۔ کسی ایسی چمک دار دھات کے دانت جو کھوپڑی سے زیادہ چمک رہے تھے۔

"صدف!" ایک بھاری بھرکم آواز اس طرح آئی جیسے وہی کھوپڑی بول رہی ہو۔ "غور سے سنو اور یقین کرو۔ تم خوب جانتی ہوگی کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تم شدید خطرے میں ہو صدف!......تمہیں قتل کرنے کا حکم صادر کیا جا چکا ہے۔ فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ کسی اور جگہ جا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکو گی۔"

پھر وہ کھوپڑی تحلیل ہوتی چلی گئی، اندھیرے میں مدغم ہوگئی۔

خواب ختم ہوتے ہی صدف کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو آواز اس نے خواب میں سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ آواز کالاشیوں کے کافر قبیلے کے مذہبی پیشوا کی تھی۔ وہ مذہبی پیشوا کالاش قبیلے کی زبان میں "بٹیان" کہلاتے تھے۔

بٹیان کو صدف "خیلاری" کے نام سے جانتی تھی۔

دو سال پہلے صدف تقریباً کافرستان جا چکی تھی جہاں بٹیان خیلاری ایک معاملے میں اس کا احسان مند ہوا تھا۔ اسی لیے جب صدف کافرستان سے رخصت ہونے لگی تھی تو پراسرار قوتوں کے مالک خیلاری نے اس سے کہا تھا۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''اچھی لڑکی!...... میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان سکتا ہوں مگر فی الحال میں نے تمہارے مستقبل میں تھوڑا سا جھانکا ہے۔ جب تم بیس سال کی ہو جاؤ گی تو ایک خطرہ تمہارے سر پر منڈلائے گا۔ جب بھی ایسا ہوا، میں تمہیں اس خطرے سے آگاہ ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں تمہاری زندگی میں محبت بھی دیکھ رہا ہوں اس لیے جب بھی تمہیں کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہوں گا تو تمہارے خواب میں داگنائی کی کھوپڑی بھیجوں گا جو یہاں رہنے والوں کے لیے محبت کی علامت ہے۔ تم نے یہاں اس کے بارے میں سنا تو ہوگا!''

کافرستان میں صدف داگنائی کی لازوال محبت کا قصہ سن چکی تھی۔

وہ سب باتیں اس وقت بھی صدف کو یاد آگئیں۔

اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا خواب بٹیان غیلاری ہی کی پراسرار قوتوں کا کرشمہ تھا۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا، وہ کر بھی دکھایا۔ صدف کو یہ بھی یقین تھا کہ اس سے کوئی بات بھی غلط نہیں کہی گئی ہوگی۔

اسی یقین کے باعث اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ کیا اس کا باپ اشرف خاں اس کی زندگی کا دشمن بن سکتا ہے؟

یہ تو بہرحال طے تھا کہ صدف اس کے ایک نہایت سنگین راز سے واقف ہوگئی تھی لیکن کیا کوئی باپ ایسی کسی وجہ سے اپنی بیٹی کو قتل بھی کروا سکتا ہے؟

ان خیالات کی وجہ سے صدف باقی رات جاگتی رہی۔

''کیا رات کو سو نہیں سکیں؟'' صبح ناشتے کی میز پر دل شاد خانم نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''جی مما!'' صدف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''نیند نہیں آئی رات کو۔''

''کیا پاپ نے بہت زیادہ ڈانٹا تھا۔''

صدف جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی کیونکہ اسی وقت اشرف خاں ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔

لیکن جلد ہی دل شاد خانم نے اشرف خاں سے کہا۔

''میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ مجھ سے اجازت لے کر گئی ہے، پھر بھی آپ نے اسے اتنا ڈانٹا کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی۔ دیکھ رہے ہیں آپ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

اشرف خاں نے ایک اچٹتی سی نظر صدف پر ڈالی جو نظریں جھکائے خاموشی سے ایک ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھی۔

''میں نے اسے کتنا ڈانٹا ہے، یہ اسی سے پوچھو!'' اشرف خاں نے کہا اور ناشتے میں مصروف رہا۔

''آپ کے سامنے تو یہ نہیں بتائے گی۔'' دل شاد خانم نے کہا۔

''تو بعد میں پوچھ لینا۔'' اشرف خاں نے کہا۔ ''ناشتا کر کے میں جا ہی رہا ہوں دفتر...... آج شاید واپسی میں بھی کچھ دیر ہو۔ کام زیادہ ہے۔''

جب اشرف خاں چلا گیا تو دل شاد نے اپنا سوال صدف سے دہرایا۔

''کچھ خاص نہیں مما!'' صدف نے جواب دیا، پھر فوراً ہی بولی۔ ''اس وقت بھی میں اپنی دوست کے گھر جا رہی ہوں۔ کل سالگرہ کی تقریب کے دوران ہی اس کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اسے دیکھنے جاؤں گی۔ فون پر خیریت دریافت کرنا تو رسمی سی بات ہوگی نا۔''

لیکن صدف نہ تو گزشتہ رات کسی دوست کی سالگرہ پر گئی تھی، نہ اس وقت اس نے سچ بولا تھا۔ وہ گزشتہ رات بھی شیراز کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی اور اس وقت بھی شیراز ہی سے ملنے جانا چاہتی تھی۔

شیراز سے اس کی محبت پروان چڑھتے ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ ان دونوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ صدف فرسٹ ائیر میں داخل ہوئی تھی۔ شیراز اس وقت تھرڈ ائیر میں تھا۔ دو سال بعد گریجویشن کرنے کے بعد اسے ایک کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ صدف نے اسی سال فائنل ائیر کا امتحان دیا تھا اور نتیجے کی منتظر تھی۔ شیراز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی اس کا نتیجہ آئے گا، وہ اپنے والدین کو اس کا رشتہ لینے کے لیے بھیج دے گا۔

ان دنوں شیراز اپنے گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ اس کے والدین اور اس کی چھوٹی بہن خلیجی ریاست ابوظہبی گئے ہوئے تھے جہاں شیراز کی بڑی بہن بیاہ کر گئی تھی۔ ان دنوں اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ سب اسے ہی دیکھنے گئے تھے۔ شیراز کمپنی کی مصروفیت کے بہانے وہیں رک گیا تھا مگر ان کے جاتے ہی اس نے پندرہ دن کی چھٹی لے لی تھی تاکہ صدف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے۔

گزشتہ روز اس کی چھٹی کا پہلا دن تھا۔ صدف نے اس کے ساتھ چار گھنٹے گزارے تھے لیکن اب دوسرے دن صبح ہی صبح وہ اس لیے ملنا چاہتی تھی تاکہ اسے اپنی موجودہ صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کر سکے۔

جب وہ اپنی کار میں شیراز کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں ہی اسے موبائل فون پر اطلاع دے دی کہ وہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

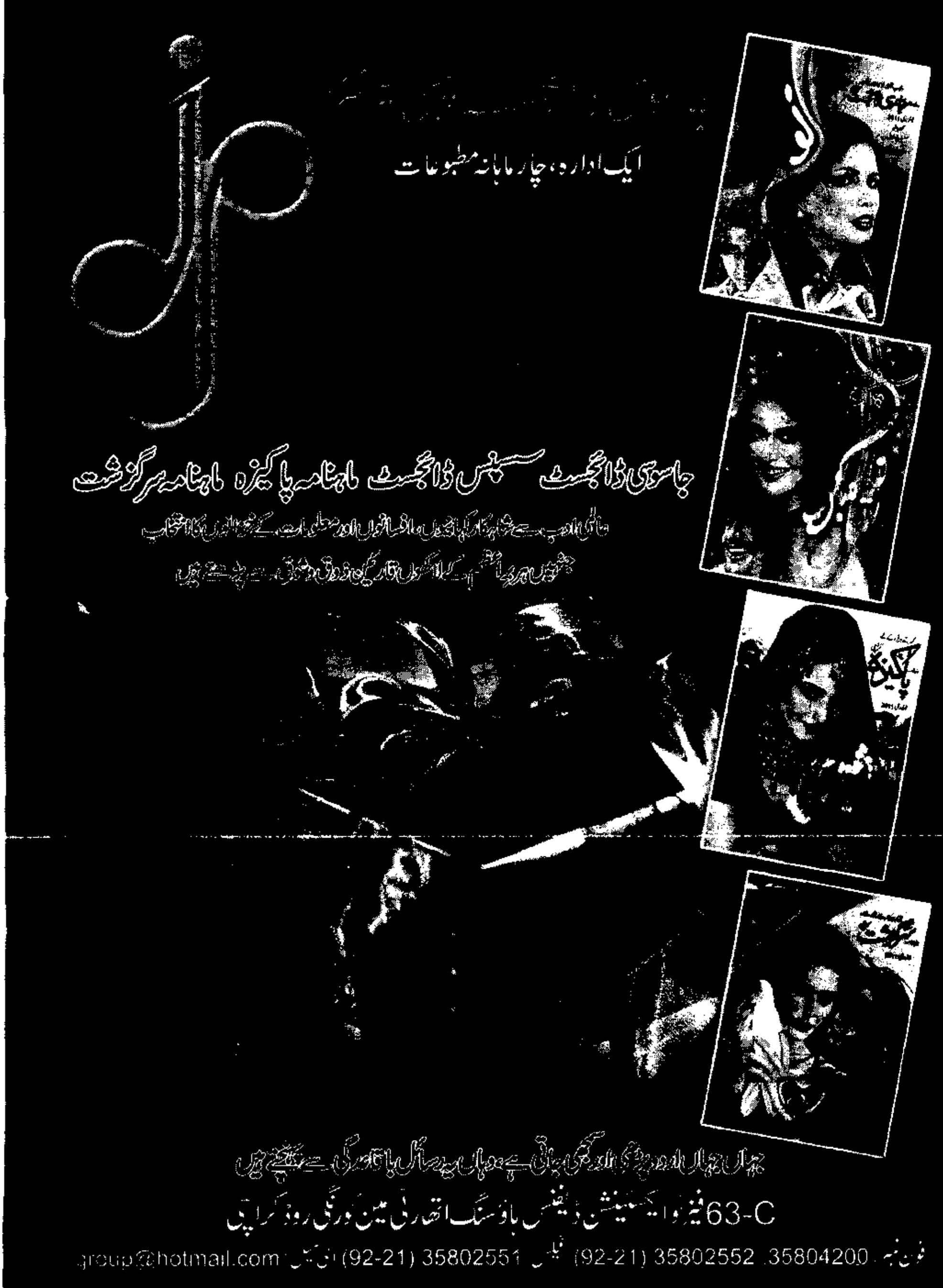

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

بیس منٹ میں اس کے گھر پہنچ رہی ہے۔
"اتنی صبح؟" شیراز نے حیرت سے کہا تھا۔ "کل تو یہ طے ہوا تھا کہ......"
"کل کی بات چھوڑو۔ میں اس وقت کسی اور وجہ سے آرہی ہوں اور گھر پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔ راستے میں نہیں بتا سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں تیز ڈرائیونگ کرتی ہوں اور اس وقت تو کچھ زیادہ ہی تیز کررہی ہوں۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر موبائل پر زیادہ بات نہیں کرسکتی۔"
پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کردیا تھا۔
شیراز کے والد بھی ایک بڑی پوسٹ پر کام کرتے تھے، اس لیے گھر میں کئی ملازم تھے لیکن والدین وغیرہ کے جانے کے بعد اس نے خانساماں اور چوکیدار کے علاوہ سب کو اس وقت تک کے لیے چھٹی دے دی تھی جب تک اس کے والدین واپس نہ آجاتے......
صدف کی باتوں کی وجہ سے شیراز بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔
"میں ناشتا کرچکا ہوں۔" اس نے صدف سے کہا۔ "خانساماں سے چائے بنانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ تمہارے ساتھ چائے پی لوں گا۔"
صدف نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "میں اس وقت تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اب کچھ دن تک ہماری ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ میں کالاش وادی جارہی ہوں۔"
"ایسی کیا پسند آگئی کالاش وادی؟ دو سال پہلے بھی تم کالج کی چھٹیوں میں وہاں گئی تھیں۔ وہاں کے عجیب عجیب قصے بھی سنائے تھے مجھے!"
"آج میں ایک خاص وجہ سے جارہی ہوں۔ یہاں میری زندگی خطرے میں ہے۔"
"کیا؟" شیراز چونک گیا۔
"مجھے قتل کیا جاسکتا ہے۔" صدف نے اسے اور زیادہ چونکا دیا۔
"کیا کہہ رہی ہو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"رات خواب میں مجھے بٹیان غیلاری نے بتایا ہے۔"
"کیا بکواس ہے!" شیراز نے منہ بنایا۔ "تم مجھے بتا چکی ہو غیلاری کے بارے میں اور میں نے کبھی یقین نہیں کیا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے صدف! اب ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا۔"
"پہلے میں بھی یقین نہیں کرتی تھی اور وہی لوگ اب بھی یقین نہیں کرتے جن کا ایسی باتوں سے سابقہ نہیں پڑا۔ مجھ سے بٹیان غیلاری نے چلتے وقت جو کچھ کہا تھا، بالکل ویسا ہی ہوا ہے۔"
"یعنی تم نے خواب میں وہ کھوپڑی دیکھی ہے جس کے بارے میں غیلاری نے بتایا تھا؟"
"ہاں۔" صدف نے جواب دیا۔ "اور آواز میں نے پہچان لی تھی۔ وہ بٹیان غیلاری ہی کی آواز تھی۔" پھر اس نے وہ سب کچھ بتادیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔
"سب وہم ہے تمہارا۔" شیراز نے پھر منہ بنایا۔ "بٹیان غیلاری تمہارے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے۔ خواب میں تم نے وہی سب کچھ دیکھا جو تم شاید سوچتی رہتی ہو۔ یہاں کون تمہاری جان کا دشمن ہوسکتا ہے؟"
"کوئی ضرور ہے۔ مجھے اپنے خواب پر یقین ہے۔"
صدف نے جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے اپنے باپ پر شبہ ہے۔ اس صورت میں شیراز اس کا اور مذاق اڑاتا۔ کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کو قتل کرانے کے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔
صدف نے اشرف خاں اور اس کے بزنس پارٹنر صدیق وڑائچ کی وہ گفتگو بھی نہیں دہرائی جس سے اس پر ایک راز کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی کہ اس کا باپ ایسا آدمی ہے۔
"اچھا!" شیراز نے طویل سانس لے کر کہا۔ "کیا گھر پر مما اور بابا کو بتا آئی ہو کہ کہاں جارہی ہو؟"
"ہاں۔ بتا آئی ہوں۔" صدف نے جھوٹ... بولا کیونکہ اسے اپنے باپ پر ہی شبہ تھا......
"اچھا تو......" شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ان دنوں چھٹی پر ہوں۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ تمہاری باتوں کی وجہ سے کالاش وادی دیکھنے کی خواہش مجھے بھی ہے۔"
"مجھے اچھا لگے گا اگر تم میرے ساتھ چلو گے۔ ایسی صورت میں یہ بھی مناسب رہے گا کہ میں اپنی کار تمہارے گیراج میں بند کردوں۔ یہاں سے تمہاری گاڑی پر روانہ ہوا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جو لوگ مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں، وہ میری کار تو پہچانتے ہیں لیکن تمہاری کار نظرانداز کردیں گے۔"
اس گفتگو کے درمیان چائے بھی آچکی تھی اور باتوں کے دوران ہی پی بھی لی گئی تھی۔ اب صدف جلد از جلد یہ شہر چھوڑ دینا چاہتی تھی جہاں اس کے یقین کے مطابق اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''بس جلدی نکل چلو!'' صدف نے کہا۔
''وہاں کتنے دن رکنا پڑسکتا ہے؟''
''کچھ کہہ نہیں سکتی۔''
''کپڑے وغیرہ لے کر آئی ہو؟''
''نہیں۔'' صدف نے جواب دیا۔'' عجلت کی وجہ سے کچھ ساتھ نہیں لیا۔ راستے میں کسی جگہ سے دیکھنا پڑے گا۔ کسی مارکیٹ سے ضرورت کی کچھ چیزیں خرید لوں گی۔''
''ایک اٹیچی کیس میں کہیں جانے کے لیے تیار رکھتا ہوں۔ وہ لے لیتا ہوں۔ خانساماں کو بھی چھٹی دے دوں گا۔ گھر کو بھی لاک کر دیتے ہیں۔''
دس منٹ بعد شیراز کی کار وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔ صدف پچھلی نشست پر لیٹ گئی تھی تاکہ باہر سے کسی کی بھی نظر اس پر نہ پڑ سکے......
جب کار پشاور کی حدود سے نکل گئی تو صدف اٹھ بیٹھی اور اس نے کہا۔'' اب ڈرائیونگ میں کروں گی۔''
'' تم تیز رفتاری سے چلاؤ گی۔ مجھے تمہاری ڈرائیونگ سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے کچھ آگے جانے کے بعد راستہ بھی خطرناک ہو جائے گا۔''
''میں اس راستے سے واقف ہو چکی ہوں۔''
شیراز نے کار روک دی اور صدف نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
''وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔'' شیراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیوں؟''
''وہ غیلاری تمہیں بتائے گا کہ اس نے تمہیں کسی خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔''
''اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' صدف نے یقین سے کہا۔
شیراز نے موضوع بدلا۔'' یہاں سے فاصلہ شاید ساڑھے چار سو کلومیٹر ہے!''
''ہاں۔'' صدف نے کہا۔'' ہم سہ پہر تک پہنچ جائیں گے۔''
''یہ کالاش وادی کافرستان ہی کا ایک حصہ ہے نا؟''
''ہاں۔''
چترال سے کتنا فاصلہ ہے؟''
''وہ قریب ہی ہے۔ کالاش وادی سے پہلے میں چترال ہی گئی تھی۔ وہاں سے کالاش وادی کا رخ کیا تھا۔ ابھی چترال کے نام پر مجھے بتیان غیلاری کی ایک بات اور یاد آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بعض اوقات مذہبی رسومات کا کچھ سامان خریدنے چترال جانا پڑتا ہے اسے لہٰذا اگر کبھی میں اس سے ملنے آؤں اور وہ کالاش وادی میں نہ ملے تو سمجھ لینا کہ وہ چترال گیا ہوا ہوگا۔''
''ابھی تم چترال جانا چاہتی ہو یا کالاش وادی؟''
''ابھی تو کالاش وادی ہی جانا ہے۔''
''ہوں۔ اچھا اب میں پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹتا ہوں۔ تمہاری ڈرائیونگ سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے مجھے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ تیز چلا رہی ہو جبکہ یہ راستہ اس رفتار کے لیے مناسب نہیں ہے۔''
وہ صدف کے جواب کا انتظار کیے بغیر پچھلی سیٹ پر جانے لگا۔
''یہ ایک عام سی بات ہے۔'' صدف نے سنجیدگی سے کہا۔'' جو لوگ خود ڈرائیو کرتے ہیں، انہیں کسی دوسرے کی ڈرائیونگ پر بھروسا نہیں ہوتا۔''
اس کے جواب میں شیراز کچھ کہنے کے بجائے پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔'' میں اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم تھک جاؤ گی تو ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔ بتا دینا مجھے۔''
صدف ''ہوں'' کر کے رہ گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ کچھ دیر ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ وہ اپنے مسئلے پر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ یکایک ہی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اسے قتل کرنے یا کروانے کا خواہاں کہیں اس کے باپ کا بزنس پارٹنر صدیق وڑائچ تو نہیں! کوئی باپ اپنی بیٹی کو قتل کرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔
اسی بات کی روشنی میں صدف سوچنے لگی تھی کہ ممکن ہے اس کے باپ نے صدیق وڑائچ کو بتا دیا ہو کہ ان دونوں کی میٹنگ کی باتیں اس کی بیٹی نے سن لی تھیں جو ایک خطرناک بات ہے۔ اور اسی لیے صدیق وڑائچ نے فیصلہ کیا ہو کہ صدف کا قصہ تمام کروا دیا جائے۔

☆☆☆

دو بجنے والے تھے جب صدیق وڑائچ اشرف خاں کے دفتر میں داخل ہوا۔ اسی وقت اشرف خاں کی میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اشرف خاں نے صدیق وڑائچ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے موبائل پر آنے والی کال ریسیو کی۔
کال ''بوبی'' کی تھی جسے اشرف خاں نے صدف کو ختم کرنے کی ہدایت کی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''کام ہوگیا؟'' اشرف خاں نے پوچھا۔

''نہیں باس!...... ہمارے آدمیوں نے سارا پشاور چھان مارا ہے۔ وہ نہیں نظر آئیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پشاور سے کہیں اور چلی گئی ہوں۔''

''یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ پشاور میں رکی تو قتل ہوجائے گی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ اسے یہ معلوم ہوجائے۔''

''میں نے کہا نا باس کہ ہم نے سارا پشاور چھان لیا ہے۔ ان کے دوست شیراز کو بھی چیک کیا تھا۔ اس کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔ چوکیدار سے معلوم ہوا کہ صدف بی بی نو ساڑھے نو بجے کے قریب وہاں پہنچی تھیں۔ شیراز اس وقت گھر پر ہی تھا۔ دونوں میں کچھ دیر باتیں ہوئیں، پھر صدف بی بی شیراز کے ساتھ اس کی کار میں کہیں چلی گئیں۔ اپنی کار انہوں نے شیراز ہی کے گیراج میں چھوڑ دی ہے۔''

''ہوں۔'' اشرف خاں کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا۔ ''تو پھر ایک امکان یہ ہے کہ وہ چترال یا کالاش ویلی گئی ہو۔ تم فوراً چار آدمیوں کو بذریعہ طیارہ چترال بھیجو۔ دو آدمی اسے چترال ہی میں تلاش کریں اور دو کالاش وادی کی طرف چلے جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ چاروں آدمی صدف کو بھی جانتے ہوں اور شیراز کو بھی۔ قوی امکان ہے کہ اگر اس نے وہاں کا رخ کیا ہے تو ابھی راستے ہی میں ہوگی۔ وہ وہاں کار سے ہی جائے گی۔ اور آخری بات یہ کہ اسے پشاور میں بھی تلاش کرتے رہو۔ ضروری نہیں کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ پشاور چھوڑ گئی ہو۔''

''ٹھیک ہے باس!'' جواب ملا۔ ''فوری طور پر جو بھی فلائٹ ملی، اس سے چار آدمی روانہ کردیے جائیں گے۔''

''ایک آخری بات اور سنو!'' اس مرتبہ اشرف خاں اس طرح بولا تھا جیسے غرایا ہو۔ ''مجھے زیادہ سے زیادہ کل رات تک تمہاری کامیابی کی رپورٹ مل جانی چاہیے۔''

''لیکن ...... وہ......'' قدرے تذبذب کے ساتھ کہا گیا۔ ''معلوم تو ہوجائے ...... کہ وہ ...... کہاں ہیں!''

''نالائقی ہوگی تمہاری اگر معلوم نہ ہوا!'' اشرف خاں نے غصے میں دہاڑنے کے انداز میں کہا اور رابطہ منقطع کرکے موبائل میز پر پٹخ دیا۔

صدیق وڑائچ اس دوران میں غور سے اشرف خاں کی طرف دیکھتا رہا تھا پھر وہ بولا۔ ''تم نے فون پر بتایا تھا اس بارے میں۔ میں اسی کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔ یہ خیال تمہیں کیوں آیا کہ اگر وہ پشاور میں نہیں تو چترال یا کالاش وادی کی طرف گئی ہوگی۔''

''وہ ایک مرتبہ جاچکی ہے وہاں۔ قصے سناتی رہی ہے کافرستان کے۔ یہ بھی بتایا تھا اس نے کہ وہاں اس کے کئی اچھے دوست بن گئے ہیں جن میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ وہ ہمیشہ وہاں کے لوگوں کی تعریف بھی کرتی رہی ہے۔''

''خیر! میں تمہیں یہ مشورہ دینے آیا تھا کہ اپنا یہ فیصلہ بدل دو۔ صدف کو کسی طرح سمجھا بجھا دو کہ وہ اس بارے میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھے۔ دل شاد بھابی کو بھی اعتماد میں لو۔ وہ تم سے زیادہ بہتر انداز میں صدف سے بات کرسکتی ہیں۔ وقتی طور پر یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم جلد ہی یہ سارا کام ختم کردو گے۔''

''میں جانتا ہوں اس کا مزاج۔ وہ یقین نہیں کرے گی۔ خطرہ ہم دونوں ہی کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔''

''تمہیں یہ خیال نہیں کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''اگر یہ خیال رکھوں تو پھر دوسرا راستہ ہم دونوں ہی کو جیل پہنچا سکتا ہے۔''

''میں بہرحال اصرار کروں گا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کرو۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ صدف جہاں بھی ملے، اسے بہ حفاظت گھر پہنچادیا جائے اور پھر اسے سمجھانے کے لیے......''

''آج موسم عجیب ہورہا ہے!'' اشرف خاں نے منہ بناتے ہوئے صدیق وڑائچ کی بات کاٹ دی۔

''ہاں۔''

''صدیق! تم جانتے ہو کہ میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو سوچ سمجھ کر ہی کرتا ہوں اور پھر اپنا وہ فیصلہ کبھی نہیں بدلتا۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے صدف کے سلسلے میں مجھ سے زیادہ ہمدرد تم ہو!''

''ہاں۔'' اس مرتبہ صدیق وڑائچ نے ایک طویل سانس بھی لی۔ ''میرا پیشہ اپنی جگہ لیکن معصوم لڑکیوں کے لیے میرے دل میں ہمدردی ہی ہوتی ہے۔''

''اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تم لڑکی کے باپ نہیں بن سکے۔ بیٹا ہے ایک تمہارا اور تمہاری خواہش ہوگی کہ تمہاری بیٹی بھی ہو۔''

اس بار صدیق وڑائچ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے جھنجلا گیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔

''اچھا میں اب چلتا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔''

اس نے اشرف خاں کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دفتر سے نکل کر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا ایک ڈیڑھ میل تک نکل گیا۔ اس مختصر دورانیے میں صرف ایک ہی خیال اس کے ذہن میں چکرا تا رہا تھا۔ آخر اس نے کار سڑک کے کنارے روکی اور موبائل فون پر کوئی نمبر ملانے لگا......

''ہیلو!'' دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

''کون؟ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟''

''تم ہی سے کرنی ہے دل شاد!'' صدیق وڑائچ نے کہا۔ ''میں نے تمہاری آواز پہچان لی، تم نے نہیں پہچانی۔''

''اوہ! صدیق؟''

''ہاں۔''

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر کہا گیا۔

''کیا بات ہے؟''

''صدف کہاں ہے؟''

''صبح سے ہی غائب ہے۔ کہہ کر تو گئی تھی کہ اپنی کسی دوست کو دیکھنے جا رہی ہے لیکن ابھی تک نہیں لوٹی۔ اتنی دیر ہونی تو نہیں چاہیے تھی۔''

''ہوں۔'' صدیق وڑائچ نے سر ہلایا۔ ''بس اسی کی خیریت پوچھنی تھی۔''

''پہلے تو کبھی نہیں پوچھی!''

''اشرف سے معلوم ہوتی رہتی تھی۔ آج اس سے بات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ صدف سے کچھ ناراض ہے۔''

''وہ اس کے خلاف ہیں کہ صدف رات کے وقت زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہے۔ کل اس کی کسی دوست کی سالگرہ تھی۔ مجھ سے اجازت لے کر گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اس قسم کی تقریبات میں کچھ دیر تو ہو جاتی ہے۔ اسی خیال سے اجازت دے دی تھی۔ اشرف اسی بات پر ناراض ہیں۔''

''آج اسے دیر ہو گئی ہے۔ اس کا خیال نہیں ہے تمہیں؟''

''خیال تو ہے۔ کچھ پریشان ہو گئی ہوں۔ اشرف کو اس لیے اطلاع نہیں دی کہ وہ تو پہلے ہی اس سے ناراض ہیں۔''

''خیر! آ جائے گی۔'' صدیق وڑائچ نے بہ ظاہر سرسری انداز میں کہا۔ ''بس اسی کی خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ اور کوئی بات نہیں۔''

صدیق وڑائچ نے اسے اشرف خاں کے ارادے سے آگاہ نہیں کیا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار بہ دستور قائم رہے۔

دو گھنٹے بعد اس نے دل شاد خانم کی کال ریسیو کی۔

''وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے صدیق!'' دل شاد خانم نے کہا۔ ''اب میں پریشان ہو گئی ہوں۔ اس کی جن دو چار دوستوں کو جانتی ہوں، انہیں بھی فون کر چکی ہوں۔ انہی سے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات ان کی کسی دوست کی سالگرہ نہیں تھی۔ اس سے اور الجھن ہو گئی ہے۔ اشرف اس سے ناراض ہیں لیکن میں نے انہیں بھی فون پر اطلاع دی تھی۔ اصل پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ صدف کا فون بھی بند مل رہا ہے۔'' وہ بولتی ہی چلی گئی تھی۔

''اشرف خاں نے کیا کہا؟'' صدیق وڑائچ نے پوچھا۔

''مجھ پر ہی طنز کرنے لگے تھے کہ اور آزادی دو بیٹی کو...... میں نے ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ پولیس میں رپورٹ کریں۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ کسی کی گمشدگی کی رپورٹ چوبیس گھنٹے سے پہلے پولیس نہیں لکھتی۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا کوئی قانون ہے لیکن اشرف خاں اپنے رسوخ سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ ہر جگہ تو تعلقات ہیں ان کے۔''

''لڑکی کا معاملہ ہے۔'' صدیق وڑائچ نے کہا۔ ''باپ کی بدنامی کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ شیراز کو جانتی ہو تم؟''

''ہاں۔ وہ اور شیراز ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ صدف کا رزلٹ آنے کے بعد ان دونوں کی شادی کر دی جاتی۔''

''دوپہر کو تمہیں فون کرنے کے بعد میں نے چھان بین کی تھی۔ شیراز کے گھر بھی گیا تھا۔'' صدیق وڑائچ نے جھوٹ بولا۔ ''وہاں کے ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ صدف وہاں پہنچی تھی، پھر اس کے ساتھ ہی کہیں چلی گئی۔''

''یہ تو سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ کہیں بھاگ جائے گی۔ ایسا تو اسی صورت میں ہوتا ہے جب گھر والے ان کی شادی کے لیے تیار نہ ہوں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم! میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ دونوں کہاں چلے گئے ہیں اور کیوں گئے ہیں۔''

''معلوم ہوتے ہی مجھے اطلاع دینا۔ اگر اس نے اپنا فون بند نہ رکھا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہیں ہوتی۔''

''سمجھ رہا ہوں میں۔'' صدیق وڑائچ نے کہا۔ ''جیسے ہی کچھ معلوم ہوگا، میں تمہیں اطلاع دوں گا۔''

''میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔''

صدیق وڑائچ نے صرف ''ہوں'' کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ فکر مندی اس کے چہرے سے اب بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

خاصا راستہ طے ہوچکا تھا جب صدف نے شیراز سے کہا۔ ”میں تو سیدھی کالاش وادی میں جاؤں گی لیکن تم چترال چلے جاؤ۔“

”کیوں؟“

”میں نے بتایا تھا کہ بٹیان غیلاری کسی وقت چترال بھی چلا جاتا ہے اس لیے اگر وہ وہاں ہو تو اسے اطلاع دے دینا کہ میں کالاش وادی پہنچ چکی ہوں۔ وہ فوراً اپنا سارا کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پہنچ جائے گا۔“

”لیکن میں اسے کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟ اسے جانتا بھی نہیں ہوں۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم جس ہوٹل میں ٹھہرو، اسی کے کسی بھی منتظم سے پوچھ لینا۔ چترال میں بھی بٹیان غیلاری بہت مشہور ہے۔ وہ کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا تو بھی اس ہوٹل کے منتظم کو معلوم ہوگا۔ وہ تمہیں بتادے گا۔ تم جاکر اس سے مل لینا۔ بتادینا کہ میں نے ہی تمہیں بھیجا ہے، بلکہ فون پر اس سے میری بات بھی کرادینا۔“

”راستے میں تم نے دوسری سم ڈلوائی ہے اپنے موبائل میں۔ اس کا نمبر نہیں بتایا تم نے!“

”ابھی خود مجھے وہ نمبر یاد نہیں ہے۔ میں تمہیں مس کال دیتی ہوں۔ نمبر آجائے گا تمہارے پاس۔ سیو کرلینا۔“

صدف نے کار کی رفتار بہت کم کرتے ہوئے اپنے موبائل سے شیراز کا نمبر ملایا۔ شیراز کے موبائل کی گھنٹی بجی جو اس نے پہلے ہی جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس نے اسکرین پر آیا ہوا نمبر صدف کے نام سے سیو کرلیا۔

اس دوران میں دل شاد خانم اسے کئی بار رنگ کرچکی تھی لیکن صدف نے اسے کال ریسیو نہیں کرنے دی تھی۔

”خیال نہیں رہا مجھے۔“ وہ بولی۔ ”بہتر ہوتا کہ فی الحال تمہارا نمبر بھی بدل جائے۔ خیر!...... ابھی راستے سے تم بھی دوسری سم لے لو۔“

”آخر تم اپنے گھر والوں کو اتنا بے خبر کیوں رکھنا چاہتی ہو؟“

”دو بار کرچکے ہو تم یہ سوال اور میں بتا چکی ہوں کہ فی الحال کسی وجہ سے یہی مناسب ہے۔“ صدف نے جواب دیا۔

”زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جب تم میرے لیے کسی ناول کا پراسرار کردار بن گئی ہو۔“

صدف کچھ نہیں بولی۔

”سم کہاں سے ملے گی؟“ شیراز نے پوچھا۔

”ایک چھوٹا سا شہر ابھی اور ہے ہمارے راستے میں۔ وہیں سے مل جائے گی۔ اس کے بعد ہمارے راستے بھی تبدیل ہوجائیں گے۔“

”کیا مطلب......؟“

”میں کار میں ہی کالاش وادی جاؤں گی۔ تم کسی جیپ میں چلے جانا۔“

”جیپ کہاں ملے گی مجھے؟“

”راستے میں دیکھی نہیں لوگوں کی جیپیں؟“

”لیکن وہ......“

”پوری بات سنو!“ صدف نے اس کی بات کاٹی۔ ”یہ لوگ سامان لینے کے لیے مختلف بستیوں کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔ راستے میں انہیں کوئی سواری مل جائے تو اسے بھی معقول معاوضہ لے کر اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ ہمیں کسی جگہ رک کر ذرا دیر کسی ایسی جیپ کا انتظار کرنا ہوگا جو چترال جارہی ہو، یا چترال سے گزر کر آگے جارہی ہو۔“

”نہ جانے کس قسم کے لوگ مل جائیں۔ مجھے اغوا کرلیا تو!“ شیراز ہنسا۔

”کوئی خوب صورت لڑکی نہیں ہو تم!“ صدف نے منہ بنایا۔

”لڑکی نہ سہی، خوب صورت مرد تو ہوں، اور سنا ہے کہ یہاں کے لوگ......“

”فضول باتیں نہ کرو۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تمہارا موڈ ٹھیک ہو۔ آج ایسا محسوس ہورہا ہے کہ تم شاید ہنسنا مسکرانا ہی بھول گئی ہو۔“

”میں تمہیں بتاچکی ہوں کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔“

”مجھے تمہارے خواب پر یقین نہیں ہے۔ بس چل پڑا ہوں تمہارے ساتھ۔“

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے یقین کرنا پڑا جب ایک چھوٹے سے جنرل اسٹور کے سامنے گاڑی روک کر دونوں اترے۔

صدف بولی۔ ”سم اگر یہاں نہ ملی تو کسی اور جگہ سے مل جائے گی مگر یہاں سے مجھے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں مل جائیں گی۔“

وہ دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ دکاندار ایک ہی تھا اور اس وقت ایک گاہک کو کچھ دکھا رہا تھا۔ صدف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں اسٹور میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے ہی ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ اس میں دکان کے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر نے صدف کو چونکا دیا۔ اس نے دکان کے سامنے رکنے والی ایک گاڑی کی کھڑکی سے رائفل کی نال جھانکتے دیکھ لی تھی۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"بیٹھ جاؤ!" صدف نے تیزی سے کہتے ہوئے شیراز کا ہاتھ بھی کھینچا اور دونوں نیچے ہو گئے۔ اس وقت دو گولیاں چلیں جن سے وہ دونوں تو محفوظ رہے لیکن ایک گولی نے اسٹور کا کچھ سامان برباد کر دیا تھا اور دوسری گولی دکاندار کے شانے میں لگی تھی۔

"نکلو یہاں سے!" صدف کھڑی ہوتے ہوئے شیراز سے بولی۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کار بہت تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔

"یہ....." شیراز اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس مرتبہ صدف نے نہیں سنبھالی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنے بھی بیگ سے ریوالور نکال لیا تھا۔

"تیزی سے چلو۔" صدف بولی۔ "کار اسی طرف گئی ہے۔ پکڑنا ہے اسے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ گولی ان پر بھی چلائی جا سکتی ہے۔"

"گولیاں کسی کار سے چلائی گئی تھیں؟" شیراز نے پوچھا۔

"ہاں، آئینے میں عکس دیکھ لیا تھا میں نے اس کا۔ رائفل بھی کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دے گئی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ نشانہ مجھے ہی بنایا جا سکتا ہے۔"

شیراز نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ جنرل اسٹور کے سامنے لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

"تیز چلاؤ شیراز!" صدف بولی۔ "ہمیں پکڑنا ہے اس کار کو۔ نیلے رنگ کی کار ہے۔ شاید اوپل ہے پرانے ماڈل کی۔"

"اب اسے پکڑنے کی ضرورت کیا ہے۔" شیراز نے رفتار کچھ بڑھائی۔ "کیوں ان خطرناک لوگوں سے ٹکرانا چاہتی ہو؟"

"انہیں معلوم تو ہو جائے کہ میں کوئی تر نوالہ نہیں ہوں۔ اور مجھے بے خبری میں مار لیں تو دوسری بات ہے۔ اس وقت تو اسٹور کا آئینہ میرے لیے مسیحائی کر گیا۔"

شیراز کو نہ تو اس کی ان باتوں پر حیرت ہوئی اور نہ وہ اس پر حیران ہوا کہ صدف کے وینٹی بیگ میں ریوالور موجود تھا۔ اس سے بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ صدف کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اس نے فائٹنگ کی تربیت بھی لی تھی۔

"اور تیز چلاؤ شیراز!" صدف دانت پر دانت جما کر لی بولی۔ "وہ کار ہماری دسترس سے نکلنا نہیں چاہیے۔

راستہ ابھی کافی دور تک ایسا ہے کہ کوئی موڑ نہیں آئے گا۔"

"میں اس راستے پر اس سے زیادہ تیز نہیں چلا سکتا صدف!"

"پھر تو نکل جائیں گے وہ۔" صدف نے مایوسی سے کہا۔

"نکل جائیں، اچھا ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے ایسے لوگوں سے ٹکرانے کا۔"

"ٹکراؤ تو پھر بھی ہو گا کسی وقت۔ اپنی اس ناکامی کے بعد وہ حج یا عمرہ کرنے نہیں چلے جائیں گے۔"

"وہی آ ٹکرائیں گے تو دوسری بات ہو گی۔"

"اب تو یقین آ گیا ہو گا تمہیں میرے خواب کا!"

"بات تو اب سمجھ میں آ رہی ہے۔" شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے تمہاری حفاظت کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟"

"اس حد تک کام نہیں کرتی ہو گی اس کی مافوق الفطرت طاقت۔" صدف نے جواب دیا۔ "اسی لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلایا ہے۔"

"تو کیا تم اب وہیں رہو گی؟"

"وہ کوئی ایسا بندوبست کر دے گا کہ یہ خطرہ میرے لیے خطرہ نہ رہے۔"

"یہ کیسے ہو گا؟"

"یہ تو اس سے مل کر ہی معلوم ہو سکے گا۔" صدف نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریوالور بیگ میں رکھ لیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کار تک نہیں پہنچا جا سکے گا جس سے اس پر فائرنگ کی گئی تھی۔

"اب۔" صدف کچھ توقف سے بولی۔ "چند میل کے بعد وہ مقام آئے گا جہاں سے ہمارے راستے تبدیل ہوں گے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں چترال جانا ہو گا۔ بتا چکی ہوں تمہیں۔"

"وہ اس وقت کی بات ہے جب تم پر گولیاں نہیں چلائی گئی تھیں۔ اب حالات دوسرے ہیں۔ یہ بات میرے سامنے آ چکی ہے کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دوں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں شیراز! ریوالور میرے لیے کھلونا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"پیچھے سے چلائی جانے والی گولی کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس وقت بھی تم نے آئینے میں دیکھ لیا تھا، اس لیے بچت ہو گئی۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''ایسی صورت میں تمہاری موجودگی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایسا تجربہ ہوا ہے کہ میں اب بہت محتاط رہوں گی۔'' صدف نے کہا۔ ''کیونکہ اب تم بھی ان کی نظر میں آگئے ہو اس لیے خطرہ تمہارے لیے بھی ہوسکتا ہے۔''

''ریوالور میرے پاس بھی ہے۔ تمہاری طرح بہت اچھا نشانے باز نہیں لیکن ریوالور چلانا جانتا ہوں لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' صدف نے اس کی بات کاٹی۔ ''ضروری ہے کہ تم چترال جاؤ۔''

صدف بہ مشکل ہی شیراز کو چترال جانے پر آمادہ کرسکی۔

''میں وہاں تمہارے لیے فکر مند رہوں گا۔'' شیراز نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیا مجھے تمہاری فکر نہیں رہے گی؟ پھر یہ کہ تمہیں مستقل تو وہاں نہیں رکنا ہوگا۔'' صدف نے کہا۔ ''اگر وہاں بٹیان غیلاری نہ ملے تو کالاش وادی آجانا۔''

شیراز کچھ نہیں بولا لیکن اس کے چہرے سے فکرمندی کا تاثر ختم نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

صدف کے کہنے کے مطابق اسے ایک ایسی جیپ مل گئی جس میں اسی علاقے کے لوگ چترال جارہے تھے۔ معاوضہ طے کرکے انہوں نے شیراز کو جیپ میں بٹھا کر چترال بھی پہنچادیا اور اسے چترال کے ایک اچھے ہوٹل پر اتارا۔ چونکہ شیراز کے ساتھ ایک سوٹ کیس بھی تھا، اس لیے وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ سیاح وہاں قیام کرے گا۔

شیراز خاصا تھک گیا تھا لیکن یہ اس کے لیے آرام کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کمرے میں رک کر اس نے صرف چائے پی اور ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ اس نے ریسپشنسٹ سے کہا۔ ''کیا آپ بٹیان غیلاری کے بارے میں کچھ بتاسکتے ہیں؟...... شاید وہ آج کل چترال......''

''جی۔'' چترالی مسکرایا۔ ''وہ ہمارے ہی ہوٹل میں مقیم ہیں۔''

شیراز کو تعجب ہوا کہ چترالی بڑی صاف اردو بولا تھا۔

''مجھے ان سے ملنا ہے۔'' شیراز اس حسین اتفاق پر خوش ہوا تھا کہ بٹیان غیلاری سے ملنے کے لیے اب اسے ادھر ادھر کہیں نہیں جانا پڑتا۔

''وہ جانتے ہیں آپ کو؟'' چترالی نے پوچھا۔

''میں تو نہیں جانتا لیکن ان کو جاننے والی ایک ہستی ہی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ملوں۔''

اسی وقت شیراز نے محسوس کیا کہ وہاں کچھ ہلچل ہوئی تھی۔ ہلچل کا سبب وہ شخصیت تھی جو اسی وقت ہوٹل میں داخل ہوئی تھی۔

شیراز نے چترالی سے پوچھا۔ ''کیا یہی بٹیان غیلاری ہیں؟''

''جی نہیں۔ یہ تو شہزادہ خان ہیں۔ کالاش کے بہت بڑے رئیس۔ مجھے بتایا جاچکا ہے کہ وہ یہاں انہی سے ملنے آرہے ہیں جن سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ!''

''لیکن بٹیان غیلاری کی بڑی بات ہے جناب!'' چترالی کہتا رہا۔ ''شہزادہ خان کو ہی آنا پڑا غیلاری بابا سے ملنے۔ غیلاری بابا نہیں گئے ان کے گھر۔''

اچانک پیدا ہونے والی ہلچل جلد ہی ختم ہوگئی کیونکہ شہزادہ خان اوپری منزل پر جاچکا تھا۔

''میرا نام وغیرہ تو آپ رجسٹر میں لکھ ہی چکے ہیں۔'' شیراز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ غیلاری بابا کو یہ پیغام پہنچادیں کہ میں ان سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کے پاس صدف نے بھیجا ہے۔''

''فوری طور پر تو ممکن نہیں جناب!'' چترالی نے کہا۔ ''غیلاری بابا پہلے ہی ہدایت کرچکے ہیں کہ شہزادہ خان کے آنے کے بعد انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

یہ جواب شیراز کے لیے مایوس کن تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کتنی دیر کی ملاقات ہے ان کی؟''

''غیلاری بابا کے کہنے کے مطابق گھنٹا بھر تو ضرور لگ جائے گا۔''

''اچھا۔'' شیراز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جب ان کی ملاقات ختم ہوجائے تو انہیں میرے بارے میں اطلاع دے کر مجھے بھی مطلع کردیجیے گا۔ میں اپنے کمرے میں جاکر کچھ دیر آرام کرلیتا ہوں۔''

''بہتر ہے۔''

شیراز اپنے کمرے میں آگیا۔ اب اسے کچھ دیر آرام کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے موبائل پر صدف سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' صدف کا جواب آیا۔ ''میرا خیال درست ہی ثابت ہوا تا کہ شاید وہ وہاں ہوں۔ تم ان سے ملاقات کرکے ہی آنا۔ ویسے تو غالباً انہیں معلوم ہوچکا ہوگا

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کہ میں کالاش وادی پہنچ گئی ہوں، پھر بھی انہیں بتا دینا اور پوچھنا کہ میرے لیے کیا ہدایت ہے۔''

''ایک گھنٹے بعد ملاقات ہو سکے گی۔''

''جب بھی ہو...... میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔ ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ آرام کرنے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ تمہاری کال آ گئی۔''

''آرام کرو اور چوکنا رہو۔ میں بھی اب کچھ دیر آرام کروں گا۔''

گفتگو کرنے کے بعد شیراز نے موبائل بند کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ غنودگی کا تصور تھا یا کوئی خواب کہ شیراز نے ایک کھوپڑی دیکھی۔ ویسی ہی کھوپڑی جیسی صدف نے اسے بتائی تھی۔ کھوپڑی کے چار دانت خاصے چمک دار تھے۔ کھوپڑی کے نظر آتے ہی ایک آواز بھی شیراز کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں غیلاری ہوں شیراز! تم خطرے میں ہو۔ فوراً یہ ہوٹل چھوڑنا ہے تمہیں۔ مجھ سے ملاقات کے لیے انتظار نہ کرو۔ کالاش وادی پہنچو۔ صدف وہاں پہنچ چکی ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ میری عبادت گاہ میں جا کر وہیں میرا انتظار کرے۔ میں آج ہی چند گھنٹے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

آواز ختم ہوتے ہی کھوپڑی اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شیراز کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں۔ کیونکہ وہ غیلاری سے کبھی نہیں ملا تھا اس لیے جو آواز اس نے سنی تھی، وہ اس کے لیے اجنبی تھی لیکن اس خواب یا تصور کے باعث اسے یقین آ گیا کہ وہ غیلاری ہی کی آواز تھی جس نے اسے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے ہوٹل چھوڑنے کی ہدایت کی تھی۔

شیراز بستر سے فوراً ہی اٹھ گیا۔ اس نے یہاں آنے کے بعد اپنا سوٹ کیس کھولنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی، وہ پہیوں والا سوٹ کیس گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے صدف کی باتوں پر صحیح معنوں میں یقین نہیں کیا تھا کہ غیلاری پراسرار قوتوں کا مالک ہے لیکن اب اسے یقین آ چکا تھا کہ اس اکیسویں صدی میں بھی پراسرار قوتوں کے مالک موجود ہیں۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر کھڑے ہوئے دو آدمی اس سے ٹکرائے اور اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''صدف کہاں ہے؟'' دوسرے آدمی نے شیراز کو گھورتے ہوئے اس طرح پوچھا کہ اگر جواب نہ ملا تو شیراز کو کچا ہی چبا جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال شیراز کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

غیلاری نے درست پیغام دیا تھا کہ شیراز خطرے میں تھا۔

''کون صدف؟'' اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''جس کے ساتھ تم پشاور سے آ رہے تھے!'' ریوالور والے نے کہا۔

''میں نے اس لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا۔'' شیراز نے بہ دستور انجان بننے کی کوشش کی۔ ''وہ راستے میں مل گئی تھی۔ میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اس نے مجھے لفٹ دی تو میں یہاں پہنچا۔ وہ کسی اور طرف چلی گئی۔ مجھے چترال آنے کے لیے کرائے کی جیپ......''

''بکومت!'' وہ بولا جس نے دروازہ بند کیا تھا، پھر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''یہاں زیادہ دیر تک رکنا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی وقت ہوٹل ہی کا کوئی آدمی شاید نکل آئے ادھر!''

''لیکن اس سے معلوم کرنا تو ضروری ہے۔''

''معلوم کر لیں گے۔'' وہ آدمی تیزی سے شیراز کے قریب آیا۔ شیراز نے محسوس کیا کہ وہ اسے دبوچنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ جھکائی دے کر خود کو بچائے اور جیب سے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش کرے لیکن فوراً ہی وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

''خبردار! بالکل ساکت رہو۔ میں گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔ گولی چلنے کی آواز سے لوگ اس طرف متوجہ تو ہوں گے لیکن ہمیں پکڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔''

اس دھمکی کے بعد شیراز ساکت رہ گیا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ ریوالور والے کی بات محض دھمکی نہیں تھی۔

جو آدمی جھپٹ کر اس کی طرف آیا تھا، وہ اس کی پشت پر چلا گیا۔ پھر شیراز کو ایسا لگا جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی ہو۔ وہ کسی بھاری چیز کا اس کے سر سے ٹکراؤ تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے خود کو پہاڑی علاقے کے ایک ویران حصے میں پایا۔ اسے ایک درخت سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ یہ جاننے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے قاصر تھا کہ اسے ہوٹل سے نکال کر یہاں کس طرح لایا گیا ہوگا۔ اس وقت اس کے سامنے تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو وہی تھے جو ہوٹل میں اس کے کمرے میں آئے تھے۔ تیسرا اس کے لیے اجنبی تھا۔

''اب۔'' وہی ریوالور والا شیراز سے بولا۔ ''میرے سوال کا جواب دو ورنہ تمہاری کھال ادھیڑ دی جائے گی۔''

''میں جواب دے چکا ہوں۔'' شیراز نے کہا۔ ''تم کو میری بات پر یقین کرنا چاہیے۔''

''بکواس کی تھی تم نے ...... وہ تمہاری ہی کار میں آئی تھی لیکن چترال تم جیپ میں ہی آئے تھے۔''

اتنا کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کے دماغ میں خیال آیا۔ اب ان سے کوئی اور جھوٹ بولنا بے کار تھا لیکن وہ سچ بھی نہیں بولنا چاہتا تھا۔ صدف کی زندگی اسے اپنی زندگی سے زیادہ پیاری تھی۔

''تم جیپ میں چترال آئے ہو!'' وہی آدمی پھر بولا۔ ''یہ تو ہم معلوم کر چکے ہیں لیکن صدف کہاں گئی؟ کیا وہ تمہاری کار میں کالاش وادی گئی ہے؟''

''تم اب جو چاہو، کرو۔'' شیراز نے کہا۔ ''میری زبان اب بند رہے گی۔''

''تم تو طوطے کی طرح بولو گے۔'' دانت پیستے ہوئے کہا گیا، پھر اس نے ایک ساتھی سے کہا۔ ''شروع ہو جاؤ۔ زبان تو کھلوانی ہے اس کی۔''

شیراز نے دیکھا کہ جس آدمی کو مخاطب کیا گیا تھا، وہ ایک چابک سنبھالے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

''اگر تم نہیں بولو گے تو میں تمہاری کھال اس وقت تک ادھیڑوں گا جب تک تم جواب نہیں دو گے یا مر نہیں جاؤ گے۔ تم صرف صحیح جواب دے کر ہی ہم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو۔''

شیراز نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ اس طرح مضبوطی سے بند کر لیے جیسے مرنے کے لیے تیار ہو۔

قریب آکر اس شخص نے چابک گھمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کہیں سے ایک گولی چلی جو اس کا بازو زخمی کر گئی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی، چابک اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

سبھی نے چونک کر دیکھا کہ دو آدمی قریب ہی موجود تھے جن کے چہروں پر نقابیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ گولی یقیناً اسی سے چلائی گئی ہوگی۔

شیراز کو قید کر کے لانے والوں نے جلدی سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے تاکہ ان پر گولی نہ چلائی جائے۔ ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔ انہیں اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ شیراز کو انہوں نے درخت سے باندھ دیا تھا۔

نو وارد افراد میں سے ایک نے کسی قدر بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ شیراز نے بھی ادھر دیکھا۔ اس بلند ٹیلے پر ایک مشین گن نظر آئی۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص بھی چہرے پر نقاب لگائے ہوئے تھا۔

''کوئی بھی غلط حرکت ہوئی تو......'' ریوالور والا بولا۔ ''تم سب کے جسم میں سوراخ ہی سوراخ ہوں گے۔ چھلنی ہو جاؤ گے۔''

شیراز نے محسوس کیا کہ اس شخص نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی تھی۔ یہ احساس ان تینوں کو بھی ہو گیا ہوگا جنہوں نے شیراز کو اپنا قیدی بنایا تھا۔

''تم ...... کون ہو؟'' نو وارد نقاب پوش سے پوچھا گیا۔

''ہم تمہارے قیدی کو لینے آئے ہیں۔'' نقاب پوش نے جواب دیا۔

اس کا ساتھی شیراز کے قریب آیا اور وہ رسیاں کھولنے لگا جس سے اسے باندھا گیا تھا۔

''تم اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہے ہو!'' نقاب پوش سے پھر کہا گیا۔ ''کیا ہم تمہیں جانتے ہیں؟ آواز اس لیے بدلی ہے کہ ہم تمہیں پہچان نہ سکیں؟''

''کوئی سوال نہیں، کوئی جواب نہیں۔'' ریوالور والے نے سرد لہجے میں کہا۔

شیراز کو درخت سے آزاد کرانے کے بعد اس آدمی نے پوچھا۔ ''تمہاری جیبوں سے تو کچھ نہیں نکالا گیا؟''

سوال دوستانہ انداز میں کیا گیا تھا لیکن شیراز کے دماغ میں خیال آیا تھا کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والا تو نہیں؟

اس نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی پھر کہا۔ ''میرا ریوالور کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے۔'' بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔

''نکالو۔'' اسے حکم ملا۔ ''اور یاد رکھو کہ ذرا سی بھی شرارت کرنے کی کوشش کی گئی تو تم تینوں ہی کے جسم چھلنی کر دیے جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تھا اور وہ اس کے پاس پہنچ گیا تھا جس نے اعتراف کیا تھا کہ شیراز کا ریوالور اس کے پاس ہے۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ریوالور نقاب پوش کو دے دیا گیا۔

"تم سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔" ریوالور والا نقاب پوش بولا۔ "ہم یہاں تمہاری لاشیں نہیں بکھیریں گے۔ بس باندھ دیں گے تاکہ بعد میں خود کو آزاد کرا لو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم لوگ فوری طور پر ہمارے پیچھے آنے سے باز رہو۔"

وہ تینوں خاموش رہے۔

شیراز اس دوران میں اس طرح کھڑا رہا تھا جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ وہ ان سب کے منہ تک رہا تھا۔

جس نقاب پوش نے اسے رسی سے چھٹکارا دلایا تھا، اسی نے رسی کے تین ٹکڑے کیے۔ شیراز کو مضبوطی سے باندھنے کے لیے خاصی لمبی رسی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے تین ٹکڑے ان تینوں کو اس طرح باندھنے کے لیے کافی تھے کہ وہ تھوڑی سی جدوجہد کر کے خود کو آزاد کرا سکیں۔

جب ان تینوں کو ایک ایک کر کے باندھا جا رہا تھا تو ان میں سے ایک بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ فوری طور پر تم لوگوں کے پیچھے نہیں آؤں گا۔"

"بکواس مت کرو!" ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کہتا لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔"

ان تینوں کو باندھ دیا گیا۔

جس نقاب پوش نے شیراز کو رسی سے آزاد کرایا تھا، اسی نے شیراز سے پوچھا۔ "تمہارا سوٹ کیس کہاں ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ ایک سوٹ بھی کیس تھا۔"

"وہ ہوٹل میں ہونا چاہیے۔" شیراز نے جواب دیا۔

"اگر یہ لوگ وہ بھی اٹھا نہ لائے ہوں۔"

"کیوں؟" ریوالور والے نے اپنا ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

جواب ملا۔ "ہم سوٹ کیس کا کیا کرتے؟ وہ وہیں ہوگا۔"

نقاب پوش نے جیب سے موبائل نکالا۔ کسی سے رابطہ کیا۔ دھیمی آواز میں مختصر سی بات کی اور موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"چلو۔" شیراز سے کہا گیا۔ "تم جہاں کہو گے، تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

شیراز نے دیکھا کہ کچھ بلندی پر نظر آنے والا نقاب پوش مشین گن کے ساتھ غائب ہو چکا تھا۔ شیراز ان دونوں نقاب پوشوں کے ساتھ چل پڑا۔

"یہ لوگ تم سے کیا پوچھنا چاہتے تھے؟" شیراز سے سوال کیا گیا۔

"اگر میں اس کا جواب نہ دوں تو!" شیراز نے ہمت کر کے کہا۔

"تو جواب کے لیے تم پر زور نہیں دیا جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ تم سے صدف کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔ تم دونوں ساتھ ہی چلے تھے لیکن چترال صرف تم پہنچے مگر انہیں اصل فکر تو صدف کی ہوگی۔"

سبھی کچھ جانتے ہیں یہ لوگ، شیراز کو خیال آیا۔

"کہاں ہے صدف؟" شیراز سے پوچھا گیا۔

"اس کا جواب تو میں اس صورت میں بھی نہیں دیتا جب وہ لوگ میری کال ادھیڑ دیتے۔"

نقاب پوش ہنسا۔ "اتنی محبت کرتے ہو صدف سے؟...... خیر! میں اپنا سوال نہیں دہراؤں گا۔ وہ یقیناً کالاش وادی گئی ہوگی۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چترال کیوں آئے تھے لیکن اس بارے میں بھی تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

شیراز خاموش رہا۔

"ہم تمہیں واپس ہوٹل پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا۔ تمہیں کہیں اور جانا چاہیے۔ غالباً تم کالاش وادی جانا پسند کرو گے!"

"میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ تم لوگ میرے ہمدرد ہو؟"

"اگر نہ ہوتے تو تمہیں ان لوگوں سے کیوں چھڑاتے؟"

"تو مجھے چترال کے بس اڈے پر چھوڑ دو۔ مجھے جہاں جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔"

"بس میں سفر تمہارے لیے پھر خطرہ بن سکتا ہے۔"

"میرے لیے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔"

وہ نقاب پوش اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے تیزی سے چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ موبائل پر اس کی باتیں شیراز کے علم میں نہ آسکیں۔

ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی وہ پھر شیراز کے قریب تھا۔

"تمہیں جہاں جانا ہے، وہاں کے راستوں سے واقف ہو؟"

"یہ پوچھنے کا سبب؟"

"ہم تمہیں ایک جیپ دے دیں گے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

''مگران مہربانیوں کا مطلب......؟''
''مناسب وقت آنے پر تم جان لو گے۔ میرے سوال کا جواب دو۔ تم یہاں کے سب راستوں سے واقف ہو؟''
''واقف نہیں بھی ہوں گا تو لوگوں سے پوچھتا ہوا چلا جاؤں گا۔''
''تم یقیناً کالاش وادی جاؤ گے۔'' نقاب پوش بولا۔
''ہم تمہیں لوباش چیک پوسٹ تک پہنچا دیں گے۔ وہاں تمہیں جیپ دے دی جائے گی۔ وہاں سے بجریت بارہ میل اور بمبوریت دس میل دور ہے۔ کالاش وادی بھی وہیں کہیں ہوگی۔ دو گھنٹے کا سفر ہے تم جہاں بھی جاؤ گے، ہمیں معلوم ہو جائے گا، تمہارا سوٹ کیس وہیں پہنچا دیا جائے گا۔ ٹھیک ہے؟''
شیراز نے سر ہلانے پر اکتفا۔
اب وہ اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں ایک جیپ کھڑی تھی۔ مشین گن والا بھی جیپ میں موجود تھا......
''بیٹھو!'' شیراز سے کہا گیا......
شیراز جیپ میں بیٹھ گیا۔ مشین گن والا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔
''لوباش چیک پوسٹ۔'' اس سے کہا گیا۔
اس نے سر ہلایا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

☆☆☆

کافرستان میں تین علاقے ہیں۔ بجریت، بمبوریت اور کالاش! عقیدوں کے اختلاف کے باوجود یہاں پرامن لوگ ہیں۔ جن میں پائی جانے والی روایات کافی دلچسپ ہیں، لیکن صدف جب کالاش وادی پہنچی تھی تو یہ سب باتیں اس کے ذہن میں نہیں تھیں۔ وہ غیلاری...... کی عبادت گاہ پر پہنچی تھی جہاں سے معلوم ہوا تھا کہ غیلاری چترال گیا ہوا تھا۔ پھر صدف ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوگئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شیراز کو چترال بھیج کر اس نے بہت صحیح قدم اٹھایا تھا۔ اسے شیراز کی کال بھی ریسیو ہوگئی تھی کہ غیلاری سے اس کی ملاقات ایک گھنٹے بعد ہو سکے گی، لیکن جب ڈیڑھ گھنٹے بعد شیراز کی دوسری کال نہیں آئی تو اسے تشویش ہوئی۔ غیلاری سے ملاقات میں شیراز کو اتنی دیر تو نہیں لگنی چاہیے تھی۔ اسے غیلاری کو بس صدف کا پیغام پہنچانا تھا جس کے بعد صدف کی دانست میں غیلاری جلد از جلد کالاش وادی واپس لوٹتا......
ایک گھنٹا پینتیس منٹ کے بعد صدف نے شیراز کو فون کیا تو اس کا موبائل بند ملا۔ یہ اس کے لیے اور زیادہ تشویش کی بات تھی۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کا دماغ وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کچھ ایسے سوالات جنم لینے لگے جو اس کے لیے پریشان کن تھے۔
اسی عالم میں اس نے آدھا گھنٹا اور گزارا۔ اس آدھے گھنٹے میں شیراز سے رابطہ کرنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن شیراز کا موبائل بند ہی ملا۔ وہ پریشانی کے عالم میں کمرے سے نکل کر ہال میں آگئی......
ہال میں بیٹھ کر صدف نے کافی پی اور پھر اچانک یہ فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اسے چترال جانا چاہیے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ عین اس وقت جب وہ باہر نکلنے کے لیے پہلا قدم اٹھا چکی تھی، گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نے صدف کو اتنی زور کا دھکا دیا کہ وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکی۔
جس نے دھکا دیا تھا، وہ بھی ایک عورت تھی اور وہ بھی صدف کے قریب ہی گری تھی......
گولی کی آواز نے وہاں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ گولی ہوٹل کے باہر سے چلائی گئی تھی جو ہوٹل کے ایک ویٹر کے ہاتھ میں موجود ٹرے سے ٹکرائی تھی۔ ویٹر بری طرح بوکھلا گیا تھا۔
صدف اپنا لباس درست کرتی ہوئی اٹھی تو اس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ وہ گولی اسی پر چلائی گئی ہوگی۔
اسے دھکا دینے والی عورت بھی کھڑی ہو چکی تھی۔
''معاف کیجیے گا۔'' وہ بولی۔ ''میں اتنی جلدی میں تھی کہ آپ سے ٹکرا گئی۔''
صدف نے خود کو دروازے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے اس عورت کو غور سے دیکھا جو مقامی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اردو اس نے بڑی حد تک صاف لہجے میں بولی تھی۔
صدف کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق عورت نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس گولی کا نشانہ کون ہے۔ اسی لیے اس نے اسے دھکا دے کر گولی کا نشانہ بننے سے بچایا تھا۔
مگر کیوں؟ یہ عورت کون ہے؟
پے در پے کئی سوال صدف کے دماغ میں ابھرے۔
دو عورتوں کو گرتے دیکھ کر خاصے لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے تھے جن میں ہوٹل کی انتظامیہ بھی تھی۔ انہوں نے سوالات کی بھرمار کر دی تھی۔
جواب میں صدف کی مددگار عورت نے انہیں مقامی زبان میں دو ایک ہی جواب دیے تھے کہ پولیس آگئی، مقامی پولیس جنہیں صدف نے ان کے مخصوص لباس سے پہچانا۔ وہ تین تھے جن میں سے ایک عورت بھی تھی۔ ان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

تینوں ہی نے صدف کی مددگار عورت کو سیلیوٹ کیا جس پر صدف کو حیرت ہونی ہی چاہیے تھی۔ اسی عورت نے ان سے کچھ کہا جس پر انہوں نے وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو منتشر کردیا۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ ویٹر کو کہیں لے گئے جس کے ہاتھ میں موجود ٹرے گولی کا نشانہ بنی تھی۔ ویٹر کا ہاتھ بھی زخمی ہوا تھا۔

مددگار عورت نے مسکرا کر صدف سے کہا۔ ''میرا نام نتاشا ہے۔ کیا آپ مجھ سے چند منٹ بات کرنا پسند کریں گی؟''

''ضرور۔''

''تو آیئے، اس طرف بیٹھتے ہیں۔'' اس نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ صدف اس کے ساتھ اس کی میز پر جا بیٹھی۔

''میرا تعلق یہاں کی پولیس سے ہے۔'' نتاشا نے کہا۔

''پولیس والوں نے آپ کو سلام کیا تھا!''

''جی ہاں۔ میں ان کی آفیسر ہوں۔''

''اوہ!...... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ مقامی پولیس کے افسران کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے۔ پولیس کے مقامی لوگ کانسٹیبل کی سطح سے زیادہ کے نہیں ہیں۔''

''یہ کچھ پرانی بات ہوگی۔ اب ہمارے یہاں تعلیم بڑھ گئی ہے۔''

''یقیناً مجھے اس کا علم نہیں۔'' صدف نے کہا۔ ''لیکن ...... آپ مجھ سے کیا خاص بات کرنا چاہتی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' نتاشا نے کہا۔ ''آپ کو اندازہ ہوا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر آپ کو دھکا دیا تھا؟''

''ہاں کچھ شبہ تو ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی تھیں؟''

''میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ آپ کا خیال رکھوں کیونکہ پشاور ہی سے آپ کے کچھ دشمن آپ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور آپ کو شاید ختم کردینا چاہتے ہیں۔ آپ پشاور ہی سے آئی ہیں نا؟''

''جی ہاں اور اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو کیسے معلوم ہوا کہ میں کسی خطرے میں پڑ سکتی ہوں؟''

''یہ تفصیل مجھے نہیں بتائی گئی لیکن دو ایک باتوں سے مجھے ایک شبہ ضرور ہوا ہے۔''

''کس بات کا شبہ؟''

''پولیس افسران کی آپس کی دھیمی گفتگو میں سے چند لفظ میرے کان میں پڑ گئے تھے۔ ان میں ہمارے ایک رئیس شہزادہ خان کے علاوہ ہمارے قبیلے کے سردار سیف

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
900 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
0301-2454188
0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

جان کا نام بھی آیا تھا۔ شاید انہی میں سے کسی کے کہنے پر پولیس نے آپ کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ کیا آپ سیف جان سے واقف ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"شہزادہ خان سے؟"

"ان کو بھی نہیں جانتی۔ اگر آپ کے خیال میں انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم ہے تو ان سے ملنا ہوگا۔"

"سیف جان سے آپ کی ملاقات کرانا میرے اختیار میں نہیں ہے البتہ شہزادہ خان سے ملاقات کرا سکتی ہوں اگر وہ چترال سے جلد واپس آگئے۔"

"وہ چترال گئے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ آج ہی گئے ہیں۔ میرے علم کے مطابق انہیں کوئی خاص کام تھا جس کے لیے انہیں ہمارے ایک روحانی پیشوا کی مدد درکار تھی۔ اتفاق ہے کہ ہمارے وہ روحانی پیشوا بھی آج صبح چترال گئے تھے۔ شہزادہ خان انہی سے ملنے گئے ہوں گے۔"

"روحانی پیشوا؟" صدف نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا آپ کا اشارہ غیلاری بابا کی طرف ہے؟"

"اوہ! کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟"

"میں انہی سے ملنے یہاں آئی ہوں۔"

"خوب!" وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگی......

"اور کوئی بات؟" صدف نے کرسی پر پہلو بدلا۔

"دراصل مجھے کہیں جانا ہے۔"

"خطرے کی وجہ سے آپ کو ہوٹل تک محدود رہنا چاہیے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھ لیا تھا جو آپ کو ریوالور سے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔"

"کوئی مقامی......"

"جی نہیں۔ کسی مقامی کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ لوگ تو پشاور ہی سے آپ کے پیچھے آئے ہیں۔"

"کیا یہاں فائرنگ کرنے والے کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟"

"ریوالور والا فوراً بھاگ نکلا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ باہر موجود ہمارے کچھ لوگ اس کے پیچھے دوڑے تو ہوں گے۔ میں نتیجے سے ابھی بے خبر ہوں۔"

اسی وقت صدف کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر اسے شیراز کا نام دکھائی دیا۔

"کہاں ہو؟" وہ کال ریسیو کرتے ہی بولی۔ "تم نے اپنا موبائل بھی بند کر رکھا تھا۔ میں بہت پریشان ہو کر چترال آنے ہی والی تھی کہ یہاں ایک واقعہ پیش آگیا۔"

"میں ایک مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ہوٹل میں مجھے......"

شیراز نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔

صدف خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اس نے دو ایک سوال کرنے چاہے لیکن نتاشا کی موجودگی میں مناسب نہیں تھا۔

جب شیراز خاموش ہوگیا تو صدف نے پوچھا۔ "لیکن یہ بات تو خاصی دیر پہلے کی ہے۔ اس کے بعد تم نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا تھا؟"

"ان لوگوں نے میرا ریوالور اور موبائل مجھے دے دیا تھا' موبائل بند تھا۔ مجھے ذہنی اذیت کی وجہ سے اسے کھولنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ابھی میں نے دیکھا کہ موبائل بند پڑا ہے تو میں نے اسے کھولا۔ پھر خیال آیا کہ تمہیں فون پر ہی سب کچھ بتا دوں گا۔"

"اچھا خیر! تفصیلی بات تو یہاں آجاؤ گے، تبھی ہوگی۔ کب تک پہنچ رہے ہو؟"

"شاید پون گھنٹا اور لگے گا۔"

"میں ایک ہوٹل میں ہوں لیکن اب...... جیسا کہ غیلاری بابا نے ہدایت کی ہے، میں یہاں سے ان کے معبد چلی جاؤں گی۔"

نتاشا جو خاموشی سے صدف کی طرف دیکھ رہی تھی، غیلاری کا نام سن کر چونکی۔

صدف کہہ رہی تھی۔ "تم بھی وہیں چلے آنا۔ کسی سے بھی پوچھو گے، وہ تمہیں معبد تک پہنچا دے گا۔"

گفتگو ختم کر کے صدف نے موبائل بند کیا۔

نتاشا فوراً بولی۔ "آپ نے ابھی بتایا تھا کہ آپ غیلاری بابا ہی سے ملنے آئی تھیں۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو چترال سے آرہا ہے؟"

"جی ہاں۔ میں اور وہ ساتھ ہی آرہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ غیلاری بابا کہیں چترال نہ گئے ہوئے ہوں اس لیے اسے وہاں بھیج دیا تھا اور یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ میرے دوست کی ملاقات غیلاری بابا سے ہو چکی ہے اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میں ان کے معبد چلی جاؤں اور وہیں قیام کروں۔"

"غیلاری بابا......" نتاشا کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔ "وہیں شہزادہ خان بھی ان سے ملا ہوگا۔ غیلاری بابا جان چکے ہوں گے کہ یہاں آپ کسی خطرے سے دوچار

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہوسکتی ہیں اس لیے انہوں نے شہزادہ خان سے ہی اس بارے میں کچھ کہا ہو۔ شہزادہ خان نے فون پر سیف جان سے بات کی ہوگی۔ سیف جان نے یہاں کے پولیس آفیسر سے کچھ کہا ہوگا جس کی وجہ سے مجھے آپ کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔"

"شاید۔" صدف نے کہا لیکن اسے نتاشا کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے اب یہاں سے اپنا سامان لے کر معبد منتقل ہوجانا چاہیے۔"

"آپ کو ہوٹل آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ معبد ہی میں قیام کرتیں۔"

"پہلے میں وہیں گئی تھی لیکن وہاں کے لوگ مجھے بابا کی اجازت کے بغیر وہاں نہیں روک سکتے تھے لیکن اب انہیں فون پر بابا سے اجازت مل گئی ہوگی۔" صدف کھڑی ہوگئی۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس کار ہے۔ میں اپنی کار میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔"

☆☆☆

صدف ہوٹل سے معبد منتقل ہوگئی۔ اس مرتبہ بٹیان غیلاری کے نائبین نے اس کا استقبال بڑی عزت سے کیا۔ اس کے لیے ایک کمرا وہ پہلے ہی ٹھیک کروا چکے تھے۔ انہیں یقیناً غیلاری بابا سے ہدایات مل چکی ہوں گی۔

شیراز سے موبائل پر ہونے والی گفتگو کے باعث صدف کا دماغ اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ وہ لوگ کون ہوسکتے ہیں جنہوں نے شیراز کی مدد کی۔ شیراز نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے مددگار مقامی لوگ نہیں تھے۔ غالباً وہ بھی پشاور سے آئے ہوں گے، مگر کون؟"

اس سوال کا جواب اس کا دماغ نہیں دے سکا۔ وہ بے چینی سے شیراز کا انتظار کرتی رہی جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ شیراز اپنے سامان سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس کی آمد کے بارے میں صدف نے بٹیان غیلاری کے نائبین کو بتا دیا تھا اس لیے اسے فوراً صدف کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

"تم نے فون پر بڑے غیر معمولی حالات بیان کیے تھے لیکن مختصر طور پر، میں کئی سوال اس لیے نہیں کرسکی کہ میرے ساتھ کوئی تھا۔"

"کون؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ جنہوں نے تمہاری مدد کی تھی۔ نقاب پوش تو وہ اس لیے ہوں گے کہ تم سے اور تمہارے دشمنوں سے، بلکہ میرے دشمنوں سے اپنے چہرے چھپا سکیں لیکن تم نے بتایا تھا کہ آواز بدلنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ یہ بات تو ممکن نہیں معلوم ہوتی کہ تم ان سے واقف ہو اس لیے انہوں نے آواز بدلی۔ صرف یہ ممکن ہے کہ وہ میرے دشمنوں سے خود کو چھپانا چاہتے ہوں۔"

"یہی بات ہوسکتی ہے۔"

"لیکن یہ ایک معما ہے۔"

"جو کبھی نہ کبھی حل تو ہوگا۔"

"بٹیان غیلاری سے تمہاری اور کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"میری اس سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"کیا؟" صدف حیرت سے بولی۔ "تو پھر اس کی ہدایت؟"

"وہ۔" شیراز نے طویل سانس لی۔ "وہ مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی گئی تھی۔ فون پر میں وہ تفصیل نہیں بتا سکتا تھا۔ اختصار سے کام لیا تھا میں نے!"

"تو وہ کھوپڑی تم نے بھی خواب میں دیکھی تھی؟"

"خواب میں یا غنودگی میں، اس کا اندازہ نہیں مجھے۔"

"اب تو تمہیں میری باتوں پر مکمل یقین آ گیا ہوگا کہ بٹیان غیلاری......"

"یقین تو اسی وقت آ گیا تھا جب تم پر حملہ ہوا تھا۔"

"دوسرا حملہ بھی ہو چکا ہے۔"

"کب؟" شیراز چونکا۔

صدف نے بھی وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اس پر گزری تھی۔

شیراز بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مسلسل پیچھا کیا جا رہا ہے تمہارا!"

"اس حملے کے بعد تو بات بالکل واضح ہوگئی۔"

"ابھی ابھی ایک اور خیال آیا ہے مجھے۔ غیلاری نے جو ہدایات مجھے کھوپڑی کے ذریعے دی تھیں، وہ براہِ راست تمہیں کیوں نہیں دیں؟"

"اس لیے کہ میں یہاں آنے کے بعد نہ تو سوئی ہوں اور نہ مجھ پر غنودگی طاری ہوئی ہے۔ وہ کھوپڑی غالباً بیداری میں نظر نہیں آسکتی۔"

"ہوں۔" شیراز نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

"بٹیان غیلاری کا انتظار۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"وہ کب تک آ رہا ہے؟ پوچھا تھا یہاں کسی سے؟"
"ہاں۔ اس کے ایک نائب نے بتایا تھا کہ وہ کل صبح آئے گا۔"
"تو فی الحال ہمیں یہیں قید رہنا ہے؟"
"قید ہی سمجھو۔ باہر نکلنے میں تو خطرہ ہے۔"
"غیلاری تمہیں اس خطرے سے کس طرح بچائے گا؟"
"یہ تو اسی وقت معلوم ہوگا جب اس سے ملاقات ہو جائے۔"
شیراز نے اپنا پیٹ سہلایا۔ "مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔"
"رات ہو چکی ہے۔ بھوک تو لگے گی۔"
"یہاں کھانا تو ملے گا نا؟"
"کیوں نہیں ملے گا۔ میں ابھی کسی کو بلا کر بات کرتی ہوں۔"
"نہ جانے کیسا کھانا ہوتا ہوگا یہاں!"
"اب یہاں سب کچھ مل جاتا ہے، جو بھی کھانا چاہو۔ اب یہ سو پچاس سال پہلے کا کافرستان نہیں ہے۔ اچھے خاصے ہوٹل کھل چکے ہیں یہاں۔"
اسی دوران معبد کے ایک آدمی نے آ کر ان سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ صدف نے اسے ہدایات دیں اور وہ سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

صبح وہ دونوں اٹھے ہی تھے جب انہیں معلوم ہوا کہ غیلاری آ گیا تھا۔
"آپ لوگ ناشتا کر لیں پھر وہ آپ سے ملاقات کرنے خود آئیں گے۔" انہیں ناشتا پہنچانے والے نے بتایا۔
وہ دونوں بڑی بے چینی سے غیلاری کے منتظر تھے۔ انہوں نے جیسے تیسے ناشتا کیا اور انتظار کرنے لگے۔
"یہ تمہارا بٹیان آدمی کیسا ہے؟" شیراز نے پوچھا۔
"نہایت شفیق، نہایت شریف۔" صدف نے جواب دیا۔ "اس نے اپنی پراسرار قوتوں سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، اپنے کسی مخالف یا دشمن کو بھی نہیں۔"
"تمہیں اس کا یقین کیوں ہے؟"
"بٹیان غیلاری کی باتوں سے سمجھا ہے میں نے اور میں اسے جھوٹا انسان بھی نہیں سمجھتی۔"
وہ دونوں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک معمر شخص ان کے کمرے میں آیا۔ صدف اس کے احترام میں کھڑی ہوئی تو شیراز کو بھی کھڑا ہونا پڑا اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ غیلاری ہی ہوگا۔

اس کے بال سفید تھے لیکن عمر اتنی زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کسی موقع پر صدف نے اسے بتایا تھا کہ بٹیان غیلاری کی عمر نوے سال ہے لیکن وہ ساٹھ پینسٹھ سال کے تن درست شخص کی طرح چاق و چوبند تھا۔
اس کی شفقت کا مظاہرہ شیراز نے اسی وقت دیکھ لیا جب اس نے پہلے صدف اور پھر شیراز کے سر پر بزرگانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔
"میں تمہارا منتظر رہتا لیکن کل ایک بہت ضروری مسئلے کے باعث چترال جانا پڑ گیا۔"
"شیراز نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں شہزادہ خان آپ سے ملنے پہنچا تھا۔"
"ہاں۔ وہ اس وقت وہیں تھا اور ایک ایسے معاملے میں پھنس گیا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ وہ خود نہیں آ سکتا تھا اس لیے مجھے چترال جانا پڑا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ میں جان چکا تھا کہ تم شیراز کے ساتھ یہاں پہنچ چکی ہو۔ مجھے یہ علم بھی ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن تمہاری تاک میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور چترال میں شیراز کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس وقت تک انہیں علم نہیں تھا کہ تم کالاش وادی پہنچ چکی ہو۔ وہ شیراز سے تمہارے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اسی لیے میں نے شیراز کو خبردار کیا تھا اور اسے تمہارے لیے پیغام دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ چترال سے یہاں کے لیے روانہ ہوتا، دشمنوں نے اس کو اغوا کر لیا۔"
"اور کچھ لوگوں نے اسے میرے دشمنوں سے بچایا۔"
"یہ بھی میرے علم میں آ چکا ہے۔ پشاور ہی سے تمہارے کچھ ہمدرد بھی یہاں پہنچے ہیں جو تمہیں ہر قیمت پر دشمنوں سے بچانا چاہتے ہیں۔"
"وہ کون ہیں...... کون ہیں بابا؟" صدف نے بے چینی سے پوچھا۔
"میں دونوں ہی کے بارے میں جان چکا ہوں لیکن ابھی تمہیں بتا کر ذہنی انتشار میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن تم خود ہی سب کچھ جان لوگی۔ اس وقت کا انتظار کرو۔"
"ابھی آپ نے کہا تھا کہ شہزادہ خان کا آپ کے پاس پہنچنا اچھا ہی ہوا۔"
"ہاں۔" غیلاری نے جواب دیا۔ "مجھے علم ہو گیا تھا کہ تمہارے دشمن یہاں بھی پہنچ چکے ہیں۔ ہوٹل میں قیام کی وجہ سے تم کسی وقت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھیں اس لیے میں نے شہزادہ خان سے کہا کہ وہ سیف جان سے رابطہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کر کے تمہاری حفاظت کا بندوبست کروائے۔ اس نے یہ کام فوراً کیا تھا۔ پولیس کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے مامور کر دیے گئے تھے۔ تم پر جو گولی چلائی گئی تھی، اس سے تمہیں بچانے والی پولیس ہی سے تعلق رکھتی ہے۔"

"نتاشا نام بتایا تھا اس نے مجھے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"آپ کیا نہیں جانتے بابا!" اب شیراز بھی اس کا معتقد ہو چکا تھا۔

"ہاں۔" غیلاری مسکرایا۔ "میں سب جانتا ہوں لیکن ہر بات کا اظہار کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے۔"

"اب میرا بنیادی مسئلہ تو یہ ہے بابا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" صدف بولی۔ "آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا اور میں یہاں آ گئی ہوں۔"

"فوری طور پر میرے دماغ میں ایک بات آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ محبت کی وہ کھوپڑی ہی تمہاری حفاظت کرے گی۔"

"محبت کی کھوپڑی؟" شیراز پوچھ بیٹھا۔

"ہاں۔" غیلاری مسکرایا۔ "یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہاں کے ایک بہت خوب صورت اور بہادر شخص کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کا نام داگنائی تھا۔ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ بعض لوگ ان دونوں کی محبت کو ایک روایتی قصہ سمجھتے ہیں لیکن میں جو کچھ بتا رہا ہوں، وہ کوئی قصہ نہیں، حقیقت ہے۔ اس زمانے میں یہاں بہار کے موسم میں بکریوں کو چرانے کے لیے دور ایک چراگاہ میں جانا پڑتا تھا۔ داگنائی جب موسم بہار میں بکریاں چرانے جاتا تھا تو اس کی محبوبہ ایک پہاڑی ٹیلے پر اتنی آگ جلایا کرتی تھی کہ وہ چراگاہ سے دیکھی جا سکے۔ چراگاہ میں داگنائی آگ روشن کرتا تھا۔ اس طرح ان دونوں میں پیام وسلام ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ جب خزاں کے موسم میں داگنائی واپس آنے والا تھا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی کی طرف سے آگ نہیں جلائی گئی تھی۔ داگنائی اسی وقت بے تاب ہو کر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا۔"

"اور اسے معلوم ہوا کہ لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔" شیراز بول پڑا۔

"نہیں۔" غیلاری نے جواب دیا۔ "وہ لڑکی اچانک کسی وجہ سے مر گئی تھی، داگنائی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے سینے میں چھری مار کر خود کو ہلاک کر لیا۔"

"میں ایک مرتبہ یہ سب کچھ سن چکی ہوں۔" صدف بولی۔ "یہاں کی لڑکیاں اب بھی رقص کر کے اور گا کر داگنائی کی محبت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔"

غیلاری نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "اس زمانے میں میرے جدامجد اس معبد کے بڑے پجاری تھے۔ چند سال بعد انہیں خواب میں بشارت ہوئی۔"

"بشارت؟" شیراز بول پڑا۔ "کس کی طرف سے؟"

"یہ سوال مت کرو میرے بچے!" غیلاری مسکرایا۔ "شہروں کی بڑی بڑی درس گاہوں میں پڑھے ہوئے لوگ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتے۔"

"بابا کو اپنی بات کرنے دو شیراز!" صدف بول پڑی۔

"ہاں۔" غیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔ "انہیں بشارت یہ ہوئی کہ ہمارے بڑے دیوتا نے محبت کے لیے داگنائی کی قربانی اس حد تک پسند کی ہے کہ اس کی کھوپڑی کو غیر معمولی طاقتیں بخش دی ہیں لہٰذا اس کھوپڑی کو اب مندر میں ہونا چاہیے چنانچہ میرے جدامجد قبرستان گئے اور صندوق سے داگنائی کی کھوپڑی نکال لائے۔ اسے صاف ستھرا کیا تو دیکھا کہ اس میں غیر معمولی چمک تھی۔ وہ چمک اس قوت کی تھی جو ہمارے بڑے دیوتا نے اسے دی تھی اور اسے محبت کی کھوپڑی قرار دیا تھا۔ میرے جدامجد نے وہ کھوپڑی محبت کی دیوی وینا کے مجسمے کے قدموں میں رکھ دی۔"

"وینا۔" شیراز پھر بول پڑا۔ "سوا دو ہزار سال پہلے یونان کا سکندر اس علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے خاصے فوجی یہیں رہ گئے تھے۔ غالباً اس کے اثرات یہاں اب تک ہیں۔ یونانی مائتھالوجی میں ان کی ایک دیوی وینس ہے جس کو حسن و محبت سے نسبت دی جاتی ہے۔ یہ نام "وینا" کیا وینس ہی کی وجہ سے رکھا گیا ہے؟"

غیلاری نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمارا عقیدہ یہ رہا ہے کہ اگر کوئی محبت کرنے والا کسی پریشانی میں پڑ جائے تو داگنائی کی کھوپڑی اس کی مدد کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کھوپڑی میں دنیا کی سب سے قیمتی دھات کا ایک دانت لگوا دے۔"

"سب سے قیمتی دھات تو غالباً پلاٹینم ہے۔" شیراز پھر بول پڑا۔

غیلاری نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس طویل عرصے میں چار بار ایسا ہو چکا ہے کہ یہاں کے چار دولت مندوں نے اس کھوپڑی کے دانت لگوائے ہیں، مختلف ادوار میں۔ وہی دانت اب بھی داگنائی کی کھوپڑی میں ہیں۔ جن لوگوں نے دانت لگوائے تھے، داگنائی کی قوت

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

نے ان کی پریشانی دور کردی۔“
”یہاں ایسے کاریگر ہیں جو کھوپڑی میں دھات کے دانت فٹ کرسکیں؟“
”نہیں۔“ اس مرتبہ غیلاری نے اسے جواب دیا۔ ”اس کے لیے کھوپڑی تمہاری دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں لے جانی پڑتی ہے۔ ہمارے کئی بزرگ داگناٹی کی کھوپڑی لے کر وہاں جاچکے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز اب تک حاصل نہیں ہوا۔“
”اسی لیے آپ نے مجھے یہاں بلایا تھا۔“ صدف مسکرائی۔ ”آپ چاہتے تھے کہ میں داگناٹی کی کھوپڑی میں پانچواں دانت لگوا کر اپنی پریشانی سے نجات حاصل کرلوں؟“
”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔ ”فوری طور پر میرے دماغ میں یہی خیال آیا تھا لیکن پھر یہاں حالات کچھ بدل گئے۔ میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ میں ہفتے بھر کے لیے بھی معبد سے غیر حاضر رہ سکوں اور داگناٹی کی کھوپڑی صرف میں ہی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔“
”تو پھر اب آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟“
”تمہیں واپس جانا ہوگا۔“ غیلاری نے کہا۔ ”سیف جان کے ذریعے تمہاری حکومت کو آگاہ کردیا جائے گا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ اس طرح سرکاری طور پر تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی ہوجائے گا اور وہ لوگ تمہارے دشمنوں کا بھی سراغ لگالیں گے۔ اس کے علاوہ میں بھی بہرحال تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔“
”یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے۔“ شیراز نے سر ہلایا۔
”ابتدا ہی میں یہ قدم اٹھایا جانا چاہیے تھا۔“
”میری خواہش تھی کہ مجھے داگناٹی کی کھوپڑی میں پانچواں دانت لگوانے کا اعزاز حاصل ہوجائے۔“
”آپ نے وہ کھوپڑی میرے خیالوں میں کیسے پہنچادی تھی؟“
”وہ داگناٹی کی کھوپڑی نہیں، اس کا عکس ہوتا ہے۔ میں نے ایک عمل کے ذریعے یہ طاقت حاصل کی ہے کہ داگناٹی کی کھوپڑی کے عکس کے ذریعے کسی سے بھی بات کرسکوں۔“
”مجھے اپنی بات کرنے دو شیراز!“ صدف بولی اور پھر غیلاری سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے کب واپس جانا چاہیے؟“
”پیاری لڑکی!“ غیلاری مسکرایا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہو اس بات سے کہ کچھ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہوگئے ہیں۔“
”ہاں بابا! مجھے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ بس الجھن میں ضرور ہوں کہ میری زندگی کا دشمن کون ہے اور کیوں ہے۔“
غیلاری نے طویل سانس لی۔ ”جب تم پر یہ راز کھلے گا تو...... “ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
”تو؟“ صدف کا انداز سوالیہ تھا۔
”بس تم واپسی کے بارے میں سوچو۔“ غیلاری نے جواب دینے سے پہلو بچایا۔
”آپ نے بتایا نہیں کہ میں کب واپس جاؤں؟“
”ستاروں کے حساب سے تمہیں آج سہ پہر تک یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔“
”یعنی رات کا سفر؟“ شیراز بولا۔
”ہاں۔“ غیلاری نے کہا۔
اسی وقت ایک آدمی ناشتے کا سامان لے کر آگیا۔
”ہم ناشتا کرچکے ہیں۔“ صدف نے بتایا۔
”میں نے نہیں کیا۔“ غیلاری نے جواب دیا۔ ”رات کو دیر تک جاگا تھا۔ ابھی آنکھ کھلی تو فوراً تم سے ملنے آگیا۔ تم لوگ یہ اخروٹ اور شہتوت کھاؤ۔“ ناشتے میں یہ دونوں چیزیں بھی تھیں۔ ”اتنے مزے دار شہتوت اور اخروٹ تمہیں ہمارے علاقے کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتے۔“
”بابا صحیح کہہ رہے ہیں شیراز!“ صدف بولی۔ ”میں جب پہلی بار یہاں آئی تھی تو میں نے اخروٹ اور شہتوت بہت کھائے تھے۔“
ناشتے کے بعد غیلاری دو ایک باتیں کرکے رخصت ہوگیا۔
”میری خواہش تھی کہ میں یہاں کچھ دن اور گزاروں۔“ شیراز بولا۔ ”یہ علاقہ اور یہاں کے رہنے والے مجھے بہت پیارے لگے ہیں۔ ایک الگ ہی کلچر ہے ان کا۔ لباس دیکھو تو انوکھا۔ ہرے نیلے رنگ کے کپڑے اور ان پر سیپیاں، ٹوپی بھی خوب ہوتی ہے۔ علاقہ بھی سرسبز ہے بے حد۔ صنوبر کے درخت ہی درخت۔“
”چلو...... حالات ٹھیک ہونے کے بعد یہاں آتے رہنا۔“ صدف ہنس کر بولی۔
شیراز اسے غور سے دیکھنے لگا۔
”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ پھر ہنسی۔
”تمہاری زندگی خطرے میں ہے اور تم اس طرح ہنس بول رہی ہو جیسے یہ عام حالات ہوں۔“
”تو کیا آدمی کو مرنے سے پہلے مرجانا چاہیے؟“ صدف مسکرائی۔ ”اور پھر میری وجہ سے تم بھی خطرے میں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

ہو۔ تمہیں اغوا کیا جاسکتا ہے۔ ایک بار کیا بھی جاچکا ہے لیکن تم بھی نارمل نظر آرہے ہو۔"

شیراز نے طویل سانس لی۔ "تمہارا سایہ جو پڑ گیا ہے مجھ پر...... اور اب ایک اطمینان یہ ہوگیا ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے بھی کچھ نامعلوم لوگ ہیں۔"

"اس بات نے مجھے اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔" صدف سنجیدہ ہوگئی۔ "اور جب سب کچھ سامنے آجائے گا تو نہ جانے کیا ہو۔ غیلاری بابا کے الفاظ یاد ہیں مجھے۔"

"واپس شہر پہنچنے کے بعد ہی یہ معاملہ حل ہوگا۔" شیراز نے کہا، پھر مسکراتا ہوا بولا۔ "بشرطیکہ ہم صحیح سلامت شہر پہنچ جائیں۔"

☆☆☆

سہ پہر کو وہ دونوں کافرستان سے روانہ ہوئے۔

"پہلے تو تمہیں میرے ہی گھر چلنا ہوگا۔" راستے میں شیراز نے کہا۔ "تمہاری کار وہیں ہے۔"

"وہاں سے مجھے اپنی کار لے کر آئی جی کے پاس جانا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اس وقت سامان ٹھیک کرنے میں مصروف تھے جب غیلاری بابا نے مجھے یہ ہدایت کی تھی۔" صدف نے جواب دیا۔ "یہاں کے سردار سیف جان نے میرے بارے میں آئی جی ہی سے بات کی ہے، اسے بتایا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ دو مرتبہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جاچکی ہے۔"

"ہم رات گئے پہنچیں گے پشاور۔" شیراز نے کہا۔ "اس وقت آئی جی پولیس ہیڈ کوارٹر میں تو نہیں ہوگا، اپنے گھر پر پڑا سو رہا ہوگا۔"

"میں اس کے گھر ہی جاؤں گی۔ غیلاری بابا نے بتایا ہے کہ اس وقت آئی جی اپنے گھر پر میرا منتظر ہوگا۔ اسے بتایا جاچکا ہے کہ میں وہاں کس وقت پہنچوں گی۔ ان سب باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آئی جی سے سیف جان کے تعلقات ذاتی نوعیت کے ہیں۔"

"تب ٹھیک ہے، ورنہ اتنی رات کو کسی کے گھر جانا مناسب نہیں ہوتا۔ میں بھی چلا جاؤں گا تمہارے ساتھ۔"

"نہیں۔" صدف نے کہا۔ "میں اکیلی ہی جاؤں گی آئی جی کے پاس۔"

"تم خطرے میں ہو، کسی کو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

"کار جیسے ہی پشاور کی حدود میں داخل ہوگی، پولیس خفیہ طور پر مجھے نظر میں رکھے گی۔ یعنی اس طرح میری

موذی

ہمیں غور و فکر کی لت لگانے کے بعد انہوں نے آنا جانا موقوف کردیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ واقعی تائب ہوگئے ہیں اور کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، بالخصوص سگریٹ پینے والوں سے۔ (انہی کا قول ہے کہ بڑھیا سگریٹ پیتے ہی ہر شخص کو معاف کردینے کو جی چاہتا ہے۔ خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) میں گیا بھی تو کھنچے کھنچے رہے اور چند دن بعد ایک مشترکہ دوست کے ذریعے کہلوایا کہ "اگر میں نے برنائے مجبوری سگریٹ پینے کی قسم کھائی تھی تو آپ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ زبردستی پلادیتے۔ میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں۔" سات مہینے تک سگریٹ اور سوسائٹی سے اجتناب کیا لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے، آخر ایک دن جب وہ وعظ سن کر خوش خوش گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں بس میں ایک سگریٹ لائٹر پڑا مل گیا چنانچہ پہلے ہی بس اسٹاپ پر اتر پڑے اور لپک کر سگریٹ کا ڈبا خریدا (ہمیں اس واقعے پر قطعاً تعجب نہیں ہوا اس لیے کہ گزشتہ کرسمس پر انہیں کہیں سے نائلون کے موزے چار آنے رعایت سے مل گئے تھے جن کو "میچ" کرنے کے لیے انہیں ایک دوست سے قرض لے کر پورا سوٹ سلوانا پڑا) سگریٹ اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں میں دبا کر لائٹر جلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اندر کے تمام پرزے غائب ہیں۔ اب ماچس خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے اکثر یہی دیکھا کہ مرزا پیمبری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے! اور دوسرے دن اچانک غریب خانے پر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے بادل چھاگئے جن میں سے مرزا کا مسکراتا ہوا چہرہ رفتہ رفتہ طلوع ہوا۔ گلے شکوے تمام ہوئے تو نتھنوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے بشارت دی کہ سگریٹ میرے لیے موجبِ نشاط نہیں، ذریعۂ نجات ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس

عاصم خان، حیدر آباد کا مطالعہ

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آئی جی کو تمہاری کار کا نمبر بتا دیا گیا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری تنہائی کی وجہ سے پریشان رہتا۔" شیراز نے کہا پھر بولا۔ "جب تم تھک جاؤ تو بتا دینا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں سنبھال لوں گا۔"

صدف نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

تین گھنٹے بعد ڈرائیونگ سیٹ شیراز نے سنبھال لی۔

صدف اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"پچھلی سیٹ پر جا کے لیٹ جاؤ۔" شیراز نے کہا۔

"اتنی تھکن بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"جب دماغ کسی الجھن کا شکار ہو تو تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔" شیراز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم کافی الجھی ہوئی ہو۔"

"یہ بات مجھے زیادہ الجھا رہی ہے کہ کوئی ایک مجھے ختم کرانا چاہتا ہے اور کوئی دوسرا مجھے بچانے کے لیے مستعد ہے۔"

شیراز نے سر ہلا دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر جاتا ہوا راستہ پہاڑ کے گرد گردش میں نظر آتا ہے۔ گاڑیوں کی روشنیاں اوپر بھی دکھائی دیتی ہیں اور نیچے بھی لیکن دن کی بہ نسبت رات کے وقت ٹریفک کم ہو جاتا ہے۔ اس خیال کا اظہار شیراز نے بھی کیا۔

"ہاں۔" صدف نے کہا۔ "لوگ احتیاطاً رات کے وقت کم سفر کرتے ہیں۔ خصوصاً برف باری کے موسم میں تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی ہم برف باری کے موسم سے دور ہیں۔"

"یہ اچھا ہی ہے، کسی پریشانی میں نہیں پڑے۔ رات کے وقت یہاں لگتا بہت اچھا ہے۔ دن میں تو دکھائی نہیں دیتا لیکن رات کے وقت ہیڈ لائٹس کی وجہ سے پتا چلتا رہتا ہے کہ ہمارے اوپر کے راستے پر کتنی گاڑیاں رواں دواں ہیں اور نیچے کتنی ہیں۔ اس وقت دو گاڑیاں اوپر دکھائی دے رہی ہیں۔ تین گاڑیاں نیچے ہیں۔ نیچے والی دو گاڑیاں نیچے جا رہی ہیں۔ ایک اوپر آ رہی ہے۔ جو گاڑیاں اوپر ہیں، اگر ان کی رفتار ہم سے زیادہ تیز ہوئی تو وہ جلد ہی ہمیں اپنے پیچھے نظر آئیں گی۔"

"اور جو اوپر آ رہی ہے، وہ ہمارے سامنے آ جائے گی۔ اس وقت بہت محتاط رہنا ڈرائیونگ میں۔ بعض جگہ راستہ بہت تنگ ہوتا ہے۔"

"دیکھ چکا ہوں میں۔"

اسی وقت انہیں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں چونک گئے۔ پھر انہوں نے ایسی آواز بھی سنی جیسے کوئی بہت بڑا پتھر لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا ہو۔

چاندنی رات ہونے کی وجہ سے شیراز اور صدف نے پتھر دیکھ لیا۔ وہ خاصا بڑا پتھر تھا جو ان کی گاڑیاں کو کچل بھی سکتا تھا۔

"بریک لگاؤ۔" صدف تیزی سے بولی۔

شیراز اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بریک لگا چکا تھا لیکن نیچے جاتی ہوئی گاڑی میں فل بریک لگانا گاڑی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے شیراز نے اس طرح بریک لگایا تھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہوتی چلی گئی۔

گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

پہاڑ پر ایسی آوازوں کی گونج ایسی ہوتی ہے کہ فائرنگ کی سمت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا لیکن گولیاں چلنے سے جو شعلے چمک رہے تھے، وہ اوپر دکھائی دے رہے تھے۔

جو دو گاڑیاں اوپر تھیں، وہ اب دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ غالباً ان کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ انہی گاڑیوں میں سے لوگوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلانی شروع کی ہوں۔

جو پتھر اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا، وہ ان کی گاڑی سے خاصا آگے راستے پر گرا۔ اب شیراز، گاڑی روک چکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"کیا یہ پتھر ہماری گاڑی کو کچلنے کے لیے لڑھکایا گیا ہوگا؟" وہ بولا۔

"اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" صدف نے کہا۔ "شاید یہ مجھے ختم کرنے کی تیسری کوشش تھی۔"

شیراز نے اس وقت دیکھا کہ صدف نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا اور بہت چوکنا نظر آ رہی تھی۔

"یہ جو فائرنگ ہے۔" وہ پھر بولی۔ "یہ شاید وہ لوگ ہوں گے جن میں سے ایک مجھے ختم کرنا اور دوسرا مجھے بچانا چاہتا ہے۔ اس پتھر کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں گاڑی روکنا پڑے۔ آگے بڑھو شیراز! ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔"

اس وقت فائرنگ کی آوازیں آنی بند ہو چکی تھیں۔

شیراز گاڑی کو پھر حرکت میں لے آیا۔ پتھر...... راستے کے کنارے پر تھا۔ اگر بیچ میں ہوتا تو گاڑی آگے نکالنا مشکل ہو جاتا۔

"یہ صورتِ حال تو بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی ہے۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

اس مرتبہ شیراز کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ممکن ہے کہ اوپر اب دو ایک لاشیں بھی پڑی ہوئی ہوں۔'' صدف بولی۔ ''اتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی۔''

''اور ہلاک ہونے والے دونوں ہی طرف کے لوگ ہوسکتے ہیں۔''

''ہوں۔''

اسی وقت شیراز کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

صدف جلدی سے بولی۔ ''تم اسٹیئرنگ دونوں ہاتھوں سے سنبھالے رکھو۔ میں دیکھتی ہوں۔'' صدف نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔

''اجنبی نمبر۔'' صدف اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔

''دیکھو تو، کون ہے۔''

صدف نے کال ریسیو کی لیکن خاموش رہی۔ وہ پہلے دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سننا چاہتی تھی۔

''ہیلو!'' ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شیراز...... ہیلو!''

''کون ہیں آپ؟'' صدف نے پوچھا۔

دوسری طرف چند لمحے سکوت رہا پھر آواز آئی۔

''آپ صدف بول رہی ہیں؟''

''آپ کون ہیں؟ مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' صدف نے پوچھا۔ اس نے موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا تاکہ شیراز بھی وہ باتیں سن سکے۔

موبائل پر آواز آئی۔ ''میں وہی ہوں صدف بی بی جس نے آپ کے دوست کو آپ کے دشمنوں سے چھڑایا تھا۔ ان کا موبائل ہم نے آپ کے دشمنوں سے واپس لیا تھا تو دیکھ لیا تھا کہ اس کا نمبر کیا ہے۔ میں آپ کے پیچھے آرہا ہوں۔ جو پتھر آپ کے راستے میں آکر گرا ہے، وہ انہی لوگوں نے گرایا تھا جو آپ کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے انہی لوگوں پر فائرنگ کی تھی۔ پھر ان لوگوں نے بھی گولیاں چلانی شروع کردیں لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے البتہ ان میں سے دو مارے جاچکے ہیں۔ باقی دو اپنی گاڑی چھوڑ کر کسی طرف بھاگ چکے ہیں۔ میں نے فون یہ کہنے کے لیے کیا ہے کہ آپ دونوں تیزی سے نکل جانے کی کوشش کیجیے...... ممکن ہے کہ آپ کے دشمن دوسرا ناکا لگائے بیٹھے ہوں۔''

''ہم آگے نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں لیکن آپ کون ہیں؟ آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہے کہ میں خطرے میں ہوں یا نہیں؟''

صدف کو اپنی اس بات کا جواب نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا تھا۔

صدف نے موبائل بند کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا۔ ''یہ آواز۔'' شیراز سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اسی آدمی کی تھی جن لوگوں نے مجھے بچایا تھا، زیادہ تر یہی بولتا رہا تھا اس وقت۔ اس نے اپنی آواز بھی بدلی تھی۔ فون پر اور زیادہ بدلی ہوئی تھی لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔''

''اس کا نمبر تو آ گیا ہے تمہارے موبائل پر۔ کسی وقت اس سے دوبارہ بات کی جاسکتی ہے۔'' صدف نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کسی طرح معلوم تو ہو کہ یہ کون ہے۔''

''تم اس صورتِ حال سے نکل آنے کے بعد بھی پرسکون نظر آرہی ہو۔'' صدف جھنجلاسی گئی۔

''کتنی بار کرو گے اس قسم کی باتیں؟...... تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ خوف مجھ سے ہمیشہ دور رہتا ہے۔''

''تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے یار!''

''بار بار یہ باتیں مت کیا کرو۔''

''اچھا سرکار۔''

صدف نے موبائل اس کی جیب میں واپس رکھنے سے پہلے کال کرنے والے کا نمبر اپنے موبائل میں ''فیڈ'' کرلیا۔

پشاور پہنچنے تک ان دونوں کا موضوع، صدف کی زندگی کو خطرات اور اس کے ''نامعلوم'' دشمن اور دوست ہی رہے۔

پشاور کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انہیں یہ احساس بھی ہوگیا کہ ان کے پاس سے آتی جاتی ہوئی گاڑیوں میں پولیس کے سادہ لباس والے ہوسکتے تھے۔

شیراز کے گھر پہنچنے کے بعد صدف وہاں سے اپنی کار لے کر فوراً ہی روانہ ہوجانا چاہتی تھی لیکن شیراز نے اصرار کرکے اسے چائے کے لیے روک لیا۔ رات کا کھانا وہ راستے ہی میں کھاچکے تھے۔

چائے پیتے ہوئے شیراز نے پوچھا۔ ''تم آئی جی کے گھر پہنچوگی کیسے؟ کیا پتا بھی بتادیا گیا ہے؟''

''ہاں، اور بہت آسان پتا ہے۔ آسانی سے پہنچ جاؤں گی۔''

☆☆☆

صدف کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ چائے پینے کے بعد وہ شیراز کے گھر سے اپنی کار میں روانہ ہوئی تو

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

آدھے گھنٹے کے اندر اندر بڑی آسانی سے آئی جی کے گھر پہنچ گئی۔

غیلاری کے کہنے کے مطابق آئی جی اس کا منتظر تھا۔

"میرا خیال تھا بے بی کہ آپ آدھے گھنٹے پہلے آجائیں گی۔"

"راستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کا اندازہ غلط ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟"

"پچھلی باتیں تو آپ کو سیف جان سے معلوم ہو چکی ہوں گی۔"

"ہاں۔" آئی جی نے کہا۔ "مجھے تفصیل سے سب کچھ بتایا جا چکا ہے۔"

"یہاں آتے ہوئے مجھ پر ایک بار پھر حملے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"کیسے؟" آئی جی نے تیزی سے پوچھا۔

صدف نے وضاحت سے سب کچھ بتایا۔

آئی جی بولا۔ "آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ آپ کا مددگار کون ہے؟"

"بالکل نہیں ہے۔"

"اور جو آپ کا دشمن ہو گیا ہے، اس کے بارے میں بھی آپ کسی پر شبہ ظاہر نہیں کرنا چاہتیں!"

"جی۔"

"ایسی صورت میں تفتیش آگے بڑھانا خاصا دشوار ہوگا۔ یہ بات تو غالباً آپ کے علم میں نہیں ہوگی کہ آج آپ کے والد اور والدہ نے پولیس میں آپ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہے؟"

"جی بالکل۔ مجھے علم کیسے ہو سکتا تھا!"

"آپ نے اپنے والدین کو بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ کالاش وادی جا رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ؟"

"اچانک فیصلہ کیا تھا میں نے وہاں جانے کا۔"

صدف نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا بتانا ہے اور کیا نہیں بتانا۔

"اس کے باوجود۔" آئی جی نے کہا۔ "آپ انہیں فون پر بتا سکتی تھیں۔"

"میں انہیں فون پر اطلاع دینے ہی والی تھی کہ مجھے ایک خیال آ گیا۔ یعنی میرا دشمن کوئی ایسا بارسوخ شخص بھی ہو سکتا ہے جو کمپنی سے میری لوکیشن معلوم کر لے۔"

آئی جی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "آپ کسی پر شبہ ظاہر نہیں کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی سے آپ کی دشمنی یا کسی معاملے میں مخالفت نہیں ہے۔"

"درست خیال ہے آپ کا۔ میرے صرف دوست ہیں، دشمن کوئی نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ میری جان کا دشمن کون ہو گیا ہے اور کیوں ہو گیا ہے۔"

"خیر! فی الحال آپ کی حفاظت کا بندوبست تو میں نے فوراً ہی کر دیا تھا۔ اس معاملے کی تفتیش کے لیے انسپکٹر آصف کو بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ کل کسی وقت آپ سے ملاقات کرے گا۔ فون کر کے آئے گا۔ فی الحال میں نے ایک اور آفیسر کو روک رکھا ہے۔ وہ ایک موبائل میں آپ کی گاڑی کے پیچھے آپ کے گھر تک جائے گا۔ آپ اپنے گھر ہی جائیں گی نا؟"

"کیا آپ کے خیال میں مجھے گھر نہیں جانا چاہیے؟"

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" آئی جی نے کہا۔ "روا روی میں پوچھ بیٹھا۔ میں آپ کے والد کو فون کر کے ان سے کہوں گا کہ وہ پولیس کو آپ کی واپسی سے آگاہ کر دیں تاکہ اس رپورٹ پر کام نہ کیا جائے جو انہوں نے کی ہے۔"

"بہتر۔"

"مجھے مختصر طور پر جو کچھ معلوم کرنا تھا، وہ میں نے معلوم کر لیا۔ اب آپ جا سکتی ہیں!"

"ابھی آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے کسی پولیس آفیسر کو روک رکھا ہے جو......؟"

"وہ باہر پولیس موبائل ہی میں بیٹھا ہے۔ آپ اپنی گاڑی میں روانہ ہوں گی تو موبائل آپ کے پیچھے چل پڑے گی۔ میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے کہ ہر وقت ایک موبائل آپ کے ساتھ رہے۔"

"بہت شکریہ۔" صدف کھڑی ہو گئی۔

جب وہ آئی جی کے گھر سے روانہ ہوئی تو اس نے دیکھ لیا کہ ایک پولیس موبائل اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

اب صدف کو سوچنا یہ تھا کہ اشرف خاں اور دل شاد خانم سے کیا بات کرے گی۔ خاص طور سے دل شاد خانم تو اس پر بہت بگڑتیں کہ وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو اسے فوری طور پر تعجب ہوا کہ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں اس کے منتظر تھے۔

"آپ دونوں اتنی جلدی تو نہیں اٹھتے۔"

"آئی جی کا فون آیا تھا ابھی۔" اشرف خاں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد ہی میں نے تمہاری ماں کو جگا دیا ہے حالانکہ یہ گھنٹا بھر پہلے ہی سوئی تھیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

پریشان کر دیا تم نے۔ آخر کہاں غائب ہوگئی تھیں؟'' آخری فقرہ کہتے ہوئے اشرف خاں کے لہجے میں تختی آ گئی تھی۔

''میں کالاش وادی چلی گئی تھی۔ اچانک پروگرام بنایا تھا۔''

''فون بھی نہیں کر سکتی تھیں!'' دل شاد خانم پھٹ پڑیں۔ ''تمہیں اتنی آزادی اس لیے تو نہیں دی گئی تھی۔''

''آئی ایم سوری مما!'' صدف نے دھیمی آواز میں کہا۔

''نیند خراب ہوگئی میری۔ صبح بات کروں گا اب تم سے!'' اشرف خاں نے کہا اور ڈرائنگ روم سے جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''نیند۔'' دل شاد خانم نے ترشی سے کہا۔ ''نیند اب کیا خاک آئے گی۔''

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے مما!'' صدف کھڑی ہوگئی۔ ''پلیز! میرے کمرے میں چلیے۔ ناراض ہیں آپ مجھ سے۔ میں آپ کی ناراضگی دور کردوں گی۔''

دل شاد خانم نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔

صدف انہیں اپنے کمرے میں لے آئی اور انہیں بڑی محبت سے اپنے بستر پر بٹھا کر خود ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''خوشامد سے میری ناراضگی ختم نہیں ہوجائے گی۔'' دل شاد بیگم ترخیں۔

''یہ خوشامد نہیں ہے مما! میری جگہ آپ کے قدموں ہی میں ہے۔ میں آپ سے پہلے صرف یہ سوال کروں گی کہ...... کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی اس دنیا میں نہ رہے؟''

''کیا مطلب؟''

''میری زندگی خطرے میں ہے مما۔''

دل شاد بیگم چونک پڑیں۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں مما...... ! میں اپنی حفاظت ہی کے لیے کالاش وادی گئی تھی۔''

''وہاں کیوں...... اور تمہارا دشمن کون ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی اور یہی جاننے کے لیے کالاش وادی گئی تھی لیکن غیلاری بابا نے میرے دشمن کی نشاندہی نہیں کی۔ بس میری حفاظت کا بندوبست کرا دیا۔''

''کالاش وادی کے اس بوڑھے کے بارے میں تم پہلے بھی بتا چکی ہو اور مجھے کسی انسان کی ایسی طاقتوں پر یقین نہیں ہے۔'' دل شاد خانم نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری دشمنی کس سے ہوگئی ہے؟''

''مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کسی کو اپنا دشمن بنایا ہو۔''

''کہیں تم...... کسی کے راز سے تو واقف نہیں ہوگئی ہو؟''

صدف نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا۔ ''جی۔''

''کس کے؟'' دل شاد خانم نے جلدی سے پوچھا۔

صدف ان کے سوال پر دھیان دیے بغیر بولی۔ ''لیکن میں نہیں مان سکتی کہ وہ شخص میری جان کا دشمن ہوسکتا ہے۔''

''آخر وہ ہے کون؟''

صدف نے پھر ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ ''جس شخصیت کے ایک راز سے میں واقف ہوگئی ہوں، اسے آپ بھی جانتی ہیں۔''

''میں بھی جانتی ہوں؟'' دل شاد خانم نے چونک کر کہا، پھر کچھ اس طرح ٹھنڈی سانس لی جیسے صدف کا اشارہ سمجھ گئی ہوں، تاہم سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''بابا۔'' صدف نے اب بھی دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیکن میں اس معاملے میں شدید الجھن کا شکار ہوں۔ کوئی باپ اس طرح اپنی اولاد کا جانی دشمن کیسے ہوسکتا ہے!'' پھر وہ حیرت سے بولی۔ ''مما! میرا خیال تھا کہ آپ بابا کا نام سن کر چونک جائیں گی لیکن......'' وہ رکی۔ ''کیا آپ بھی ان کے اس راز سے واقف ہیں؟''

''ہاں۔'' دل شاد خانم نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور...... اور...... اور......'' صدف فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

''میرے مقدر میں یہی لکھا ہے۔'' دل شاد خانم نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''مگر میں صبر کر چکی ہوں۔''

''اوہ!'' صدف ماں کا منہ تکتی رہ گئی۔

دل شاد خانم کچھ توقف سے بولیں۔ ''کالاش وادی تم اسی شخص سے ملنے گئی تھیں جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے؟''

''جی۔''

''تمہارا خیال تھا کہ وہ تمہیں بچالے گا...... یا بچا سکتا ہے؟''

''جی مما! مجھے خطرے سے بھی انہوں نے ہی آگاہ کیا تھا۔ بعد میں ان کی بات سچ بھی ثابت ہوگئی۔ میری جان لینے کے لیے تین کوششیں کی جا چکی ہیں۔''

صدف نے وہ سب کچھ بھی بیان کر دیا جو کچھ اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ بٹیان غیلاری نے اسے خطرے سے کس طرح آگاہ کیا تھا پھر بولی۔ ''اب میری دوسری الجھن یہ بھی ہے کہ مجھے بچانے کی کوشش کرنے والے کون لوگ ہیں۔''

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"اب تو یہ سب کچھ شاید پولیس ہی معلوم کر سکے گی۔"

"مجھے اس پر یقین نہیں ہے مما کہ بابا میری زندگی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اب مجھے یہ پریشانی بھی ہے کہ پولیس نے بابا کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ آپ انہیں سمجھاتی کیوں نہیں مما کہ وہ یہ سارے کام چھوڑ دیں۔"

"کر چکی ہوں بات! کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میں جا کر سوؤں گی۔ تم بھی سو جاؤ۔ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔"

صدف کچھ نہیں بولی۔ دل شاد خانم اس کے کمرے سے چلی گئیں۔ ساری رات جاگنے کے باوجود صدف کو کچھ دیر سے ہی نیند آئی۔ دوسری صبح وہ جاگی بھی دیر سے۔

"تمہارے باپ نے تمہارے جاگنے کا انتظار نہیں کیا۔" دل شاد خانم نے اس سے کہا۔ "ناشتا کر کے دفتر چلے گئے۔"

"مگر رات انہوں نے کہا تھا کہ مجھ سے صبح بات کریں گے!"

"اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو کچھ تم مجھے بتا چکی ہو، وہ سب میں نے انہیں بتا دیا ہے۔"

"پھر کیا بولے؟"

"کچھ نہیں۔ ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ دفتر چلے گئے۔"

اسی دوران صدف کے موبائل کی گھنٹی بجی...... اس نے کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا انسپکٹر آصف تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ آئی جی کی ہدایت کے مطابق صدف سے ملنا چاہتا ہے۔

"میں گھر پر ہی ہوں۔" صدف نے اس سے کہا۔ "آ جائیے!" پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

"کسے بلایا ہے؟" دل شاد خانم نے پوچھا۔

صدف نے انہیں انسپکٹر آصف کے بارے میں بتا دیا۔

"کیا بیان دو گی اسے؟" دل شاد خانم نے پوچھا۔

"جو وہ پوچھنا چاہے گا، وہ بتا دوں گی لیکن یہ بہرحال نہیں بتاؤں گی کہ میں بابا کے کسی راز سے واقف ہو گئی ہوں۔ پولیس خود کچھ معلوم کر سکے تو کر لے۔ میں بابا کی گرفتاری میں فریق نہیں بننا چاہتی حالانکہ بابا کو میں نے بھی تاثر دیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتی۔"

دل شاد خانم کا چہرہ سپاٹ رہا۔

بیس منٹ بعد ہی انسپکٹر آصف آ گیا۔ صدف سے اس کی گفتگو ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ اس کے سوال جواب میں صدف نے وہی سب کچھ بیان کر دیا جو وہ آئی جی سے کہہ چکی تھی۔

"آپ کسی پر بھی شبے کا اظہار نہیں کر رہی ہیں۔" انسپکٹر آصف نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں کہ کوئی بلا وجہ کسی کی جان لینا چاہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"آپ اپنے دماغ پر زور دیجیے۔ میں کھوپڑی والی بات کی طرف تو نہیں جاؤں گا لیکن آپ اس پر غور کیجیے کہ جب آپ کو کسی بھی وجہ سے خطرے کا احساس ہوا اور آپ نے کالاش وادی جا کر مدد لینے کا فیصلہ کیا، اس سے پہلے چوبیس گھنٹے کا وقت آپ نے کیسے گزارا تھا۔ اس دوران میں کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سنا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے، اس کے خیال میں وہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی اس لیے وہ اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے لیکن کسی اور کے لیے یہ خطرناک بات ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ کسی کے علم میں آ گیا جو نہیں آنا چاہیے تھا اور جس کی وجہ سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے جو اس کے بارے میں کوئی خاص بات جان گیا ہو۔"

ان باتوں سے صدف نے اندازہ لگا لیا کہ انسپکٹر آصف محض عام سا پولیس آفیسر نہیں بلکہ خاصا پڑھا لکھا اور سمجھدار شخص بھی ہے۔

"سمجھ رہی ہیں نا..... آپ میری بات؟" انسپکٹر آصف قدرے توقف سے بولا۔

"جی۔" صدف نے کہا۔ "میں سوچوں گی، یاد کرنے کی کوشش کروں گی کہ میرے وہ چوبیس گھنٹے کس طرح گزرے تھے، میں نے کیا کیا دیکھا تھا یا کیا کیا سنا تھا۔"

"اگر ایسا کوئی معاملہ آپ کو یاد آ گیا تو پولیس کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔" انسپکٹر آصف نے کہا۔ "کسی اور انداز سے سوچ بچار اور تفتیش میں دیر لگ سکتی ہے۔ خیر!" اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر صدف کی طرف بڑھایا۔ "آپ کو اگر کچھ یاد آ جائے تو مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ کارڈ پر میرے دفتر اور میرے موبائل کا نمبر موجود ہے۔" اس کے ساتھ وہ کھڑا ہو گیا۔

"بہتر ہے۔"

اسے رخصت کرنے کے بعد صدف اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس نے شیراز سے رابطہ کیا۔ شیراز نے فوراً کال ریسیو کی۔

"میں رات سے ہی منتظر رہا ہوں تمہاری کال کا۔"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

شیراز نے کہا۔ ''میں نے فون اس لیے نہیں کیا کہ تم سو رہی ہوگی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں۔''

''جاگے ہوئے تو تم بھی تھے۔''

''ہاں! لیکن میں کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا اور میری آنکھ دو گھنٹے بعد کھل گئی تھی۔ خیر، چھوڑو یہ باتیں۔ اپنی سناؤ۔ کیا گزری؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' لیکن اس جواب کے باوجود صدف نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔

''یہ اچھا ہوا۔'' شیراز نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ایک پولیس موبائل تمہاری حفاظت کے لیے ہر وقت موجود رہے گی۔''

''اس قسم کی حفاظت کو میں اطمینان بخش نہیں سمجھتی۔'' صدف نے کہا۔ ''تم بھی ایسی خبریں سنتے اور پڑھتے رہے ہو کہ پولیس کی موجودگی میں لوگ قتل ہوتے رہے ہیں۔''

''وہ تو ہے، تاہم اس تدبیر سے دشمن کے لیے مشکلات بہرحال بڑھ جاتی ہیں اور ساتھ ہی خود بھی محتاط رہنا ضروری ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جب تک تمہارے دشمن کا پتا نہ چل جائے تم خود کو گھر تک محدود رکھو!''

''اس طرح تو میرا دم گھٹ جائے گا شیراز!''

شیراز نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ خود کو اپنے گھر تک محدود رکھو۔ کچھ تو احتیاط برتو!''

''اچھا!'' صدف نے طویل سانس لی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں خود کو قیدی سمجھ لیتی ہوں۔''

''کچھ بھی سمجھو لیکن یہ ضروری ہے کہ گھر تک محدود رہو۔''

''اچھا بابا!'' صدف نے منہ بنایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے خود پر کچھ تعجب ضرور تھا کہ اسے خطرے کی پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے اس بارے میں خود بھی سوچا تھا کہ یہ غیر فطری سی بات تھی۔

شب و روز گھر میں رہنے کے خیال ہی سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بستر پر پڑی اس معاملے پر غور کرتی رہی۔ اسے اب بڑی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شبہ اپنے باپ کے پارٹنر صدیق وڑائچ پر تھا لیکن پولیس کو وہ اپنے اس شبہے سے بھی آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح پولیس اس کے باپ کے بارے میں بھی سب کچھ جان لے گی۔ اس صورت میں اشرف خاں کی گرفتاری بھی یقینی ہو جاتی۔

سارا دن اسی الجھن میں گزر گیا۔ شام کو اس نے کچھ دیر شیراز سے موبائل پر بات کی۔

رات کے کھانے کی میز پر اس کا سامنا اشرف خاں سے ہوا۔ اشرف خاں سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی اسے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ دل شاد خانم بھی خاموش رہیں۔ اس میز پر رات کا کھانا اتنی خاموشی سے پہلے کبھی نہیں کھایا گیا تھا۔

کھانے کے بعد اشرف خاں نے اپنے معمول کے مطابق ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا۔ اس موقع پر دل شاد خانم اور صدف بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس موقع پر صدف نے فیصلہ کیا کہ اسے اشرف خاں سے بات کر لینی چاہیے۔ دل شاد خانم کی موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صدف انہیں سب کچھ بتا ہی چکی تھی۔

''بابا!'' صدف بولی۔

اشرف خاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ میری جان کے دشمن نہیں ہو سکتے لیکن مجھے ایک شخص پر شبہ ہے۔ کیا میں آپ سے اس بارے میں بات کر سکتی ہوں؟''

''کس پر شبہ ہے تمہیں؟'' اشرف خاں نے پوچھا۔

''پہلے میں اپنے ایک سوال کا جواب چاہوں گی۔''

''پوچھو!''

''کیا آپ نے اپنے کاروباری شریک کار کو بتا دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کے اصل کاروبار سے واقف ہو چکی ہوں؟''

''تمہارا اشارہ صدیق وڑائچ کی طرف ہے؟''

''جی۔''

''یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تم نے؟''

''اگر آپ نے ان کو اس بارے میں بتا دیا ہے تو وہ میرے دشمن ہو سکتے ہیں۔''

''کیا تم اس بارے میں پولیس کو بتانا چاہتی ہو؟ یعنی صدیق وڑائچ پر شبہے کا اظہار کرنا چاہتی ہو۔''

''میں الجھن کا شکار ہوں۔ میں نے پولیس کو یہ بات بتا دی اور وہ حقیقت ثابت ہو گئی تو اس کے بعد آپ بھی پولیس کی نظر میں مشتبہ ہو جائیں گے۔ آپ کی گرفتاری کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا۔''

اشرف خاں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمہیں یہ شبہ نہیں ہوا کہ میں ہی تمہیں ختم کرانا چاہتا ہوں؟''

دل شاد خانم اس دوران میں بالکل خاموش رہی تھیں۔ وہ اب بھی خاموش رہیں لیکن اشرف خاں کے سوال پر غور سے صدف کی طرف دیکھنے لگیں۔

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

صدف بولی۔ "میں صاف گوئی سے کہوں گی بابا کہ میں اس بارے میں بھی تذبذب کا شکار ہوں۔"

اشرف خاں کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔

صدف نے نظریں جھکا لیں۔

"یہ کیا کہہ گئیں تم!" دل شاد خانم بولیں۔ "تم نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں ان پر شبہ بہرحال رہا ہے۔"

صدف اب بھی خاموش رہی۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے خود پر رونا آنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے شیراز کو فون کیا۔ وہ اپنا ذہن بتانا چاہتی تھی۔ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو بھی وہ شیراز کو فون کرتی۔ اسے بتاتی کہ اشرف خاں سے کیا بات چیت ہو چکی ہے۔

کچھ دیر باتیں کر کے اس نے فون بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ خاصی دیر بعد اسے نیند آ ہی گئی۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس نے خواب میں داگناٹی کی کھوپڑی دیکھی اور اسے بٹیان غیلاری کی آواز سنائی دینے لگی۔

"مجھے دیر سے معلوم ہوا کہ خطرہ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ جاگ جاؤ!"

وہ فوراً جاگ گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ تکیے کے نیچے گیا۔ ان دنوں وہ ریوالور اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سونے لگی تھی۔

ریوالور اس کے ہاتھ میں بھی آ گیا لیکن اسی وقت کسی نے عقب سے اس کا منہ دبا دیا۔ منہ دبانے والے ہاتھ میں رومال یا ایسی ہی کوئی چیز تھی جس سے ایک عجیب سی بو سانس کے ذریعے اس کے جسم میں گئی اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

شیراز کا معمول تھا کہ ناشتا کرنے کے بعد انٹرنیٹ پر کئی اخبارات کی خبروں پر اچٹتی سی نظریں ضرور ڈالتا تھا۔ اگر کوئی خاص خبر دکھائی دیتی تو توجہ سے پڑھ لیتا تھا۔ اس روز اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے اس کے پیروں سے زمین نکل گئی ہو۔

خبر کے مطابق معروف بزنس مین اشرف خاں کی بیٹی صدف کو گزشتہ رات اس کی خواب گاہ سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس اس معاملے کی تفتیش کر رہی تھی۔

خبر میں اس معاملے کی وضاحت نہیں تھی۔ غالباً اخبار کی کاپی پریس جاتے جاتے یہ خبر ملی تھی، اسی لیے اسے مناسب جگہ بھی نہیں لگایا جا سکا تھا۔ صرف اشرف خاں کے نام کی وجہ سے شیراز کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

جلدی سے کمپیوٹر بند کر کے وہ تقریباً دوڑتا ہوا باہر نکلا اور کار میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے صدف کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کار کی رفتار کے ساتھ اس کا دماغ بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔

صدف......صدف ...... ! صرف اس نام کی گونج پھیلی ہوئی تھی اس کے دماغ میں اور یہ سوال اسے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا کہ کیا صدف کو مار دیا گیا ہوگا؟

نہیں، اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ زندہ ہوگی۔ اسے ہلاک تو اس کی خواب گاہ میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ اغوا کرنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوگا۔

اسی سوچ بچار اور ذہنی انتشار میں وہ صدف کے گھر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں اشرف خاں اور دل شاد خانم، دونوں ہی موجود تھے۔ دل شاد خانم کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دیر تک روتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اشرف خاں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

"یہ کیا ہوا ہے آنٹی؟ گھر میں یہ کیسے ہو گیا؟" شیراز دل شاد خانم سے مخاطب ہوا۔ وہ اشرف خاں سے کم ہی بات کرتا تھا اور اس وقت تو اس کو یہ خیال بھی تھا کہ صدف کے اغوا میں اشرف خاں کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ صدف کی یہ بات اپنی اہمیت کھو چکی تھی کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔

دل شاد خانم نے بیٹھی ہوئی سی آواز میں اسے بتایا۔ "وہ کئی تھے بیٹا! سب کے چہروں پر نقابیں تھیں۔ انہوں نے مجھے اور تمہارے انکل کو مضبوط ڈوریوں سے باندھ دیا تھا۔ وہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ اس کے بعد ہی صدف کے کمرے میں گئے ہوں گے۔ نہ جانے کیا گزری ہوگی اس پر......!" آخر میں ان کی آواز بھرا گئی۔

"پھر؟" شیراز نے بے تابی سے پوچھا۔ "آپ دونوں آزاد کیسے ہوئے؟"

اس مرتبہ دل شاد خانم سے بولا نہیں گیا۔ اشرف خاں نے جواب دیا۔ "انہیں باندھتے ہوئے وہ لوگ کچھ جلدی کر گئے تھے۔ ڈوری صحیح طور پر نہیں باندھی گئی تھی۔ دس بارہ منٹ کی کوشش سے یہ خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی تھیں، اس کے بعد انہوں نے مجھے ان ڈوریوں سے نجات

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

دلائی تھی۔ پھر ہم فوراً ہی صدف کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔ صدف موجود نہیں تھی۔''

''پھر...... پھر؟'' شیراز جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

''پولیس کو فون کیا تھا میں نے!'' اشرف خاں نے ہی جواب دیا۔ ''یہ رات ڈیڑھ بجے کا واقعہ ہے۔ پولیس نے آ کر ہر جگہ انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ انہوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ انہیں کوئی نشان ملا تھا یا نہیں۔ چھ بجے کے قریب گئے تھے وہ لوگ یہاں سے۔''

''باہر ایک پولیس موبائل بھی تو کھڑی ہوگی۔'' شیراز نے کہا۔ ''صدف نے مجھے بتایا تھا کہ......''

''سب پولیس والوں کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔'' اشرف خاں نے جواب دیا۔ ''ان کی گاڑی میں کسی قسم کی گیس کے دو شیل پھینکے گئے تھے اور وہ گیس اتنی تیزی سے خارج ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی گاڑی سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ گھر کے ملازمین بھی ہمیں بے ہوش ہی ملے تھے۔''

شیراز اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ اسے اشرف خاں پر غصہ آ رہا تھا جو اس وقت خود کو بہت پریشان ظاہر کر رہا تھا۔ شیراز کی دانست میں سب کچھ کیا دھرا اسی کا تھا۔ شیراز نے اس وقت یہاں تک سوچا کہ وہ پولیس کو بتا دے کہ صدف کو اپنے باپ کے بارے میں ایک ایجنسی ''را'' سے تعلق کا علم ہو گیا تھا۔

صرف اشرف خاں ہی کا نہیں بلکہ صدیق وڑائچ بھی ''را'' کے لیے کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کی مشترکہ دوا ساز کمپنی محض دکھاوا تھی۔ شیراز نے یہ بھی سوچ لیا کہ وہ کمپنی جعلی دوائیں بھی تیار کر سکتی تھی۔ ''را'' کے ایجنٹ کسی سے کوئی بھی کام لے سکتے تھے۔ انہیں ''فنڈنگ'' بھی وہی ملک کرتا ہوگا۔

دل شاد خانم کی نظریں اس وقت اشرف خاں کی طرف تھیں۔

شیراز نے سوچتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''صدف کو ہلاک کرنے کے بجائے اسے اغوا کیا گیا۔ یعنی اس کے دشمن یا دشمنوں کے منصوبے میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ ابھی تو صدف زندہ ہی ہوگی۔ اگر وہ لوگ اسے مارنا چاہتے تو یہیں مار دیتے، اغوا نہیں کرتے۔'' وہ یکایک اشرف خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے انکل؟''

''ہاں۔ یہ بات سمجھ میں تو آتی ہے۔'' اشرف خاں نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اب ان کا منصوبہ کچھ اور ہو۔''

''وہ کیا ہو سکتا ہے؟'' شیراز نے اشرف خاں کی طرف غور سے دیکھا۔

''کیا تمہیں یہ سوال مجھ سے کرنا چاہیے؟'' اشرف خاں نے تیز لہجے میں کہا۔

شیراز نے دل میں کہا۔ ''کرنا تو آپ ہی سے چاہیے۔'' لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر نہیں لا سکا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اشرف خاں کو دھمکی دے دے۔ اس سے کہہ دے کہ وہ جا کر سب کچھ بتا دے گا۔

لیکن اس نے یہ دھمکی نہیں دی۔ فہم و فراست کا تقاضا یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام لے۔ اشرف خاں کے گھر میں ہی بیٹھ کر اسے یہ دھمکی دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ فوری طور پر خود کو خطرات میں ڈال لے۔ اسے اس معاملے میں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

''میرا دماغ کچھ ناکارہ ہو گیا ہے۔'' شیراز نے اشرف خاں کو جواب دینے کے بجائے دل شاد خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے!''

''ہاں۔'' دل شاد خانم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''معاملہ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے۔''

دل شاد...... نے بس سر ہلا دیا۔ شیراز نے وہ جملہ کہا ابھی سے تھا۔ مگر اس کی نظریں اشرف خاں کی طرف ہی تھیں۔

اپنے گھر آ کر وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ صدف کے اغوا کی وجہ سے وہ بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس کے پاس جائے اور اشرف خاں کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔

لیکن وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نتائج و عواقب پر اچھی طرح غور کر لے۔ جو قدم اٹھانے کا خیال اسے بار بار آ رہا تھا، وہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ صرف اس کے بیان کی بنیاد پر پولیس اشرف خاں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی ٹھوس ثبوت ہونا ضروری تھا اور جتنا وقت پولیس کو ثبوت حاصل کرنے میں لگتا، اس دورانیے میں شیراز کی زندگی کسی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔

صدف اس کمرے میں ٹہل رہی تھی جہاں اسے ہوش آیا تھا۔ آرام کی ہر چیز اس کمرے میں موجود تھی۔ بستر بھی آرام دہ تھا لیکن صدف ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک ٹھیک سے آرام نہیں کر سکی تھی۔ جب حالات کے

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

باعث دماغ منتشر ہو تو انسان کے لیے آرام کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

اغوا ہونے سے پہلے صورت حال یہ بتا رہی تھی کہ کوئی اس کی زندگی ختم کرنا چاہتا ہے اور اب اغوا سے بات یہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ بعد میں کچھ اور سوچ کر اسے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا ہے ورنہ اسے اغوا کرنے کے بجائے اس کی خواب گاہ میں ختم بھی کیا جا سکتا تھا۔ بے ہوش کرنے کے بعد اس کے سینے میں چاقو بھی اتارا جا سکتا تھا۔

ارادے میں تبدیلی کیوں؟ یہ سوال صدف کے دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا......

اس کمرے کے ساز و سامان سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ جدید طرز کے کسی گھر میں ہوگی لیکن ایک طرف کی دیوار میں روشن دان کی موجودگی سے قدامت ظاہر ہو رہی تھی......

ہوش میں آنے پر ناشتے کا سامان اسے سرہانے کی تپائی پر رکھا نظر آیا تھا۔ اس سامان کے ساتھ گرم چائے اور گرم کافی کے تھرماس بھی تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والے اسے کوئی جسمانی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔

صدف کو جب ہوش آیا تھا، اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ کمرے میں لگے ہوئے دیوار گیر کلاک سے یہی بات ظاہر ہو رہی تھی ورنہ صدف کو وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

پریشانی میں اس نے ناشتا تو نہیں کیا البتہ کافی پی لی اور کمرے میں ٹہلتی رہی......

سات بج چکے تھے جب روشن دان سے ایک اخبار کمرے میں آ گرا۔ اس نے وہ جلدی سے اٹھایا۔ وہ سبھی خبروں پر نظر ڈالتی لیکن اس کی توجہ ایک چھوٹی سی خبر کی طرف اس لیے مبذول ہوگئی کہ اس کے گرد سرخ دائرہ بنایا گیا تھا۔

وہ خبر اس کے اغوا ہی کے بارے میں تھی۔ اسی سے اسے معلوم ہوا کہ اسے اغوا کرنے والوں نے پولیس والوں، گھر کے ملازمین کو بے ہوش کرنے کے علاوہ اس کے والدین کو بھی باندھ کر ڈال دیا تھا۔

اس خبر نے صدف کو اور زیادہ الجھا دیا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اسے اغوا کرنے والا اشرف خاں نہیں تھا......

''تو پھر کون؟''

اس سوال پر غور کرتے ہوئے اچانک اس کے دماغ میں خیال آیا کہ یہ سب ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کو یہ باور کرانا مقصود ہوگا کہ صدف کو اغوا کرنے میں اشرف خاں کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اخبار اسے بھی اس لیے پہنچایا گیا تھا کہ خبر پڑھ کر وہ سمجھ لے کہ اسے اشرف خاں نے اغوا نہیں کروایا تھا۔

لیکن یہ بات صدف کی سمجھ میں نہیں آ سکی کہ اشرف خاں کم از کم اسے کیوں باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کے اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں؟

ان خیالات میں بہتے ہوئے صدف پھر چونکی۔ یہ کیا ہو گیا؟ اسے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس کا جانی دشمن بن گیا ہے لیکن اس وقت وہ اسی انداز میں سوچ

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II [illegible]

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

رہی تھی......

اس نے اپنا سر جھٹکا۔ وہ صدیق وڑائچ کے بارے میں سوچنے لگی، لیکن یہ اس کے لیے معما ہی بنا رہا کہ اسے ختم کرنے کے بجائے اسے اغوا کیوں کیا گیا ہے؟ ارادے کی اس تبدیلی کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟

صدف کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اسے ان لوگوں کا بھی خیال آیا جواب تک اس کی حفاظت کرتے رہے تھے اور شیراز کو اس کے دشمنوں سے بچا چکے تھے۔ مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں بچایا؟ کیا انہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اسے اس کے گھر میں بھی ٹارگٹ کیا جاسکتا ہے؟

پھر صدف کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ اسے شاید انہی لوگوں نے اغوا کیا ہو اور مقصد یہی ہو کہ وہ خطرات میں نہ پڑے۔ اس کمرے میں وہ ہر خطرے سے محفوظ ہوگئی تھی۔ اخبار بھی اسے اسی لیے پہنچایا گیا تھا کہ وہ سمجھ لے کہ اس کے اغوا میں اس کے باپ کا ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے والدین کو تو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا!

صدف ٹہلتی رہی اور اس کا دماغ الجھتا ہی رہا۔ اسے شیراز کا بھی خیال آیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شیراز پولیس سے رابطہ کرکے وہ سب کچھ بیان کرسکتا ہے جو وہ اسے بتا چکی تھی۔

انہی خیالات میں الجھتے ہوئے اس نے کئی گھنٹے گزار دیے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ تھک جاتی تو کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ جاتی اور پھر ٹہلنے لگتی۔

اس کا خمیر نہ جانے کہاں سے اٹھا تھا کہ وہ پہلے بھی کسی مرحلے پر خوف زدہ نہیں ہوئی تھی اور اب بھی اسے کوئی خوف نہیں تھا۔

دوپہر بھی ڈھلنے لگی۔ ایک بج چکا تھا جب وہ چونکی۔ اس نے دیکھا کہ ایک مضبوط باسکٹ آہستہ آہستہ روشن دان سے نیچے آرہی تھی۔ اس باسکٹ میں خاصی بڑی ٹرے تھی۔ باسکٹ فرش پر آکر ٹک گئی۔ صدف نے اس کے قریب جاکر دیکھا۔ ٹرے میں اس کے لیے کھانا بھیجا گیا تھا۔

اتنی مہمان نوازی؟ صدف کے دماغ میں سوال ابھرا۔ وہ بھوک تو محسوس کررہی تھی لیکن کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت اشرف خاں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے صدیق وڑائچ سے کہہ رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں فون پر بتادیا تھا کہ اس واقعے کے باعث میں بہت الجھا ہوا ہوں، پھر بھی تم نے اصرار کیا کہ میں دفتر آؤں کیونکہ تم مجھ سے ملاقات کرکے کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن تم کچھ کہنے کے بجائے بس گھورے جارہے ہو مجھے!“

”ہاں۔“ صدیق وڑائچ نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ تم نے صدف کو زندہ رہنے دیا ہوگا یا کہیں اور لے جاکر ختم کرادیا ہوگا۔“

”کیا بکواس کررہے ہو تم صدیق!...... میں فون پر تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اور اخبار میں آچکا ہے کہ وہ لوگ مجھے اور دل شاد کو باندھ کر چھوڑ گئے تھے۔“

”یہ سب کچھ مجھے تمہارا ڈراما معلوم ہورہا ہے۔ تم اسے اپنے گھر میں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے یا ایک بات اور ہوسکتی ہے......“

”مزید کوئی بات نہیں ہوسکتی۔“ اشرف خاں نے اس کی بات کاٹی۔ ”حقیقت صرف یہ ہے کہ میرے فیصلے کے بارے میں تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے میں نے صدف کو ختم کرانے کا فیصلہ ترک کردیا تھا، یا یوں سمجھ لو کہ بعد میں باپ کا دل نرم پڑ گیا تھا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح سمجھانے ہی کی کوشش کرتا۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم اشرف خاں!...... تم نے میری بات پوری نہیں ہونے دی۔ ایک بات اور ابھی ہوسکتی ہے۔ یہ ڈراما کرکے تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ صدف کے اغوا میں تمہارا ہاتھ نہیں۔“

”تم بے تکے انداز میں سوچ رہے ہو!“

”اگر یہ بے تکا انداز ہے تو بتاؤ کہ صدف کو اغوا کرنے یا کروانے والا اور کون ہوسکتا ہے...... کس میں اتنی ہمت آسکتی ہے کہ وہ تمہاری یعنی اشرف خاں کی بیٹی کو اغوا کرسکے؟“

”یہ تو پولیس ہی معلوم کرسکے گی۔“

”نہیں اشرف خاں!...... صدف خطرہ تھی تو صرف تمہارے لیے یا میرے لیے۔ اس کے دشمن ہم دونوں ہی ہوسکتے ہیں۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اسے میں نے اغوا کروایا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا۔“

”تو کوئی تیسرا دشمن کون ہوسکتا ہے صدف کا!“

”میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تو پولیس ہی معلوم کرسکے گی۔“

”ان فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں اشرف خاں

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

......تم مجھے صاف بتاؤ کہ ابھی اسے زندہ رکھا ہے یا ختم کروا چکے ہو۔"

"شاید میں تمہاری غلط فہمی دور نہیں کرسکتا۔"

"سنو اشرف خاں!" صدیق وڑائچ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے ابھی بتاؤ کہ وہ کہاں ہے ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تم سے اپنا کاروباری اشتراک ختم کرلوں۔ میں کسی ایسے شخص کا شریک کاروبار نہیں رہنا چاہتا جو تم جیسا سفاک ہو۔ اتنا سفاک کہ اپنی بیٹی کو ہی......"

اشرف خاں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "تم اپنی سوچ کا انداز بدلو صدیق!"

"میں فیصلہ کرکے آیا ہوں اشرف خاں!" صدیق وڑائچ نے کہا۔ "تمہیں دونوں میں سے کوئی ایک بات ماننا ہوگی۔ تم مجھے صدف کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے تو ہماری شراکت فوراً ختم ہو جانی چاہیے۔ میں اپنے لیگل ایڈوائزر کو ہدایات بھی دے آیا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم جھوٹ بولنے سے باز نہیں آؤ گے۔ وہ کاغذات تیار ہو چکے ہوں گے جن کی رو سے ہمارا پچھلا شراکت نامہ منسوخ ہوجائے گا۔ میں کمپنی میں نصف کا حصے دار ہوں۔ میرا سرمایہ تم مجھے لوٹا دو۔"

"ہوں۔" اشرف خاں کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "کیا اس طرح ہمارا تعلق ختم ہوجائے گا؟"

"ظاہر ہے۔"

"را کے لیے ہم دونوں ہی کام کرتے ہیں۔"

"وہ کوئی شراکت داری نہیں ہے، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ میں آج ہی شاستری سے بات کرلوں گا۔"

شاستری وہ ایجنٹ تھا جس کی ہدایات کے مطابق وہ دونوں کام کرتے تھے۔

"کیا بات کرو گے شاستری سے؟" اشرف خاں نے پوچھا۔

"یہی کہ اسے مجھ سے جو کام لینا ہے، وہ مجھ سے لے اور جو کام تم سے لینا ہے، وہ تم سے لے۔ کوئی بھی کام ہم دونوں کو بہ یک وقت نہ دیا جائے گا۔"

"اچھا!" اشرف خاں نے طویل سانس لی۔ "میری اس پریشانی کی حالت میں بھی تم مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کرہی چکے ہو تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"ہماری علیحدگی اسی وقت ہونا ہے۔"

"جیسا چاہو۔" اشرف خاں نے کہا۔ "کیا تمہارے لیگل ایڈوائزر نے کاغذات تیار کرلیے ہوں گے؟"

"ابھی معلوم ہوجائے گا۔" صدیق وڑائچ نے کہا اور اپنا موبائل نکال کر اس پر اپنے لیگل ایڈوائزر سے رابطہ کرنے لگا۔

اشرف خاں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے سے گہری سوچ بچار کا اظہار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ذہنی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ صدف کو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اسے وقت کا علم بھی نہ ہو پاتا اگر کمرے میں دیوار گیر کلاک نہ ہوتا۔ اس وقت کلاک میں رات کے نو بجنے والے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھی خیالات میں ڈوب ابھر رہی تھی... کہ دروازے کے قریب ہونے والی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

وہ ایک مرتبہ دروازے کے قریب جاکر اسے کھولنے کی کوشش کرچکی تھی اور خود اس کے خیال کے مطابق بھی دروازہ باہر سے بند ہونا چاہیے تھا اور وہ بند ہی تھا۔ صدف نے اس کمرے کی قیدی بننے کے بعد پہلی مرتبہ دروازے پر قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ وہ بستر سے کھڑی ہوگئی۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والے اس شخص کو دیکھ کر اسے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ صدیق وڑائچ تھا۔ اس نے دروازہ صرف بھیڑنے پر اکتفا کیا اور صدف کی طرف چلا آیا۔

"کچھ فیصلہ کرلیا تم نے!" صدف بے خوفی سے بولی۔ "مجھے اب گولی مارو گے یا ذبح کرو گے؟ زہر تو تم میرے منہ میں اس وقت بھی ٹپکا سکتے تھے جب مجھے میری خواب گاہ میں بے ہوش کیا گیا تھا۔"

"بہت بہادر لڑکی ہو تم! میں تمہارے چہرے پر خوف کا سایہ بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔" صدیق وڑائچ اس کے قریب آگیا۔ صدف ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹی اور صدیق وڑائچ کو گھورتی رہی۔

"بیٹھ جاؤ!" صدیق وڑائچ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہی پوچھو گے کہ میں نے تمہارے اور اپنے باپ کے بارے میں کس کس کو وہ سب کچھ بتادیا ہے جو میں جان چکی ہوں۔ مجھے ختم کرنے کے بعد تم ان لوگوں کو بھی ختم کرنا چاہو گے۔"

"بیٹھ جاؤ بے بی! میرا خیال ہے کہ تم نے وہ باتیں شیراز کے علاوہ کسی کو نہیں بتائی ہوں گی۔" صدیق وڑائچ نے کہا۔ "اور مجھے اپنے ذریعے سے معلوم ہوگیا تھا کہ شیراز

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

کو پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے وہاں جانے کا مطلب تم بھی سمجھ سکتی ہو اور میں نے بھی سمجھ لیا تھا۔''

صدف چونکی۔ ''شیراز کے ساتھ تم نے کیا کیا؟''

''کچھ نہیں۔ وہ اپنے گھر پر ہوگا۔ اشرف خاں پر پولیس نے ابھی ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔ ثبوت حاصل کیے بغیر پولیس یہ قدم اٹھا بھی نہیں سکتی۔ صرف ایک شخص کے بیان کی وجہ سے وہ اشرف خاں کو گرفتار کر سکتی ہے نہ مجھے!''

''تو کیا ہم دونوں کو ایک ساتھ ختم دو گے؟'' صدف چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اسے آج رات اغوا کرنے کا منصوبہ تو بنا لیا ہوگا تم نے!''

''تم فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہو۔'' صدیق وڑائچ کسی حد تک جھنجلا گیا۔ ''نہ میں اسے قتل کرنا چاہتا ہوں نہ تمہیں۔''

''تو مجھے مذاق میں اغوا کیا ہے؟''

''ہاں۔ تمہیں اغوا تو میں نے ہی کرایا ہے۔'' صدیق وڑائچ نے کہا۔ ''اگر نہ کرواتا تو تم اپنے گھر میں بھی ماری جا سکتی تھیں۔ اشرف خاں تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا کیونکہ تم اس کے خلاف واحد گواہ ہو۔ صرف تم ہی نے میری اور اس کی باتیں سنی تھیں لیکن میں اشرف خاں کو شروع ہی میں لعن طعن کر چکا ہوں کہ اس نے یہ فیصلہ غلط کیا ہے۔ میں نے تو تمہاری حفاظت کا بندوبست کیا تھا صدف! اشرف خاں نے اپنے گروہ کے لوگوں کو چترال اور کالاش وادی کی طرف بھیجا تھا اس لیے میں نے بھی فوری طور پر بندوبست کیا تھا کہ وہ تمہیں نہ مار سکیں۔ شیراز کو تمہارے دشمنوں سے میں نے ہی بچایا تھا اور جن لوگوں نے کالاش وادی سے پشاور آنے والے راستے میں تمہاری کار پر ایک بڑا پتھر لڑھکایا تھا، ان پر فائرنگ بھی میرے آدمیوں نے کی تھی۔''

صدف حیران نظر آنے لگی۔

''کیا مطلب!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''کیا مطلب ہوا ان باتوں کا؟''

''شاید میں نے کوئی بھی الجھی ہوئی بات نہیں کی۔'' صدیق وڑائچ اب بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں بچانے اور اپنی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے میں جو کچھ کر سکتا تھا، وہی کیا ہے میں نے!''

پھر اس نے خاموش ہو کر اپنا موبائل نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ صدف حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صدیق وڑائچ کی باتوں پر یقین کرے یا نہ کرے!

''کہاں ہو؟'' صدیق وڑائچ نے موبائل فون پر کسی سے پوچھا اور کہا۔ ''میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' پھر اس نے کچھ سن کر صرف ''اچھا'' کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''میں کچھ بھی سمجھنے سے اب تک قاصر ہوں۔'' صدف کی آواز اس مرتبہ بھرائی ہوئی سی تھی۔

''میں نے اپنی زندگی بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے صدف!'' صدیق وڑائچ نے کہا۔ ''میں نے اشرف خاں کے ادارے سے اپنی شراکت ختم کر لی ہے۔ اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ اس شرط پر ایک ادارے کے حوالے کر دیا ہے کہ اسے غریبوں کی بہتری پر خرچ کیا جائے۔ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' صدف کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد اسے کیا کہنا چاہیے!

''کیوں؟'' صدیق وڑائچ کی مسکراہٹ پژمردہ سی تھی۔ ''نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک ایسی زندگی گزار رہا ہوں جو مجھے نہیں گزارنا چاہیے تھی۔ آج میں نے اپنے اور اشرف خاں کے خلاف ثبوت بھی حاصل کر لیا ہے۔ آج میں نے اس سے اپنی علیحدگی کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، وہ ریکارڈ بھی کر لی تھیں۔ وہ ریکارڈنگ اور اپنا ایک تفصیلی بیان بھی میں پولیس کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ایک خاص کام کرنے کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔'' صدف دھنسی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''خواب میں سن رہی ہوں میں تمہاری باتیں اور یہ تم نے بلایا کسے ہے؟''

اس سے پہلے کہ صدیق وڑائچ اسے جواب دیتا، کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی ایک آواز آئی۔

''مہمان ...... باس!'' یہ گویا اطلاع تھی۔

''آنے دو۔''

فوراً دروازہ کھلا اور جو شخصیت اندر آئی، اسے دیکھ کر صدف بھونچکا رہ گئی۔ وہ دل شاد خانم تھیں۔

''مما!'' صدف کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔

دل شاد خانم تیزی سے اس کے قریب آئیں اور اسے سینے سے لگا کر پاگلوں کی طرح پیار کرنے لگیں۔ پھر سر موڑ کر صدیق وڑائچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کس زبان

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

سے تمہارا شکریہ ادا کروں!"

"کیا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے؟" صدیق وڑائچ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا یہ میرا فرض نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو مرنے سے بچاؤں؟"

صدف چونکی۔

"ہاں صدف!" دل شاد خانم نے کہا۔ "صدیق ہی تمہارے باپ ہیں۔"

صدف پاگلوں کی طرح کبھی صدیق وڑائچ کی طرف اور کبھی دل شاد خانم کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں صدف!" دل شاد... بولیں۔ "میری پہلی شادی صدیق ہی سے ہوئی تھی۔ جب تم ایک سال کی تھیں تو ہم دونوں ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ بعد میں وہ غلط فہمی تو رفع ہو گئی لیکن طلاق ہو چکی تھی اور میں نے اشرف خاں سے شادی بھی کر لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں صدیق کی مطلقہ ہوں۔ میں نے اس سے یہ شرط منوالی تھی کہ یہ بات وہ تم پر کبھی ظاہر نہ ہونے دے کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔"

اس وقت صدیق وڑائچ موبائل فون پر کسی کو پتا بتانے کے بعد کہہ رہا تھا۔ "آپ اپنے کسی افسر کو ہتھکڑیوں کے ساتھ یہاں بھیج دیں۔ میں گرفتاری دینے کے لیے تیار ہوں۔" پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دل شاد... بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب میں اشرف خاں سے طلاق لے کر تم سے شادی کر سکتی تھی اور تم......"

"اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے دل شاد!" صدیق وڑائچ نے کہا اور پھر صدف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے غداری کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی ہے اور شاید عمر قید...... اس لیے کہ میں خود ہی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ دونوں ہی صورتوں میں ہمیں ہمیشہ کے لیے بچھڑنا ہے۔ ایسی صورت میں کیا تم ایک مرتبہ میرے سینے سے نہیں لگو گی بیٹی؟"

"بابا!" صدف کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"میری بیٹی!" صدیق وڑائچ نے بڑی محبت سے کہا۔

صدف اس کے سینے سے جا لگی۔ اس وقت دل شاد خانم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"پولیس شاید اشرف خاں کو گرفتار کر چکی ہو۔" دل شاد خانم نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ "میں کار میں گھر سے کچھ دور نکل آئی تھی جب میں نے بیک مرر میں دیکھا تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں بنگلے کے سامنے آئی تھیں۔"

"پولیس کو میرا بیان جو مل چکا ہے۔ ابھی آئی جی نے مجھے فون پر بتایا ہے۔ اشرف خاں کے خلاف کوئی بڑا ثبوت تو نہیں لیکن شیراز کے پاس میری اور اشرف خاں کی گفتگو کی ریکارڈنگ اسے گرفتار کرنے کے لیے تو کافی ہے......"

اسی وقت ایک آدمی تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔

"باس!" وہ تیزی سے بولا۔ "اشرف خاں کے آدمیوں نے حملہ کیا ہے۔ وہ اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"روکو انہیں!" صدیق وڑائچ نے دانت پر دانت جما لیے تھے۔

رائفل والا جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

"اب کیا ہوگا بابا!" صدف کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں۔" صدیق وڑائچ نے کہا۔ "میرے جیتے جی تم دونوں پر آنچ نہیں آ سکتی۔"

اسی وقت صدیق وڑائچ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

صدیق وڑائچ نے فوراً کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا اشرف خاں تھا۔

"پولیس مجھے گرفتار نہیں کر سکی صدیق!" اشرف خاں کی آواز میں چیلنج تھا۔ "فرار ہونے کی نوبت تمہاری وجہ سے آئی ہے اس لیے اب میرے آدمی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ تمہیں گھر میں گھس کر ماریں گے۔"

"چوہا نہیں ہوں میں اشرف خاں کہ تمہارے آدمی مجھے آسانی سے مار لیں۔" صدیق وڑائچ دہاڑا۔ "ہاتھ میرا بھی خالی نہیں ہے۔"

پھر اس نے مزید کچھ کہے سنے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور جیب سے ریوالور نکال کر دل شاد خانم سے بولا۔ "تم دروازہ اندر سے بند کر لو!" اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا۔

"آپ خود کیوں جا رہے ہیں بابا!" صدف اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ "آپ کے آدمی......"

"یہاں میرے زیادہ آدمی نہیں ہیں میری بچی!" صدیق نے کہا۔ "وہ انہیں اندر آنے سے نہیں روک سکیں گے۔ تم دونوں بھی خطرے میں پڑ جاؤ گی۔"

"ہم ساتھ مر جائیں گے بابا!" صدف جذباتی ہو گئی۔ "اتنے دن بعد تو مجھے ملا ہے اپنا باپ۔ اب ساتھ ہی جئیں گے اور ساتھ ہی مریں گے، یا مجھے بھی ایک ریوالور دیجیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ......"

www.urdusoftbooks.com

www.urdusoftbooks.com

"ابھی تو میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ تم اپنی ماں کے ساتھ یہیں رکو میری جان!"

"نہیں۔" صدف اس سے لپٹ گئی۔ "مما آپ کو......"

"اسے سنبھالو دل شاد!" صدیق وڑائچ نے صدف کو شاید پوری قوت سے دل شاد خانم کی طرف دھکیل دیا۔ صدف گرتے گرتے بچی۔ اسے دل شاد خانم ہی نے سنبھالا تھا۔

صدیق وڑائچ تقریباً دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ بڑی شدت سے جاری تھی۔

"مجھے جانے دیں مما!" صدف نے خود کو دل شاد خانم سے چھڑایا اور دروازے کی طرف لپکی۔

"صدف!" دل شاد خانم نے اسے آواز دی اور اس کے پیچھے آئی۔

صدف اس وقت مایوسی کا سامنا کر چکی تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ صدیق وڑائچ نے دل شاد خانم سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا لیکن صدف کی جذباتیت دیکھ کر خود ہی باہر سے دروازہ بند کر گیا تھا۔

صدف نے پاگلوں کی طرح دروازے پر گھونسے برسا دیے۔

"خود کو قابو میں رکھو صدف...... میری بچی!" دل شاد خانم نے اسے گھسیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

اسی وقت ایسا معلوم ہوا جیسے گولیاں چلنے میں شدت آ گئی ہو۔ ان دھماکوں سے سارا علاقہ گونج رہا تھا۔

"مما!" صدف سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "اتنے دن چھپائے رکھی آپ نے مجھ سے یہ بات!"

"میں نہیں چاہتی تھی بیٹی کہ تم اشرف خاں کو سوتیلا باپ سمجھو۔"

اسی وقت گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔

صدف چونکی۔ "یہ کیا ہوا؟"

لیکن دل شاد... کیا جواب دیتی! وہ خود کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔

پھر دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازہ کھول کر صدیق وڑائچ اندر آیا۔

"پولیس آ گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ان کی طرف سے جب فائرنگ ہوئی تو اشرف خاں کے آدمی بھاگ نکلے۔ میں اپنے آدمیوں سے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور پولیس کو اندر آنے دیں۔"

صدف پھر اس سے جا لپٹی۔ اس کی جذباتیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"دل شاد!" صدیق وڑائچ بولا۔ "میرے گھر کی قیمت بیس کروڑ سے کم نہیں ہے۔ وہ میں صدف کے نام کر چکا ہوں۔ تم وہ بیچ کر کوئی چھوٹا گھر خرید لینا، دو تین کروڑ کا۔ باقی رقم سے دونوں مناسب زندگی گزار سکتی ہو۔"

دوڑتے ہوئے وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔

پولیس اندر آ چکی تھی۔

"بابا!" صدف آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "آپ اس طرح ملے اب بچھڑ بھی جائیں گے۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں بیٹی! تم نے اشرف خاں سے جو باتیں کی تھیں، وہ بھی بتائی تھیں اس نے مجھے۔ تمہاری ان باتوں نے میرا ضمیر جھنجوڑ ڈالا اور تم سے مجھے جو محبت ہے، اس نے بھی مجھے مجبور کیا کہ میں اس زندگی سے کنارہ کر لوں۔"

زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور کئی پولیس والے اندر آ گئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر اور ایک انسپکٹر بھی تھا۔

"صدیق وڑائچ؟" انسپکٹر سوالیہ انداز میں بولا۔

"ہاں۔" صدیق وڑائچ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میری کلائیاں حاضر ہیں آفیسر!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

جب صدیق وڑائچ کے ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں، صدف دل شاد ... کے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔ دل شاد خانم کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"آفیسر!" صدیق وڑائچ بولا۔ "یہ صدف اور اس کی ماں ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ انہیں اپنی حفاظت میں میرے گھر پہنچا دیجیے گا۔" پھر وہ دل شاد خانم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اشرف خاں کے گھر جانا پسند نہیں کرو گی۔"

دل شاد خانم نے اثبات میں سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"شیراز کو بھی فون کر دو۔" ہتھکڑیاں لگے ہوئے صدیق وڑائچ نے کہا پھر مسکرا کر صدف سے بولا۔ "میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے تمہاری شادی میں گھنٹا بھر شرکت کی اجازت دے۔"

صدف ایک بار پھر روتی ہوئی صدیق وڑائچ سے جا لپٹی۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ اشرف خاں کو شہر سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا......

www.urdusoftbooks.com